وفیاتِ بُرہان

مشاہیر عالم کے انتقال پر ماہنامہ ''برہان'' دہلی میں شائع ہونے والی تحریریں

(جولائی 1938ء تا اپریل 2001ء)

مرتّبہ

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

قرطاس

وفیات برہان

(جولائی ۱۹۳۸ء تا اپریل ۲۰۰۱ء)

مرتبہ

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

قرطاس

۲۰۱۸ء

جملہ حقوق محفوظ

قرطاس

سلسلۂ مطبوعات - ۱۴۷

نومبر ۲۰۱۸ء

قیمت : -/۱۰۰۰ روپے

ISBN: 978-969-9640-54-4

ش ف ی

۹۲۰ وفیاتِ برہان/مرتب: ڈاکٹر محمد سہیل شفیق۔

کراچی: قرطاس، ۲۰۱۸ء۔

۲۶۶ص۔ (قرطاس سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۴۷)

اشاریہ شامل ہے

آئی ایس بی این:

۱۔شخصیات۔ ۲۔وفیات۔ ۳۔برہان (دہلی) ۱۹۳۸ء۔۲۰۰۱ء۔

الف۔مرتب۔ ب۔(سلسلۂ مطبوعات)۔

قرطاس

فلیٹ نمبر A-15، گلشن امین ٹاور، گلستان جوہر بلاک 15، کراچی

موبائل: 0321-3899909 ای میل: saudzaheer@gmail.com

ویب سائٹ: www.qirtas.co.nr

انتساب

جناب **رفیق العصری** (دائم اقبال دائم کتب خانہ، اسلام گڑھ، میر پور آزاد کشمیر)

جناب **ضیاء اللہ کھوکھر** (عبدالمجید کھوکھر یادگاری کتب خانہ، گوجرانوالہ)

جناب **ڈاکٹر ندیم شفیق ملک** (صفیہ رفیق کتب خانہ، اسلام آباد)

جناب **راشد علی زئی** (میرا کتب خانہ، حضرو، اٹک)

برادرم **محمد زبیر** (شرف آباد بیدل لائبریری، کراچی)

اور

جناب **ملک نواز احمد اعوان** (کراچی)

کی کتابوں سے محبت کے نام

سہیل

یلوح الخط فی القرطاس دھرا
و کاتبہ رمیم فی التراب

تحریر کاغذ (قرطاس) میں عرصے تک چمکتی رہتی ہے
جب کہ اسے لکھنے والا مر کر مٹی میں بوسیدہ ہوجاتا ہے

فہرست

پیش لفظ _____ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق ۱۷

مقدمہ _____ ڈاکٹر سفیر اختر ۱۹

نمبر شمار	تاریخ اشاعت	شخصیت	وفیات نگار	صفحہ نمبر
۱	جولائی ۱۹۳۸ء	ڈاکٹر علامہ محمد اقبال	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۲۵
۲	جولائی ۱۹۳۸ء	مولانا سید سراج احمد رشیدی	ایضاً	۲۵
۳	جولائی ۱۹۳۸ء	مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	ایضاً	۲۶
۴	دسمبر ۱۹۳۸ء	مصطفیٰ کمال پاشا	ایضاً	۲۶
۵	دسمبر ۱۹۳۸ء	مولانا شوکت علی	ایضاً	۲۸
۶	جنوری ۱۹۴۰ء	مولانا سید احمد مہاجر مدنی	ایضاً	۲۹
۷	مارچ ۱۹۴۰ء	علامہ طنطاوی جوہری	ایضاً	۲۹
۸	مارچ ۱۹۴۰ء	مولانا معین الدین اجمیری	ایضاً	۳۱
۹	اکتوبر ۱۹۴۰ء	خواجہ عشرت لکھنوی	ایضاً	۳۱
۱۰	اکتوبر ۱۹۴۰ء	احسن مارہروی	ایضاً	۳۲
۱۱	اکتوبر ۱۹۴۰ء	ڈینی سن راس	ایضاً	۳۲
۱۲	دسمبر ۱۹۴۰ء	مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری	ایضاً	۳۲
۱۳	اپریل ۱۹۴۱ء	سر شاہ محمد سلیمان	ایضاً	۳۳
۱۴	مئی ۱۹۴۱ء	مولوی ابوالمکارم عبدالبصیر عتیقی آزاد	ایضاً	۳۵
۱۵	اپریل ۱۹۴۲ء	مولانا شکر اللہ مبارکپوری	ایضاً	۳۵
۱۶	اپریل ۱۹۴۲ء	مشتاق احمد انبیٹھوی	ایضاً	۳۶
۱۷	اپریل ۱۹۴۲ء	مولوی قاضی ظہور الحق	ایضاً	۳۶
۱۸	اگست ۱۹۴۲ء	مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی	ایضاً	۳۶
۱۹	اگست ۱۹۴۳ء	مولانا اشرف علی تھانوی	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	۳۶
۲۰	نومبر ۱۹۴۳ء	نواب عالی مرحوم	حمیدہ سلطانہ	۳۸

۲۱	دسمبر۱۹۴۳ء	والدہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	۴۰
۲۲	مارچ۱۹۴۴ء	حاجی موسیٰ میاں سملکی (جنوبی افریقا)	ایضاً	۴۰
۲۳	اگست۱۹۴۴ء	مولانا محمد الیاس کاندھلوی	ایضاً	۴۰
۲۴	ستمبر۱۹۴۴ء	مولانا عبیداللہ سندھی	ایضاً	۴۱
۲۵	فروری۱۹۴۵ء	مولانا سید اصغر حسین	ایضاً	۴۲
۲۶	جولائی/اگست۱۹۴۵ء	مولانا قاری محمد اسحاق نقشبندی مجددی	ادارہ	۴۳
۲۷	مئی۱۹۴۶ء	مولانا محمد میاں منصور	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۴۴
۲۸	مئی۱۹۴۶ء	پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی	ایضاً	۴۴
۲۹	مئی۱۹۴۶ء	سید طفیل احمد منگلوری	ایضاً	۴۵
۳۰	فروری۱۹۴۷ء	مولانا عبدالسمیع	ایضاً	۴۵
۳۱	مئی۱۹۴۷ء	سید شاہ محمد محی الدین پھلواروی	ایضاً	۴۶
۳۲	مئی۱۹۴۷ء	مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی	ایضاً	۴۶
۳۳	مارچ۱۹۴۸ء	گاندھی جی	ایضاً	۴۶
۳۴	اکتوبر۱۹۴۸ء	محمد علی جناح [قائداعظم]	ایضاً	۴۹
۳۵	نومبر۱۹۴۹ء	حاجی اسرار احمد	محمد حفظ الرحمٰن	۵۰
۳۶	جنوری۱۹۵۰ء	مولانا شبیر احمد عثمانی	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۵۰
۳۷	اپریل۱۹۵۰ء	مسٹر اے کیمرن	ایضاً	۵۳
۳۸	ستمبر۱۹۵۰ء	مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی	ایضاً	۵۴
۳۹	فروری۱۹۵۱ء	مولانا عاشق حسین سیماب اکبرآبادی	ایضاً	۵۵
۴۰	فروری۱۹۵۱ء	مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی	ایضاً	۵۵
۴۱	جون۱۹۵۱ء	مولانا حسرت موہانی	ایضاً	۵۶
۴۲	نومبر۱۹۵۱ء	لیاقت علی خان [وزیراعظم پاکستان]	ایضاً	۵۷
۴۳	جنوری۱۹۵۲ء	مولانا سید مرتضیٰ حسن	ایضاً	۵۹
۴۴	جنوری۱۹۵۲ء	نہال سیوہاروی	ایضاً	۵۹
۴۵	مارچ۱۹۵۲ء	مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی	ایضاً	۵۹
۴۶	مئی۱۹۵۲ء	حافظ ضیاء الدین احمد	ایضاً	۶۰
۴۷	اگست۱۹۵۲ء	ڈاکٹر ابرار حسین [والد ماجد سعید احمد اکبرآبادی]	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	۶۰
۴۸	جنوری۱۹۵۳ء	مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۶۲
۴۹	فروری۱۹۵۳ء	حاجی شیخ رشید احمد	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	۶۴

۵۰	مئی ۱۹۵۳ء	آصف علی	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۶۵
۵۱	مئی ۱۹۵۳ء	شفیق الرحمٰن قدوائی	ایضاً	۶۵
۵۲	دسمبر ۱۹۵۳ء	سلطان ابن سعود	ایضاً	۶۵
۵۳	دسمبر ۱۹۵۳ء	مولانا سید سلیمان ندوی	ایضاً	۶۶
۵۴	جنوری ۱۹۵۴ء	عبداللہ یوسف علی	ایضاً	۶۷
۵۵	ستمبر ۱۹۵۴ء	مفتی حافظ عبداللطیف سہارنپوری	ایضاً	۶۷
۵۶	ستمبر ۱۹۵۴ء	مولانا الحاج عبدالرحمٰن	ایضاً	۶۷
۵۷	نومبر ۱۹۵۴ء	رفیع احمد قدوائی	ایضاً	۶۸
۵۸	فروری ۱۹۵۵ء	سرشانتی سروپ بھٹناگر	ایضاً	۷۰
۵۹	فروری ۱۹۵۵ء	پنڈت کشن پرشاد کول	ایضاً	۷۰
۶۰	اپریل ۱۹۵۵ء	مولانا محمد اعزاز علی	ایضاً	۷۰
۶۱	اگست ۱۹۵۵ء	مولانا عبدالحق مدنی	ایضاً	۷۲
۶۲	ستمبر ۱۹۵۵ء	خواجہ حسن نظامی دہلوی	ایضاً	۷۳
۶۳	ستمبر ۱۹۵۵ء	مولانا بشیر احمد کٹھوری	ایضاً	۷۴
۶۴	نومبر ۱۹۵۵ء	شاہ محمد عبدالحلیم عطا شیخ	ایضاً	۷۴
۶۵	نومبر ۱۹۵۵ء	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی	ایضاً	۷۴
۶۶	دسمبر ۱۹۵۵ء	اقبال سہیل	ایضاً	۷۵
۶۷	جنوری ۱۹۵۶ء	مولانا حافظ محمد اسلم جیراج پوری	ایضاً	۷۵
۶۸	فروری ۱۹۵۶ء	قاضی عبدالغفار مرادآبادی	ایضاً	۷۶
۶۹	مئی ۱۹۵۶ء	سید ابوالنظر رضوی	ایضاً	۷۶
۷۰	جولائی ۱۹۵۶ء	مولانا مناظر احسن گیلانی	ایضاً	۷۷
۷۱	جولائی ۱۹۵۶ء	خان بہادر مولوی بشیر الدین	ایضاً	۷۷
۷۲	جولائی ۱۹۵۶ء	سید مرتضیٰ علی	ایضاً	۷۸
۷۳	ستمبر ۱۹۵۶ء	مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی	ایضاً	۷۸
۷۴	اکتوبر ۱۹۵۶ء	مولانا نورالدین بہاری	ایضاً	۷۸
۷۵	نومبر ۱۹۵۶ء	مولانا عبدالسلام ندوی	ایضاً	۷۹
۷۶	دسمبر ۱۹۵۶ء	مولانا ظفر علی خاں	ایضاً	۷۹
۷۷	اپریل ۱۹۵۷ء	حاجی محمد اسمٰعیل جیون بخش	ایضاً	۸۰
۷۸	اگست/دسمبر ۱۹۵۷ء	مولانا آزاد سبحانی	ایضاً	۸۰

۷۹	نومبر۱۹۵۷ء	مولانا سید محمد ادریس سکروڈوی	ایضاً	۸۰
۸۰	دسمبر۱۹۵۷ء	مولانا سید حسین احمد مدنی	ایضاً	۸۰
۸۱	جنوری۱۹۵۸ء	رام بابو سکسینہ	ایضاً	۸۲
۸۲	مارچ۱۹۵۸ء	مولانا ابوالکلام آزاد	ایضاً	۸۲
۸۳	اپریل۱۹۵۸ء	افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق	ایضاً	۸۳
۸۴	جون۱۹۵۸ء	ڈاکٹر خاں	ایضاً	۸۴
۸۵	جون۱۹۵۸ء	مولانا سید ابوظفر ندوی	ایضاً	۸۴
۸۶	فروری۱۹۵۹ء	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	ایضاً	۸۵
۸۷	جولائی۱۹۵۹ء	مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	ایضاً	۸۵
۸۸	اکتوبر۱۹۵۹ء	سید عنایت حسین	ایضاً	۸۵
۸۹	اکتوبر۱۹۵۹ء	چودھری محمد علی رودولوی	ایضاً	۸۶
۹۰	اکتوبر۱۹۵۹ء	عبدالمجید سالک	ایضاً	۸۶
۹۱	دسمبر۱۹۵۹ء	سید محمد احمد کاظمی	ایضاً	۸۷
۹۲	دسمبر۱۹۵۹ء	اسد ملتانی	ایضاً	۸۷
۹۳	دسمبر۱۹۵۹ء	مولانا حافظ احمد سعید دہلوی	ایضاً	۸۷
۹۴	جنوری۱۹۶۰ء	مولانا مفتی عبداللطیف	ایضاً	۸۷
۹۵	مارچ۱۹۶۰ء	نواب بھوپال حاجی حمیداللہ خاں	ایضاً	۸۸
۹۶	مارچ۱۹۶۰ء	دلؔ شاہ جہاں پوری	ایضاً	۸۸
۹۷	مئی۱۹۶۰ء	قاضی ظہورالحسن ناظمؔ سیوہاروی	ایضاً	۸۸
۹۸	اگست۱۹۶۰ء	مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی	ایضاً	۸۹
۹۹	اکتوبر۱۹۶۰ء	جگر مرادآبادی	ایضاً	۹۰
۱۰۰	جنوری۱۹۶۱ء	مولانا محمد شفیع [دیوبند]	ایضاً	۹۱
۱۰۱	اپریل۱۹۶۱ء	ڈپٹی حبیب اللہ خان	ایضاً	۹۲
۱۰۲	مئی۱۹۶۱ء	امجدؔ حیدرآبادی	ایضاً	۹۲
۱۰۳	جون۱۹۶۱ء	سید عبدالعلی	ایضاً	۹۲
۱۰۴	ستمبر۱۹۶۱ء	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	ایضاً	۹۳
۱۰۵	ستمبر۱۹۶۱ء	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری	ایضاً	۹۴
۱۰۶	فروری۱۹۶۲ء	شاہ سلیمان احمد چشتی	ایضاً	۹۴
۱۰۷	اپریل۱۹۶۲ء	مولانا احمد علی	ایضاً	۹۵

۱۰۸	اپریل۱۹۶۲ء	شعیب قریشی	ایضاً	۹۵
۱۰۹	اگست۱۹۶۲ء	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی	ایضاً	۹۵
۱۱۰	ستمبر۱۹۶۲ء	مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری	ایضاً	۹۷
۱۱۱	اکتوبر۱۹۶۲ء	مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں	ایضاً	۹۸
۱۱۲	اکتوبر۱۹۶۲ء	نواب مقصود جنگ بہادر مولانا حکیم مقصود علی خاں	ایضاً	۹۸
۱۱۳	اکتوبر۱۹۶۲ء	حکیم محمد اسمٰعیل	ایضاً	۹۹
۱۱۴	جنوری۱۹۶۳ء	خواجہ عبدالمجید	ایضاً	۹۹
۱۱۵	جون۱۹۶۳ء	ڈاکٹر راجندر پرشاد	ایضاً	۹۹
۱۱۶	جون۱۹۶۳ء	ڈاکٹر محی الدین زورؔ	ایضاً	۹۹
۱۱۷	جون۱۹۶۳ء	خان بہادر مولوی محمد شفیع	ایضاً	۱۰۰
۱۱۸	جون۱۹۶۳ء	مولانا سعید انصاری	ایضاً	۱۰۰
۱۱۹	جون۱۹۶۳ء	شفیق جونپوری	ایضاً	۱۰۰
۱۲۰	جون۱۹۶۳ء	مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی	ایضاً	۱۰۰
۱۲۱	جون۱۹۶۳ء	ڈاکٹر ہادی حسن	ایضاً	۱۰۱
۱۲۲	اکتوبر۱۹۶۳ء	سید صدیق حسن	ایضاً	۱۰۱
۱۲۳	نومبر۱۹۶۳ء	مولانا حکیم سید محفوظ علی	ایضاً	۱۰۲
۱۲۴	دسمبر۱۹۶۳ء	کینیڈی	ایضاً	۱۰۲
۱۲۵	دسمبر۱۹۶۳ء	مولانا محفوظ الرحمٰن نامی	ایضاً	۱۰۳
۱۲۶	جون۱۹۶۴ء	پنڈت جواہر لال نہرو	ایضاً	۱۰۳
۱۲۷	ستمبر۱۹۶۴ء	پروفیسر محمد عمر الدین	ایضاً	۱۰۴
۱۲۸	جنوری۱۹۶۵ء	مولانا صبغۃ اللہ شہیدؔ فرنگی محلی	ایضاً	۱۰۵
۱۲۹	مارچ۱۹۶۵ء	خواجہ عبدالحئی فاروقی	ایضاً	۱۰۵
۱۳۰	اپریل۱۹۶۵ء	مولانا محمد یوسف [امیر تبلیغی جماعت]	ایضاً	۱۰۵
۱۳۱	نومبر۱۹۶۵ء	مولانا شیخ محمد بدر عالم میرٹھی	ایضاً	۱۰۶
۱۳۲	نومبر۱۹۶۵ء	پنڈت تربھون ناتھ زارؔ زتشی	ایضاً	۱۰۷
۱۳۳	دسمبر۱۹۶۵ء	سید ناڈاکٹر طاہر سیف الدین	ایضاً	۱۰۸
۱۳۴	فروری۱۹۶۶ء	شاستری جی	ایضاً	۱۰۸
۱۳۵	فروری۱۹۶۶ء	پروفیسر تلک چند محروم	ایضاً	۱۰۹
۱۳۶	جولائی۱۹۶۶ء	پروفیسر ایم ایم شریف	ایضاً	۱۰۹

۱۳۷	جولائی ۱۹۶۶ء	نیاز فتح پوری	ایضاً	۱۱۰
۱۳۸	جولائی ۱۹۶۶ء	مولانا عبدالسلام نیازی	ایضاً	۱۱۰
۱۳۹	نومبر ۱۹۶۶ء	مولانا بشیر احمد خاں	ایضاً	۱۱۰
۱۴۰	اکتوبر ۱۹۶۶ء	ڈاکٹر عبدالبصیر خان	ایضاً	۱۱۱
۱۴۱	جنوری ۱۹۶۷ء	مولوی مجید حسن	ایضاً	۱۱۱
۱۴۲	جنوری ۱۹۶۷ء	پوتا، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	ایضاً	۱۱۱
۱۴۳	مارچ ۱۹۶۷ء	میر عثمان علی خاں [نظام حیدرآباد]	ایضاً	۱۱۱
۱۴۴	جولائی ۱۹۶۷ء	اہلیہ، مولانا محمد انور شاہ کشمیری	ایضاً	۱۱۲
۱۴۵	ستمبر ۱۹۶۷ء	خواجہ محمد علی شاہ رحمانی	ایضاً	۱۱۲
۱۴۶	ستمبر ۱۹۶۷ء	حاجی احمد غریب	ایضاً	۱۱۲
۱۴۷	اکتوبر ۱۹۶۷ء	مولانا مسعود علی ندوی	ایضاً	۱۱۲
۱۴۸	دسمبر ۱۹۶۷ء	مولانا شاہ وصی اللہ	ایضاً	۱۱۳
۱۴۹	جنوری ۱۹۶۸ء	علامہ محمد ابراہیم بلیاوی	ایضاً	۱۱۳
۱۵۰	فروری ۱۹۶۸ء	حافظ محمد ابراہیم	ایضاً	۱۱۴
۱۵۱	مارچ ۱۹۶۸ء	عبدالباقی [مدیر ہفت روزہ کاروانِ وطن]	ایضاً	۱۱۵
۱۵۲	جولائی ۱۹۶۸ء	پرویز شاہدی	ایضاً	۱۱۶
۱۵۳	اگست ۱۹۶۸ء	مظفر شاہ خاں یوسفی	ایضاً	۱۱۷
۱۵۴	اگست ۱۹۶۸ء	مولانا محمد جلیل کیرانوی	ایضاً	۱۱۷
۱۵۵	اگست ۱۹۶۸ء	مولانا محمد مبارک علی	ایضاً	۱۱۸
۱۵۶	اکتوبر ۱۹۶۸ء	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	ایضاً	۱۱۸
۱۵۷	اکتوبر ۱۹۶۸ء	مفتی انتظام اللہ شہابی	ایضاً	۱۱۸
۱۵۸	دسمبر ۱۹۶۸ء	مولانا حمید الدین فیض آبادی	ایضاً	۱۱۸
۱۵۹	دسمبر ۱۹۶۸ء	رئیس احمد جعفری	ایضاً	۱۱۹
۱۶۰	دسمبر ۱۹۶۸ء	محمد نظام الدین	ایضاً	۱۲۰
۱۶۱	فروری ۱۹۶۹ء	مولانا لقاء اللہ عثمانی	ایضاً	۱۲۰
۱۶۲	فروری ۱۹۶۹ء	مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی	ایضاً	۱۲۰
۱۶۳	فروری ۱۹۶۹ء	قاری حفظ الرحمٰن	ایضاً	۱۲۱
۱۶۴	مئی ۱۹۶۹ء	ڈاکٹر ذاکر حسین	ایضاً	۱۲۱
۱۶۵	جون ۱۹۶۹ء	الم مظفر نگری	ایضاً	۱۲۲

۱۶۶	فروری ۱۹۷۰ء	جمال عبدالناصر	ایضاً	۱۲۲
۱۶۷	فروری ۱۹۷۱ء	اسرار احمد آزاد	ایضاً	۱۲۳
۱۶۸	فروری ۱۹۷۱ء	قاری محمد یوسف	ایضاً	۱۲۳
۱۶۹	فروری ۱۹۷۱ء	روش صدیقی	ایضاً	۱۲۳
۱۷۰	جولائی ۱۹۷۱ء	الحاج شیخ فیروز الدین جاپان والا	ایضاً	۱۲۴
۱۷۱	اگست ۱۹۷۱ء	پروفیسر محمد حبیب	ایضاً	۱۲۸
۱۷۲	اگست ۱۹۷۱ء	مولانا سید محمود	ایضاً	۱۲۸
۱۷۳	اگست ۱۹۷۱ء	خیؔر بہوروی	ایضاً	۱۲۹
۱۷۴	اگست ۱۹۷۱ء	محمد یٰسین نوری بیرسٹر	ایضاً	۱۲۹
۱۷۵	اگست ۱۹۷۱ء	مولانا عبدالحفیظ بلیاوی	ایضاً	۱۲۹
۱۷۶	اکتوبر ۱۹۷۱ء	ڈاکٹر سید محمود	ایضاً	۱۲۹
۱۷۷	اکتوبر ۱۹۷۱ء	اسداللہ کاظمی	ایضاً	۱۲۹
۱۷۸	نومبر ۱۹۷۱ء	مولانا رسول خان	ایضاً	۱۳۰
۱۷۹	دسمبر ۱۹۷۱ء	ڈاکٹر سید عبداللطیف	ایضاً	۱۳۱
۱۸۰	دسمبر ۱۹۷۱ء	مولانا غلام رسول مہؔر	ایضاً	۱۳۲
۱۸۱	جنوری ۱۹۷۲ء	خواجہ غلام السیدین	ایضاً	۱۳۲
۱۸۲	جنوری ۱۹۷۲ء	مولانا احتشام الحسن کاندھلوی	ایضاً	۱۳۲
۱۸۳	مارچ ۱۹۷۲ء	مولانا عبدالباری حاوی	ایضاً	۱۳۳
۱۸۴	مئی ۱۹۷۲ء	الحاج محمد اسمٰعیل [صدر مسلم لیگ و جمعیت علماء ہند]	ایضاً	۱۳۳
۱۸۵	مئی ۱۹۷۲ء	مولانا سید فخر الدین احمد	ایضاً	۱۳۳
۱۸۶	ستمبر ۱۹۷۲ء	ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	ایضاً	۱۳۴
۱۸۷	نومبر ۱۹۷۲ء	مُلّا جان محمد	ایضاً	۱۳۴
۱۸۸	نومبر ۱۹۷۲ء	مولانا محمد عاقل	ایضاً	۱۳۵
۱۸۹	اکتوبر ۱۹۷۲ء	پروفیسر سید احتشام حسین	ایضاً	۱۳۵
۱۹۰	فروری ۱۹۷۳ء	سید عبدالرحمٰن تھنگل	ایضاً	۱۳۵
۱۹۱	فروری ۱۹۷۳ء	مولانا عبداللطیف نعمانی	ایضاً	۱۳۵
۱۹۲	فروری ۱۹۷۳ء	عبدالقیوم انصاری	ایضاً	۱۳۵
۱۹۳	فروری ۱۹۷۳ء	غلام احمد فرقت	ایضاً	۱۳۶
۱۹۴	مئی ۱۹۷۳ء	حاجی اقبال احمد	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	۱۳۶

۱۹۵	مئی۱۹۷۳ء	حاجی محمد صالح	ایضاً	۱۳۷
۱۹۶	جون۱۹۷۳ء	مولانا عبدالصمد رحمانی	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۱۳۷
۱۹۷	اگست۱۹۷۳ء	پروفیسر ضیا احمد بدایونی	ایضاً	۱۳۸
۱۹۸	ستمبر۱۹۷۳ء	مولانا عبدالسلام فاروقی	ایضاً	۱۳۸
۱۹۹	اکتوبر۱۹۷۳ء	پروفیسر عبدالمعید خاں	ایضاً	۱۳۸
۲۰۰	فروری۱۹۷۴ء	مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی	حفیظ الرحمٰن عمری	۱۳۹
۲۰۱	مئی۱۹۷۴ء	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۱۴۲
۲۰۲	مئی۱۹۷۴ء	شیخ ابوزہرہ	ایضاً	۱۴۲
۲۰۳	جون۱۹۷۴ء	ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی	ایضاً	۱۴۳
۲۰۴	جون۱۹۷۴ء	شیخ علال فاسی	ایضاً	۱۴۳
۲۰۵	اگست۱۹۷۴ء	سید امین الحسینی [مفتی اعظم فلسطین]	ایضاً	۱۴۳
۲۰۶	نومبر۱۹۷۴ء	مفتی سید عمیم الاحسان مجددی	ایضاً	۱۴۴
۲۰۷	جنوری۱۹۷۵ء	شاہ معین الدین احمد ندوی	ایضاً	۱۴۵
۲۰۸	جنوری۱۹۷۵ء	نورالدین بیرسٹر	ایضاً	۱۴۵
۲۰۹	مئی۱۹۷۵ء	شاہ فیصل شہید	ایضاً	۱۴۵
۲۱۰	مئی۱۹۷۵ء	مولانا عامر عثمانی	ایضاً	۱۴۶
۲۱۱	اکتوبر۱۹۷۵ء	مولانا شاہد فاخری الہ آبادی	ایضاً	۱۴۶
۲۱۲	نومبر۱۹۷۵ء	مولانا سید محمد میاں	ایضاً	۱۴۷
۲۱۳	نومبر۱۹۷۵ء	آغا شورش کاشمیری	ایضاً	۱۴۷
۲۱۴	دسمبر۱۹۷۵ء	ڈاکٹر میر ولی الدین	ایضاً	۱۴۸
۲۱۵	دسمبر۱۹۷۵ء	مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی	ایضاً	۱۴۸
۲۱۶	فروری۱۹۷۶ء	مولانا عبدالباری ندوی	ایضاً	۱۴۸
۲۱۷	مارچ۱۹۷۶ء	ڈاکٹر عبدالعلیم	ایضاً	۱۴۹
۲۱۸	اپریل۱۹۷۶ء	ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی	ایضاً	۱۴۹
۲۱۹	مئی۱۹۷۶ء	مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوری	ایضاً	۱۵۰
۲۲۰	مئی۱۹۷۶ء	محمد یوسف صدیقی	ایضاً	۱۵۰
۲۲۱	جولائی۱۹۷۶ء	مولانا محمد عثمان فارقلیط	ایضاً	۱۵۱
۲۲۲	جولائی۱۹۷۶ء	مولانا محمد رحمت اللہ	ایضاً	۱۵۳
۲۲۳	اکتوبر۱۹۷۶ء	مولانا مفتی محمد شفیع	ایضاً	۱۵۳

۲۲۴	اکتوبر۱۹۷۶ء	مولانا محمد اویس نگرامی ندوی	ایضاً	۱۵۴
۲۲۵	اکتوبر۱۹۷۶ء	ڈاکٹر وحید مرزا	ایضاً	۱۵۴
۲۲۶	جنوری۱۹۷۷ء	مولانا عبدالماجد دریابادی	ایضاً	۱۵۴
۲۲۷	فروری۱۹۷۷ء	پروفیسر رشید احمد صدیقی	ایضاً	۱۵۵
۲۲۸	مارچ۱۹۷۷ء	فخرالدین علی احمد	ایضاً	۱۵۶
۲۲۹	جون۱۹۷۷ء	مولانا شریف الحسن	ایضاً	۱۵۹
۲۳۰	جون۱۹۷۷ء	مولانا شاہ عزالدین	ایضاً	۱۶۰
۲۳۱	جون۱۹۷۷ء	مولانا مفتی عتیق احمد فرنگی محلی	ایضاً	۱۶۰
۲۳۲	اگست۱۹۷۷ء	مولانا محمد سلیم	ایضاً	۱۶۰
۲۳۳	ستمبر۱۹۷۷ء	بسمل سعیدی	ایضاً	۱۶۱
۲۳۴	نومبر۱۹۷۷ء	مولانا محمد یوسف بنوری	ایضاً	۱۶۲
۲۳۵	نومبر۱۹۷۷ء	قاری محمد یعقوب	ایضاً	۱۶۲
۲۳۶	دسمبر۱۹۷۷ء	مولانا سید اختر حسین	ایضاً	۱۶۲
۲۳۷	مارچ۱۹۷۸ء	اعجاز صدیقی	ایضاً	۱۶۲
۲۳۸	مارچ۱۹۷۸ء	شفیع الدین نیر	ایضاً	۱۶۲
۲۳۹	جون۱۹۷۸ء	مولانا ماہر القادری	ایضاً	۱۶۳
۲۴۰	جون۱۹۷۸ء	حکیم صدیق احمد امروہوی بریلوی	ایضاً	۱۶۳
۲۴۱	اکتوبر۱۹۷۸ء	خان بہادر میجر محمد یٰسین خان ناغڑ	حبیب احمد فریدی	۱۶۳
۲۴۲	اکتوبر۱۹۷۸ء	مولانا محمد اسمٰعیل نانا [جنوبی افریقا]	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۱۶۵
۲۴۳	جنوری۱۹۷۹ء	ڈاکٹر سید عابد حسین	ایضاً	۱۶۵
۲۴۴	مارچ۱۹۷۹ء	ڈاکٹر یوسف حسین خان	ایضاً	۱۶۶
۲۴۵	اپریل۱۹۷۹ء	سید محبوب رضوی	ایضاً	۱۶۶
۲۴۶	جون۱۹۷۹ء	مولانا فضل اللہ الگیلانی	ایضاً	۱۶۶
۲۴۷	جولائی۱۹۷۹ء	مولانا محمد الحسنی	ایضاً	۱۶۷
۲۴۸	جولائی۱۹۷۹ء	مولانا اسعد اللہ	ایضاً	۱۶۸
۲۴۹	ستمبر۱۹۷۹ء	مولانا عبدالسلام قدوائی	ایضاً	۱۶۸
۲۵۰	ستمبر۱۹۷۹ء	مولانا محمد اسحٰق جلیس	ایضاً	۱۶۹
۲۵۱	اکتوبر۱۹۷۹ء	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ایضاً	۱۶۹
۲۵۲	جنوری۱۹۸۰ء	مولانا ظفر احمد خاں	ایضاً	۱۷۰

۲۵۳	اپریل۱۹۸۰ء	قاضی محمد عدیل عباسی	ایضاً	۱۷۰
۲۵۴	مئی۱۹۸۰ء	مولانا احتشام الحق تھانوی	ایضاً	۱۷۱
۲۵۵	اگست/ستمبر۱۹۸۰ء	اختری بیگم [اہلیہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی]	ایضاً	۱۷۲
۲۵۶	اکتوبر۱۹۸۰ء	مولانا سید فخر الحسن الحسنی العمری	ایضاً	۱۷۲
۲۵۷	اکتوبر۱۹۸۰ء	علامہ جمیل مظہری	ایضاً	۱۷۳
۲۵۸	جنوری۱۹۸۱ء	خان بہادر شیخ محمد جان	ایضاً	۱۷۳
۲۵۹	جنوری۱۹۸۱ء	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی	ایضاً	۱۷۴
۲۶۰	فروری۱۹۸۱ء	پروفیسر اشتیاق حسین قریشی	ایضاً	۱۷۴
۲۶۱	مارچ۱۹۸۱ء	امتیاز علی خاں عرشی	ایضاً	۱۷۶
۲۶۲	نومبر۱۹۸۱ء	کے۔ایل۔گابا	ایضاً	۱۷۷
۲۶۳	نومبر۱۹۸۱ء	پروفیسر اصغر علی فیضی	ایضاً	۱۷۸
۲۶۴	فروری۱۹۸۲ء	حافظ احمد سعید خان [نواب آف چھتاری]	ایضاً	۱۷۸
۲۶۵	اپریل۱۹۸۲ء	مولانا محمد ثانی [بھانجہ، مولانا ابوالحسن ندوی]	ایضاً	۱۷۹
۲۶۶	اپریل۱۹۸۲ء	احسان دانش	ایضاً	۱۷۹
۲۶۷	جون۱۹۸۲ء	مولانا محمد زکریا [شیخ الحدیث]	ایضاً	۱۸۰
۲۶۸	جولائی۱۹۸۲ء	پیر سید حسام الدین راشدی	ایضاً	۱۸۲
۲۶۹	جولائی۱۹۸۲ء	مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری	ایضاً	۱۸۴
۲۷۰	اکتوبر۱۹۸۲ء	شیخ محمد عبداللہ [وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر]	ایضاً	۱۸۴
۲۷۱	نومبر۱۹۸۲ء	مولانا محمد کفیل فاروقی	ایضاً	۱۸۵
۲۷۲	فروری۱۹۸۳ء	مولانا عبدالحمید نعمانی	ایضاً	۱۸۶
۲۷۳	مارچ۱۹۸۳ء/ اگست۱۹۸۶ء	ڈاکٹر محمد نور النبی	مولانا سعید احمد اکبرآبادی/ حمید نسیم رفیع آبادی	۱۸۷
۲۷۴	اپریل۱۹۸۳ء	مولانا محمد رفیع	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۱۸۹
۲۷۵	اپریل۱۹۸۳ء	لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید	ایضاً	۱۸۹
۲۷۶	اگست۱۹۸۳ء	مولانا قاری محمد طیب	ایضاً	۱۹۳
۲۷۷	مارچ۱۹۸۴ء	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	ایضاً	۱۹۵
۲۷۸	مارچ۱۹۸۴ء	پروفیسر محمد سرور جامعی	ایضاً	۱۹۵
۲۷۹	مارچ۱۹۸۴ء	میاں ایم اسلم	ایضاً	۱۹۵
۲۸۰	مارچ۱۹۸۴ء	نانی، رضاء الرحمٰن	ادارہ	۱۹۶
۲۸۱	مارچ۱۹۸۴ء	سید عبدالدائم الجلالی	محمد نظر علی خاں	۱۹۶

۲۸۲	مئی ۱۹۸۴ء/۱۹۸۶ء	مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۲۰۲
۲۸۳	جون ۱۹۸۴ء/ مئی ۱۹۸۵ء	مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	محمد اظہر صدیقی	۲۰۸
۲۸۴	جولائی ۱۹۸۴ء	ڈاکٹر پی کے عبدالغفور	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۲۰۸
۲۸۵	جولائی ۱۹۸۴ء	جسٹس بشیر احمد سعید	ایضاً	۲۰۹
۲۸۶	جولائی ۱۹۸۴ء	مولانا محمد عثمان	ایضاً	۲۰۹
۲۸۷	اگست ۱۹۸۴ء	عمر سعید	عمید الرحمٰن عثمانی	۲۰۹
۲۸۸	ستمبر ۱۹۸۴ء	مولانا حامد علی خاں	وجیہہ الدین احمد	۲۱۰
۲۸۹	نومبر ۱۹۸۴ء	شریمتی اندرا گاندھی	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۲۱۱
۲۹۰	اپریل ۱۹۸۵ء	اہلیہ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	عمید الرحمٰن عثمانی/ محمد اظہر صدیقی	۲۱۳
۲۹۱	جون ۱۹۸۵ء	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	جمیل مہدی/ عمید الرحمٰن عثمانی	۲۱۴
۲۹۲	فروری ۱۹۸۶ء	مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری	قاضی اطہر مبارکپوری	۲۱۷
۲۹۳	اپریل ۱۹۸۷ء	مولانا حفیظ الرحمٰن واصف	جمیل مہدی	۲۱۹
۲۹۴	مئی ۱۹۸۷ء	پرنس نجم الدین	ایضاً	۲۲۰
۲۹۵	نومبر ۱۹۸۷ء	مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن	جمیل مہدی	۲۲۲
۲۹۶	فروری ۱۹۸۸ء	جمیل مہدی	محمد اظہر صدیقی/ عمید الرحمٰن عثمانی	۲۲۴
۲۹۷	ستمبر ۱۹۸۸ء	جنرل محمد ضیاء الحق [صدرِ پاکستان]	عمید الرحمٰن عثمانی	۲۲۷
۲۹۸	ستمبر ۱۹۸۹ء	امام خمینی	ایضاً	۲۲۹
۲۹۹	جنوری ۱۹۹۰ء	اہلیہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	ایضاً	۲۳۰
۳۰۰	جنوری ۱۹۹۰ء	مولانا افضل حسین	ایضاً	۲۳۱
۳۰۱	جنوری ۱۹۹۰ء	حکیم شریف الدین بقائی	ایضاً	۲۳۱
۳۰۲	دسمبر ۱۹۹۰ء	مولانا ابواللیث صدیقی	ایضاً	۲۳۱
۳۰۳	دسمبر ۱۹۹۰ء	پنڈت وجے لکشمی	ایضاً	۲۳۲
۳۰۴	دسمبر ۱۹۹۰ء	قاضی سجاد حسین	ایضاً	۲۳۲
۳۰۵	مارچ ۱۹۹۱ء	مولانا محمد تقی امینی	محمد مشتاق تجاروی	۲۳۳
۳۰۶	اپریل ۱۹۹۱ء	مولانا منت اللہ رحمانی	عمید الرحمٰن عثمانی	۲۳۶
۳۰۷	اپریل ۱۹۹۱ء	قاضی زین العابدین میرٹھی	ایضاً	۲۳۶
۳۰۸	اپریل ۱۹۹۱ء	شری راجندر ماتھر	ایضاً	۲۳۷
۳۰۹	مئی ۱۹۹۱ء	راجیو گاندھی	ایضاً	۲۳۷
۳۱۰	جولائی ۱۹۹۲ء	غفار احمد ناز انصاری	ادارہ	۲۳۸

۳۱۱	نومبر۱۹۹۲ء	میر واعظ مولوی عمر فاروق	عمید الرحمٰن عثمانی	۲۳۹
۳۱۲	نومبر۱۹۹۲ء	حکیم عبدالقوی دریابادی	ایضاً	۲۳۹
۳۱۳	نومبر۱۹۹۲ء	مولانا حامداللہ الانصاری غازی	ایضاً	۲۴۰
۳۱۴	نومبر۱۹۹۲ء	حکیم الیاس کٹھوری	ایضاً	۲۴۰
۳۱۵	جنوری/فروری۱۹۹۳ء	سردار نرنجن سنگھ لانبہ	ایضاً	۲۴۰
۳۱۶	اپریل۱۹۹۳ء	مولانا غلام محمد نور گت	ایضاً	۲۴۱
۳۱۷	جون۱۹۹۳ء	مولانا مفتی شوکت علی فہمی	ادارہ	۲۴۱
۳۱۸	جون۱۹۹۳ء	مولانا شمس الرحمٰن نوید عثمانی	ایضاً	۲۴۲
۳۱۹	جولائی۱۹۹۴ء	خلیق ٹونکی	ایضاً	۲۴۳
۳۲۰	اگست۱۹۹۴ء	علامہ اخلاق حسین دہلوی	ایضاً	۲۴۳
۳۲۱	فروری۱۹۹۵ء	مخمور عثمانی	ایضاً	۲۴۴
۳۲۲	اپریل ومئی۱۹۹۵ء	مولانا وحید الزماں کیرانوی	ایضاً	۲۴۴
۳۲۳	اپریل ومئی۱۹۹۵ء	شمیم عثمانی	ایضاً	۲۴۵
۳۲۴	اپریل ومئی۱۹۹۵ء	توفیق فاروقی	ایضاً	۲۴۵
۳۲۵	ستمبر۱۹۹۵ء	قاری جلیل الرحمٰن عثمانی	ایضاً	۲۴۶
۳۲۶	جون/جولائی۱۹۹۶ء	قاضی اطہر مبارکپوری	ایضاً	۲۴۶
۳۲۷	جولائی/اگست۱۹۹۷ء	والدہ، ڈاکٹر جوہر قاضی	عمید الرحمٰن عثمانی	۲۴۷
۳۲۸	ستمبر۱۹۹۷ء	مقیم الدین فاروقی	م۔س۔ب	۲۴۷
۳۲۹	ستمبر۱۹۹۷ء	لیڈی ڈیانا	عمید الرحمٰن عثمانی	۲۴۷
۳۳۰	ستمبر۱۹۹۷ء	مدر ٹریسا	ایضاً	۲۴۹
۳۳۱	مارچ۱۹۹۸ء	مولانا احمد رضا بجنوری	ادارہ	۲۵۰
۳۳۲	اکتوبر۱۹۹۸ء	حکیم محمد سعید دہلوی	ایضاً	۲۵۰
۳۳۳	جولائی۱۹۹۹ء	حکیم عبدالحمید دہلوی	عمید الرحمٰن عثمانی	۲۵۱
۳۳۴	ستمبر۱۹۹۹ء	نجیب الرحمٰن عثمانی	ایضاً	۲۵۲
۳۳۵	ستمبر۱۹۹۹ء	مولانا عبدالرشید نعمانی	ایضاً	۲۵۳
۳۳۶	جنوری وفروری۲۰۰۰ء	حکیم محمد زماں الحسینی	ادارہ	۲۵۳
۳۳۷	جنوری وفروری۲۰۰۰ء	مولانا ابوالحسن علی ندوی	ایضاً	۲۵۴

۞۞۞

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

پیش لفظ

تاریخ کا ایک ماخذ تذکرۂ رفتگاں یا وفیات نگاری بھی ہے۔عربی زبان میں ابن خلکان کی وفیات الاعیان وانباء الزمان، ذہبی کی تاریخ الاسلام و وفیات المشاهیر والاعلام اور ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جب کہ اردو زبان میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کے علاوہ پاک و ہند کے علمی و تحقیقی جرائد نے بھی اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔اس سلسلے میں ماہ نامہ ''معارف'' اعظم گڑھ اور ماہ نامہ ''برہان'' دہلی بالخصوص قابل ذکر ہیں۔''برہان'' ندوۃ المصنفین کا علمی ترجمان تھا، جس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۳۸ء/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوا۔مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی اس کے بانیوں میں ہیں۔''برہان'' کے اجراء سے اپنی وفات (۱۹۸۵ء) تک مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہی اس کے مدیر رہے۔البتہ درمیان میں دو سال (فروری ۱۹۴۳ء تا دسمبر ۱۹۴۵ء) مولانا کے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں بحیثیت لیکچرر تقرر کے باعث مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے برہان کی ادارتی ذمے داریاں سنبھالیں۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی پوری زندگی درس و تدریس، تعلیم و تربیت، تبلیغ و اشاعت، تصنیف و تالیف اور تحقیق سے عبارت ہے۔مولانا کی دینی و علمی خدمات کا یہ سلسلہ دیوبند سے علی گڑھ، سینٹ اسٹیفن کالج اور مغربی جامعات تک پھیلا ہوا ہے۔مولانا کے قلم سے ایک درجن کے لگ بھگ مستقل تصانیف اور سینکڑوں مقالات و مضامین قرطاس کی زینت بنے۔مولانا سعید اکبرآبادی اور ''برہان'' لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بغیر برہان کا تصور بھی مشکل تھا۔یہی وجہ ہے کہ مولانا کی وفات (۱۹۸۵ء) کے بعد یہ سلسلہ زیادہ عرصے چل نہیں سکا۔

مولانا کی وفات کے بعد مارچ ۱۹۸۵ء سے مئی ۱۹۸۵ء تک مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے داماد اطہر صدیقی نے ''برہان'' کی ادارتی ذمے داریاں ادا کیں۔ان کے انتقال کے بعد جمیل مہدی نے یہ خدمت انجام دی۔۳ رفروری ۱۹۸۸ء کو جمیل مہدی راہیٔ ملک عدم ہوئے تو ان کے بعد عمید الرحمٰن عثمانی (فرزند مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی) نے مدیر کے فرائض سنبھالے اور اُنھی کی ادارت میں مارچ اور اپریل ۲۰۰۱ء کے مشترکہ شمارے کے ساتھ ''برہان'' کی اشاعت کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے برہان کی ادارت کی ذمے داریاں جس قدر محنت و مشقت سے انجام دیں، اس کا اعتراف ''معارف'' کے مدیر سید صباح الدین نے بایں الفاظ کیا:

> ''مولانا نے اس رسالہ کی ادارت کے فرائض جس شان سے سرانجام دیے، وہ اردو زبان کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھے جائیں گے، ان کا کوئی معاون نہیں رہا۔وہ خود ہی اس کے مضامین کے حک و اصلاح اور ترتیب میں لگے رہتے۔اس کے لیے لمبے لمبے مضامین بھی لکھتے، اس میں ریویو کے لیے جو کتابیں آتیں، ان پر ریویو بھی قلمبند کرتے۔البتہ اس کی کتابت اور طباعت کی ذمہ داری مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی پر ہوتی، ورنہ سینتالیس سال کی طویل مدت تک ادارت کا سارا کام تنہا ان ہی کے ذریعے سے انجام پاتا رہا، کسی مہینے میں اس کی اشاعت نہیں رکی، جو ان کا زبردست علمی کارنامہ ہے۔
>
> (ماہنامہ معارف، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۶۲)

نظرات (اداریے)، تبصرہ کتب اور وفیات برہان کے مستقل سلسلے تھے جو مولانا سعید اکبرآبادی رقم کیا کرتے تھے۔''نظرات'' کے تحت مولانا سعید اکبرآبادی نے ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا جن کا تعلق مسلمانانِ ہند سے تھا۔مولانا کا یہ خاصہ تھا کہ وہ قومی و بین الاقوامی امور پر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار بڑی جرأت و بے باکی لیکن شائستگی سے

کیا کرتے تھے۔ تبصرۂ کتب کے باب میں مولانا کسی قسم کی رورعایت کے قائل نہیں تھے۔ برہان میں مشاہیر کی وفیات سے متعلق مولانا نے سینکڑوں صفحات تحریر کیے۔ وفیات کے باب میں مولانا کی وسعتِ قلم کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں علماء، فضلاء، فقہاء، حکماء، محققین، مصنفین، مؤلفین، سربراہانِ مملکت، دینی درس گاہوں کے شیوخ و مدرسین، جامعات کے شیوخ و اساتذہ، شعراء، ادباء، سیاستدان، معمارانِ قوم و بہی خواہانِ ملت، غرض یہ کہ قومی اور بین الاقوامی سبھی شخصیتیں شامل ہیں۔ مولانا مشاہیر کے تذکرے میں نظریاتی اختلاف کے باوجود حتی المقدور توازن کو قائم رکھتے تھے۔ اور نظریاتی و سیاسی اختلاف کے باوجود اصحابِ علم وفضل اور مشاہیر کے انتقال پر ان کے ذکر کو ''برہان'' میں جگہ دیتے تھے۔ مولانا کی ان تعزیتی تحریروں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ مولانا نے جن شخصیات کے بارے میں لکھا ہے، صرف ان کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور ان کی چند سرگرمیوں تک اپنے قلم کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ان کے مقام و مرتبے اور منصب کے ساتھ ان کی دینی، علمی، ادبی، سیاسی اور دیگر خدمات کا ایسا مکمل و مفصل جائزہ لیا ہے کہ ان کی زندگیوں کے جیتے جاگتے نمونے ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس کی اثر انگیزی دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ماہ نامہ ''برہان'' میں گزشتہ تریسٹھ برسوں (۱۹۳۸ء تا ۲۰۰۱ء) میں تین سو چھتیس (۳۳۶) شخصیات کی وفیات قلم بند کی گئی ہیں۔ جن میں سے ڈھائی سو سے زائد وفیات مولانا سعید اکبر آبادی کے قلم کی رہینِ منت ہیں۔ جب کہ باقی دیگر اہلِ قلم کی کاوشیں ہیں۔ یہ تذکرہ رفتگاں اعزہ واحباب، علماء وفضلاء، ادباء وشعراء، ارباب سیاست اور اصحاب کمال سب کو محیط ہے۔ بجا طور پر ''برہان'' کے یہ صفحات بھی گزشتہ صدی کی ملی وقومی، علمی وادبی اور سیاسی وسماجی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔

وفیات کے سلسلے میں ''برہان'' (جولائی ۱۹۳۸ء تا اپریل ۲۰۰۱ء) کے ایک ایک صفحے اور حتی المقدور ایک ایک سطر کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

ریکارڈ کی درستی کے لیے استدراکات وتصحیحات کو بھی مذکورہ وفیات کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔

تذکرہ نگاروں کا نام فہرست مندرجات میں اور ہر مضمون کے آخر میں بھی درج کیا گیا ہے۔

املا میں قارئین کی آسانی کے لیے بعض مقامات پر تصرف کیا گیا ہے جیسے اوس کی جگہ اس، اون کی جگہ ان اور پہونچ کی جگہ پہنچ وغیرہ۔

ابتدا میں فہرست مضامین میں شخصیات کا اندراج ''برہان'' کی زمانی ترتیب کے مطابق کیا گیا ہے۔ جب کہ آخر میں (اشاریے میں) شخصیات کے ناموں کو الف بائی ترتیب سے درج کیا گیا ہے تاکہ مطلوبہ شخصیت کو تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ اشاریے میں نام کے آخری جزو کو عموماً پہلے لایا گیا ہے۔ البتہ بعض صورتوں میں بوجوہ اس کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ استثنائی حالتوں میں عبوری حوالے (Cross References) بھی دیے گئے ہیں۔

میں سراپا سپاس ہوں محترمہ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ، سابق صدر شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی اور مدیرہ ''الایام'' کراچی کا، جن کی رہنمائی، علمی معاونت ومشاورت، شفقت اور ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یہ کام تکمیل واشاعت کے مراحل طے کرسکا۔ محترم ڈاکٹر سفیر اختر صاحب خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ازراہِ خورد نوازی میری درخواست پر ''وفیاتِ برہان'' کے لیے ایک پرمغز علمی مقدمہ تحریر فرمایا۔

برہان کے بعض شماروں کی فراہمی کے لیے میں جناب ملک نواز احمد اعوان (کراچی حال مقیم لاہور)، جناب ضیاء اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ) اور جناب شاہد حنیف (لاہور) کا شکر گزار ہوں۔ برادرم محمد زبیر (لائبریرین، شرف آباد بیدلؔ لائبریری) اور امان اللہ شیخ صدیقی (اسسٹنٹ لائبریرین) بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کا پرخلوص تعاون شاملِ حال رہا۔ مختلف مراحل میں ڈاکٹر داؤد عثمانی، ڈاکٹر محمد طاہر قریشی، خرم سبزواری اور بالخصوص محمد فیصل کمال کی بھرپور معاونت بھی حاصل رہی۔ ان تمام دوستوں کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

محمد سہیل شفیق

شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، کراچی

۱۵ر شعبان ۱۴۳۹ھ/۳ر مئی ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر سفیر اختر

مقدمہ

بیسویں صدی عالم اسلام میں اسلامیت اور مغربیت کے مابین کشمکش کی صدی تھی۔ جمود کی قوتوں نے بدلتی ہوئی دنیا کا ادراک کیا، اور نہ مغرب کی جانب سے اسلام کو درپیش تحدیات کو کوئی اہمیت دی۔ اس کے برعکس طاقت اور بالادستی کے پجاریوں نے مغرب کی مادی ترقیات اور علمی معیارات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، اور اپنی معاشرت اور سیاست کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کے لیے کوشاں رہے، جہاں ان کا بس چلا، وہاں انھوں نے طاقت اور جبر کے استعمال سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس صورتِ حال میں وہ مختصر سا طبقۂ اہل فکر و دانش سامنے آیا جس کے افراد جزئیات میں تو ایک دوسرے سے متفق نہ تھے، مگر اپنی مثبت روایات اور تہذیبی اقدار کے تحفظ کا داعیہ رکھتے تھے، اور اس بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیاں صاف کرنا چاہتے تھے، مزید برآں مغربی انسان کے تجربے میں موجود خیر و صلاح کو ضالة المومن کے طور پر قبول کرنے کی خاطر ان کے دلوں کے دروازے وا تھے۔ مختصراً دین اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں عدل و اعتدال، جدوجہد اور اجتہاد کے اوصاف کو بروئے کار لانے کے خواہش مند تھے، اور اپنے مستقبل کو دینی اور دنیوی ہر دو اعتبار سے خوبصورت بنانا چاہتے تھے۔

اس قافلہ فکر و دانش کا ایک اہم فرد وہ تھا جسے دنیا علامہ شبلی نعمانی کے نام سے جانتی ہے۔ اُس نے روایت اور جدّت کے امتزاج کا خواب دیکھنے والوں کو تعبیر مہیا کرنے کی خاطر ملازمت ترک کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں رہایش اختیار کر لی۔ ادارے میں تعلیمی اصلاحات کا آغاز کیا اور اس کی آواز کو برعظیم کی سطح پر بلند کرنے کی خاطر کانفرنسوں، نمایشوں اور اہل علم سے انفرادی رابطوں کے ساتھ ساتھ ماہ نامہ ''الندوہ'' کا اجرا کیا (اگست ۱۹۰۴ء)۔ علامہ شبلی اور ان کے معتمد پیروکاروں نے اسلاف کے کارناموں پر روشنی ڈالی، اپنے قارئین کو بدلتی ہوئی دنیا میں علم و دانش کی ترقی سے آگاہ کیا اور اسلامی تہذیب و تاریخ کے متنوع پہلوؤں کو اس طرح نمایاں کیا کہ جمود ٹوٹے اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ تہذیب اسلامی کے احیاء کا جذبہ نمودار ہو۔ خود سیرت النبی کی تصنیف کا ایک جامع پروجیکٹ سامنے رکھ کر کام شروع کیا، مگر جمود کی قوتوں کے سامنے علامہ شبلی کی ایک نہ چلی اور اُنھیں بصد حسرت و یاس ندوۃ العلماء سے الگ ہو کر نئی راہیں تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' (کلکتہ) میں 'ایک اہم تجویز' پیش کی۔ ان کے الفاظ میں:

> خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور قابل قدر ارباب کرم [کذا: قلم] پیدا ہوتے جاتے ہیں، لیکن بایں ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنّف کے بجائے مضمون نگار یا انشاء پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیوں کہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں، بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں۔
>
> اس کی وجہ یہ نہیں کہ اُن کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار ہے، وہ مہیا نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے۔ اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دل جمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں۔ ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادلۂ خیالات ہو سکے۔
>
> ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک وسیع 'دارالتصنیف' قائم کیا جائے۔(۱)

۱۱؍فروری ۱۹۱۴ء کی اشاعت ''الہلال'' میں تجویز شائع ہوئی اور سوچ بچار شروع ہوگئی کہ ادارہ کہاں قائم ہو؟ ابھی کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ علامہ شبلی کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحٰق (وکیل ہائی کورٹ الہ آباد) کا ۵؍اگست ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوگیا، اور علامہ کو اپنے شہر اعظم گڑھ آنا پڑا۔ گرتی ہوئی صحت کا عالم یہ تھا کہ لن یصلح العطّار ماافسدالدھر، جلد از جلد کچھ کر گزرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ۱۶؍ستمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کو یہ خبر دی:

> اسکول [نیشنل اسکول اعظم گڑھ] کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ ۱۱ بیگہ پختہ ہے، اس کو وقف کر رہا ہوں، اور شرکاء بھی راضی ہوگئے ہیں۔ مسوّدہ لکھا جاچکا، رجسٹری کرانا ہے، دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتد مہیا ہوگیا ہے، اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہوجائے گا، بنگلہ صرف کتب خانہ کے لیے کافی ہوگا۔... دستاویز کی رجسٹری ہوجائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے۔... نواب عمادالملک نے دارالمصنفین کی صدر انجمنی قبول کرلی ہے۔ تکمیلِ دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدے داروں کے نام شائع ہوں گے۔ (۲)

''سیرت النبی'' کا خاصا کام ہو چکا تھا، اس کی سرپرستی ریاست بھوپال سے جاری تھی۔ زمین، مکان اور کتب خانہ فراہم ہو چکا تھا، یوں دارالتصنیف کے، جسے دارالمصنفین کا نام دیا گیا، وجود میں آنے میں کوئی دیر نہ تھی اور علامہ شبلی کی رحلت (۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء) کے صرف تین بعد ان کے اخلاص مند شاگردوں نے دارالمصنفین کے قیام کا اعلان کر دیا، اور ملک کے دیگر اصحابِ علم کے ساتھ مشورے کے بعد ۴؍جون ۱۹۱۵ء کو اس کے قواعد وضوابط اور اغراض ومقاصد کی نوک پلک سنوار کر باقاعدہ رجسٹریشن کرالی گئی۔ شیخ محمد اکرام (م ۱۹۷۳ء) کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''علامہ شبلی کی وفات سے پہلے ہی ... دارالمصنفین کی قریب قریب تمام ضروریات مہیا ہونے کا انتظام ہوگیا تھا۔'' (۳)، تاہم دارالمصنفین کی نشوارتقاء علامہ شبلی نعمانی کے جانشین سیّد سلیمان ندوی اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں ہوئی۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ نے اپنے کارِ تحقیق وتصنیف سے عامۃ الناس کو آگاہ کرنے، اسلامی تہذیب وثقافت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے، اور ہم فکر اہل علم کا تعاون حاصل کرنے کی خاطر جولائی ۱۹۱۶ء سے اپنا ترجمان ماہ نامہ ''معارف'' جاری کیا۔

''معارف'' نے جلد ہی اس طبقے میں اپنے لیے پذیرائی پیدا کرلی جو قدیم صالح اور جدید نافع کا خواہش مند تھا۔ اس نے فروعی مسائل اور مناظرانہ طرزِ اظہار سے ہٹ کر تاریخ وتہذیب، فکر وفلسفہ اور معاشرت وسیاست پر تحریریں شائع کیں، مزید برآں اسلوبِ تحریر ایسا دلکش تھا کہ بعد میں شائع ہونے والے رسائل کے لیے ایک نمونہ ثابت ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے ایک شیدائی ابومحمد مصلح نے قرآنی تعلیمات کے عام کرنے کے لیے ''ترجمان القرآن'' ہی کے نام سے ایک معمولی سے جریدے کا اجراء رجب ۱۳۵۱ھ/نومبر ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد دکن سے کیا جس میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے مضمون نگار کے طور پر لکھنا شروع کیا اور ابتدائی چھے ماہ کے بعد انھوں نے جریدہ مولوی ابومحمد مصلح سے خرید کر اپنی ادارت میں مرتب کرنا شروع کر دیا (محرم ۱۳۵۲ھ/اپریل - مئی ۱۹۳۳ء)، وہ ''معارف'' کے مضمون نگار رہ چکے تھے اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے اعزازی رفیق کا اعزاز بھی انھیں حاصل تھا۔ ان کی ادارت میں ''ترجمان القرآن'' نے بھی ان خصائص اور امتیازات میں سے بعض قبول کیے جو ''معارف'' کا خاصہ تھے۔ اسی طرح جنوری ۱۹۳۶ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں ماہ نامہ ''الاصلاح'' جاری کیا۔ اس کے مضمون نگاروں سیّد سلیمان ندوی اور دبستانِ شبلی کے دوسرے اہل قلم شامل تھے۔ یہ رسائل اپنے اپنے انفرادی رنگ کے ساتھ ایک ہی طبقۂ فکر کی کاوشیں تھیں۔ ان کے بعد ندوۃ المصنفین، دہلی کا ماہ نامہ ''برہان''، علمی دنیا کے افق پر نمودار ہوا۔ (جولائی ۱۹۳۸ء)

ندوۃ المصنفین کا تصور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا پروردۂ دماغ (Brain Child) تھا۔ وہ ۱۹۳۳ء سے ایک ایسے ادارے کے قیام کے لیے کوشاں تھے۔ ایک بار احباب سے مشاورت ہوئی، مگر بات نہ بن سکی۔ آخر جب مفتی صاحب کلکتے میں مقیم تھے تو ان کے کرم فرما تاجروں نے علمی ادارے کے لیے پانچ ہزار کی رقم دینے کا وعدہ کیا، وہ دہلی آئے اور مشاورتی مجلس ہوئی جس میں ان کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ظفر الملک علوی، محمد عثمان فارقلیط اور حامد الانصاری غازی شریک تھے۔ حامد الانصاری غازی

نے ادارے کا نام ندوۃ المصنفین تجویز کیا اور ادارہ خیال سے عمل میں آ گیا۔(۴) اس کا ''خاکہ دارالمصنفین کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا اور زمانے کے بیس بائیس سال آگے بڑھ جانے کے بقدر نئے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا گیا'' [تھا]۔(۵)

ندوۃ المصنفین دارالعلوم دیوبند کے فاضلوں نے قائم کیا تھا، اور اس کے رفقاء میں بھی دارالعلوم کے ابنائے قدیم نمایاں تھے۔ ''برہان'' کی ادارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو سپرد کی گئی، جو انھوں نے روزِ اوّل سے فروری ۱۹۸۵ء تک نبھائی۔ اس طویل عرصے میں جولائی ۱۹۴۳ء سے دسمبر ۱۹۴۵ء تک تعطل رہا، جب ادارتی ذمہ داریاں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے ادا کیں اور بطور مرتب انہی کا نام سرورق پر شائع ہوتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے ''القاسم'' اور ''الرشید'' کے نام کے رسائل جاری ہو چکے تھے، اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی دارالعلوم دیوبند کے پندرہ روزہ ''مہاجر'' کو مرتب کرنے کا تجربہ رکھتے تھے، مگر ''برہان'' ان مذکورہ جرائد کی نسبت اپنے معاصر ''معارف'' کے زیادہ قریب تھا۔ دونوں رسالوں کا سائز ایک جیسا تھا، دونوں کی پیشکش میں یکسانیت تھی۔ ''معارف'' کی ادارتی تحریریں 'شذرات' کے عنوان سے چھپتی تھیں، ''برہان'' نے اسی وزن پر اپنے اداریے کے لیے 'نظرات' کا لفظ پسند کیا۔ مقالات کے علاوہ دونوں رسائل تلخیص وتبصرہ، شئون علمیہ، مختصر تبصرہ ہائے کتب اور مفصل مطالعاتِ کتب کے عنوانات رکھتے تھے۔ ''معارف'' میں معاصر مشاہیر کی رحلت پر مولانا سیّد سلیمان ندوی نے تعزیتی شذرات لکھنا شروع کیے تو انھیں مولوی ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے مشورہ دیا کہ مغربی مجلّات کی روایت کے مطابق تعزیتی تحریریں (Obituary Notices) مستقل بالذات عنوان کے تحت شامل کیے جائیں، تاہم کوئی واضح انداز اختیار نہ کیا جا سکا۔ یہی صورت ''برہان'' میں رہی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ جمعیت علماء ہند کے دیوبندی اکابر کی تائید کرتے تھے اور اہل دیوبند بھی اُنہیں پوری اہمیت دیتے تھے۔ آخری زمانۂ حیات میں شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے سربراہ تھے (۲۵ر دسمبر ۱۹۸۲ء - ۲۴ر مئی ۱۹۸۵ء)، مگر اس قریبی دوطرفہ تعلق کے باوجود وہ نرے دیوبندی نہیں تھے، بلکہ 'چیزے دیگر' کے مصداق تھے۔ اُنہوں نے اورینٹل کالج (پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور) سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے تھے، انگریزی کے امتحانات پاس کر کے گریجویٹ ہوئے، اور پھر دہلی یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم۔اے کر لیا تھا (۱۹۳۶ء)۔ دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج کے استاد رہے تھے (۱۹۴۳ء۔۱۹۴۹ء) ہندوستان میں مدرسہ عالیہ کلکتہ جیسے مستشرقانہ اٹھان کے ادارے کی پرنسپلی کی (۱۹۵۹۔۱۹۷۲ء)، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے پروفیسر اور سربراہ رہے (۱۹۵۹ء۔۱۹۷۲ء)۔ اسی دوران میں معروف مستشرق ولفرڈ کنٹیڈیل سمتھ کے قائم کردہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز (میگگل یونیورسٹی۔ مانٹریال) کے فیلو کے طور پر کام کیا (۱۹۶۳ء) اور مستشرقین کے بارے میں متوازن رویے کی دعوت دی۔

جہاں تک ''معارف'' اور ''برہان'' کے اسلوب تحریر کا تعلق ہے۔ ''معارف'' کے مدیر سیّد سلیمان ندوی نے تو ''الندوہ'' کے معاون مدیر کی حیثیت سے علامہ شبلی کی براہ راست نگرانی میں تربیت حاصل کی تھی، مولانا اکبر آبادی کے لیے علامہ شبلی نعمانی اور سیّد سلیمان ندوی کی تحریریں نمونے کی حیثیت رکھتی تھیں۔(۶) ایک زمانے میں مولانا اکبر آبادی کثرت سے شعر کہتے تھے اور اُن کی منظومات بعض ادبی رسائل میں چھپتی بھی تھیں۔ انھوں نے ایک نظم ''معارف'' میں اشاعت کے لیے سید سلیمان ندوی کو بھجوادی۔ انھوں نے نظم واپس کرتے ہوئے لکھا: ''آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ یہ آپ کے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجیے اور مقالہ نویسی پر توجہ دیجیے۔ قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہو سکتی ہے اور یہی ہونی چاہیے۔''(۷)

اس نظم گوئی کے پس منظر کے ساتھ مولانا اکبر آبادی نے لکھا ہے: ''میرا اسلوب بنیادی طور پر سب سے زیادہ منّت کشِ احسان شبلی اور داغ کا ہے جنہیں میں نے بڑی افراط سے پڑھا اور ان سے سرور حاصل کیا ہے۔''(۸)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ''برہان'' کا آخری اداریہ فروری ۱۹۸۵ء کی اشاعت کے لیے لکھا، اور اپنی علالت کے پس منظر میں ''برہان'' کے قارئین اور اپنے احباب سے استدعا کی کہ وہ ''انھیں اپنی دعاؤں میں حسب معمول ہمیشہ یاد رکھیں۔''(۹) اداریہ لکھنے کے بعد کسی وقت پاکستان آ گئے، اور یہیں ۲۴ر مئی ۱۹۸۵ء کو جاں، جان آفریں کو سپرد کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مارچ ۱۹۸۵ء سے مئی ۱۹۸۵ء تک صرف تین ماہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے داماد اطہر صدیقی نے ''برہان'' کی ادارتی ذمہ داریاں ادا کیں کہ اُنہیں بھی اجل

کا بلاوا آ گیا۔اب قرعۂ فال جمیل مہدی کے نام نکلا، مگر انھیں بھی موت نے زیادہ خدمت کا موقع نہ دیا۔اُن کی رحلت (۳؍فروری ۱۹۸۸ء) کے بعد عمید الرحمٰن عثمانی (فرزند مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی) نے، جن کا نام ''برہان'' کے معاون مدیر کے طور پر چھپتا تھا، مدیر کے فرائض سنبھالے اور اُنہی کی ادارت میں مارچ اور اپریل ۲۰۰۱ء کے مشترک شمارے کے ساتھ ''برہان'' ماضی کا حصّہ بن گیا۔

۱۹۶۶ء میں جب ''معارف'' کے اجراء کو تقریباً نصف صدی اور ''برہان'' کی اشاعت کو لگ بھگ ۳۰ سال ہو رہے تھے، جناب عابد رضا بیدار نے ان دونوں کے مضامین کا اشاریہ ''علومِ اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا'' کے نام سے مرتب کیا تھا جو ماہ نامہ ''برہان'' میں اپریل تا ستمبر ۱۹۶۶ء میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔انھوں نے لکھا تھا: ''اس اشاریہ کو میرا دیا ہوا عنوان حیرت واستعجاب یا پھر اعتراض کی نظر سے دیکھا جائے [گا]۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں پرچوں نے اسلامی اور عمومی علمی موضوعات پر مستند اور ٹھوس مضامین کا اتنا بڑا ذخیرہ اردو میں فراہم کر دیا ہے جس کی نظیر اسلامی دنیا میں ملنی مشکل ہے۔'' (۱۰)

''معارف'' اور ''برہان'' میں شائع شدہ متعدد سلسلہ وار مضامین کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں، بہت سے مضامین موضوعاتی انتخابات کا حصّہ بنے ہیں۔سیّد سلیمان ندوی کے تحریر کردہ شذرات تین جلدوں میں شائع ہو گئے ہیں۔اُن کی ''یادِ رفتگاں'' معارف میں چھپنے والی تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے، اور ابھی ان دونوں رسائل کے صفحات میں اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ درجنوں موضوعی انتخابات مرتب ہو سکتے ہیں۔جناب ڈاکٹر محمد سہیل شفیق اُن صاحبِ نظر ''قدر دانانِ معارف و برہان'' میں شامل ہیں جو ان کی تحریریں اردو قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔پہلے انھوں نے ''اشاریۂ معارف'' پیش کیا، پھر ''وفیاتِ معارف'' مرتب کی اور اب ''وفیات برہان'' نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔اللھم زدفزد۔

وفیات نگاری مسلمانوں کی علمی روایت میں بڑی مقبول اور مضبوط رہی ہے (۱۱)، اور برعظیم پاکستان و ہند میں بھی بیسویں صدی میں اس سلسلے میں خاصا کام ہوا ہے ،اور اس روایت کو آگے بڑھانے میں اردو کے علمی و دینی جرائد نے بنیادی کام کیا ہے۔انہی جرائد میں ''برہان'' بھی شامل ہے۔زیرِ نظر ''وفیاتِ برہان'' سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی ۱۹۳۸ء سے اپریل ۲۰۰۱ء تک اس میں سوا تین سو سے زائد مشاہیر اور اپنے اپنے احاطۂ کار میں نمایاں کام کرنے والوں کے بارے میں معلومات یک جا کی گئی ہیں۔پہلی شخصیت جس کی یاد میں قلم اٹھایا گیا تھا، وہ علامہ اقبال تھے اور جس آخری رجلِ عظیم کی یاد میں آنسو بہائے گئے ہیں، وہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

''وفیات برہان'' میں یوں تو پاکستان و ہند کے حکمرانوں، بڑے سیاست دانوں، بعض خادمانِ انسانیت کا ذکر ہے اور ان سے ندوۃ المصنفین دہلی کے اعیان ثلاثہ --- مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حفظ الرحمٰن سیوہاری اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی--- کا تعلق بھی تھا۔کانگریس اور جمعیت علماء ہند کے رہ نما تحریک آزادی وطن میں ایک دوسرے کے قریب رہے اور یوں حصول آزادی کے بعد کی حکمران نسل کے ساتھ ان کا ربط و تعلق تھا۔بعد کے حالات میں وطن عزیز کی باگ ڈور جنرل محمد ضیاء الحق کے ہاتھ میں آ گئی۔جنرل صاحب دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں مولانا اکبرآبادی کے شاگردرہ چکے تھے، اور مولانا جب کبھی اُن کے زمانۂ اختیار و اقتدار میں پاکستان آئے تو اُن کی پذیرائی میں شاگرد کسی سے پیچھے نہ رہا، اور جب مولانا کی رحلت کے بعد شاگرد کا طیارہ حادثے کا شکار ہوا تو ''برہان'' کے بہرۂ وفیات میں عمید الرحمٰن عثمانی نے قلم اٹھایا اور جنرل صاحب کے سوانحی کوائف سے اپنے قارئین کو باخبر کیا۔

''وفیات برہان'' کا غالب حصّہ مولانا اکبرآبادی کے قلم سے ہے۔اُن کی زندگی میں خال خال وفیات مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی یا کسی اور کے قلم سے ہیں۔مولانا اکبرآبادی کے جانشینوں میں زیادہ تر وفیات نگاری عمید الرحمٰن عثمانی نے کی ہے۔کسی بھی رسالے میں بالعموم قافلۂ رفتگاں میں اُن اہلِ قلم کے بارے میں تعزیتی تحریریں چھپتی ہیں جو رسالے کے ناشر ادارے یا بالخصوص مدیر کے حلقۂ ربط و تعلق میں ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے ''برہان'' میں بھی اُن افراد کا ذکرِ خیر نمایاں ہے جو کسی نہ کسی طرح ندوۃ المصنفین سے وابستہ تھے یا مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے حلقۂ تعارف کا حصّہ تھے۔ندوۃ المصنفین کے رفقاء قاضی اطہر مبارک پوری، مفتی انتظام اللہ شہابی، سیّد بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا عبدالدائم جلالی، مولانا عبدالرشید نعمانی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور خود مولانا اکبرآبادی کا ذکرِ خیر اسی حوالے سے ہے۔اسی طرح ندوۃ المصنفین کی جانب سے جن اہلِ قلم کی کتابیں شائع ہوئیں یا جو ''برہان'' کے صفحات پر دعوتِ فکر و نظر دیتے رہے ہیں، اُن کے سفرِ آخرت کرنے پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے اور اُن کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔سیّد ابوظفر ندوی، خواجہ عبدالرشید، مولانا محمد تقی امینی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور دوسرے اس ضمن میں آتے ہیں۔

مولانا اکبرآبادی کا ایک بڑا حلقۂ نیاز مندی اُن دیوبندی بزرگوں کا تھا جن سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، یا اُن کے لیے اپنے دل میں محبت کے فراواں جذبات رکھتے تھے۔ انھیں مولانا اکبرآبادی نے بہت اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے اور اُن کی خوبیوں کا اظہار کیا ہے، تاہم مولانا اکبرآبادی اپنے مزاج کے اعتبار سے اپنے بزرگوں سے بھی اختلاف کرنے کا دل گردہ رکھتے تھے۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی دیوبندی حلقے اور بالخصوص تبلیغی جماعت میں جو بلند مقام رکھتے ہیں، اس سے دینی ذوق رکھنے والا ہر شخص واقف ہے، جب اُن کی طرف سے جماعت اسلامی اور سیّدابوالاعلیٰ مودودی کی مخالفت میں سخت عنوان کے ساتھ ایک کتاب شائع ہوئی تو اُن کی زندگی میں مولانا اکبرآبادی نے اپنے اختلاف کا اظہار کیا اور اُن کے بارے میں اپنی تعزیتی تحریر میں بھی اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔

مولانا اکبرآبادی کی مرقومہ وفیات میں بحیثیت مجموعی زندگی میں ہونے والے اختلافِ نظر کے باوجود جانے والی کی خوبیوں کے بارے میں فراخ دلی پائی جاتی ہے۔ ''برہان'' کے 'نظرات' اور 'تبصرۂ کتب' پڑھنے والوں سے مخفی نہیں کہ اُنہوں نے سید مودودی کی بعض تحریروں پر گرفت کی، اور جب انھیں اپنی گرفت میں غلطی معلوم ہوئی تو اسے تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کی اور وفیات کے زمرے میں اُنہیں وہ خراج تحسین پیش کیا جو ایک معاصر پیش کرسکتا ہے۔ اُن کی وفیات میں معاصرین کے بارے میں اُن کی پختہ آراء سامنے آتی ہیں۔ مرحوم نیاز فتح پوری کو اردو ادب کا معمار تسلیم کرتے ہوئے لکھا: ''انھوں نے مورخ، عالمِ دین، ماہر نفسیات ان میں سے ہر ایک کا روپ دھارنا چاہا، لیکن اُن کو کامیابی نہیں ہوئی۔''

مولانا اکبرآبادی کا شعری ذوق بہت اچھا تھا، خود بھی گاہے ماہے شعر کہتے تھے، اپنے بعض معاصر شعراء سے، جو شعر گوئی کے ساتھ دوسرے شخصی خصائص کے مالک بھی تھے، اُن کی یاداللہ تھی، چنانچہ ''وفیات برہان'' کی بزم میں بہت سے شعراء بھی دکھائی دیتے ہیں، اور ان تحریروں میں اردو شاعری کے حوالے سے اُن کی تنقیدی آراء بھی سامنے آتی ہیں۔

رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی وفیات کے بارے میں یہ پہلو بھی اہل نظر کے سامنے رہنا چاہیے کہ اکثر یہ تحریریں ہنگامی طور پر حافظے کی بنیاد پر لکھی جاتی ہیں، اور بالخصوص وہ باتیں جن کا تعلق لکھنے والے کی ذات سے ہوتا ہے، اس طرح کبھی کبھار شنیدہ روایات بھی درجِ وفیات ہوجاتی ہیں۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے استشہاد کرتے ہوئے دوسرے ضروری پہلو بھی دیکھ لیے جائیں۔

جناب ڈاکٹر محمد سہیل شفیق ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے پون صدی پر محیط ''برہان'' کی مجلدات کی ورق گردانی کی۔ جملہ وفیات کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا اور وفیات کے ذخیرۂ ادب میں ایک وقیع کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

سفیر اختر

حواشی:

۱۔شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (مرتبہ سیّد سلیمان ندوی)، اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۹ء، ج ۸، ص ۵۷

۲۔محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مقالاتِ شروانی، علی گڑھ: شروانی پرنٹنگ پریس، ۱۹۴۷ء، ص ۱۷۵۔۱۷۶

۳۔شیخ محمد اکرام، یادگارِ شبلی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۲۵۱

۴۔مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، کہاں سے چلے تھے، مشمولہ: برہان، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر، نومبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۵۰۔۳۵۵

۵۔عابد رضا بیدار، ماہ نامہ برہان کا اشاریہ (۱۹۳۸ء۔۱۹۶۵ء)، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۶ء، ص ۷

۶۔ایک انٹرویو میں مولانا اکبر آبادی نے کہا ہے: ''اردو سیکھنے کے لیے علامہ شبلی نعمانی اور سیّد سلیمان ندوی کی تحریروں کا مطالعہ بہت ضروری ہے اور یہ بھی سمجھے رہیے کہ کسی علمی مسئلہ پر بھی اگر اردو میں لکھنا ہے تو انھیں حضرات کو نمونہ بنانا چاہیے۔اردو میں علمی انداز سے لکھنا علامہ شبلی ہی کے ذریعہ رائج ہوا۔'' (یونس نگرامی ندوی، خیالات، لکھنؤ: مکتبۂ طیبہ، [۱۹۶۵ء]، ص ۴۱)

۷۔مسعود انور علوی کاکوروی، مولانا اکبر آبادی مرحوم اور برہان، برہان (دہلی)، اگست ۱۹۸۶ء، ص ۳۲

۸۔سعید احمد اکبر آبادی، نظرات، برہان، جون ۱۹۸۴ء، ص ۵۔۶

۹۔ایضاً، نظرات، برہان، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۵

۱۰۔عابد رضا بیدار، حوالہ مذکورہ، ص ۶

۱۱۔دیکھیے: بشار عواد معروف، کتب الوفیات و اهمیتها فی دراسته التاریخ الاسلامی، مجلّہ کلیۃ الدراسات الاسلامیہ، بغداد ۱۹۶۸ء (العدد الثانی)

اقبال، ڈاکٹر محمد

ڈاکٹر اقبال مرحوم

وادریغا! دوسال کی طویل علالت کے بعد اسلام کے مایۂ ناز فرزند ڈاکٹر محمد اقبال نے بتاریخ ۲/اپریل ۱۹۳۸ء لاہور میں انتقال فرمایا، اور ہماری بزم علم و حکمت کو خالی چھوڑ کر رہ گزاے عالم جاودانی ہوگئے۔ اقبال کا وجود عشقِ رسول کا پیکر تھا، اخیر عمر میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ جہاں ''مدینہ'' یا آقائے مدینہ کا ذکر آیا اور بے ساختہ رونے لگے۔ ان کی شاعری کے انمول موتیوں کا خزانہ اور اُن کی زبان حقیقت و معرفت ربانی کی ترجمان تھی، ان کا قلب اسلامی سوز و گداز سے معمور اور ان کا دماغ حب اسلام کے نشہ سے مخمور تھا، وہ اگرچہ انگلینڈ اور جرمنی کی اعلیٰ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے لیکن خمستانِ حجاز کی جس بادۂ ہوش افزا کے چند جرعے اُنھوں نے اپنی طفولیت کے ابتدائی دنوں میں لے لیے تھے اس کا نشہ کم ہونے کے بجائے دن بدن بڑھتا ہی گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی سرتاپا اسلامی سوز و گداز بن کے رہ گئی۔ اقبال نے اسلام کے دورِ عروج و تنزل کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا اور ان کی شاعری میں اسلام کے روشن مستقبل سے متعلق بہت کچھ اُمید افزا خیالات پائے جاتے ہیں۔ اقبال نے اپنا ترانہ اُس وقت چھیڑا جب کہ ہنگامہ غدر کے اثرات مابعد سے مسلمانوں پر انتہائی جمود و خمود کا عالم طاری تھا اور اُن کے قومی و ملّی احساسات پامال ہو چکے تھے۔ اقبال نے اپنے حیات آفریں نغموں سے اس دل شکستہ قوم کو اُبھارا اور زندگی کے احساس سے پھر انہیں بھرپور کر دیا۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی وفات حسرت آیات کا صدمہ ہمیں اس لیے بھی زیادہ محسوس ہوتا کہ آں مرحوم میں اور ہمارے استاذ حضرت شاہ صاحبؒ میں ایک خاص قلبی ارتباط تھا۔ ڈاکٹر صاحب علوم اسلامیہ میں حضرت شاہ صاحب کو اپنا مرشد و رہنما جانتے تھے اور دل و جان سے اُن کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ خطبات مدراس جو "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے نام سے شایع ہو چکے ہیں ان میں ڈاکٹر صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے اپنے علمی استفادہ کا برملا اعتراف کیا ہے۔ اُدھر حضرت استاذ رحمتہ اللہ علیہ ڈاکٹر صاحب کی علمیت و لیاقت، اسلام پرستی و فقر منشی کی قدر کرتے تھے اور دونوں میں مراسلت کا سلسلہ جاری تھا۔ دیوبند سے حضرت شاہ صاحب کی علیحدگی کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح حضرت مرحوم لاہور میں مستقل قیام کرنا منظور فرمالیں لیکن چند در چند موانع کے باعث ایسا نہ ہوسکا۔

حضرت شاہ صاحب سے اس خاص تعلق کے علاوہ ندوۃ المصنفین جن اغراض و مقاصد کے ماتحت قائم ہو رہا ہے، ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم کو ان سے خاص دلچسپی تھی اور اپنی گفتگو میں ان کی اہمیت کو بڑے زور سے بیان کرتے تھے، علی الخصوص فقہ کی جدید ترتیب و تدوین کا مسئلہ اُن کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اور حضرت شاہ صاحب سے بھی بارہا اس کا تذکرہ کر چکے تھے، اس بنا پر ندوۃ المصنفین کے ابتداء قیام سے ہی ہمارا ارادہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنے ادارہ کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل کریں اور ہمیں قوی توقع تھی کہ آں مرحوم ہماری اس خواہش کو مسترد نہ کرتے۔

صدحیف کہ ابھی ہم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے لاہور کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اچانک ان کی وفات کی اطلاع آگئی اور ہمارا یہ منصوبہ دل کا دل ہی میں رہ گیا:

وما کان قیس هلکه هلك واحد ولکنه بنیان قوم تهدما

حق تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور اپنی بیش از بیش نعمتوں سے نوازے۔ آمین ثم آمین۔ [جولائی ۱۹۳۸ء]

رشیدی، مولانا سید سراج احمد

حضرت مولانا سید سراج احمد رشیدی مرحوم

اس سلسلہ میں ہم کو اپنے استاذ حضرت مولانا سید سراج احمد رشیدی کا بھی ماتم کرنا ہے۔ حضرت مولانا دیوبند کے قدیم اساتذہ میں سے تھے۔ 'القاسم' کے دور اوّل میں اس کی ادارت کے فرائض آپ سے متعلق تھے۔ صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ صاحب باطن تھے، حضرت مولانا گنگوہی سے نسبت حاصل تھی، بے حد ذاکر شاغل، وضع کے پابند، اخلاق و مروت کا مجسمہ، بزرگانہ خصائل و شمائل کے پیکر، طلبہ کے مونس و غمخوار، دوستوں کے جاں نثار، دوست اور چھوٹوں کے مشفق و شفیق بزرگ تھے۔ دیوبند میں عرصہ دراز تک مشکوۃ شریف کا خصوصاً اور ادب و فقہ کی اعلیٰ کتابوں کا عموماً درس دیتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ اپنی جماعت کے ساتھ دیوبند سے ڈابھیل منتقل ہوئے تو آپ بھی اس کارواں کے بزرگانِ کارواں میں سے ایک تھے، صدحیف کہ وہاں تقریباً دس سال تک علم حدیث کی خدمت جلیلہ میں منہمک رہنے کے بعد آپ

نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس دنیائے دنیٰ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ گئے۔ انالله وانا الیه راجعون۔

آپ کی صورت دیکھ کر بزرگانِ سلف کی یاد تازہ اور آپ کی باتیں سن کر قلب ودماغ کو خاص مسرت ہوتی تھی۔آپ عالم کامل تھے اور شاعر خوش نوا بھی۔آپ علم حدیث وادب کے مدرس بھی تھے اور خوش بیان وبذلہ سنج بھی، سنجیدہ ظرافت آپ کی باتوں کا جوہر تھی۔ ایک عرصہ سے دمہ کے عارضہ میں مبتلا تھے لیکن اس کے باوجود تہجد اور وظائف کی پابندی کرتے تھے۔

خاتمہ بھی ایسا اچھا ہوا کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے، خاص بقرعید کے دن عصر ومغرب کے درمیان جب کہ دنیائے اسلام میں ہر جگہ قربانیاں ہوئی ہوں گی، آپ نے اپنی جان ناتواں کی قربانی رب السماء والارض کی بارگاہِ کبریائی میں بڑی ہنسی خوشی کے ساتھ پیش کی اور رفیق اعلیٰ کا کلمہ پڑھتے ہوئے بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ جو احباب ومخلصین دم نزع آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے دیکھا کہ ایک مسافر عدم دنیا سے رخصت نہیں ہورہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رحمتِ ربانی کی آغوش نے وا ہوکر اُس کو اپنی عاطفت میں لے لیا ہے اور وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے دوسرے ہی عالم میں پہنچ گیا ہے۔حق تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں مقام عنایت فرمائے اوران کے پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق ارزانی کرے۔آمین [جولائی ۱۹۳۸ء]

نجیب آبادی، مولانا اکبر شاہ خان

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

ہماری مرثیہ خوانی ناتمام رہے گی اگر اس موقع پر ہم نے ایک اور ذات گرامی یعنی مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کا ذکر نہ کیا۔مولانا ہندوستان کے مشہور مورخ تھے لیکن جدید طرز کے نہیں بلکہ قدیم طرز کے، وہ راسخ ومضبوط اسلامی عقیدت کی رہنمائی میں تاریخ کی قابل قدر خدمات انجام دینی چاہتے تھے۔اُن کی تصنیفات 'آئینہ حقیقت نما'، 'تاریخ اسلام'، 'مقدمہ تاریخ ہند'، 'نظامِ سلطنت'، 'حجۃ الاسلام'، 'فصل الخطاب' اور 'معیار العلماء' وغیرہ یہ سب اُن کے مذہبی جوش ودینی عقیدت کی شاہد عدل ہیں۔مرحوم نہایت فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ان کا اثاثہ بیت صرف ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں فارسی کی زیادہ اور عربی کی کم، تاریخ کی نادر قلمی کتابیں موجود ہیں۔مرحوم انتہا درجہ کے خوددار اور غیور تھے، انھوں نے اپنی تمام عمر انتہائی افلاس وعسرت کے ساتھ ایک گوشہ گمنام میں گزاری اور کبھی گوارا نہ کیا کہ ارباب ثروت کے آستانہائے عظمت وغرور پر جبہ سائی کرکے علم کی متاع لازوال کو رسوا وذلیل کریں حالانکہ اگر وہ چاہتے تو امارت وریاست کی دکان پر اپنے مذہبی تقدس اور علم کی فاتحہ پڑھنے والوں کی طرح ہزاروں روپے ماہوار کما سکتے تھے۔آں مرحوم ہو بہو اسلامی اخلاق کا مجسمہ تھے، نہایت متواضع، حلیم وبردبار، صاف باطن، مروت کیش، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کرنے والے۔

اپنے والدین کے اس درجہ اطاعت گزار اور فرمانبردار تھے کہ اس قدر علم وفضل کے باوجود اپنے تئیں والدین کا ادنیٰ سے ادنیٰ خادم تصور کرتے تھے، عربی میں عُـمَلَّس والدین کی اطاعت میں ضرب المثل ہے۔کہا جاتا ہے ھو اَبَرُّ من عُـمَلَّس۔ ہماری رائے میں اگر عُـمَلَّسُ کی بجائے مولانا کا نام رکھ دیا جائے تو بالکل بجا درست ہے۔

افسوس ہے کہ نو ماہ کی طویل علالت کے بعد ہماری بزمِ علم وفضل کا یہ لعل شب چراغ بھی ۱۰/مئی ۱۹۳۸ء کو قیامت تک کے لیے گُل ہوگیا۔امطرالله علیه شآبیب الرحمة والغفران واسکنه فی فرادیس الجنان۔ [جولائی ۱۹۳۸ء]

پاشا، مصطفےٰ کمال

آہ! مصطفےٰ کمال پاشا

نومبر ۱۹۳۸ء کا سب سے زیادہ المناک حادثہ جس نے تمام عالم اسلامی میں رنج وغم کی ماتمی صفیں بچھادیں، مصطفیٰ کمال کی وفات کا حادثہ ہے۔مصطفیٰ کمال کا وجود اس زمانہ میں مسلمانوں کے تار عظمت وبزرگی کا ایک درخشندہ موتی اور اسلامی سطوت وصولت کی ایک شمشیر لرزہ فگن تھا۔ وہ دبدبۂ وشوکت اسلام کے قصر رفیع کے ایسے ستون تھے، جس کے گرتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام عالم میں زلزلہ آگیا، اور اس کے بام ودر پر کپکپی طاری ہوگئی ہے۔

وما کان قیس هلکه هلك واحد ولکنه بنیان قوم تهدما

وہ ۱۸۸۱ء میں سالونیکا کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، ابھی عمر نو برس کی ہی تھی کہ سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، ماں انتہا درجے کی عابدہ زاہدہ تھیں۔انھوں نے ہر چند چاہا کہ بیٹا دینی تعلیم حاصل کرکے ملّا بن جائے، لیکن جس کی قسمت میں ٹرکی کے مریض نیم جاں کی مسیحائی لکھی ہوئی تھی اور جس کو غازی بن کر عالم میں رونما ہونا تھا، وہ کس طرح اس مفت خوری پر آمادہ ہوسکتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے فوجی تعلیم حاصل کی اور ٹرکی کے مختلف معرکوں میں

اپنی شجاعت وبسالت کے وہ حیرت انگیز جوہر دکھائے جس نے ٹرکی کی تاریخ کو یکسر منقلب کر کے رکھ دیا۔ مصطفیٰ کمال شروع سے ہی حریت پرست اور استقلال کوش تھے، وہ خلیفۂ وقت کو عیسائی طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کھلونا بنا ہوا دیکھتے تھے تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا، اور چاہتے تھے کہ ٹرکی کو اجنبی عناصر سے پاک وصاف کر کے اتنا مضبوط وقوی بنادیا جائے کہ پھر کسی حریف کو اُس کی طرف نگاہ حرص وآز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔ اس سلسلہ میں اُن کا تعلق ایک ایسی انقلاب پسند جماعت سے ہوگیا جو موجودہ خلافت کا تختہ اُلٹ کر ترکی کی حریت واستقلال کے لیے راہ صاف کرنا چاہتی تھی۔ اس جرم میں مصطفیٰ کمال کو کئی بار قید خانہ کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن اس مرد یقین واذعان کا عزمِ بلند ان تکلیفوں سے کہیں پست ہوسکتا تھا؟ وہ جب کبھی قید خانہ سے باہر آیا، اُسی ولولۂ وعزم کے ساتھ، اور اسی جنونِ استقلال وآزادی کے ساتھ جو تندرست جوانی کے خون کی طرح اُس کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا اور جس نے اُس کی زندگی کو پارۂ لرزاں وشعلہ سوزاں کی طرح بے چین کر رکھا تھا۔

دنیا کی تاریخ میں ایسے بڑے لوگ کم ملیں گے جو بیک وقت دل اور دماغ دونوں کی خوبیوں کے مالک ہوں۔ شیر کا سا گردہ وجگر کی مانند دل رکھتے ہوں اور دماغ نورِ بصیرت وتدبر کی شمع روشن ہو۔ خدا نے غازی مصطفیٰ کمال کو دونوں قسم کی خوبیوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور اس بنا پر اُن کے سوانح حیات موجودہ ٹرکی کی پوری عمرانی وتمدنی تاریخ ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان میں فوجی اسٹاف کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک صوفیہ میں ترکی سفارت کے ایک فوجی ممبر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وقت آیا کہ اُن کی غیر معمولی جنگی قابلیتیں آشکارا ہوں۔ چنانچہ جنگ عظیم میں اُنہوں نے درّہ دانیال کی مدافعت میں حیرت انگیز شجاعت کا اظہار کیا۔ پھر فلسطین میں ترکی افواج کی قیادت کی، اور گلی پولی کے معرکہ میں حق کی شمشیر آبدار بن کر نمودار ہوئے۔ ۱۹۱۸ء کے معاہدۂ سیورے کی رُو سے جب اتحادیوں نے ترکی کے مریض نیم جان کے حق میں موت کا فتویٰ صادر کر دیا اور مئی ۱۹۱۹ء میں یونانی افواج نے سمرنا پر پڑاؤ ڈالا تو مصطفیٰ کمال کسی طرح اناطولیہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور یہاں انھوں نے ترک جوانوں کو جوش دلا کر حزب وطنی کی ایک جماعت میں منسلک کر دیا۔ پھر انھی نوجوانوں کی ایک لاکھ کی جمعیت کے ساتھ ستمبر ۱۹۲۲ء میں انھوں نے یونانیوں کو اتنی زبردست شکست دی کہ وہ ایشیائے کوچک کو بصد حسرت ویاس چھوڑ دینے پر مجبور ہوگئے۔ پھر یہی وہ بہادر سپاہی اور جرنیل تھا جس کے غیر معمولی تدبر نے ۲۴/ جولائی ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزان میں اُن لوگوں کو بھی ٹرکی کی دستاویزات حیات پر مہر تصدیق ثبت کیے بیٹھے تھے۔ مصطفیٰ کمال کا یہ کارنامہ جس نے لائڈ جارج جیسے گرگ باراں دیدہ اور دوسرے مدبرین برطانیہ کو غرقِ تحیر کر دیا، اتنا عظیم الشان تھا کہ ملک ملک میں اس پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا گیا اور اُنھیں غازی کے خطاب سے پکارا جانے لگا۔ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۳ء کا دن ٹرکی میں ہمیشہ یادگار رہے گا جب کہ ترکی نے غازی مصطفیٰ کمال کی انقلاب آفریں ہمت وعزم، کوہ آسا استقلال وپامردی اور حیرت انگیز حزم ودوراندیشی کی بدولت ایک نیا جنم لیا اور تمام پچھلی آلایشوں سے پاک وصاف ہوکر ترکی جمہوریت کا اعلان کر دیا جس کے صدر خود مصطفیٰ کمال منتخب ہوئے۔ یکم نومبر ۱۹۲۳ء کو سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور نہ صرف سلطان بلکہ پورے عثمانی خاندان کو ٹرکی سے نکلنا پڑا۔

صدر جمہوریہ ترکی کی حیثیت سے غازی مصطفیٰ کمال نے جس وادیٔ پُرخار میں قدم رکھا تھا اُس سے پورے طور پر صحیح سلامت نکل آنا اُن کے تدبر اور مآل اندیشی اور وقت شناسی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس زمانہ میں ترکی کے لوگوں پر بالعموم جہالت کا غلبہ تھا۔ قدامت پسندی حد سے زیادہ تھی۔ غازی مصطفیٰ کمال نے ترکی کو عہد جدید کی ایک زندہ ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے اصلاحات کا جو زبردست پروگرام بنایا تھا اُس پر وہ سخت سے سخت مخالفتوں کے باوجود شدت سے کاربند رہے۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں اُن کے قتل کی سازشیں بھی ہوئیں اور بغاوتوں کے شعلے بھی بھڑکے لیکن مصطفیٰ کمال نے ان سب کو ختم کر کے رکھ دیا۔ آج ترکی صنعت وحرفت، معاشرت، تعلیم اور اقتصادی حالات کے اعتبار سے عہد حاضر کی بڑی سی بڑی متمدن قوم سے پیچھے نہیں ہے۔ شاہ امان اللہ خاں کو اپنے مشن میں ناکام ہوکر افغانستان سے ہجرت اختیار کرنی پڑی لیکن غازی مصطفیٰ کمال اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ قوم کی نفسیات اور مزاج سے بخوبی واقف تھے اور خود بھی اصلاحی اسپرٹ کا ایک ایسا جذبۂ معتدل رکھتے تھے جو اُن کی کامرانیوں کا ضامن تھا۔ غازیٔ مرحوم نے ترکی کو زندہ قوم بنا کر نہ صرف اپنے ملک پر بلکہ تمام مسلمانوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ کیونکہ جب تک مسلمان ہیں اُن کا رشتۂ اخوت مسلمانانِ عالم سے منقطع نہیں ہوسکتا۔

غازی مصطفیٰ کمال کے جزئی اعمال وافعال سے یا اُن کی بعض اصلاحات وطنی سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کر دینی چاہیے

کہ جو مجاہد حریت وآزادی حق کی راہ میں سربکف ہوکر میدان جنگ میں اپنی جان کی بازی لگادے، وہ اُن ہزاروں خانقاہ نشینوں سے بدرجہا بہتر ہے جو ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے تسبیح ومصلیٰ کا شغل تو رکھتے ہیں لیکن حق کی حمایت میں اپنی ایک انگلی بھی شہید کرانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔شہدا بدر وحنین کے جامہ ہائے گلرنگ و دامن ہائے صد چاک کی قسم ایک سرفروش اسلام کا نعرۂ تکبیر جو کفروشرک کے سربفلک ایوانوں کو خاک مذلت پر گرادے، اُن بے روح سجدہ ہائے بندگی سے کہیں زیادہ افضل واشرف ہے جو ایک کافر کے دل میں بھی خروش پیدا نہیں کرسکتے۔

وہ مصطفیٰ کمال جس نے اسلام کی دشمن طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا اور جس نے اپنے مجاہدانہ عزم و حوصلہ سے ٹرکی کی نعش کو جابر وقاہر حکومتوں کے پنجۂ استبداد واستیلاء سے چھین کر ازسرِنو اس میں زندگی کی روح پھونک دی۔کیا اُس پر طعن کرنے کا حق کسی ایسے شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جس کا دل توپ وتفنگ کی آواز سن کر دہل جاتا ہے اور رسمی عبادتوں اور ریاضتوں کے باوجود دین حق کی مردانہ وار حمایت کا ایک ادنیٰ سا جذبہ اور ولولہ بھی نہیں رکھتا۔

ابو محجن ثقفی شراب نوشی کے جرم میں گرفتار تھے، اُنہوں نے دور سے دیکھا کہ قادسیہ کے میدان میں مسلمان اور ایرانی برسرپیکار ہیں، جذبۂ مردانگی و شجاعت نے جوش مارا لشکر اسلام کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی بیوی سے درخواست کی کہ خدا کے لیے ذرا میری بیڑیاں کھول دو، میں جنگ میں شریک ہوں گا اور پھر واپس آکر بیڑیاں پہن لوں گا۔اُنہوں نے منظور کرلیا ابو محجن حضرت سعدؓ کے گھوڑے پر بیٹھ کر سیدھے میدان جنگ میں جا پہنچے اور دشمنوں کی صفوں میں گھس کر داد شجاعت دینے لگے۔حملہ میں ممتاز تھے۔حضرت سعدؓ نے اپنے بالاخانہ سے یہ منظر دیکھا تو بول اُٹھے ''حملہ محجن کا سا ہے مگر گھوڑا میرا ہے''۔ جنگ کے ختم پر ابو محجن واپس ہوئے تو حسب وعدہ کہا ''مجھ کو بیڑیاں پہنا دو''لیکن جس نے دین حق کی حمایت میں اس قدر جان فروشی کا ثبوت دیا تھا۔حضرت سعدؓ کب اس کو ایک جزئی فروگزاشت پر قید کرسکتے تھے۔فرمایا ''لاضربنك ابدا'' اب میں تم کو کبھی شراب کے جرم میں نہیں ماروں گا''۔ابو محجن نے کہا ''تو اب میں کبھی شراب بھی نہیں پیوں گا۔''

دنیا میں کتنے بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار انسان مرتے ہیں لیکن کتنے آدمی ہیں جو اُن کے ماتم میں اشکبار ہوتے ہوں۔مصطفیٰ کمال کی وفات ہوئی تو عالم میں کہرام مچ گیا۔دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں اُن کا ماتم کیا گیا اور اُن کے لیے مغفرت کی دعائیں کی گئیں۔ایصال ثواب کے جلسے ہوئے، فاتحہ خوانی ہوئی اور پھر جب نماز جنازہ اُٹھا تو ٹرکی کا بچہ بچہ گریاں وزاری کناں تھا،عورتوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ فرطِ غم والم سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں ''آہ مصطفیٰ کمال!تم کہاں گئے،تم کہاں گئے۔'' یہ عام آہ وبکا اور شیون وماتم اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اپنی قوم اور اپنے ملک ووطن کے لیے جان کی قربانی میں بھی دریغ نہیں کرتا وہ اُن ہزاروں عابدوں اور زاہدوں سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعہ اپنی نجات کا سامان تو کرلیتے ہیں، لیکن اپنے بھائیوں کے لیے ایک رات کی نیند بھی قربان نہیں کرسکتے۔حق تعالیٰ غازی مصطفیٰ کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اپنی بیش از بیش رحمتوں سے نوازے۔آمین [دسمبر۱۹۳۸ء]

علی، مولانا شوکت

مولانا شوکت علی مرحوم

اسی مہینہ کا دوسرا المناک سانحہ مولانا شوکت علی خادم کعبہ کی وفات ہے، شوکت علی مرحوم ہندوستان کے اُن پر چند مسلمانوں میں ایک تھے جن کی شہرت نہ صرف ہندوستان تک محدود ہے بلکہ دنیائے اسلام کے دور دراز گوشوں تک ان کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ مرحوم بجا طور پر اس شہرت واحترام کے مستحق تھے، پچھلے چند برسوں کو چھوڑ کر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی زندگی قربانی، ایثار، ولولہ اور جوش عمل کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ تھی، جنگ طرابلس اور جنگ بلقان سے لے کر اب تک ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے جتنے دور گذرے ہیں مرحوم کی خدمات اُن تمام دوروں میں اس قدر نمایاں اور اس قدر روشن ہیں جنہیں کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا ''علی برادران'' ہندوستان کی دو شخصیتوں سے مرکب ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے زبان پر آتے ہی کردار وعمل اور شجاعت وبسالت کا ایک سبق آموز نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

صد حسرت وافسوس کہ ہندوستان اپنے ایک جانباز، بہادر سپاہی اور پرانے خادم سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔حق تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اور دامانِ رحمت میں جگہ دے۔

[دسمبر۱۹۳۸ء]

مدنی، مولانا سید احمد مہاجر

مولانا سید احمد مہاجر مدنی

ہمیں یہ معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا کہ پچھلے دنوں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے برادر بزرگ مولانا سید احمد صاحب مہاجر مدنی جوار نبوی میں ایک عرصہ مدید کے قیام ہجرت کے بعد پچھلے دنوں رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔ آں ممدوح کی تعریف میں مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ آپ صحیح معنی میں مولانا حسین احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ عادات واطوار میں اسلاف کرام کا نمونہ تھے۔ آپ کا عظیم الشان کارنامہ مدینہ طیبہ میں ایک شاندار دینی وصنعتی مدرسہ کا قیام ہے جس میں اس بلدۂ مطہرہ کے غریب بچے دینی اور صنعتی تعلیم حاصل کر کے سامان معاد ومعاش پیدا کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ آں مرحوم کو صدیقین وشہدا کے مراتب عالیہ سے شرف اندوز فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزاں ہو۔ رحمه الله رحمةً واسعةً۔ [جنوری ۱۹۴۰ء]

جوہری، علامہ طنطاوی

آہ! علامہ طنطاوی جوہری

گذشتہ ماہ فروری میں مصر اور ہندوستان کے دو بڑے عالموں نے وفات پائی۔ مصر کے مشہور عالم علامہ طنطاوی جوہری عہد حاضر میں اُن مسلمانوں کے خواب کی سچی تعبیر تھے جو علوم جدیدہ کی خیرہ کن جگمگاہٹ سے مرعوب ہو کر ایسے جید عالم کی تلاش میں رہتے تھے جو ان علوم کے مقابلہ میں اسلامی وقرآنی حقائق کی فوقیت اس تحقیقی انداز میں ثابت کر سکے کہ بڑے سے بڑے ماہر علوم کو بھی مجال انکار باقی نہ رہے۔ وہ جس طرح دینیات اور علوم قرآن وحدیث میں یگانۂ روزگار تھے اُسی طرح اُن کو جدید علوم، علم نباتات، علم حیوانات، فلسفہ، سائنس، تاریخ اور علم ہیئت وطبقاتِ ارض میں بھی بڑی دستگاہ تھی۔ پھر ان سب فضیلتوں پر مستزاد یہ کہ اُن کا ذوق نہایت مستقیم اور طبیعت انتہا درجہ سلیم تھی۔ ان کی قوت فیصلہ درست اور ملکۂ تنقید صائب تھا۔ بے شبہ اُنھوں نے اس دور میں وہی کام کیا جو امام غزالی اور ابن رشد نے فلسفۂ یونان کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت و صیانت کے لیے انجام دیا۔ ان دونوں بزرگوں نے فلسفۂ یونان کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا اور اُس میں وہ کمال پیدا کیا کہ فلسفہ کے ایک ایک جزیہ اور مسئلہ پر حاوی ہوگئے۔ پھر فلسفہ کے جو اصول حق بجانب تھے اُن کو اسلام کی تعلیمات پر منطبق کیا اور جو لغو و لاطائل باتیں تھیں اُن کا تار و پود ''تہافت الفلاسفہ'' لکھ کر اس تحقیق وکمال دیدہ وری کے ساتھ کھولا کہ فلسفہ کا خلعتِ زریں ایک گداگر عقل و خرد کی گدڑی میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

علامہ طنطاوی ۱۲۸۷ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم مروجہ کی تحصیل وتکمیل کے بعد قاہرہ کے مدرسہ دارالعلوم میں استاد مقرر ہوگئے۔ درس وتدریس کے شغل کے ساتھ اُنھوں نے تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں چند اہم کتابیں یہ ہیں: (۱) الارواح، (۲) اصل العالم، (۳) این الانسان، (۴) التاج المرصع بجواهر القرآن والعلوم، (۵) جمال العالم، (۶) الزهرة، (۷) السر العجيب في حكمة تعدد ازواج النبي صلى الله عليه وسلم، (۸) ميزان الجواهر في عجائب هذاالكون الباهر، (۹) نظام العالم والامم، (۱۰) النظام والاسلام، (۱۱) نهضة الامة وحياتها، الحكمة والحكماء۔

مرحوم کو دینیات کے ساتھ علوم جدیدہ کی آمیزش میں خاص کمال حاصل تھا چنانچہ اُن کی کوئی کتاب اس خصوصیت سے خالی نہیں تھی، اُن کا یہ نظریہ بالکل صحیح ہے جس کا اظہار اُنھوں نے اپنی تفسیر میں جابجا کیا ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کی اصل وجہ اُن کا ذہنی ودماغی جمود ہے۔ اوّل تو ان میں تعلیم یافتہ ہی کتنے ہیں؟ اور جو تعلیم یافتہ ہیں تو اُن کا مبلغ علم اس سے زیادہ نہیں کہ چند پرانی کتابیں پڑھ پڑھا کر کسی مسئلہ پر بحث کی نوبت آئے تو دو چار بزرگوں کے اقوال نقل کر دیں اور بس۔ دماغی بیداری جو کائنات عالم اور فطرت کے عمیق مطالعہ سے اور اُس سے نتائج اخذ کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی طرف قرآن مجید نے بار بار مسلمانوں کو دعوت دی ہے، وہ اُن سے یک قلم سلب کر لی گئی ہے۔ اب اُن کا علم جو کچھ بھی ہے محض تقلیدی ہے اجتہادی نہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کے افکار مضمحل، قوت استنباط بیکار اور صلاحیت تنقید مردہ ہے۔ وہ ماضی کی حکایاتِ پارینہ سنا کر چند آنسو تو بہا سکتے ہیں لیکن زمانۂ حال کے پیغام سے مستقبل کو سنوارنے اور بنانے کا کوئی اہتمام نہیں کر سکتے۔ وہ دوسروں کے بنائے ہوئے زمین وآسمان میں امن وعافیت کی زندگی بسر کرنے کے خواہشمند ہیں لیکن اب اُن میں خود یہ حوصلہ نہیں ہے کہ اپنی قوت ''یداللّٰہی'' سے کام لے کر ایک نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کریں اور دنیا کو اُس کے سایہ میں پناہ لینے کی دعوت دیں۔ علامہ مرحوم کا یہی وہ جذبہ تھا جس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے اخیر میں قرآن مجید کی ایک نہایت اہم تفسیر لکھنے کا عزم بالجزم کیا اور انجامِ کار سالہا سال کی شب وروز کی محنت شاقہ کے بعد اس کو پچیس ضخیم جلدوں میں ختم کر کے اُن کے رہوار قلم نے دم لیا۔ اس

تفسیر کے مقصد کی توضیح وہ شروع میں خود اس طرح کرتے ہیں:

''میں نے یہ تفسیر اس غرض سے لکھی ہے کہ کیا عجب ہے اللہ تعالیٰ اس کو حسن قبول کے خلعت سے سرفراز فرمائے اور عام مسلمانوں کی آنکھوں پر جو جہل و نادانی کے پردے پڑے ہوئے ہیں وہ اُٹھ جائیں اور وہ علوم فطریہ کو سمجھنے لگیں۔ انھیں آسمانی عجائب کے معلوم کرنے کا شوق ہو، اور جو زمین کی حیرت انگیز چیزیں ہیں اُن کی تحقیق پر وہ مائل ہوں۔ مجھ کو امید ہے کہ اس تفسیر کی وجہ سے مسلمانوں کی تہذیب بہت بلند ہوجائے گی اور وہ علوی و سفلی دنیاؤں سے نکل کر نوادر کا علم حاصل کر کے زراعت، طب، معدنیات، حساب، ہندسہ، فلکیات اور تاریخ وجغرافیہ وغیرہ علوم میں کمال پیدا کر کے علما مغرب سے بھی سبقت لے جائیں گے اور یہ کیوں نہ ہو جب کہ علم الفقہ کی آیتیں تو صرف ڈیڑھ سو ہی ہیں لیکن علوم وفنون کی آیات سات سو پچاس سے بھی متجاوز ہیں۔''

جن اہل علم کو علامہ مرحوم کی تفسیر ''الجواھر فی تفسیر القرآن الحکیم'' کے مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ آپ نے جس مقصد کے پیش نظر اس اہم تفسیر کا آغاز کیا تھا وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوسکے ہیں۔ امام رازی کی تفسیر کبیر کی طرح ممکن ہے بعض لوگ اس تفسیر کی نسبت بھی یہ کہیں کہ قرآن مجید تو بنی نوع انسانی کی اخلاقی، روحانی اور دینی وعملی اصلاح کی کتاب الٰہی ہے بھلا اُسے فلسفہ وتاریخ اور علوم عصریہ سے کیا تعلق، کہ اُس کی تفسیر میں ان چیزوں سے بحث کی جائے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ علوم عصریہ کی روشنی میں علامہ نے جو بحثیں کی ہیں اُن سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ قرآن مجید کس طرح کائنات عالم اور فطرت کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ اُن کے علم کے بعد جس طرح معلول سے علت، کسی فعل سے اُس کے فاعل کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے اُسی طرح مخلوق سے خالق، اُس کے وجود، اُس کی ربوبیت اور الوہیت کی طرف ذہن کا نہ صرف انتقال ہو بلکہ اس کا اذعان وتیقن پیدا ہوجائے اور انسان ان تمام سلسلہ اسباب وعلل سے متجاوز ہوکر اپنے وجود کو صرف اُس وراء الوراء ذات احدیت کے ساتھ مربوط کرلے جس کی مشیت و قدرت ان تمام کل پرزوں کو ایک خاص نظام کے ساتھ چلا رہی ہے۔ حق یہ ہے کہ دین دنیا کی تمام سعادتوں کا سرچشمہ صرف ایک ہی اذعان ہے جس کو قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا لُبِ لباب اور عطر کہا جاسکتا ہے۔ پھر تاریخی حقائق کے سلسلہ میں جو مباحث پیدا ہوگئے ہیں ضرورت ہے کہ اُن کا حل قدیم تاریخ کے تمام ذرائع معلومات کی روشنی میں تلاش کیا جائے تاکہ کلامِ الٰہی کی حقانیت و صداقت روز روشن کی طرح واضح اور مبرہن ہوجائے۔ اسی طرح قرآن مجید نے قوموں کے عروج وزوال کے جو نفسیاتی اصول وقوانین بیان کیے ہیں اُن کی سچائی کا یقین دلانے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخِ اقوام پیش نظر ہو اور اُن کے عروج وانحطاط کے اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ علامہ مرحوم کی یہ مساعی کامیاب ثابت ہوئیں اور اُن کے کارناموں کو بارگاہ ایزدی سے خلعت قبول وپذیرائی حاصل ہوا۔ آج مصر و شام کے علاوہ ہندوستان، افغانستان، ایران، ترکی، جاوہ، انڈوچائنا، افریقہ اور یورپ میں کون ایسا صاحب علم ہے جو علامہ طنطاوی کے نام سے واقف نہیں۔ اُن کی کتابوں کے ترجمے بلادِ روس میں ترکی زبان میں، جاوہ میں ملائی زبان میں اور ہندوستان میں اردو زبان میں کثرت سے شائع ہوئے اور گھر گھر پھیلے۔ وہ جس طرح علم وفن میں یگانۂ روزگار تھے، شعروادب اور خطابت میں بھی اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے تھے اُن کی تحریر میں بلا کا زور تھا، جس موضوع پر لکھتے تھے اس قوت سے اُس کے ایک ایک پہلو پر بحث کرتے تھے کہ بڑے سے بڑے مخالف کو بھی سرِتسلیم خم کردینے کے سوا کوئی اور چارۂ کار باقی نہیں رہتا تھا۔ اُن کا طرز استدلال نہایت سلجھا ہوا اور عمیق ومنطقیانہ تھا۔

ایک جلیل المرتبت علامۂ روزگار ہونے کے علاوہ آں مرحوم اپنے عہد کے زبردست اسلامی مفکر بھی تھے۔ مسلمانوں کا انحطاط اُن کے دل ودماغ کو ہر وقت بے چین رکھتا تھا اور وہ اپنی تحریر وتقریر میں برابر مسلمانوں کو اصلاح کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ انھوں نے مصر کے رسالہ ''الرسالہ'' بابت ۲۹/نومبر ۱۹۷۳ء میں ''الحلقة المفقوده'' کے زیرعنوان ایک زبردست اصلاحی مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جس میں اُنھوں نے تمام مسلم جماعتوں اور اُن کے افراد کے رجحانات و میلانات کا تجزیہ کرکے بتایا تھا کہ آج مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کس طرح خطرناک طریقہ پر ذہنی انتشار اور دماغی پراگندگی میں مبتلا ہوگئے ہیں اور اس سے نجات پانے کی تدابیر کیا ہیں۔ اصلاح کے سلسلہ میں علامہ مرحوم جس خاص نقطۂ خیال کے پابند تھے اُس کا اندازہ آپ اس مضمون کے اقتباس ذیل سے کرسکتے ہیں، فرماتے ہیں: مثلاً رمضان کو ہی لے لیجیے۔ کیا اس وقت یہ ضروری نہیں کہ رویت ہلال کے مسئلہ پر ازسرنو غور کیا جائے۔ کیا موجودہ جمود کے ماتحت یہ بات مسلمانوں کے لیے انتہائی شرمناک نہیں ہے کہ ایک اسلامی شہر میں رمضان کی پہلی تاریخ ہفتہ کو ہوتی ہے اور دوسرے شہر میں اتوار کو، تیسرے شہر میں پیر کو۔ پھر اس اختلاف کا اثر مسلمانوں کے تمام اجتماعی کاموں پر بھی پڑتا ہے، کیا کسی کو یہ

امر محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ہڑبونگ شریعت اسلام کی اصل روح کے بالکل منافی ہے، میں اس مشکل کے حل کے لیے کسی نئی بدعت کی دعوت نہیں دیتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو قدیم فقہاء اسلام نے کہا ہے۔ فقہاء حنفیہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اگر چاند کسی ایک خطہ میں بھی دیکھا جائے تو تمام مسلمانوں پر روزہ رکھنا واجب ہوجاتا ہے۔ تو اب ہم اس قول سے فائدہ اُٹھا کر یہ کیوں نہ کریں کہ کسی ایک بڑے اسلامی شہر میں ایک رصدگاہ قائم کرلیں اور یہاں چاند دیکھنے کے بعد اس خبر کو تمام اسلامی شہروں میں بیک وقت شائع کردیا جائے اور سب کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کی پابندی کریں۔ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ اگر ہم سائنس کی غیر معمولی ترقی کے دور میں اپنے اندر یک جہتی پیدا کرنے کے لیے اتنا بھی نہ کرسکیں۔''

اس اقتباس سے جہاں علامہ مرحوم کی اصابت رائے، بلند فکر اور روشن خیالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ علوم وفنون میں کمال مہارت کے باوجود مذہبی معاملات میں طریق سلف سے منحرف ہوکر کسی اور نئی شاہراہ کی تلاش نہیں کرتے تھے، اور ان کے نزدیک مسلمانوں کی فلاح ونجاح کا انحصار اتباع سنت وقرآن میں ہی تھا۔

ہمارے جن بزرگوں اور دوستوں کو اُن کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اُن سے معلوم ہوا کہ یوں بھی حضرت مرحوم اپنی عملی زندگی میں نہایت متقی اور پرہیزگار تھے اور شریعت کے اوامر ونواہی کا بڑا لحاظ واحترام کرتے تھے۔

آہ صد افسوس! دنیائے اسلام کا یہ سب سے بڑا مفکر وعالم چند ہفتہ بیمار رہ کر گذشتہ ماہ فروری میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر اُنہی صدیقین وشہداء سے جاملا جن کے نقش قدم پر وہ عمر بھر چلتا رہا اور جن کے اتباع میں اُس کا قلم اعلاء کلمۃ اللہ میں برابر مصروف رہا۔

فاصبح فی لحدِمن الارض میتاً وکانت بحیاً تضیق الصحاصح
لئن حسنت فیك المراثی وذکرها لقد حسنت من قبل فیك المدائح

رحمه الله رحمة واسعة وامطرعليه شابيب الرافة والغفران۔

[مارچ ۱۹۴۰ء]

اجمیری، مولانا معین الدین

مولانا معین الدین اجمیری

دوسرا حادثۂ وفات حضرت مولانا معین الدین اجمیری کا ہے جو ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ کو اجمیر میں پیش آیا۔ مولانا کی ذات ہندوستان کے علماء میں ایک نمایاں مقام رکھتی تھی وہ علم وعمل دونوں کے پیکر تھے۔ منطق وفلسفہ میں ان کو مولانا ابوالبرکات ٹونکی مرحوم سے تلمذ خاص حاصل تھا، لیکن عام علماء منطق وفلسفہ کے برخلاف وہ دینیات اور علوم قرآن وحدیث میں بھی درخور وافر رکھتے تھے۔ اجمیر میں کتاب وسنت کی روشنی جو کچھ نظر آتی ہے اُنہی کے دم سے قائم تھی۔ پھر طرفہ یہ ہے کہ وہ صرف ارباب درس وتدریس اور اصحاب وعظ وارشاد میں سے ہی نہ تھے بلکہ اُن کا شمار اُن ابطال عزیمت وحریت میں تھا جو اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کانٹوں سے بھری ہوئی راہ کو دیکھ کر دل میں ذرا خوف وہراس محسوس نہیں کرتے، اور ''دل خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر'' پڑھتے ہوئے اُسے اپنے لیے ''تختہ گل'' جان کر بے خوف وخطر عبور کرجاتے ہیں اور ''بخاک وخون غلطیدن'' کو ''عاشقان پاک طینت'' کا شیوۂ خوش یقین کرنے کے باعث دست قاتل کے لیے اُن کی زبان سے بکمال خندہ پیشانی احسنت ولبیك کا نعرہ بیساختہ نکل جاتا ہے۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کے سرگرم کارکن تھے، اُنہوں نے اس مجلس کے سالانہ اجلاس امروہہ کی صدارت اُس پُرآشوب زمانہ میں کی جبکہ ہندوستان کشمکش حریت و آمریت کی طوفان خیزیوں کے باعث ایک نہایت ہی خطرناک دور سے گذر رہا تھا اور جبکہ ملک میں عام داروگیر نے سخت اضطراب وہیجان پیدا کررکھا تھا وہ اپنے عزائم میں پہاڑ کی طرح مضبوط تھے۔ جرم حریت کوشی کی پاداش میں جیل خانہ بھی گئے لیکن علالت کے باوجود ان سب تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرگئے اور ان کی جبین استقلال وہمت مایوسی وخوف کی ایک شکن سے بھی آشنا نہیں ہوئی۔ مسلمانوں میں جو قحط الرجال پایا جاتا ہے، اُس کے پیش نظر مولانا ایسے جامع کمالات اور پیکر علم وعمل کا سانحۂ مرگ یقیناً بہت زیادہ محسوس ہوگا۔ مولانا کا وطن اجمیر تھا، وہیں ایک مدرسہ معینیہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اخیر عمر تک انہوں نے اس گوشہ کو ترک نہیں کیا اور انجام کار اپنے جسم کی امانت اُسی سرزمین کو سپرد کردی جس کی آغوش میں کئی صدی سے اُنہی کے ہمنام وہم وطن مجاہد اسلام کا جسد مقدس آسودۂ سکون ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی بیش از بیش نعمتوں سے نوازے اور اپنے دامانِ رحمت میں قربِ خاص کا شرف عطا فرمائے۔ آمین [مارچ ۱۹۴۰ء]

عشرت لکھنوی، خواجہ / احسن مارہروی

خواجہ عشرت لکھنوی

افسوس ہے ہماری بزم ادب وشعر طرز قدیم کے اساتذہ شعروسخن سے خالی ہوتی جارہی ہے اور جو یہاں سے جاتا ہے اپنا قائم مقام چھوڑ کر نہیں جاتا۔ چند

مہینے ہوئے خواجہ عشرت لکھنوی جو بیگماتی اور ٹکسالی زبان لکھنے میں اپنی دو ایک ہی نظیریں رکھتے تھے، داغ مفارقت دے گئے تھے کہ اب اردو کے ایک مشہور استاد سخن حضرت احسنؔ مارہروی کے انتقال پر مُلال کی خبر آئی ہے۔

احسنؔ مارہروی

احسنؔ مرحوم اردو کے کہنہ مشق شاعر اور قواعد زبان کے بڑے عالم تھے۔ حضرت داغؔ دہلوی سے تلمذ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ احسنؔ کے کلام میں بھی فصاحت و بلاغت اور چستی اور روانی داغؔ کے رنگ کی پائی جاتی ہے۔ مرحوم کا اصل وطن مارہرہ تھا۔ کئی سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو کے لیکچرر رہے۔ ۱۸۹۶ء میں ''ریاض سخن'' کے نام سے ایک گلدستۂ اشعار جاری کیا۔ پھر لاہور سے غالباً استاد داغؔ کی یادگار میں ''فصیح الملک'' نام کا ایک ماہنامہ نکالا۔ نثر میں اُن کی تصنیف ''تاریخ نثر اردو'' بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ ولیؔ دکنی کے ضخیم دیوان کی تصحیح و ترتیب بڑی محنت و جانفشانی سے کی اور داغؔ مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام کو مرتب کر کے ''یادگار داغ'' کے نام سے شائع کیا۔ موصوف شاعری کے علاوہ صورۃً و سیرۃً بھی طرز قدیم کے بزرگ تھے۔ حق تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں ابرار و صلحاء کا مقام عطا فرمائے۔ آمین [اکتوبر ۱۹۴۰ء]

راس، ڈینی سن

ڈینی سن راس

ہندوستان کے ایک مشہور ادیب و شاعر کے ساتھ یورپ کے ایک نامور مستشرق کا بھی ماتم کرنا ہے۔ ان کا نام ڈینی سن راس تھا۔ سر کا خطاب رکھتے تھے۔ عربی اور ترکی ادبیات پر اُن کی نظر وسیع تھی۔ لندن کے مشہور اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے ڈائریکٹر رہے اور اس سے پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بھی پرنسپل رہ چکے تھے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس علم و فضل کے باوصف مارگیولیوتھ ایسے متعصب مستشرقین کے برخلاف سر ڈینی سن راس مسٹر آرنلڈ کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ایک بڑی حد تک دوستانہ روش رکھتے تھے۔ افسوس ہے گذشتہ ماہ اُن کے انتقال سے یورپ کے علمی حلقے السنۂ مشرقیہ کے ایک نامور فاضل سے محروم ہو گئے۔ [اکتوبر ۱۹۴۰ء]

بہاری، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد

آہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری!

پچھلے دونوں ہندوستان نے اس خبر وحشت اثر کو نہایت رنج واندوہ سے سُنا کہ مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد بہاری چند روز کی علالت کے بعد اس دنیائے فانی سے رخصت فرما گئے۔ خبر چونکہ بالکل غیر متوقع طور پر ملی تھی اس لیے فرط حزن والم نے حیرت کی صورت اختیار کر لی۔ یعنی ہم یہ جانتے ہیں کہ ہماری بزم علم و عمل کا کوئی لعل شب چراغ گم ہو گیا ہے، لیکن اس احساس کے باوجود تحیر کی فراوانی ہم کو رخصت گریہ اور فرصت نوحہ بھی نہیں دیتی۔

مولانا ابوالمحاسن محامدِ اخلاق اور محاسن فضائل کے جامع تھے۔ فکر و نظر، علم و عمل، محنت و دیانت، تفقہ و تدبر، ایثار و جفاکشی، خلوص وللّٰہیت۔ ان سب اوصاف کے بیک وقت جمع ہونے نے اُن کی ذات کو ایسا گلدستۂ خوبی بنا دیا تھا کہ وہ ''ای تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم'' کا مصداق بن گئے تھے اور اُن پر ''ابوالمحاسن'' کی کنیت واقعی طور پر صادق آتی تھی۔ ہندوستان میں کوئی قومی اور مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں مولانا نے پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ نہ لیا ہو اور اس میدان میں اپنے ساتھیوں سے پیش پیش نہ رہے ہوں۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اُن کا دماغ نہایت دقیقہ رس اور معاملہ فہم تھا۔ وہ موضوع فکر کے ایک ایک پہلو پر بڑی سنجیدگی اور عالی ہمتی کے ساتھ غور و خوض کرتے تھے، اور اُس میں ایسی ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ وہ عملاً بڑے جری اور بہادر تھے لیکن اُن کا دماغ انتہائی جوش و خروش کے عالم میں بھی کبھی مغلوب نہیں ہوتا تھا۔ جذبات کی گرمی کے ساتھ وہ ہر معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ جماعت علما ہند میں وہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے گوہر یکتا تھے۔ بقول کسی کے وہ ہر شخص کی قائم مقامی کر سکتے تھے لیکن اُن کی قائم مقامی کوئی نہیں کر سکتا۔ فواحسرتا کہ ہماری انجمن کا یہ گل سرسبد آج خزاں دیدۂ اجل ہو کر آغوش لحد میں آسودۂ سکون ہے۔

مولانا صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ میں میں پھنسیا ایک موضع ہے وہاں پیدا ہوئے۔ درسی تعلیم مولانا عبدالوہاب اور مولانا عبدالکافی الہ آبادی سے حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند آ کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے درس حدیث میں شریک ہوئے۔ چونکہ جوہر قابل رکھتے تھے اس لیے حضرت شیخ الہند کے درس اور ان کی صحبتوں نے مولانا کو فن حدیث میں درک کے ساتھ ساتھ ایک زبردست سیاسی مفکر اور انقلابی مجاہد بھی بنا دیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے 'گیا' میں ایک مدرسہ انوارالعلوم کے نام سے قائم کیا، جہاں آپ عرصہ تک درس دیتے اور طلبا میں علم و عمل کی روح پھونکتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی جس کا سیاسی اثر تمام عالم اسلام پر پڑنے والا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند اپنے چند

خادموں سمیت مکہ معظّمہ چلے گئے اوروہاں سے گرفتار کرکے مالٹا میں نظر بند کردیے گئے تو مولانا ابوالمحاسن نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرکے علما وصوفیا اور تعلیم یافتہ لوگوں کواُن کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اوراُن کوتحریک آزادی میں شریک ہونے پرآمادہ کیا۔۱۹۱۷ء میں مدرسہ انوار العلوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پرآپ نے جمعیۃ العلما بہار کی طرح ڈالی۔آپ کے اتباع میں دوسرے صوبوں کے علما نے بھی اس طرف توجہ کی اورصوبائی جمعیۃ العلما قائم کرکے اپنی تنظیمی جدوجہد کا آغاز کردیا۔۱۹۱۹ء میں آپ نے بہار میں امارت شرعیہ قائم کی۔اس کے ماتحت ایک محکمۂ قضا اوردوسرے محکمے مثلاً محکمۂ تعلیم، شعبۂ تبلیغ اور بیت المال بھی قائم کیے گئے۔مولانا کی بڑی خواہش تھی کہ اسی طرز کی شرعی امارتیں دوسرے صوبوں میں قائم ہوجائیں اوراس طرح مسلمانوں کا ایک اسلامی نظام معاملات رواج پاجائے۔لیکن افسوس ہے کہ حالات کی ناموافقت کے باعث اُن کی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں۔

۲۰۔۱۹۲۱ء کا زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا زمانہ تھا۔مولانا نے اس میں بھی بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔۱۹۲۵ء میں اُنہوں نے مرادآباد کے سالانہ جلسہ جمعیۃ العلماء ہند کی صدارت کی۔اس موقع پرآپ نے جوطویل اور پُرازمعلومات خطبۂ صدارت پڑھا تھا وہ آپ کے تفقہ اورتدبر کا آئینہ دار ہے۔ مولانا میں بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی جماعت کی پارٹی پالیٹکس سے کبھی مرعوب نہ ہوئے تھے۔اُن کے نزدیک جو بات حق ہوتی تھی اُس کو برملا کہتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آئینی ترقی کے سلسلہ میں کانگریس کے پُرجوش حامی تھے مگر انہوں نے کبھی کانگریس کواُس کی غلطیوں پرمتنبہ کرنے میں تساہل نہیں کیا۔وہ گاندھی جی کے عقیدۂ عدم تشدد کے بھی بہت بڑے نقاد تھے۔اسمبلی کاخلع ایکٹ جو کاظمی ایکٹ کے نام سے مشہور ہے،مولانا ہی کی کوشش سے بنا۔

اردوزبان کے متعلق بہاراسمبلی کا فیصلہ،قربانی گاؤ کے سلسلہ میں حکومت کا معقول طرزعمل،یہ سب آپ کی خدمات کا نتیجہ تھا۔ایک دفعہ قربانی گاؤ کے متعلق ہندوؤں کے مطالبات کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر رجندر پرشاد سے برملا آپ نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے:

''سال بھرصرف ایک دفعہ گائے کی قربانی سے ڈاکٹر صاحب کا خون کھول جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کویاد رکھنا چاہیے کہ کہ ایک مسلمان جب بازاروں میں، دریاؤں کے کنارے اورآبادی میں گزرتا ہے توہرقدم پراُس کا خون کھولتا ہے جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ اُس کے محبوب خدا کی تحقیر کی جارہی ہے، وہ دیکھتا ہے کہ کہیں پتھروں اورمورتیوں کوپوجا جارہاہے، کہیں دریا کی موجوں کی پوجاہورہی ہے اورکہیں درخت کے پتوں کے سامنے اشرف المخلوقات انسان جھک رہاہے لیکن مسلمان ان سب کواس لیے برداشت کرتا ہے کہ اب تک وہ اس سلوک کا عادی ہے جوحکمراں ہونے کی حیثیت سے اُسے غیر مذاہب کے ساتھ کرنا چاہیے۔اگر ہندومطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمان گائے کی قربانی ترک کرکے اُن کے جذبات کا احترام کریں تو اُنہیں غیراللہ کی پرستش چھوڑ کرمسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا پڑے گا۔''

آہ صد آہ!کہ مسلمانانِ ہند کی یہ متاع گرانمایہ اُن سے ۱۷/شوال ۱۳۵۹ھ بروز دوشنبہ ہمیشہ کے لیے چھین لی گئی۔اچھا مرنے والے رخصت!توجا اوراپنے ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کی حسرت نصیب آرزوؤں اورتمناؤں کو بھی لیتاجا!شاید ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی موجودہ تباہ حالی تجھ سے برداشت نہ ہوسکی کہ تویہاں سے گھبراکراب خدا کی بارگاہ میں اُن کی طرف سے فریاد کرنے جارہاہے،لیکن تونے ہم میں اسلامی حریت وآزادی اورعملی جدوجہد کی جوگرم روح پیدا کردی ہے وہ ہم کوتیرے بعد بھی شعلۂ سوزاں وتپاں کی طرح بے قرار رکھے گی اورہمارے کارواں طلب کا جب کبھی قدم منزل مقصود کی طرف بڑھے گا، تیرے نقش پا کی یاد سے خالی نہ ہوگا۔رب السماء والارض تجھے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔تویہاں ہمیشہ مسلمانوں کے غم میں پریشاں حال رہا۔خدا تجھے اپنے دامانِ رحمت میں ایک مقام جلیل وعظیم عنایت فرمائے کہ اس زندگی کوتونے اعلاءکلمۃ اللہ اوراعلان حق کے لیے ہی وقف رکھا۔آمین۔

[دسمبر۱۹۴۰ء]

سلیمان،سرشاہ محمد

سرشاہ محمد سلیمان

سخت افسوس ہے کہ۱۳/ مارچ کی شب میں بارہ بجے کے قریب ہندوستان کے آسمان علم وفضل کا ایک روشن ستارہ جسے لوگ سرشاہ محمد سلیمان کے نام سے جانتے تھے یکا یک موت کے آغوش میں گرکر قیامت تک کے لیے غروب ہو گیا۔سرشاہ محمد سلیمان مرحوم اپنی ذہانت وطباعی اوراعلیٰ قانونی وعلمی قابلیت و لیاقت کے باعث جس طرح سرزمین ہند کے لیے مایۂ صدافتخارونازش تھے۔اسی طرح اپنے سچے اورپکے مذہبی معتقدات واعمال کی وجہ سے آج کل کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے باعث ہزارعبرت وموعظت بھی تھے۔ دل اور دماغ

دونوں کی اچھائیاں بیک وقت بہت کم لوگوں میں جمع ہوتی ہیں۔مرحوم ان دونوں قسم کی خوبیوں کا ایک ایسا مجموعۂ دل افروز تھے جس کی یاد برسوں تک ہندوستان کے ارباب علم وفضل کو خون کے آنسو رلائے گی۔

سرشاہ محمد سلیمان مرحوم ۳/فروری ۱۸۸۶ء کو جون پور کے ایک سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم یہیں پائی۔میٹرک پاس کرنے کے بعد الہ آباد کے میورسنٹرل کالج میں داخل کیے گئے۔۱۹۰۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور تمام صوبہ میں اوّل رہے۔اس امتیاز کی بناپر انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ سے وظیفہ ملااورآپ ہندوستان کوالوداع کہہ کر کیمبرج کے کرائسٹ چرچ کالج میں داخل ہوگئے۔۱۹۰۹ء میں ریاضیات کا اعلیٰ امتحان (Tripos) پاس کیا اور پھر ۱۹۱۰ء میں بیرسٹری شروع کی۔جس میں اُنہوں نے بہت جلد نمایاں کامیابی حاصل کرلی۔۱۹۲۰ء میں اُن کو الہ آباد ہائیکورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں وہ عارضی چیف جج کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۶/ مارچ ۱۹۳۲ء کوانہیں مستقل چیف جسٹس کردیا گیا۔پھر جب فیڈرل کورٹ قائم کی گئی تو وہ اُس کے جج بنا کردہلی بھیج دیے گئے اور بالآخر ۱۳/ مارچ کی شب میں یہیں جان جاں آفریں کے سپرد کرکے نظام الدین اولیاء میں ایک مقام پر جو وادیٔ ایمن کے نام سے مشہور ہے، دفن کیے گئے۔

مرحوم اس دنیوی اعزاز ومنصب کے علاوہ ریاضیات اورعلم الطبیعات کے بھی بڑے ماہر تھے۔شوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ کوئی حالت ہو، بلاناغہ صبح چار بجے سے اُٹھ کر مطالعہ شروع کردیتے تھے۔آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے زبردست نقاد تھے جس کو اُنہوں نے عرصۂ دراز کی تحقیق وجستجو کے بعد غلط ثابت کیا تھا اورجس سے یورپ کے علمی حلقوں میں سخت ہیجان پیدا ہوگیا تھا۔آخرکار ۱۹۳۶اور۱۹۳۷ء دوسال تک مسلسل سائبیریا میں تحقیق کرنے کے بعد پروفیسر میچلوف نے اعلان کیا کہ واقعی سرشاہ محمد سلیمان کانظریہ بالکل درست اورصحیح ہے۔ پروفیسر موصوف کا یہ اعلان گویا ہندوستان اور بالخصوص ایک مسلمان دماغ اور ذہانت کی یورپ کے دماغ پر فتح کا اعلان تھا۔سرشاہ سلیمان مرحوم اس حیثیت سے ہندوستان سے زیادہ یورپ اورامریکہ کے علمی حلقوں میں روشناس تھے اوروہ لوگ انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ان علمی ودماغی فضائل کے علاوہ آں مرحوم اخلاقی اور مذہبی معتقدات کے لحاظ سے بھی ایک بلند پایہ انسان تھے۔دومرتبہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور باخبر لوگ جانتے ہیں کہ اُنہوں نے اس فرض کو کس عمدگی، احساس فرض کی پوری ذمہ داری اورمحنت ودیانت کے ساتھ انجام دیا۔اگرچہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کومعقول تنخواہ دی جاتی ہے، اس کے لیے ایک الگ شاندار کوٹھی ہے اورایک موٹر کار اوراُس کا معقول الاؤنس بھی دیا جاتا ہے۔لیکن مرحوم نے ان میں سے کبھی کسی چیز کواپنے لیے پسند نہیں کیااوراپنے عہدہ کی خدمات اپنے پاس سے خرچ کرکے ہی انجام دیتے رہے۔یہاں تک کہ علی گڑھ میں جتنے دنوں قیام کرتے کوٹھی کے بجائے ایک کمرہ میں قیام کرتے تھے اورکھانا بھی یونیورسٹی کے مطبخ کا کھاتے تھے۔اُن کی مذہبی پابندی اورآج کل کی ''بدنام قدامت پسندی'' کا یہ عالم تھا کہ پردہ جس کا نام لینا بھی آج کل کے روشن خیال متفرنجین خلافِ شائستگی سمجھتے ہیں، مرحوم اُس کے زبردست حامی تھے چنانچہ خوداپنے گھر میں اورعلی گڑھ یونیورسٹی میں وہ اس کواپنے اثر واقتدار کے باعث پوری طرح قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔اس قدامت پسندی کی وجہ سے اُن پرطعن وطنز بھی کیا جاتا تھالیکن وہ اس کی ذرا بھی پروانہ کرتے اورجوبات انہیں حق معلوم ہوتی تھی اُس پر بے خوف لومتہ لائم آخر تک شدت سے عامل رہتے تھے۔غالباً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ مرحوم نے تعطیل کا دن بجائے اتوار کے جمعہ مقرر کیا۔اور یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں یہ تجویز پاس کرائی کہ ہرجلسہ کا آغاز تلاوت کلام مجید سے ہو۔اس تجویز کے مطابق وہ خودآیۂ کریمہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تلاوت کرتے تھے اوراس طرح جلسہ کا افتتاح کرتے تھے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جولوگ انتہائی علمی ہوتے ہیں اُن کی عام گفتگو علمی انہماک ومصروفیت کے باعث شگفتہ نہیں ہوتی۔لیکن اس کے برعکس مرحوم کی یہ خصوصیت تھی کہ بین الاقوامی شہرت علمی اورفیڈرل کورٹ کے جج ہونے کے باوجود ہرکہ ومہ سے نہایت خندہ پیشانی اورانبساط خاطر کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ بولتے ذراتیز تھے۔فرطِ ذہانت سے آنکھیں چمکتی رہتی تھیں اورگفتگو کے وقت سیماب وش متحرک رہتے تھے۔

اُن کا گھر علماء وطلباء کے لیے ایک مسکن امن وراحت تھا۔بڑے بڑے لوگوں کے بجائے غریب مگرارباب علم و ذوق سے ملنے میں خاص لطف محسوس کرتے اوراُن سے بے تکلف اور دیرینہ آشنا کی طرح گفتگو کرتے تھے۔انتقال سے چند ماہ پہلے آپ نے ندوۃ المصنفین کی تمام مطبوعات کوشرف مطالعہ بخشا اور ادارہ کے ناظم اوراڈیٹر برہان کومختلف مسائل پربات چیت کرنے کے لیے اپنی کوٹھی پر مدعو کیا۔کئی گھنٹہ تک مختلف علمی واسلامی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ندوۃ

المصنفین کے کام پر قلبی خوشنودی کا اظہار فرمایا اور چند اہم عنوانوں کی طرف توجہ دلائی جن پر مستقل تصنیفات کی شدید ضرورت ہے۔ دوران گفتگو میں آں مرحوم نے اپنے کتب خانہ کے ذکر کے سلسلہ میں کتب خانہ کی چند اہم اور نادر کتابوں کا بھی ذکر فرمایا جنہیں آپ نے بصرف زرکثیر فراہم کیا تھا۔

کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ عہد قحط الرجال میں سرشاہ محمد سلیمان کا وجود ہندوستان کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً ایک متاع گرانمایہ تھا جس کے اس طرح ضائع ہوجانے پر جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔ لیکن ماتم کرنے کے بجائے یہ بہتر ہوگا کہ مسلمان نوجوان علم میں، اخلاق میں اور مذہبی عقائد کی پختگی میں اُن کی زندگی سے سبق حاصل کریں جو اُن کے جسم خاکی کے پیوند زمین ہوجانے کے بعد آج بھی روشن وتابناک ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

تلك اثار ناتدل علینا فانظر وابعد نا الیٰ الاثار

دعا ہے کہ اُنہیں صدیقین وصلحاء کا مقام جلیل عطا ہو اور حق تعالیٰ اُن کو جوار رحمت میں بیش از بیش انعام واکرام سے سرفراز فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

[اپریل ۱۹۴۱ء]

آزاد، مولوی ابوالمکارم محمد عبدالبصیر عتیقی

مولوی ابوالمکارم محمد عبدالبصیر عتیقی آزاد

افسوس ہے ماہ گزشتہ میں مولوی ابوالمکارم محمد عبدالبصیر صاحب عتیقی آزاد کئی ماہ کی شدید علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ مولوی صاحب موصوف سیوہارہ ضلع بجنور کے اُس خاندان والاشان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کے ایک فرد گرامی قدر مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ تقریر اور تحریر کا اچھا ملکہ تھا۔ شاعری کا ذوق خاندانی تھا۔ پندرہ سولہ سال سے بسلسلہ ملازمت حیدرآباد دکن میں قیام پذیر تھے۔ سرکاری ملازمت کی سرگراں مصروفیتوں کے باوجود تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے رہتے تھے۔ متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ تبلیغ اسلام کا جوش اور ولولہ فطری تھا۔ اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے نام پر مرمٹنے والے تھے۔ حیدرآباد دکن میں خدا کے فضل سے دیوبند کے علماء اور فضلاء کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ موصوف نے ایک انجمن کے ذریعہ اُن سب کو ملا کر ایک مرکز پر لا کھڑا کیا اور خود اُس انجمن کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ حیدرآباد کی ہر مذہبی اور دینی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ انجمن علماء دکن اور انجمن عالمگیر تحریک قرآنی کے ممبر تھے۔ صاحب تذکرۂ 'سخنوران دکن' نے اُن کو دکن کے شاعروں میں شمار کیا ہے۔ نہایت خوش خلق اور ہنس مکھ تھے۔

موت سب کو آنی ہے۔ کسی کو اُس سے مفر نہیں ''آج وہ کل ہماری باری ہے'' یہاں کا شب وروز کا مشاہدہ ہے۔

من لم یمت عبطة یمت ھرما للموت کاس والمرء ذائقھا

مگر زیادہ رنج اور افسوس اس کا ہے کہ مرحوم ابھی بالکل جوان تھے۔ ایک عرصہ سے آنتوں کے سخت درد کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ یونانی اور ڈاکٹری ہر قسم کے علاج معالجے کرائے لیکن جانبر نہ ہوسکے اور آخرکار ۱۹/ اپریل کو لکھنؤ میں پینتیس سال کی عمر میں دو کم سن بچیوں اور ایک خورد سال بچہ، ایک نوجوان بیوہ اور ضعیف العمر باپ اور دوسرے اعزاء کو داغ مفارقت دے کر راہی ملک بقا ہوگئے۔ مرحوم کے برادر نسبتی مولوی عبدالصمد صاحب صارم نے تاریخ وفات میں ذیل کا قطعہ لکھا ہے:

عبدالبصیر راہی ملک بقا ہوئے مدت سے مبتلا تھے وہ دردِ شدید میں
تھی فکر حال وسال تو ہاتف نے دی ندا ہے اب تو وہ جوارِ رسول شہید میں

۱۳۶۰ھ

رحمہ اللہ رحمة واسعة و منحه من نعمه السابغة الکاملة۔

[مئی ۱۹۴۱ء]

مبارک پوری، مولانا شکر اللہ

مولانا شکر اللہ مبارک پوری

۲۴/ مارچ کو ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا کہ جمعیۃ علماء صوبۂ آگرہ کے صدر مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری طویل علالت کے بعد ۲۳/ مارچ کو عالم فانی کی طرف رحلت فرماگئے۔ مولانا موصوف نہایت مخلص، عالم باعمل اور پُرجوش قومی کارکن تھے۔ ردّ بدعات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اپنی معاش کے لیے کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ اس لیے قومی کاموں میں بے دریغ اپنی جیب سے خرچ کرتے تھے۔ ان کے مشاغل علمی اور عملی دونوں قسم کے تھے۔ پرانی تعلیم کے بزرگ ہونے کے باوصف سیاسی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی میں وہ اپنے کسی ہم عصر سے کم نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق ارزاں ہو کہ سدا رہے نام اللہ کا! [اپریل ۱۹۴۲ء]

انبیٹھوی، مشتاق احمد

مشتاق احمد انبیٹھوی

اس موقع پر ہمیں اپنی جماعت کے ایک اور بزرگ عالم مولانا مشتاق احمد صاحب انبیٹھوی کی وفات حسرت آیات کا بھی ماتم کرنا ہے، مولانا مرحوم ایک درویش گوشہ نشین اور عالم خلوت پسند تھے۔ انبیٹھ ضلع سہارنپور وطن تھا۔ وہاں کے مشہور خاندان شیوخ سے تعلق رکھتے تھے۔ درس نظامی کی تعلیم دہلی اور سہارنپور میں پائی تھی۔ آخر میں حدیث کا درس مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے لیا۔ مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف کا خاصا ذوق تھا۔ خود اپنا بڑا کتب خانہ رکھتے تھے۔ مرحوم کی تصنیفات کی تعداد اکیاسی (۸۱) ہے۔ اس فہرست میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سب کتابیں اور رسالے شامل ہیں۔ یہ تصنیفات اکثر وبیشتر مذہبی مسائل، تاریخ وتذکرہ اور تصوف ومعرفت سے متعلق ہیں اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں۔ علم ظاہر کے ساتھ صاحب باطن اور صاحب سلوک وطریقت بھی تھے۔ معاشی اعتبار سے مرفہ الحال ہونے کے باوجود ورع واحتیاط ان کی زندگی کا طغراء امتیاز تھا۔ کیسے ہی سخت بیمار ہوں جب تک انگریزی دوا کے متعلق ان کو الکحل سے بالکل پاک وصاف ہونے کا یقین نہیں ہوتا تھا نہیں پیتے تھے۔ پبلک زندگی سے ان کو نفرت تھی۔ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے تصنیف وتالیف، مطالعۂ کتب، ارشاد وہدایت باطنی اور افتاء کی خدمت انجام دیتے رہتے تھے۔ آج کل پرانی وضع قطع کے پابند جو بزرگ نظر آتے ہیں ان کو غنیمت جاننا چاہیے۔ کچھ عرصے بعد آنکھیں اس وضع کو دیکھنے کے لیے ترسا ہی کریں گی۔ افسوس کہ آں مرحوم نے ۱۴/فروری ۱۹۴۲ء کو شام کے چار بجے ۹۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ حق تعالیٰ مرحوم کو غریق بحرِ رحمت کرے اور مراتب اخروی بڑھائے۔ آمین [اپریل ۱۹۴۲ء]

ظہور الحق، مولوی قاضی

مولوی قاضی ظہور الحق

اس سلسلہ میں ہمیں اپنے مخلص اور جواں مرگ دوست مولوی قاضی ظہور الحق صاحب کی یاد بھی آرہی ہے۔ مرحوم نجیب آباد کے ایک قصبہ جلال آباد کے رئیس اعظم اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، خوب رواور خوش خو تھے۔ ندوۃ المصنفین سے دلی عقیدت وارادت رکھتے تھے۔ رئیس ہونے کے باوجود احکام مذہبی کے سخت پابند گویا صحیح معنٰی میں جوان صالح تھے۔ امور خیر وصلاح میں ہمیشہ سابقون اولون کی صف میں رہتے تھے۔ پورے خاندان کے واحد مربی اور سرپرست تھے۔ تندرستی لائق رشک تھی، مگر چند ماہ سے پھیپھڑوں میں پانی اتر آیا تھا، اس کا آپریشن کرایا گیا جو آخر کار گزشتہ ماہ قید ہستی سے ہی نجات کا سبب بنا۔ عمر ۳۴۔۳۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ حق تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت ومغفرت کے دامن میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ [اپریل ۱۹۴۲ء]

ٹونکی، مولانا حیدر حسن خاں

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی

افسوس ہے ۳۱/مئی ۱۹۴۲ء کو مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی نے جو ہندوستان کے مشہور محدث اور عالم تھے اپنے وطن ٹونک میں وفات پائی۔ مولانا مرحوم علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع اور ماہر تھے۔ قدیم طرزِ تعلیم کے مطابق شروع شروع میں آپ کو منطق، فلسفہ اور ریاضیات کے ساتھ زیادہ اشتغال رہا لیکن بعد میں انھوں نے اپنی پوری زندگی حدیث کے درس وتدریس اور اس کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی، علوم ظاہریہ کے علاوہ مکہ معظّمہ جا کر باطنی سلوک و معرفت کا فیض حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے حاصل کیا تھا جس سے آخر دم تک ان کی روحانیت کا چراغ روشن رہا۔ علمی وعملی کمالات کے ساتھ فضائل اور اخلاق کا پیکر تھے۔ نہایت حلیم، متواضع، منکسر اور عالی حوصلہ بزرگ تھے انھوں نے اپنی علمی خودداری کو کبھی طمع وجاہت وشہرت یا جذبۂ جلب زر کے آستانہ پر رسوا کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس قسم کے جامع الفضائل علماء اب کہیں کہیں شاذ ونادر ہی نظر آتے ہیں، اس بنا پر مولانا مرحوم کی وفات اسلامی دنیائے علوم کا ایک عظیم حادثہ ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ آں مرحوم کو صدیقین وشہداء کا مقام جلیل عطا فرمائے۔ [اگست ۱۹۴۲ء]

تھانوی، مولانا اشرف علی

آہ! حکیم الامت

اِنَّکَ مَیِّت" وَّاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنُ

یوں تو موت اس عالمِ آب وگل کی ہر اس چیز کے لیے ہی مقدر ہے جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں جو صرف افراد واشخاص کی اموات نہیں ہوتیں بلکہ ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عمارتِ حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت وارادت سے وابستہ ہوتے ہیں۔

پھراس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہ ہائے اشک سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ہزاروں دلوں کی پرسکون آبادیاں ایک مستقل غم کدۂ آمال دامانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امیدوں اور ولولوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔نشاط وکامرانیٔ حیات کے آتش کدے سرد ہوجاتے ہیں اورایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثۂ جان کاہ نے کائناتِ عالم کی ہر ہر چیز کواداس اورغمگین بنادیا ہے۔اسی قسم کی ایک موت پرعربی شاعر نے کہا تھا۔

وما کان قیس هلکهٗ هلك واحد
ولکنّه بنیانُ قومٍ تَهَدَّمَا
قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں ہے
بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا جومنہدم ہوگئی

گذشتہ ماہِ جولائی کی تاریخ ۱۹؍۲۰رکی درمیانی شب کوتقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا جو سانحۂ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا۔حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے طریقت اور سلوک میں بھی مقامِ رفیع کے مالک تھے۔ان کی ذات علوم ظاہری وباطنی کا مخزن تھی۔علمِ سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں اورتقریر بھی بلاکی اثر انگیز تھی، وہ جس بات کوحق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے اور کرتے تھے اوراس میں انھیں کسی لومۃ لائم کی پروانہیں ہوتی تھی۔خودایک درویش گوشہ نشین تھے۔مگران کا آستانہ بڑے بڑے اربابِ ثروت ودولت اوراصحابِ علم وفضل کی عقیدت گاہ تھا، جو بات اور جوعمل تھا اخلاص اور دیانت کے ساتھ تھا۔دنیوی وجاہت وشہرت اور مالی حرص وآز کا شاید دل کے آس پاس بھی کہیں گذر نہ ہوا تھا۔اپنے اصول اوراپنے عقیدہ وخیال پراس مضبوطی اورپختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کواس سے منحرف نہیں کرسکتی تھی۔حضرتِ مرحوم کا آستانہ معرفت وروحانیت کاایک ایسا چشمۂ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب ہوکرجاتے تھے، وہ جن کی زندگیاں معصیت کوشی اورعصیاں آلودگی میں بسر ہوئی تھیں یہاں سے پاک و صاف ہوکراور گوہرِمقصود سے دامانِ آرزو کوبھرکرواپس لوٹتے تھے۔ان کی زندگی اتباعِ سنت کاایک زندہ درس اوران کی گفتگو اسرار ورموزِ طریقت کادفترِ گرانمایہ تھی۔بعض مسائل میں علماء ہندکی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ لیکن تقویٰ وطہارت ،تفقہ فی الدین ،شرعی علوم میں مہارت وبصیرت ،راست گفتاری اورمخلصانہ عمل کوشی ،انابت الی اللہ ، بے لوث خدمتِ دین ، بے غرضانہ تلقینِ رشدوہدایت ،حضرت مرحوم کے یہ وہ اوصاف عالیہ اورفضائل حمیدہ تھے جو ہرموافق ومخالفت کے نزدیک برابرمسلم رہے۔بعض عوارض واسقام کی بناپرگوشہ نشین ہونے سے قبل اپنے مواعظ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاحِ عقائد واعمال اور ابطال رسوم وبدعات کی جوعظیم الشان خدمت انجام دی ہے وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد طغرائے امتیاز ہے۔قوم نے ان کو''حکیم الامت'' کا خطاب دیا تھا اور بالکل بجا دیا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اورتقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کاایسا کامیاب علاج کیا کہ جوخزف ریزے تھے وہ گوہرآبدار بن گئے اور جوصرف پیتل تھے وہ زرِخالص ہوگئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اورمستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سو سے اوپر بیان کی جاتی ہے، جن میں سے کثیر تصنیفات ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں اڈیشن طبع ہوچکے ہیں۔کہاجاتا ہے اورغالباً اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ مولانا کی تصنیفات جواب تک طبع ہوچکی ہیں ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہے۔مولانا کی سیرچشمی اورفیاضی ،خلوص اورللّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کراورکیا ہوسکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیرمعمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کاحق اشاعت وطبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہرشخص کو ان کے چھاپنے اورطبع کرانے کااذن عام تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف یہ ایک عمل ہی ایسا ہے جوآج کل کے بڑے بڑے نامورعلماء کے لیے سرمایۂ عبرت اوردرسِ موعظت ہوسکتا ہے، پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں، علماء اورفضلاء ،اربابِ شریعت اوراصحابِ طریقت ،مرداور عورتیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اردوخواں ہرایک ان سے استفادہ کرسکتا اور اپنے لیے اصلاح ظاہروباطن کا سامان بنا سکتا ہے۔مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کے علاوہ ایسا عجیب وغریب منطقی اورعقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق وتائید سے کوئی مفرنہیں دیکھتا۔ جس بات کوبیان کرتے ہیں نہایت وثوق اوریقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔حضرت مرحوم کی تحریریں اوران کی گفتگوئیں غیرمعمولی ذکاوت وفطانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں، بات سے بات پیدا کرنا اور ہرمعاملہ کی اصل حقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لیے تفسیر 'بیان القرآن' اور'شرح مثنوی مولانا روم' اورعورتوں

کے لیے 'بہشتی زیور' آپ کی ایسی گراں بہا اور کثیر الشیوع تصنیفات ہیں کہ جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور موخر الذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اردو خواندہ ہوگا جس نے کم از کم اس کا نام نہ سنا ہو۔

مولانا کی ولادت باسعادت ۵/ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو ہوئی تھی اس حساب سے آپ کی عمر تقریباً ۸۳ سال ہوتی ہے۔ آپ کی مفصل سوانح عمری 'اشرف السوانح' کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں آپ کی حیات میں ہی شائع ہوگئی تھی۔ جس کی تصنیف کا شرف اردو زبان کے مشہور شاعر اور فاضل خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب اور مولوی عبدالحق صاحب کو حاصل ہے۔ اب اگرچہ حضرت مولانا کی وفات ہوچکی ہے لیکن وہ اپنی تصنیفات اور اپنے عملی کارناموں کے باعث آج بھی زندہ ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کے بعد ان زندہ جاوید یادگاروں سے روشنی حاصل کریں اور ان کی رہنمائی میں اسلام کے صراطِ مستقیم پر چلیں۔

حق تعالیٰ اعلیٰ علیین میں مولانا کے مدارج و مراتب بیش از بیش بڑھائے کہ وہ عمر بھر لوگوں کو اسی کی راہ کی طرف بلاتے رہے۔ اور قیامت میں ان کا حشر صدیقین وابرار کے ساتھ کرے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہمیشہ ایک مومن قانت و صدیق کی ہی طرح بسر کی۔ رحمه الله رحمةً واسعةً۔ [اگست ۱۹۴۳ء]

عالی، نواب

نواب عالی مرحوم

صاحبزادہ مرزا حاجی ضمیر الدین صاحب عالی مرحوم نواب علاء الدین خاں صاحب علائی کے چوتھے اور سب سے چھوٹے لڑکے تھے۔ مرحوم میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو اگلے بزرگوں میں ہوتی تھیں۔ وہ خاندان کے ایک ایسے فرد تھے جن کی موت نے خاندان پر یہ واضح کردیا کہ اب اس کمی کو پورا کرنا بالکل ناممکن ہے۔

میرے رشتے کے ماموں تھے لیکن ان کی بزرگانہ شفقت ایسی تھی کہ حقیقی ماموؤں سے بڑھ کر تھی۔ عربی فارسی کے متبحر عالم تھے نہ صرف عالم تھے بلکہ عالم باعمل۔ ان کے دل میں خدا کی تمام مخلوق کے دکھ سکھ کا پورا پورا خیال تھا۔ ان کی موت سے بہت سی لاوارث عورتیں شکستہ دل ہوئیں اور بیکس یتیم بے سہارا رہ گئے۔ مرحوم کے حالات ذیل ان کے بھتیجے صاحبزادہ شمس الدین احمد خاں صاحب دیوان ریاست لوہارو نے لکھ کر بھیجے ہیں جس کے لیے میں موصوف کی شکرگزار ہوں۔

آپ ۱۶/دسمبر ۱۸۶۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ فخر الدولہ نواب علاء الدین احمد خاں بہادر فرمانروائے لوہارو کے پانچویں فرزند اور سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ آپ کے باپ نے پیدائش کے وقت اپنی بیاض میں یہ درج فرمالیا تھا: ''تولد پسرِ کامگار ہوشیار مرزا ضمیر الدین احمد خاں طال عمرہ در ساعتِ سُنبلہ از بطنِ شمس النسا بیگم۔

مرزا غالب کے تعلقِ خاص کی تقریب سے نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو دنیا جانتی ہے۔ شمس النساء بیگم دخترِ نواب جلال الدین خاں نبیرۂ امیر الامراء نواب نجیب الدولہ رئیس نجیب آباد ہیں۔ مرزا ضمیر الدین احمد خاں کی تعلیم و تربیت زیرِ نگرانی والد بزرگوار ہوئی۔ بعض استاد ایرانی تھے۔ مثلاً مرزا ابو طالب شیرازی ابن سید ہاشم نجفی۔ نوعمری میں گھوڑے کی سواری کا شوق ہوا۔ لوہارو میں جرنیل صاحب کے لقب سے مشہور ہوئے۔ گھوڑوں کی شناخت میں کمال رکھتے تھے۔ اسلحہ کی شناخت میں خاص مہارت تھی۔ خود گولی، بارود اور بندوق کی ٹوپیاں بنالیتے تھے۔ ریاست لوہارو میں ایک باغی راجپوت نے جب بغاوت کا علم بلند کیا تو آپ بھی مقابلہ کے لیے تیار ہوئے۔ یہ واقعہ غالباً ۱۸۹۷ء کا ہے۔

آپ کی شادی دہلی میں قاسم خانیوں میں اپنے ہی قریبی عزیزوں میں مرزا محمد حسن خاں عرف خضر مرزا صاحب کی دخترِ اول سے ہوئی تھی۔ مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اپنی عمر کا زیادہ حصہ خدائے تعالیٰ کی عبادت، نماز اور روزہ میں اور مطالعہ کتبِ دینیات میں گزارا۔ سالہا سال سے لوگوں کو مفت درس مذہبِ اسلامی دیتے تھے۔ لوہارو میں آپ کی یادگار سے ایک مسجد اور مدرسہ اسلامیہ ضمیریہ موجود ہے۔ مسجد کی امداد آپ کی سعی سے مستقل مقرر ہے۔ آپ بڑے پایہ کے عالم باعمل اور محدثِ بے بدل تھے۔ دانش مندی میں مشہور اور ہر کہ و مہ کی خدمت بلاعوض کرنے میں نامور۔

شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی مگر حسبِ فرمائش اشعار فارسی و اردو کہا کرتے تھے۔ آپ کی بیاض بھی موجود ہے۔ ایک قصیدہ فارسی اکسٹھ (۶۱) شعر کا بمقابلہ فیضی بمدح اکبر بادشاہ بھی لکھا تھا۔ فیضی کا یہ مصرع ہے: ''سحر نوید رساں قاصد سلیمانی''۔

اس پر حاجی صاحب مرزا ضمیر الدین احمد صاحب المتخلص بہ عالی فرماتے ہیں:

شمی وکلبۂ تار و بخاک پیشانی — کہ روح قدس دہد درس بے دبستانی
اگر بہ تکیہ گہ ناز بابتِ طناز — کسے بہ شوخیٔ وشنگی وبوس افشانی
منم کہ شاہدِ توحید ہست درپشیم — ببرگرفتہ ام اینک کلامِ یزدانی
امام ساز کلامے بمنزل افلاک — سپس حدیث پیمبر کہ ہست برہانی
ز حاملان احادیث ز تراجم شاں — بیب گاہ عمل گرچہ ہست نقصانی
بیابیا کہ نشانت دہم طریقِ صواب — سعادنست قریں ارنہ روئی گردانی
رسوں رست اطاعت خدائی راطاعت — اگرتو اہلِ حدیثی واہلِ قرآنی

اس کے علاوہ مدح قرآن حکیم میں فارسی کے بہت سے اشعار ابدار ہیں، جن کا نمونہ یہ ہے:

دوش کز فیض قلم طبع سخنداں آمد — نکتۂ سفتہ باندیشہ فراواں آمد
از کدورات جہاں طبع اگر مظلم بود — عقل دراک وقائق مہ تاباں آمد
گاہ بر فلسفہ ومنطق ومعقول ونجوم — خوض کردی کہ چنیں آمد ویوناں آمد
گاہ از فن طبعی و ز علم ابداں — حکم کردی کہ چنیں سود ز نقصاں آمد

علاوہ ازیں ایک غزل فارسی علی حزیںؔ کی غزل پر بھی کہی تھی:

ہلہ من کشتۂ یارم تنہ ناہا یا ہو — درغمش زارو نزارم تنہ ناہا یا ہو
غمِ دنیا نخورم زادبہ عقبی نہ برم — مست ودیوانہ وخوارم تنہ ناہا یا ہو
سوخت کانون ضمیرم زتبِ ہجر چناں — ہرنفس عین شرارم تنہ ناہا یا ہو
کارصیاد اجل ہست مگریک روزے — من بہروزِ شکارم تنہ ناہا یا ہو
آں ضمیرم کہ پس ازمرگ زافراطِ نشاط — آید آوازِ مزارم تنہ ناہا یا ہو

ریاست لوہارو کے قوال ان کی غزلیں آج تک گاتے ہیں۔ مثلاً

ساقیا ماہ و شا ساغر صہبا آور — عید فطر است مئی لعل ثمینا آور

انھوں نے جو کچھ سیکھا اپنے باپ سے سیکھا خود اس کا اقرار کرتے ہیں:

عالی ازفیضِ علائی نامور شد در جہاں — نکتہ سنج ونکتہ داں از بہر آں نامیدمش

ڈاکٹر اقبال نے ایک مرتبہ دیوبند کے مولانا حسین احمد صاحب پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ — زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

نواب ضمیرالدین صاحب عالی کو اقبال ایسے بلند پایہ شاعر اور مفکر اسلام کی یہ ادا پسند نہیں آئی اور انہوں نے جواب میں یہ اشعار لکھے:

رسول گفت کہ آرند از ثریا دیں — رجال فرس وعجم قول توچہ بوالعجبی است
خلافِ قول رسولِ کریم قول گے — سخافت است شقاوت کہ راہِ بی ادبی است
ز دیوبند و زکشمیر ہرچہ گوئی گو — شمول جملہ عجم یاوہ است بے سببی است
توشاعری وندانی رموزِ دینِ متیں — بہ پارسی است ترا بہرہ آں زباں عربی است
ببیں بعلم بخارا وعلم نیشاپور — ازاں بگیر نگیری اگرچہ بُولہبی است

آخر زمانہ میں مرزا صاحب ایسے محتاط ہوگئے تھے کہ اپنے قلم سے کچھ نہیں لکھتے تھے۔ ان کی زندگی سادہ تھی۔ مگر ازل سے نفیس طبع لائے تھے۔ اول درجہ کے قانع اور صابر تھے، ان کی وضع داری میں کبھی فرق نہ آیا۔ آپ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے مومن قانت تھے۔ توحید اور سنتِ رسول کی پابندی اور اشاعت کا خیال رہتا تھا۔ اولیاء اللہ کے منکر نہ تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہوتے ہیں۔ ان کو الوہیت کی شان میں کوئی حصہ نہیں۔ مستند احادیث کی پیروی کرتے تھے۔ عقائد میں فرقۂ قادریہ سے تھے۔ ـــــــء میں حج بیت اللہ سے سبکدوش ہوئے۔ بیگم صاحبہ بھی حج میں ہمراہ تھیں۔ کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی منقبت میں ایک کتاب طبع کرانے کا خیال تھا۔ جس کا مسودہ موجود ہے۔ حوالہ جات احادیث نبوی سے دیے ہیں۔ حاجی صاحب موصوف فتوی بھی دیتے تھے۔ زیادہ تر رجحان امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایات پر تھا۔ صاحبزادہ موصوف کو ریاست لوہارو سے خاندانی وظیفہ ملتا تھا۔ خاندان لوہارو کے یہ چراغ روشن وہدایت تھے۔ جو چراغ اب گل ہوگیا۔

یہ لکھ کر مرے دل میں آیا کہ کہدوں — چچا جان تھے بات کے قدرداں
وہ عقلِ مجسم تھے دانشوری میں — وہ تھے فخر اسلاف وہم خانداں
(شمسؔ)

صاحبزادہ صاحب موصوف کچھ عرصہ بیمار رہ کر ۲۵/مارچ ۱۹۴۳ء کو بمقام دہلی فوت ہوئے آپ کے پاؤں میں درد پیدا ہوگیا تھا۔ جس کا آپریشن ہوا۔ مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ حافظ شیراز نے کیا خوب کہا ہے ع ''کہ درمقامِ رضا باش واز قضا مگریز۔''

سید ہاشمی فرید آبادی صاحبزادہ موصوف کے حقیقی بھانجے نے کیا عمدہ تاریخ رحلت کہی ہے:

از تخمۂ علائی و از دودۂ امیں — آں زبدۂ نیاگاں وآں نخبۂ پسیں
آں زین بزمِ دانش ومسندنشینِ فضل — آموز گار فقہ و امامِ محدثین
دربرد ثار زہد و بہ سرتاجِ اتقا — دل ازغرض تہی وبہ طاعت فروجبیں
آخوند عہد و واقدی و روزگار — علامی زمانہ و خاقانی زمین
آسود زیرِخاک و سرِ لوحِ ہاشمی

سالِ وفات یافت مرزاضمیر دین[۱۳۶۳ھ]

[حمیدہ سلطانہ،نومبر۱۹۴۳ء]

والدہ،مولانا سعید احمد اکبرآبادی

والدہ،مولانا سعید احمد اکبرآبادی

قارئین برہان کو یہ معلوم ہوکر صدمہ ہوگا کہ ۲۴رنومبر کو برادر عزیز مولانا سعید احمد ایم۔اے کی والدۂ ماجدہ کا سانحۂ ارتحال پیش آ گیا، بڑھاپے کے باوجود ابھی ایسے آثار نہیں پائے جاتے تھے کہ مرحومہ اس قدر جلد پیام اجل کو لبیک کہنے والی ہیں۔ ۱۹رنومبر (جمعہ) کی صبح تک بالکل تندرست تھیں۔معمول کے مطابق اپنے اکلوتے بیٹے کے کمرے میں ریڈیو پر کلام پاک سننے کے لیے تشریف لائیں۔قرآن مجید کے بعد نعت سنی،نعت شریف کے بعد مزامیر کے ساتھ سلام شروع ہواتو اسی وقت اٹھ کر اندر چلی گئیں،بیٹا پکارتا رہا بوا! یہ بھی تو نعت ہی ہے اسے بھی سنتی جاؤ۔بولیں نہیں میاں اس کے ساتھ باجا ہے۔بس یہ آخری گفتگو تھی جو ماں بیٹے میں ہوئی،مولانا سعید احمد کالج چلے گئے۔مشکل سے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ مرحومہ کے جسم کے بائیں حصہ پر فالج کا نہایت خوفناک حملہ ہوا۔اسی وقت بے ہوشی طاری ہوگئی،مکمل بے ہوشی کی یہ کیفیت آخر وقت تک قائم رہی،یہاں تک کہ چھٹے روز ۲۴رنومبر (چہارشنبہ) کی صبح کو تقریباً ۴ بجے روح جسمِ خاکی سے پرواز کرگئی۔ اناالله وانا الیه راجعون۔

ان پانچ دنوں میں معالجہ کی بہتر سے بہتر تدبیریں کی گئیں لیکن ساعتِ معین آ پہنچی تھی کوئی علاج کامیاب نہیں ہوا اور بالآخر ”بوا“ ہم سب سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئیں۔

”بوا“ آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے اوصاف ان کے چھوٹوں کو ہمیشہ یاد رہیں گے،وہ اول درجہ کی کریم النفس، بااخلاق مرنجان ومرنج خاتون تھیں، عابدہ، معتکفہ، زہدواتقا کا پیکر، خاشعات، متصدقات، صائمات، حافظات، ذاکرات کی پہلی صف میں بیٹھنے والیں، جودوسخا اورشفقت ومودت کا بے مثل نمونہ،اکلوتے بیٹے کی شادی اس وقت تک نہیں کی جب تک اپنے ساتھ لے جا کراس کو حج نہیں کرالیا،بیٹا ہونے پرمنت بھی مانی تو کیسی انوکھی۔”الٰہ العالمین تونے مجھے بیٹا دیا ہے جب تک اس کو حج نہیں کروالوں گی اس کی شادی نہیں کروں گی۔“ رحمها الله رحمةً واسعةً۔

ناظرین سے دعائے مغفرت کی استدعائے خصوصی ہے کہ ان کے محترم اور محبوب مدیر کی والدہ کا ان پر بہرحال کچھ حق ہے۔ [دسمبر۱۹۴۳ء]

سملکی،حاجی موسیٰ میاں

حاجی موسیٰ میاں سملکی

سملک ڈابھیل کی ایک اطلاع سے یہ معلوم ہوکر افسوس ہوا کہ جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) کے مشہور ومعروف صاحبِ خیر بزرگ جناب محترم حاجی موسیٰ میاں صاحب سملکی کی وفات ہوگئی۔مرحوم ہمارے محبِ قدیم جناب مولانا الحاج محمد موسیٰ صاحب سملکی کے والد بزرگوار تھے۔ بہت بڑے صاحبِ ثروت ہونے کے باوجود اول درجہ کے مسلمان،صورت وسیرت میں پہلے بزرگوں کا نمونہ، بڑے باحوصلہ،بڑے صاحبِ خیر تھے،علمی اور مذہبی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ڈابھیل کے عربی مدرسہ کو برسوں تک ایک ہزار روپیہ ماہانہ دیتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالطلبہ کے بہت سے کمرے سب سے پہلے انھوں نے تعمیر کرائے تھے۔حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انورشاہ صاحبؒ کے علوم کی خدمت کے لیے مجلس علمی ڈابھیل کی بنیاد آپ ہی کی توجہ سے پڑی جو آج بھی ایک مفید عربی تالیفی ادارے کی حیثیت سے بہت اچھا کام کررہی ہے۔ دعا ہے حق تعالیٰ مرحوم کو اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔ ہم اس صدمہ میں مرحوم کے جانشین صادق مولانا الحاج محمد موسیٰ میاں اور ان کے متعلقین کے ساتھ شریک ہیں اور یقین ہے کہ موصوف اپنے والدِ ماجد کی روایات کو ہمیشہ زندہ وتازہ رکھیں گے۔ [مارچ ۱۹۴۴ء]

کاندھلوی،مولانا محمد الیاس

مولانا محمد الیاس کاندھلوی

وادریغا! مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے چند ماہ کی شدید علالت کے بعد ۱۲/ جولائی بروز پنج شنبہ داعی اجل کو لبیک کہا اوراس جہانِ آب وگل کو خیرباد کہہ کر اپنے ”رفیق اعلیٰ“ سے جاملے۔مولانا کی عمر ابھی ایسی کچھ زیادہ نہ تھی۔لیکن تبلیغ کے کام میں انہاک کے باعث آپ نے اس مقدس اورضروری فریضۂ اسلام کے علاوہ ہر چیز کو قطعاً فراموش کررکھا تھا۔یہاں تک کہ سینکڑوں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مرض الموت میں بھی جب کہ آپ پر عالمِ سکرات طاری تھا اورضعف ونقاہت اورمرض کے پے بہ پے حملوں کے باعث آپ کا جسم ناتواں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوکر رہ گیا تھا۔جو کوئی شخص آپ کی مزاج پرسی کرتا اورمرض کی کیفیت دریافت کرتا آپ اس پر خفگی کا اظہار کرتے اور فرماتے تھے ”میرا

مرض تم لوگ ہو جو تبلیغ کے فرض سے غافل ہو، بس اس کے سوا مجھے کوئی اور بیماری نہیں۔''

آپ درحقیقت فنافی التبلیغ تھے۔ ہر آن اسی کی دھن تھی۔ یہی ایک خیال اور یہی ایک جذبہ تھا جو سیماب کی طرح ان کو بے چین اور متحرک رکھتا تھا۔ عمل اور اخلاص کا حقیقی پیکر تھے۔ دل خشیتِ ربانی سے معمور تھا۔ تقریر اگرچہ رسمی فصاحت و بلاغت سے عاری تھی۔ مگر غایت اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے ایک ایک لفظ جو دل سے نکلتا تھا سننے والوں پر تیر وسنان کا کام کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی پوری زندگی اتباع سنت کا کامل نمونہ تھی۔ مولانا مرحوم کی ان صفات کا ہی یہ اثر تھا کہ آپ نے چند سالوں میں ہی اصلاح وتبلیغ کے میدان میں وہ کچھ کر دکھایا جو سالہا سال میں بڑی بڑی جماعتیں بھی نہیں کر سکتیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں مولانا کے مراتب ومدارج بیش از بیش بڑھائے اور آپ اپنے پیچھے جو کام چھوڑ گئے ہیں، آپ کے جانشین مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کے اعوان ورفقاء ان کاموں کو باحسن وجوہ قائم وبرقرار رکھ سکیں۔ رحمه الله رحمةً واسعةً وتغمده بالطافه الخاصة۔ [اگست ۱۹۴۴ء]

سندھی، مولانا عبیداللہ

مولانا عبیداللہ سندھی

واحسرتا! ابھی برہان کے صفحات پر مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کے ماتم میں ہمارے قلم کے آنسو خشک بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ ۲۴/اگست کی صبح کو اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہماری بزم علم وعمل کا ایک اور صدر نشین ہماری محفل سے رخصت ہو گیا۔ یعنی مولانا عبیداللہ سندھی نے چند روز کی علالت کے بعد پنجاب کے ایک مقام دینپور ریاست بھاولپور میں ۲۳/اگست کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم ۱۰/مارچ ۱۸۷۳ء کو پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ایک سکھ گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں خود اپنے غور وخوض اور تحقیق وتلاش کے بعد اسلام قبول کیا۔ پچیس سال کی عمر میں علمِ دین کی طلب کا شوق انھیں کشاں کشاں دیوبند لے آیا۔ جہاں آپ نے چھ سات سال قیام کر کے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور اس سے فارغ ہو کر سندھ چلے گئے۔ یہاں کئی سال تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔ ایک مدت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو پھر دیوبند بلا بھیجا۔ جہاں وہ اپنے شفیق استاذ کی نگرانی میں مختلف اہم اور ضروری کام انجام دیتے رہے۔ اس سلسلہ میں آپ حضرت الاستاذ کے حکم سے ۱۹۱۵ء میں کابل گئے اور یہاں افغانستان کے انقلاب میں براہِ راست حصہ لیا۔ سات سال تک اس ملک میں قیام فرمانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں آپ ماسکو آئے جہاں انقلاب کے ہاتھوں ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ زار کا روس ختم ہو چکا تھا اور لینن کے فیض دم سے سوویٹ روس کے خاکی پتلے میں جان پڑ رہی تھی۔ مولانا مرحوم نے ان تمام حالات کا جائزہ بڑے غور وخوض سے لیا اور پھر ایک سال قیام کرنے کے بعد آپ ٹرکی تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یہاں خلافت کے نسخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اسلامی قوانین کے بجائے سوئٹزرلینڈ کا قانون نافذ کیا جا رہا تھا۔ شیخ اسلام کو ترکی سے رخصت کر دیا گیا تھا۔ عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو رائج کیا جا رہا تھا۔ غرض ہر پرانا نقش ایک ایک کر کے مٹایا جا رہا تھا اور نوجوان ٹرکی کے نقشہ میں نئے نئے رنگ ابھر رہے تھے۔ مولانا نے تین ساڑھے تین سال تک یہاں مقیم رہ کر ان تمام عوامل ومحرکات کا بغور مطالعہ کیا جو ٹرکی میں اس عظیم الشان انقلاب کا سبب تھے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ مولانا کے دماغ پر اس مطالعہ کا اثر اخیر تک بہت گہرا رہا۔

ساڑھے تین سال کے قیام کے بعد آپ ٹرکی سے حجاز آئے۔ جہاں آپ نے بارہ تیرہ سال قیام کیا۔ لیکن اس مدت میں سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو کر ہمہ تن درس وتدریس اور مطالعہ وتحقیق میں مصروف رہے۔ یہاں اسلام کے مرکز میں یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر مولانا نے اپنے مطالعۂ تحقیق وتفتیش اور طویل تجربات ومشاہدات کی روشنی میں خاص ہندوستانی مسلمانوں کے استخلاص کے لیے ایک منظّم لائحہ عمل مرتب کیا اور آخر کار حکومتِ ہند کے شرائط کو قبول کر کے آپ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان تشریف لے آئے۔

دنیا میں بڑی شخصیتیں ہمیشہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بعض تو وہ ہوتے ہیں جو صرف دل کی اچھائیوں کے مالک ہوتے ہیں اور بعضوں میں دماغ کی خوبیاں تو سب جمع ہوتی ہیں لیکن دل کی خوبیوں سے ان کو کوئی حصہ نہیں ملا ہوتا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو بیک وقت دل اور دماغ دونوں کے قویٰ اور ملکات کے لحاظ سے ایک عظیم شخصیت کے مالک ہوں۔ مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اسی تیسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک طرف وہ علوم دینیہ واسلامیہ کے بڑے عالم اور سیاسیات کے بلند پایہ مفکر تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ کی کتابوں پر عبور تام حاصل تھا۔ انداز فکر تقلیدی کے بجائے سراسر اجتہادی تھا۔ اور دوسری جانب وہ

اللہ کے راستہ کے ایک ایسے سپاہی تھے جس نے زندگی کا لمحہ لمحہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کررکھا تھا۔ایک جذبہ تھا جو ہر آن انھیں بے چین رکھتا تھا۔ایک تڑپ تھی جوان میں ۷۰ سے زیادہ کی عمر میں بھی بچوں کی طرح ہروقت رواں اور متحرک رہتی تھی۔عمدہ کھانا پینا، خواب وراحت ،شہرت و وجاہت ،عشرت وآسائش ، یہ تمام چیزیں ایسی تھیں کہ مولانا کے حاشیۂ تصور میں بھی ان کا کہیں دھندلا سا نقش نہیں ہوگا۔وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنا ایک مخصوص پیغام رکھتے تھے جوان کے عمر بھر کے غور وفکر اور عمیق مشاہدات وتجربات کا حاصل تھا.....مولانا ہمارے قافلہ کے ایک ایسے میرِ کارواں تھے جو بڑھاپے میں نوجوانوں سے زیادہ جوش وخروش، چستی اور سرگرمی رکھتا تھا اور منزل مقصود کی طرف جس کے شوق جادہ پیمائی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وہ راستہ کے نشیب وفراز کی ذرا پروا نہ کرتا اور جس راہ کو حق سمجھتا اس پر اس تیز گامی سے چلتا تھا کہ قافلہ کے اچھے اچھے باہمت لوگوں کا شوق پیروی بھی ان کے عذر آبلہ پائی سے عہدہ بر آ نہیں ہوسکتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی تمام تر جہد ومشقت، ریاضت و محنت اور مجاہدانہ سعی وکوشش میں بسر ہوئی لیکن اس کے باوجود اس کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی تعداد ہمیشہ محدود رہی۔بہرحال حضرت شیخ الہندؒ کے فیضِ صحبت نے مولانا کے دل میں یقین کامل کی جو شمع روشن کردی تھی وہ آخر دم واپسیں تک پوری آب وتاب کے ساتھ منور رہی۔

اچھا !اے جانے والے جا! تجھ پہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی طرف سے ہزار در ہزار سلام ورحمت،تو نے اپنا سب کچھ قربان کرکے عمر بھر اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کی۔اب یوم الدین کا مالک تجھ کو اپنی بیش از بیش رحمتوں سے نوازے اور اپنے دامان مغفرت میں چھپالے۔آمین۔

[ستمبر۱۹۴۴ء]

حسین،مولانا سید اصغر

مولانا سید اصغر حسین

صد حیف کہ آسمانِ علم وعمل اور فلکِ شریعت وطریقت کا ایک اور کوکبِ درخشندہ ٹوٹ گیا یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ المعروف بہ میاں صاحب نے ۸/جنوری ۴۵ء کو بمقام راندیر ضلع سورت انتقال فرمایا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت میاں صاحبؒ ان بزرگوں میں سے تھے جن کو بے تامل مادرزاد ولی کہا جاسکتا ہے۔علوم ظاہر وباطن دونوں کے جامع تھے۔دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی، آپ کا شمار حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھا۔دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف مقامات میں بسلسلۂ تعلیم وتدریس مقیم رہے۔ان مقامات میں جونپور کو اس لحاظ سے خاص امتیاز حاصل ہے کہ حضرت مرحوم کا قیام وہاں قدرے ممتد رہا اور وہاں کے مسلمانوں نے آپ کے وجود سے بہت کچھ فیضِ ظاہری وباطنی حاصل کیا۔

اب سالہا سال سے دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے استاذ اعلیٰ تھے۔تفسیر کی بھی بعض اونچی کتابیں (تفسیر ابن کثیر وغیرہ) آپ کے درس میں رہتی تھیں، حدیث کی مشکل ترین کتاب سننِ ابوداؤد ہمیشہ آپ ہی کے یہاں رہتی تھی اور حق یہ ہے اس اہم کتاب کی عقدہ کشائی آپ جس فنی حذاقت سے فرمایا کرتے تھے وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔حدیث کے علاوہ فقہ میں خصوصاً اور دوسرے علوم دینیہ و الٰہیہ میں استعداد پختہ اور نظر وسیع رکھتے تھے۔درس میں بولتے کم تھے مگر جو بات فرماتے تھے نہایت جچی تلی اور ٹھوس ہوتی تھی۔حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ اپنے حلقۂ درس میں آپ کی ذہانت وفطانت کی داد دیا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے میاں صاحب ''فقیہ النفس'' ہیں۔علاوہ بریں آپ اردو زبان میں تصنیف وتالیف کا شگفتہ اور سلجھا ہوا مذاق بھی رکھتے تھے۔'القاسم' اور 'الرشید' کے دورِ قدیم میں دونوں میں علمی ودینی مباحث پر مضامین لکھتے تھے۔ان کے علاوہ چھوٹی بڑی متعدد کتابیں اور مستقل رسالے بھی تصنیف کیے ہیں جو چھپ کر ملک میں شائع اور مقبول ہو چکے ہیں۔

لیکن ان سب چیزوں کو حضرتِ مرحوم کے اوصاف وکمالات میں دوسرے نمبر پر رکھنا چاہیے۔آپ کا اصل جوہر کمال اور حقیقی طغرائے امتیاز وہ عالمِ جذب وسلوک اور کیفیتِ استغراق ومحویت ہے جو ہر آن اور ہر لمحہ آپ پر طاری رہتی تھی، آپ کی ہر ہر ادا اور ایک ایک حرکت وسکون ،اس بات کی صاف شہادت دیتے تھے کہ روئے خطاب وسخن اہلِ دنیا کی طرف ہے لیکن جہاں تک دل اور روح کا تعلق ہے وہ جمالِ حدیث کی بارگاہ میں سجدۂ عبودیت بجالانے سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل ومتساہل نہیں ہے۔بات بات میں سرچشمۂ طریقت ومعرفت ابلتا ہوا نظر آتا تھا، آنکھیں ہردم نورِ حقیقت کی فیض گستری پیہم سے مخمور وسرشار اور چہرہ ہر گھڑی جمالِ ربوبیت کی جلوہ پاشیوں سے بشاش وشاداب نظر آتا تھا جو ایک مرتبہ حضرتِ مرحوم کو دیکھ لیتا بے ساختہ خدا کو یاد کر بیٹھتا تھا۔حضرتِ مرحوم کا ذکر و فکر، خیال وتصور جو کچھ تھا اس کا مرکز ومحور ایک اور صرف ایک تھا یعنی لاالــہ الا

اللہ محمد رسولُ اللہ۔

پھر جتنے بڑے عالم، صاحبِ باطن اور ولی کامل تھے فیض بھی اسی کے مطابق تھا۔ ان کا آستانہ مرجعِ انام تھا، خاص و عام طرح طرح کی حاجتیں اور مرادیں لے کے آتے تھے اور جھولیاں بھر بھر کے جاتے تھے۔ امیر و غریب شاہ و گدا نیک و بد، سب حضرت کی نظر میں یکساں مرتبہ و مقام رکھتے تھے۔ درِ فیض و عطا وا تھا تو سب کے لیے اور اگر مخصوص اوقات میں وہ بند ہوتا تو سب کے لیے ہوتا۔ تمام ہندوستان اور ہندوستان سے باہر افریقہ، برما اور جزائر شرق الہند وغیرہ میں بھی کثرت سے معتقدین و مریدین تھے۔

ہم لوگوں سے انتہائی ذاتی تعلق رکھنے کے علاوہ ندوۃ المصنفین اور برہان سے بڑی دلچسپی لیتے تھے، رسالے کا ایک ایک مضمون پڑھتے تھے، علی الخصوص برادر عزیز مولانا سعید احمد کی تحریروں اور ان کے اندازِ نگارش کے بڑے مداح اور قدر دان تھے۔ برہان کا چندہ جب ارسال فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی لکھتے کہ یہ برہان کا چندہ نہیں ہے بلکہ عزیزی مولوی سعید احمد سلمہ کے مضامین کی رونمائی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ سال سے معدہ و جگر کے شدید امراض میں مبتلا تھے۔ شمع بجھنے کے قریب ہوتی ہے تو اس کی لَو زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بزمِ عرفان و سلوک کا یہ چراغِ روشن گُل ہونے کے نزدیک آ گیا تو اس کے روحانی و باطنی فیوض و برکات کے انوار بھی زیادہ روشن اور تیز ہو گئے۔ ایسی شدید علالت میں مریدین و معتقدین کے اصرار پر دور دراز کے سفر کرتے تھے اور اگرچہ مرض میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا تھا، اس کے باوجود چہرہ پر ہر آن اطمینان و بشاشت کے ہی آثار پائے جاتے تھے۔ اسی عالم میں راندیر تشریف لے گئے اور آخر وہیں بحالت غربت و مسافرت اس عالمِ فانی کو الوداع کہہ کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ تغمدہٗ اللہ بغفرانہ و امطر علیہ شآبیب رحمۃ الواسعۃ۔ آمین۔

ہم آئندہ کسی قریبی اشاعت میں حضرتِ مرحوم کے حالات و سوانح پر ایک مستقل مقالہ شائع کریں گے۔ [فروری ۱۹۴۵ء]

مجددی، مولانا قاری محمد اسحاق نقشبندی

موت العالِم موت العالَم

[مولانا قاری محمد اسحاق نقشبندی مجددی]

متوسلین سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ کو یہ معلوم کر کے بڑا افسوس ہوگا کہ حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب نقشبندی مجددی نے جو حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندیؒ کے جانشین اور خلیفۂ مجاز اور اس سلسلہ کے اکابر مشائخ میں سے تھے۔ ۵/جولائی ۴۵ء کو نماز ظہر کے وقت میرٹھ لال کرتی میں رحلت فرمائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حضرت مرحوم کے متوسلین سے توقع ہے کہ وہ حضرت مرحوم کی روح پر فتوح کو ایصالِ ثواب کر کے داخل حسنات ہوں گے۔ [ادارہ، جولائی ۱۹۴۵ء]

حضرت مولانا قاری محمد اسحاقؒ

گزشتہ مہینہ کے برہان میں حضرت مولانا شاہ قاری محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کی خبر شائع کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ پرچہ کی پوری کتابت ہو چکی تھی اس لیے کوئی شذرہ نہیں لکھا جا سکا۔ حضرت مرحوم دہلی کے باشندہ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولانا قاری رحیم بیگ مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کے خلیفہ تھے اور فنِ تجوید و قرأت میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ مولانا قاری محمد اسحاق صاحب نے ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی اور قرأت و تجوید کا فن بھی انھیں سے سیکھا۔ اس کے بعد علومِ دینیہ کی تحصیل کے لیے میرٹھ تشریف لے گئے۔ یہاں اُن دنوں مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ خاص شہرت رکھتا تھا۔ مولانا ناظر حسن صاحب اس کے صدر مدرس تھے اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ عثمانی بھی اسی مدرسہ میں درس دیتے تھے۔ حضرت قاری صاحبؒ نے تمام کتابیں اسی مدرسہ میں پڑھیں اور یہیں درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ آپ کی استعداد نہایت پختہ اور مضبوط تھی، خصوصاً فقہ میں بڑی دسترس اور وسیع نظر رکھتے تھے اور تفقہ کی دولت سے جو محض ایک عطیۂ خداوندی ہے پورے طور پر بہرہ اندوز تھے۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا اس وقت عالمِ شباب تھا۔ آپ جتنے بڑے عالم اور فقیہ تھے، اتنے ہی بڑے سالک راہِ طریقت اور صاحبِ معرفت بھی تھے۔ قاری صاحب حضرت مفتی صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے تو آپ کا یہ تعلق صرف علوم ظاہرہ و رسمیہ تک ہی نہیں رہا بلکہ آپ نے استاد سے علوم باطنیہ کی تحصیل بھی کی اور اس ذوق شوق اور محنت و ریاضت سے کی کہ شاگرد ہو بہو کا آئینہ بن گیا۔ حضرت مفتی صاحب دیکھنے میں بہت سیدھے سادے بھولے بھالے اور بے تکلف تھے۔ اپنے گھر کے کاموں کے علاوہ پڑوسیوں کا سودا سلف بھی بازار سے لے آتے تھے۔ کم گو تھے، حد درجہ کے مہمان

نوازاورغرباپرور تھے۔چہرہ ہروقت بشاشت اورتبسم کھیلتا رہتاتھا۔جس سے ملتے تھے تواضع اورغایت انکسار سے ملتے تھے۔تصنع اور بناوٹ کا کہیں کسی بات میں ذرادخل نہ تھا۔نہایت صابراورقانع تھے۔ ہزاروں مریدوں کاوسیع حلقہ رکھنے کے باوجودان سے کبھی کسی چیز کی توقع نہیں رکھتے تھے بلکہ جب کبھی موقع ہوتا تھا خوداپنے بعض غریب مریدوں کی مالی امداد کردیتے تھے۔ ظاہراً اس طرح بے تکلف رہتے تھے لیکن دل درحقیقت اسرارِمعرفت کا گنجینہ تھا اور روح جمالِ احدیت کی مسلسل ضیاباریوں سے سرچشمۂ تجلیات و انوار ایزدی____ ہوبہو بالکل یہی اوصاف حضرت قاری صاحب کے بھی تھے۔ان کا دستر وسیع تھا۔کھانا کھلا کرخوش ہوتے تھے۔مزاج میں بے حد فروتنی اورخاکساری تھی۔ بڑے ہنس مکھ اورخوش طبع تھے۔کم بولتے تھے مگر جب زبان کھلتی تھی تو سوائے قال اللہ اور قال الرسول کے کسی اور چیز کا ذکر بہت کم ہوتا تھا۔جس سے جوتعلق ہوتا تھااسے خواہ کچھ ہوپورے طور پرنباہتے تھے۔نہایت پابندوضع اور بزرگانہ اخلاق ومکارم کے پیکراتم تھے۔

طالب علمی سے فارغ ہوکرایک عرصہ تک میرٹھ میں درس دیتے رہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اورمولانا محمد علی نامی پروفیسرالہٰ آباد یونیورسٹی۔ ہندوستان کے مشہور قاری مولانا ابومحمد محی الاسلام صاحب پانی پتی ایسے حضرات نے آپ سے علوم دینیہ اور تجوید کا فیض حاصل کیا۔لیکن آپ کے روحانی کمالات کا سوائے خاص لوگوں کے کسی کوعلم نہ تھے۔۱۹۲۸ء میں حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال کے بعد لوگوں کوحضرت قاری صاحب کے خلیفۂ مجاز ہونے کاعلم ہوا توحضرت مفتی صاحب کے متعدد مریدوں نے جن میں بعض مشہور علماء شامل ہیں،حضرت قاری صاحب سے رجوع کیا اوراب آپ دہلی میں مستقلاً قیام فرما کر فیوض باطنی وروحانی سے مستفیدفرمانے لگے۔سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ سے وابستہ ہونے کے باعث ہرسال حضرت مجدد صاحب کے مزار پرمع ایک جماعت کثیر کے سرہندتشریف لے جاتے تھے اورکئی دن وہاں قیام کرتے تھے۔چنانچہ اس سال بھی عرصۂ دراز کی علالت اورضعف و نقاہت کے باوجود آپ۴/ جولائی کوسرہندتشریف لے گئے۔واپسی میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی یہاں تک میرٹھ میں ہی آپ اترگئے اوروہیں چندگھنٹوں کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کردی۔رحمه الله رحمة واسعةواعلیٰ مقامه فی الجنان۔

عمر تقریبا۸۴ سال کی پائی۔دوصاحبزادے جناب قاری محمد یوسف صاحب (دہلی آل انڈیا ریڈیو کے مستقل قاری)اورقاری محمد یعقوب صاحب بطور اپنی مادی یادگار کے چھوڑے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان دونوں کو صبرجمیل عطافرمائے کہ ان کے اس غم جانکاہ میں حضرت قاری صاحب کے اوربھی سینکڑوں مرید،شاگرداورعقیدت مندشریک ہیں۔ [اگست ۱۹۴۵ء]

منصور،مولانا محمد میاں

مولانا محمد میاں منصور

افسوس ہے پچھلے چندمہینوں میں اسلامی ہند کی بعض نامورشخصیتوں نے جو علم وادب اور دین وسیاست کے مختلف اعتبارات سے اپنا اپنا ایک نمایاں مقام رکھتی تھیں،اس جہانِ فانی کو وداع کہہ کر عالمِ جاودانی کی راہ لی۔اس سلسلہ میں سب سے پہلے سانحۂ ارتحال مولانا محمد میاں منصور کا پیش آیا۔مولانا مرحوم ہمارے لائق اورعزیز دوست مولانا حامد الانصاری غازی اڈیٹر' مدینہ' کے والد ماجد اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم فرزندمعنوی تھے۔حضرت شیخ الہندؒ کے فیضان صحبت نے جن چندخوش نصیبوں کے مس خام کو چمکا کرکندن بنادیا تھامولانا مرحوم بھی انھیں میں سے ایک تھے۔چنانچہ وہ حضرت شیخ الہند کے مشن پرافغانستان گئے اور اتحادِ اسلامی کی تحریک کے سلسلہ میں وہاں رہ کرانقلابی قسم کے مختلف کام کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ان کے لیے خودان کے وطن عزیز کی سرزمین ارضِ ممنوعہ قرار دے دی گئی اوردوسری جانب دشمنوں کی دسیسہ کاریوں نے دارالہجرت (افغانستان) میں بھی ان کوچین سے نہ بیٹھنے دیا۔لیکن باایں ہمہ وہ تحریر وتقریر تصنیف وتالیف اورعملی جدوجہد کے ذریعہ مسلمانوں کو اسلامی انقلاب کی دعوت دے کرحضرت شیخ الہندؒ کے ''خوابِ پریشاں'' کی تفسیر وتعبیر سناتے رہے اورآخر کارعرصۂ طویل کی جلا وطنی کے بعد جان جان آفرین کے سپرد کرکے راہی ملک بقا ہوگئے ۔ ہر چندکہ ان کی وفات وطن سے بہت دورہوئی تاہم افغانستان اسلامی ملک ہونے کے باعث ان کے لیے دیارِغیر نہ تھاچنانچہ جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھااورفرمانِ شاہی کے مطابق فوجی اعزاز واکرام کے ساتھ تدفین کی رسم عمل میں آئی۔

رب السموات والارض ان کوصدیقین وشہداء کامقامِ جلیل عطافرمائے اوراپنے الطافِ خاص سے نوازے۔آمین۔ [مئی ۱۹۴۶ء]

شیرانی، پروفیسرحافظ محمود خاں

پروفیسرحافظ محمود خاں شیرانی

دوسرا حادثۂ وفات پروفیسرحافظ محمود خاں شیرانی کا ہے جوفروری کی آخری

تاریخوں میں پیش آیا۔ مرحوم فارسی اور اردو دونوں زبانوں کی شعروشاعری اور تاریخ ادب کے نامور محقق اور فاضل تھے۔ذکاوت وفطانت کے ساتھ قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔قرآن مجید کے حافظ تھے ہی۔فردوسی کا شاہنامہ بھی انھیں ازبر یادتھا۔یورپ میں ایک مدت تک رہ چکے تھے اور وہاں کے نامور مستشرقین سے روابط رکھتے تھے۔عربی اور فارسی اور اردو کی قلمی کتابوں اور مختلف قدیم اسلامی سلطنتوں کے سکوں کو جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اور وہ علمی تحقیق وجستجو کے میدان میں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے تھے۔فارسی اوراردو زبان کے شعراء کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں اوران کے مجموعہ ہائے کلام پران کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔اس کے علاوہ اسلامی تاریخ اورعلمِ عروض میں بھی بڑا درک رکھتے تھے۔۱۹۲۰ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔بیس سال تک اس خدمت پر مامور رہنے کے بعد ۴۰ء میں اس سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن ٹونک میں خانہ نشین ہوگئے۔اس مدت میں آپ نے بحیثیت نقاد ہندوستان کے علمی اورادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت پائی۔اس شہرت کا آغاز اس مقالہ سے ہوا جو''تنقید شعرالعجم'' کے نام سے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ''اردو'' میں کئی سال تک مسلسل نکلتا رہا تھا۔اور جواب اسی نام سے کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ''آب حیات'' (آزاد)''ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی''،''رباعی کے اوزان'' وغیرہ پر جوآپ کے تنقیدی مقالات اورنٹل کالج میگزین لاہور اوردوسرے رسائل میں شائع ہوچکے ہیں ان میں سے ہرایک مقالہ معلومات اورتحقیق وژرف نگاہی کے اعتبار سے فارسی اور اردو ادبیات کے طالب علم کے لیے انمول موتیوں کاایک خزانہ ہے۔مستقل تصنیفات میں''پنجاب میں اردو''،''فردوسی پرچار مقالے''،''پرتھی راج راسا''اور''خالق باری'' آپ کی قابل قدر علمی یادگاریں ہیں۔تنقید کرتے وقت مرحوم کے لب ولہجہ میں کہیں کہیں درشتی اورتلخی ضرور آجاتی تھی جوبعض مواقع پرکسی ذاتی یاطبقاتی پرخاش کی غمازی کرتی تھی، تاہم بحیثیتِ مجموعی انھوں نے اردو زبان میں فنِ تنقید کا معیار اتنااونچا کردیا ہے کہ مغرب کے اربابِ تنقید بھی اس سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

مرحوم جنھوں نے اپنی تنقید سے بڑے بڑے اربابِ تحقیق مصنفوں کا ناطقہ بند کردیا تھاخود ایک عرصہ سے ضیق النفس کے عارضہ میں مبتلا تھے۔آخر یہ مرض ان کی جان لے کرہی رہا۔حق تعالیٰ ان کواپنی رحمتوں سے نوازے اور دامانِ مغفرت میں چھپالے۔آمین۔ [مئی ۱۹۴۶ء]

منگلوری،مولانا سید طفیل احمد

مولانا سیّد طفیل احمد منگلوری

سب سے آخر میں رنج واندوہ کے گہرے جذبات کے ساتھ ہمیں اپنے مخدوم اور بزرگ مولانا سید طفیل احمدصاحب منگلوری کے حادثۂ وفات کا ماتم کرنا ہے جو۳۰/ مارچ کو پیش آیا، مولانا کی عمراس وقت تقریباً اسّی ۸۰ برس کی تھی۔ سرسید کے زمانہ میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔عربی کی استعداد معمولی تھی لیکن انگریزی اوراردو دونوں زبانوں میں بے تکلف تحریر وتقریر کی قدرت رکھتے تھے۔مطالعہ نہایت وسیع تھا۔قومی اورسیاسی مسائل میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔چھوٹے بڑے سینکڑوں مقالات اوررسائل کے علاوہ مرحوم کی ایک عظیم الشان تصنیفی یادگار''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ہے۔انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوصف صورت وسیرت اوروضع قطع کے اعتبار سے بالکل ٹھیٹ مُلّا معلوم ہوتے تھے۔مزاج میں انتہا درجہ سادگی اورانکساری تھی۔ ساری عمر مسلمانوں کے لیے نہایت ٹھوس اورتعمیری کام کرتے رہے لیکن خودنمائی اورشہرت طلبی کا کہیں آس پاس بھی گزر نہ ہوا تھا۔اخلاق وعادات کے لحاظ سے اسلامی شرافت ونیک نفسی کے پیکر تھے۔حقیقت یہ ہے کہ اس اخلاق کے بزرگ ہماری نظروں سے بہت کم گزرے ہیں۔ایک زمانہ میں جوازِ سود کے قائل تھے لیکن بعدمیں اس سے رجوع کرکے علمائے حق کے ہی ساتھی ہوگئے تھے۔ایک عرصہ سے چند درچند امراض کا شکار تھے لیکن اپنے فرائض وواجباتِ زندگی کو ادا کرنے میں آخردم تک جوانوں سے بھی زیادہ باہمت اورمستعد رہے۔دعاہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کوعنبریں کرے اورنعمائے جنت سے بہرہ اندوز فرمائے۔ آمین۔ [مئی ۱۹۴۶ء]

عبدالسمیع،مولانا

مولانا عبدالسمیع

گزشتہ ماہ کاالم ناک سانحہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم تر استاذ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کی وفات ہے۔مولانا مرحوم کئی ماہ سے علالت کے امتداد واشتداد کی تکلیفیں اٹھارہے تھے، بالآخر۱۰/صفرالمظفر کو ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔

مرحوم حضرت مولانا میاں سید اصغرحسین صاحبؒ کے مخصوص ہم سبقوں میں تھے اور بزرگوں کی خوبیوں اورخصوصیتوں کے جامع، بڑے باوضع، بڑے

سادہ مزاج اور دارالعلوم کے اساتذہ میں بعض اوصاف کے لحاظ سے بے عدیل و بے مثیل۔ پیرانہ سالی اور غیر معمولی نقاہت کے باوجود جب درس دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کوئی تازہ دم اور بلند آواز مدرس پورے شوق و انہماک کے ساتھ طلبہ سے مصروف تخاطب ہے۔ مولانا کا طرزِ تعلیم عام فہم بھی تھا اور دل پذیر بھی، پڑھاتے پڑھاتے بہت سی کتابوں کے حافظ ہوگئے تھے۔ اُن کے تلامذہ میں آج بڑے بڑے مدرس بھی ہیں اور باکمال مصنف اور انشاء پرداز بھی۔ ندوۃ المصنفین کے تقریباً تمام بڑے بڑے رفقاء کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے مراتب بلند فرمائے۔ ہمیں اس حادثۂ عظیم میں مولانا مرحوم کے اکلوتے صاحبزادے مولوی عبدالاحد صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سے دلی ہمدردی ہے اور ہم اُن کے شریک غم ہیں۔ امید ہے مولوی صاحب موصوف اپنے والد کے صحیح قائم مقام ثابت ہوں گے۔ [فروری ۱۹۴۷ء]

پھلواروی، سید شاہ محمد محی الدین

سید شاہ محمد محی الدین پھلواروی

افسوس ہے پچھلے مہینہ اپریل کی ۲۲/ تاریخ کو صوبۂ بہار کے امیر شریعت اور پھلواری شریف کی خانقاہِ مجیبیہ کے سجادہ نشین مولانا الحاج السید شاہ محمد محی الدین صاحب نے صبح کے وقت تقریباً آٹھ بجے وفات پائی۔ مولانا علم و عمل، تقوی وطہارت اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ آپ کا روحانی اور اخلاقی فیض واثر بہت وسیع تھا اور آپ کی ذات لاکھوں مسلمانوں کی عقیدت وارادت کا مرکز تھی۔ اب جبکہ وقت آرہا تھا کہ امارتِ شریعت کا ادارہ سیاسی محکومیت کی بندشوں سے آزاد ہوکر اپنے فرائض وواجبات صحیح طور پر انجام دے سکے۔ آپ ایسے بزرگ کا رحلت کرجانا مسلمانوں کے لیے جس قدر بھی افسوس اور رنج والم کا باعث ہوکم ہے۔ بہرحال مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا مجالِ دم زدن ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو جنت الفردوس میں مقامِ جلیل عطا فرمائے اور بیش از پیش نعمتوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

اسی شمارہ میں مولانا مرحوم کے حالات وسوانح پر ایک مختصر مقالہ بھی شریکِ اشاعت ہے۔ [مئی ۱۹۴۷ء]

دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

اس مہینہ کا ایک ادبی حادثہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کی وفات ہے۔ مرزا صاحب مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کے شاگرد تھے لیکن حق یہ ہے کہ زبان کی شگفتگی، انداز بیان کی دلکشی اور عبارت کی چستی و حلاوت میں شاگرد استاد سے سبقت لے گیا تھا۔ اب ملک میں جس قسم کے ادیب پیدا ہورہے ہیں اس کے پیش نظر توقع نہیں کہ کوئی آئندہ ''دلی کا آخری مشاعرہ'' یا ''پھول والوں کی سیر'' کی پرانی داستانیں اس کمال سحرکاری کے ساتھ سُنا سکے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق ارزاں ہو۔

[مئی ۱۹۴۷ء]

گاندھی جی

آہ! لعل شب چراغ ہند

[گاندھی جی]

گزشتہ چند ماہ میں وہ کون سی قیامت تھی جو ہمارے سر پر نہیں ٹوٹی اور مصیبت وادبار کی ایسی کون سی قسم تھی جو ہندوستان (۱۵/ اگست سے پہلے کے ہندوستان) پر نہیں آئی۔ انسانیت کی دھول اُڑی، مذہب واخلاق کے قصر رفیع کی اینٹ سے اینٹ بجی، جوہر آدمیت وشرافت کی عبائے زرنگار کا ایک ایک تار بکھر گیا، امن وعافیت کی کتاب کا ورق ورق منتشر ہوا اور آسائش حیات وعزت نفس کی دھجیاں بہیمیت و درندگی کی فضائے تاریک میں پراگندہ ہوکر رہ گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے پر بھی شاید پیر فلک کے ذوق ستم وایذا رسانی کی تسکین اور اس کے حوصلۂ بیداد کی تشفی نہ ہوسکی کہ اس نے ہندستان کی کلاہِ افتخار کا وہ کوہ نور ہیرا اور خستہ حال انسانیت کی قبائے ناموس کا وہ تکمۂ زریں بھی توڑ لیا جو خودغرضی ونفس پرستی کی موجودہ متعفن دنیا میں ہندستان اور انسانیت دونوں کی امیدوں اور تمناؤں کا آخری سہارا اور ان کی عظمت رفتہ کی آرزوے بازیافت کا واحد آسرا تھا۔

وزدیست چرخ نقب زن اندرسرائے غم — آرے بہرزہ قامت اوخم نیامدہ است
آسودگی مجوکہ کسے رابزیر چرخ — اسباب ایں مرادفراہم نیامدہ است
درجامۂ کبود فلک بین وبس بداں — کیں چرخ جز سراچۂ ماتم نیامدہ است

وادریغا کہ وہ عدم تشدد کا دیوتا جس نے سخت سے سخت اشتعال کی حالت میں بھی کبھی اپنے دشمن پر انگلی نہیں اٹھائی۔ امن وعافیت کا وہ منادو داعی جس نے شدید سے شدید غیظ وغضب کے موقع پر بھی اپنے مخالف کے لیے کوئی دل آزار کلمہ زبان سے نہیں نکالا، وہ انسانیت کا علم بردارِ حقیقی جو تعصب وتنگ نظری کے

جذبات کی فراوانی کے عالم میں بھی ایک کوہِ استقامت اورصبر وتحمل کی چٹان بنا اپنے مقام پر کھڑا رہا، مذہب واخلاق کا وہ پیکر زریں جس نے حیوانیت ودرندگی کے بحرانِ عظیم میں بھی اپنے قدم کو ایک لمحہ کے لیے جادۂ مستقیم سے متزلزل نہیں ہونے دیااورحق وصداقت کا وہ سچا پجاری جوکذب وافترا اور دروغ وباطل کی بلا انگیز موجوں میں بھی صحتِ فکروعمل اورراست گفتاری وراست کرداری کی کشتی کو طوفان زدگی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا آہ! صدآہ کہ ۳۰ جنوری ۴۸ء کی شام کو خود اس کے ایک ہم وطن وہم ملک نے اس کی زندگی کا چراغ گل کردیا اوراس کے نحیف ونزار جسم کواپنی گولی کا نشانہ بنا کر ہندوستان کی پیشانی پرایک ایسا بدنما داغ لگادیا جوکبھی مٹائے نہ مٹے گا۔

گاندھی جی نسلاً ہندستانی اور مذہباً ہندو تھے۔لیکن وہ انسانیتِ عامہ کا اتنا بلند اوراعلیٰ تصور رکھتے تھے کہ دنیا میں اگرکسی انسان کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا تو اس کی چبھک اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔زمین کے کسی گوشہ میں بھی کسی پرظلم ہوتا تو وہ اس کی تڑپ سے خود بے چین ہوجاتے تھے۔ان کے اعتقاد میں رنگ ونسل ،مذہب ومشرب اورفکر وخیال کا اختلاف محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔انسانیت عامہ اور عالمگیر اخوت وبرادری کا رشتہ ان کے نزدیک سب سے مقدم تھا۔وہ ہرانسان کودوسرے انسان کا بھائی یقین کرتے اوراس کے ساتھ وہی معاملہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔عدم تشدد اورسچائی جس کا حاصل یہ ہے کہ خود اپنے ساتھ انصاف کرو اوردوسروں کے ساتھ انصاف کرو، ان کے تمام افکار و اعمال کی اساس وبنیاد تھے۔انہوں نے نصف صدی کے قریب ہندستان کوغلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے ان تھک جدوجہد کی اورآخرکار اس میں کامیاب ہوکر رہے لیکن ان کی یہ جدوجہد قومیت کے تنگ نظرانہ تصور پر ہرگز مبنی نہیں تھی اوران کا مطالبۂ آزادی اس لیے نہیں تھا کہ وہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے انگریزوں سے نفرت رکھتے اوران کواپنا دشمن سمجھتے تھے،نہیں بلکہ جیسا کہ انہوں نے بار بار کہا ہے اوراسے اپنے عمل سے ثابت بھی کردکھایا، وہ انگریزوں کے بھی ایسے ہی دوست اور خیرخواہ تھے جیسے کہ وہ اپنے یااپنوں کے تھے اوران کا مطالبۂ آزادی صرف اس لیے تھا کہ وہ اس کوہندوستان کا طبعی اورقدرتی حق سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اتنا بڑا وسیع اورزرخیز ملک اس طرح آزاد ہوگیا کہ قوتِ حاکمہ کے کسی فرد کی ناک سے نکسیر بھی نہیں پھوٹی ۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گاندھی جی کا یہ کارنامہ اس درجہ حیرت انگیز اورعظیم الشان کارنامہ ہے کہ آئندہ نسلیں تاریخ میں اس کو پڑھیں گی اور گاندھی جی کی عظمتِ فکروعمل کا اعتراف کریں گی۔

گاندھی جی اگرچہ ایک خاص ملک کی پیداوار تھے اورایک خاص مذہب سے متعلق سمجھے جاتے تھے لیکن انہوں نے اپنے ''سچائی'' کے اصول پرشدت کے ساتھ عامل ہونے کی وجہ سے کسی حقیقت کومحض تقلیداً اور دوسروں کی پیروی میں کبھی قبول نہیں کیا، وہ دل ودماغ کی پوری وسعتوں کے ساتھ حق وصداقت کی تلاش وجستجو میں ہمیشہ سرگرداں رہے اور جہاں کہیں ان کوکسی گوہرِ گراں مایہ کا سراغ ملا اس کوکسی کی ملامت وتردید کے خوف کے بغیر فوراً حفاظت واحتیاط کے ساتھ چن لیا۔اس بناپران کی شخصیت مذہب وفلسفۂ اخلاق کی مختلف صداقتوں اورسچائیوں کا ایک حسین ولطیف مجموعہ بن گئی تھی اوران کو ہرشخص اپنے سے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔ہندوؤں کوان میں رام چندر جی کی حق پرستی وصداقت شعاری نظر آتی تھی تو مسلمانوں کوان میں خواجہ معین الدین اجمیری اورخواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے فقرومسکنت اور درویشی وبے نفسی کا جلوہ دکھائی دیتا تھا۔ عیسائی ان کومسیحی تعلیمات کا علم بردار سمجھتے تھے تو سکھ ان میں گرونانک کے جرأت اخلاق اور بے باک صداقت کا پرتو دیکھتے تھے غرض یہ کہ وہ اپنے فکروعمل کے اعتبار سے ایک ایسے گلِ صد رنگ وسدا بہار تھے کہ جس مذہب کا پیرو بھی ان کو دیکھتا بے ساختہ پکاراٹھتا تھا:

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

پھروہ بدنصیب جن کے مذہب کی اصل اخلاقی اورتمدنی تعلیمات کا تعصب وتنگ نظری کے ہاتھوں خاکہ اڑچکا ہے وہ تو اس مجموعۂ رنگ وبواور پیکرِ اخلاق وحسنِ خوکودیکھ کردم بخود ہوجاتے اور یہ کہہ کررہ جاتے تھے کہ:

مجھے خندۂ گل پہ آتا ہے رونا کہ اس طرح ہنسنے کی خوتھی کسی کی

ان کی اس ہمہ گیرمحبوبیت اور ہردل عزیزی کا ہی یہ ثمرہ ہے کہ کتنے ہی آدمی بلااختلاف مذہب وملت حادثۂ فاجعہ کی خبر سنتے ہی شدتِ الم میں دنیا سے چل بسے اورکتنے ہی تھے جو زندگی سے بیزار ہوکر خودکشی پرآمادہ ہوگئے ۔پھرماتم بھی اس درجہ عالم گیر ہوا کہ دنیا میں آج تک کسی کا نہیں ہوا۔ہرطبقہ اور ہرفرقہ کا، ہر رنگ اور ہرنسل کا،ہرملک اور ہرقوم کا چھوٹا بڑا، عالم وجاہل، امیروغریب، مذہب پرست اورلامذہب کوئی ایسا نہیں تھا جس کے دل پراس حادثہ کوسن کر چوٹ نہ لگی ہواوراس کی آنکھیں اشک بار نہ ہوگئی ہوں لوگ فرط محبت وعقیدت میں ان کو باپو کہتے تھے اورکوئی شک نہیں کہ وہ بنی نوع انسان کے سچے ہمدرد وغم گسار ہونے کے باعث نہ صرف ہندوستان کے بلکہ کل کائنات انسانی کے باپو

تھے۔ آج وہ دنیا سے اٹھ گئے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کے سر پر سے قلبی شفقت و پریم کا ایک مقدس ہاتھ اٹھ گیا۔

اس موقع پر ہمیں یاد آیا کہ مشہور صوفی اور بزرگ حضرت مولانا جلال الدین رومی کا جنازہ جب قونیہ میں اٹھا تو جہاں مسلمان چیخیں مار مار کر رونے لگے، عیسائی اور یہودی بھی بے ساختہ اشک بار ہوگئے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو؟ عیسائیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک یہ بزرگ ہستی پیغمبر اسلام ﷺ سے شبیہ تھی تو ہمارے لیے یہ حضرت عیسیٰ تھی۔ یہودی بولے کہ ہم کو اس شخصیت میں حضرت موسیٰ کا سا تقدس اور ان کی سی خو بو نظر آتی تھی۔ واقعی سچ فرمایا ''جو خدا کا ہو گیا ساری دنیا اس کی ہوگئی۔''

ہندوستان میں اختلافِ مذہب کی وجہ سے پچھلے دنوں جو خون خرابہ ہوا اس کی نظیر تو تاریخ میں نہیں ملے گی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر جب مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی یہ مسئلہ اس زمانہ میں بھی چند در چند مشکلات کا باعث بنا ہوا تھا اور اس کے حل کرنے میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھیں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ خالص اسلامی فکر کے بالمقابل اپنی اصل قومی عصبیت کے رجحانات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے یا بالفاظ صحیح تر ہنگامی جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں اصل اسلامی احکام کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ جب سلطنت کی طرف سے اس مسئلہ کا کوئی حل پیدا نہیں ہوسکا تو مسلمانوں میں صوفیائے کرام اور ہندوؤں میں ان کے مصلحین و مفکرین کی جماعت نے وقتاً فوقتاً اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سکندر لودھی کے عہد میں بھگتی تحریک کا آغاز ہوا اور کبیر داس اور بابا نانک جیسے لوگ اس کے علم بردار ہوئے۔ پھر بعد میں اکبر نے دین الٰہی کی داغ بیل بھی اسی تحریک کے زیر اثر ڈالی لیکن ان تحریکوں کو اس لیے فروغ نہیں ہوسکا کہ انہوں نے مذہب کی انفرادیت کو برباد کر کے ایک نئی چیز پیدا کر دی جو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر خواہ کتنی ہی خوبصورت اور جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہو لیکن کوئی اپنے مذہب کا سچا پرستار اسے قبول نہیں کرسکتا تھا۔

اس راہ سے ہٹ کر گاندھی جی نے اختلافِ مذہب کی مشکل کا جو حل نکالا وہ بالکل طبعی اور فطری تھا، انہوں نے ہندو یا مسلمان، عیسائی یا سکھ کسی سے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر کے کوئی نیا مذہب اختیار کرلے۔ بلکہ ان کا بنیادی فکر یہ تھا کہ تمام مذاہب میں بنیادی صداقتیں اور سچائیاں ایک ہیں جسم اور قالب کے اعتبار سے شکلیں کتنی ہی مختلف ہوں لیکن روح سب کی ایک ہے یعنی یہ کہ وہ خدا پرستی اور نیک زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پس جب روح سب مذاہب کی ایک ہے اور انسانیت عامہ کے تصور کے پیش نظر ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے تو پھر محض اختلاف مذہب کی بنا پر آپس میں لڑنا جھگڑنا اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے۔ گاندھی جی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی رواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کے احترام کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اپنی پرارتھنا میں جس کو وہ ہر روز بڑی پابندی سے مجمع عام میں کرتے تھے، ہر مذہب کی مقدس کتاب کے ٹکڑے شامل کر لیے لیکن اپنی ہمہ گیر عظمت و شہرت کے باوجود نہ تو کوئی نیا مذہب ایجاد کیا اور نہ انہوں نے کسی مذہب کے پیرو کو اپنا مذہب ترک کرنے کی دعوت دی۔ اس کے برخلاف ان کا یہ پیغام تھا کہ ہر شخص کو اپنے مذہب کی پابندی کر کے صحیح معنی میں خدا پرست ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہر شخص واقعی طور پر خدا پرست ہو جائے تو اختلافِ مذہب کی وجہ سے جو بربادیاں آتی ہیں وہ نہ آئیں اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری، محبت اور ہمدردی کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔

گاندھی جی کی زندگی کا سب سے بڑا دشمن عدم تشدد اور سچ کی تعلیم تھا۔ دیکھنے میں یہ دو لفظ ہیں لیکن ان میں اخلاق و موعظت کے دفاتر پوشیدہ ہیں، گاندھی جی جس چیز کو عدم تشدد کہتے تھے وہ وہی ہے جس کو قرآن نے آیت ذیل میں بیان کیا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَاالَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (السجدہ:۳۴)

ایک ایسے طریقہ پر مدافعت کرو جو بہترین ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمہارا شدید دشمن بھی پکا دوست بن جائے۔

ہتھیاروں اور تشدد کے ذریعہ صرف جسم کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ مگر دل نہیں بدلے جاسکتے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی حق بات پر محض حق کے لیے قائم ہو اور وہ زبردست اخلاقی طاقت کا مظاہرہ کرے تو شدید ترین دشمن بھی رام ہو کر دل سے دوست بن جاتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کی اور ہر آسمانی مذہب کی یہی تعلیم ہے لیکن گاندھی جی نے اپنے بلند پایہ کردار، عظیم الشان ضبط نفس اور حیرت انگیز قوت عزم و عمل سے جس طرح اس حقیقت کو سچ کر دکھایا وہ مصلحین عالم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔

۹ ستمبر ۴۷ء کو وہ دہلی پہنچے تو تمام شہر قتل و غارت گری کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ حکومت اور اس کی پولیس اور فوج اس آگ پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی

لیکن گاندھی جی کے یہاں پہنچتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا آگ پر کسی نے پانی ڈال دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دلوں میں نفرت وعناد اور جذبۂ قتل و غارت گری کا جو زہر بھرا ہوا تھا وہ نہ نکلا۔ گاندھی جی نے پرارتھنا میں روزانہ تقریریں کیں، بیانات شائع کیے، پرائیوٹ مجلسوں میں افہام وتفہیم کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ دل پھر بھی نہیں بدلے تو انہوں نے حق وانصاف کے لیے جان کی بازی لگادی اور برت رکھ لیا۔ یہ برت کیا تھا! گویا ایک برق تھی جو تعصب اور تنگ نظری کے پردوں کو چاک کرگئی۔ فساد پرور عناصر کو اب اپنی موت نظر آئی تو انہوں نے گاندھی جی کو ختم کردینے کا ہی منصوبہ باندھ لیا اور ۳۰ر جنوری کی شام کو وہ اسے عمل میں بھی لے آئے۔

لیکن ہر شخص محسوس کررہا ہے کہ اس کا اثر کیا ہوا؟ تاریخوں میں پڑھا ہے کہ پہلے زمانہ میں خاص خاص دریا تھے کہ ان میں جب طوفان آتا تھا تو جب تک کسی کی بھینٹ نہیں لیتا تھا فرو نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح پاکستان اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت کا جو شدید طوفان اٹھا تھا وہ غالباً فرو ہونے کے لیے اس ملک کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کی قربانی کا ہی انتظار کررہا تھا کہ اس کے عمل میں آتے ہی یک بیک مسموم دل ودماغ پاک وصاف ہوگئے اور جو لوگ شدت جذبات میں اندھے ہوگئے تھے ان کو بھی شاہدِ حقیقت کا روشن وتابناک چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ پس گاندھی جی کے اصول عدم تشدد اور حق پرستی کی شاندار کامیابی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ دلوں میں تبدیلی پیدا کرنے کا کام جو دنیا کی بڑی سے بڑی فوج بھی نہیں کرسکتی وہ انہوں نے اپنے خون کے قطروں سے کر دکھایا اور خود جان دے کر پورے ملک کو نہایت ہولناک تباہی و بربادی سے بچالیا۔

قدرت کو یہی منظور تھا کہ گاندھی جی عام محسنین انسانیت اور معلمین اخلاق کی طرح انتہائی مظلومیت کے ساتھ جان دیں۔ بہرحال اگرچہ آج ان کا جسم ہم میں نہیں ہے لیکن ان کی آتما امر اور زندۂ جاوید ہے اور ان کے جسم سوختہ کی راکھ کا ایک ایک ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ حق کی بے لوث پیروی اور عدم تشدد میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے۔ ہندوستان کو یا کسی اور ملک کو اگر خوش حال ہونا اور ترقی کرنا ہے تو ان دو اصولوں پر کار بند ہونا ناگزیر ہے۔ اب گاندھی جی کے نام لیواؤں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا فرض ہے کہ گاندھی جی انہیں جو راستہ دکھاگئے ہیں اس پر وہ عزم وہمت اور خود اعتمادی وہوشیاری کے ساتھ اس طرح چلتے رہیں کہ فتنہ پرداز اور دشمن ملک عناصر کو پھر ابھرنے اور سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو گاندھی جی کی آتما کو سُکھ پہنچے گا اور ہم بھی امن و اطمینان سے رہ کر ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکیں گے۔ [مارچ ۱۹۴۸ء]

جناح، محمد علی [قائداعظم]

محمد علی جناح

گزشتہ مہینہ جب کہ برہان کی کاپیاں پریس میں جاچکی تھیں مسٹر محمد علی جناح کے انتقال کی افسوسناک خبر ملی۔ موصوف پاکستان کے معمار اولین اور اب اس کے قیام کے بعد اس کی ریڑھ کی ہڈی تھے اس بنا پر اہل پاکستان جتنا بھی غم اور ماتم کریں کم ہے لیکن اس سانحہ کا افسوس سب کو ہی ہوا کیونکہ اگرچہ کچھ دن اوپر ایک برس ہوا وہ ہم سے بچھڑ گئے تھے، تاہم تھے وہ معدن ہند کے ہی ایک گوہر آبدار اور ہندوستان کی شصت سالہ جدوجہد آزادی کی تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے بھی خالی نہیں ہیں۔

مرحوم کو عام طور پر ہندوؤں کا دشمن سمجھا جاتا ہے حالانکہ مسلمانوں کے قائد اعظم کا اُن پر ایک احسان ہی کیا کم ہے کہ جسے قدامت پرست ہندو خود چاہتے تھے مگر زبان سے اس کا اظہار تک نہ کرسکتے تھے وہ قائداعظم نے خود بخود کردیا یعنی ہندوستان کے آزاد ہونے کا وقت قریب آیا تو ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے کر یہ کہہ کر پورا ملک ان کے حوالہ کردیا:

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حسابِ کم وبیش را

اور یہاں کے مسلمانوں کو غیر موثر اقلیت میں تبدیل کرکے ایسا بے دست و پا بنادیا کہ اب ہندو مہاسبھا تک کو ان تہی دستان قسمت پر غصہ آنے اور ان کی طرف سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ان پر ترس آنے لگا ہے:

کھیل ہیں دورِ آسمانی کے

چنانچہ مرحوم کہا بھی کرتے تھے کہ ''ہندو مجھ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں لیکن اگر پاکستان بن گیا تو وہ ہمیشہ میرے احسان مند رہیں گے اور میرے مرنے کے بعد ان کو محسوس ہوگا میں ان کا دشمن نہیں سچا دوست تھا۔''

اس میں شبہ نہیں کہ مرحوم اپنی ذہانت وفطانت، قانونی اور پارلیمنٹری قابلیت ولیاقت، سیاسی سمجھ بوجھ، خود اعتمادی، قوت تحریر وخطابت، غیر معمولی قوت ارادی، مستقل مزاجی، حاضر جوابی، ان اوصاف وکمالات کے باعث عہد حاضر کے ایک بڑے آدمی تھے اور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ان کا دامن سرکار پرستی کے داغ سے بالکل پاک بھی رہا۔ اس حیثیت سے اس دور کا کوئی مورخ ان کی

شخصی عظمت کا منکر نہیں ہوسکتا، رہا یہ کہ ان کی سیاست اوران کی قابلیتوں کا اثر ہند کے مسلمانوں پر کیا ہوا اور خود پاکستان کے مسلمانوں کے لیے مستقبل قریب میں کیا خطرات ہیں؟ تو اب یہ وقت ان دلخراش باتوں کے ذکر کا نہیں ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا:

اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا

بہرحال ہم کو اپنے بھائیوں کے ساتھ ان کے اس حادثۂ المناک میں دلی ہمدردی ہے اوردعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں سے درگزر فرما کر ان کی مغفرت فرمائے اور پاکستان اس حادثہ کے اثرات بد سے محفوظ رہے، پھلے پھولے، ترقی کرے اوراپنے یہاں عدل وانصاف، حسن خلق وحسن عمل کو رواج دے کر اپنے اوردوسرے کے لیے رحمت ثابت ہو۔ [اکتوبر ۱۹۴۸ء]

احمد، حاجی اسرار

حاجی اسرار احمد

ندوۃ المصنفین کے حلقۂ احباب کے لیے اس ماہ المناک سانحہ حاجی اسرار احمد صاحب کی وفات ہے۔اکتوبر ۱۹۴۹ء کے آخری سفر کلکتہ میں حاجی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی تھی اورمیں ان کو اچھا خاصا تندرست چھوڑ کر آیا تھا۔ اب عزیزم مولوی سعید احمد کے خط سے اچانک ان کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔یوں تو دنیا گذشتنی اورگذاشتنی ہے۔یہاں جو آتا ہے اُسے ایک نہ ایک دن رخصت بھی ہوجانا پڑتا ہے۔آنے اورجانے کا یہ عمل جب سے دنیا قائم ہے برابر جاری ہے لیکن جانے والوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کردار، اخلاق اورعمل کی وجہ سے ایک خاص مقام کے مالک بن جاتے ہیں پھر جب وہ قانون فطرت کے مطابق سفرآخرت اختیار کرلیتے ہیں تو جو جگہ انھوں نے اپنے لیے بنائی تھی وہ خالی محسوس ہونے لگتی ہے۔یہ خلاء رخصت ہوجانے والے کی شخصیت کو یاد دلاتا رہتا ہے اوراُس کی مفارقت کا احساس لوگوں میں بڑھ جاتا ہے۔

حاجی اسرار احمد صاحب مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔مرحوم آنولہ ضلع بریلی کے باشندہ تھے۔عرصہ دراز سے کلکتہ میں تجارت کرتے تھے۔ میں چودہ سال ہوئے ان سے کلکتہ میں متعارف ہوا تھا۔اس دوران مجھے برابر اُن کے کردار اورعمل کے مطالعہ کا موقع ملتا رہا، وہ صرف اچھے تاجر ہی نہیں بلکہ اپنے دل میں ایک ایسا حساس دل بھی رکھتے تھے جس میں مذہب کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔جن کاموں کو وہ قوم کے لیے مفید سمجھتے تھے اُن میں اپنی حیثیت سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، جب ''ندوۃ المصنفین'' کے قیام کا ابتدائی تصور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے اورمیرے ذہن میں آیا تو حاجی صاحب مرحوم اس کی تائید کرنے والوں کی صف اوّل میں تھے۔پھر تائید بھی زبانی اور رسمی نہیں بلکہ عملی اور حقیقی، چنانچہ جو تعلق ندوۃ المصنفین سے انھوں نے پہلے دن قائم کیا تھا اُسے آخر وقت تک اُسی آن بان سے نباہتے رہے۔

حاجی صاحب مرحوم صرف چار پانچ دن ٹائیفائڈ میں مبتلا رہ کر اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔حاجی صاحب کی وفات نے نہ صرف ندوۃ المصنفین کے حلقہ میں رنج وغم کی کیفیت پیدا کردی ہے بلکہ جمعیۃ علماء، دارالعلوم دیوبند، تبلیغی جماعت اوردوسرے بہت سے مذہبی ادارے بھی اس غم میں شریک ہیں۔''ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی'' مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اوردعا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ انھیں صبر جمیل عطا فرمائیں اورمرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے کر اپنے خصوصی انعام سے نوازیں۔آمین [محمد حفظ الرحمٰن، نومبر ۱۹۴۹ء]

عثمانی، مولانا شبیر احمد

آہ ناموسِ شریعت وقاموسِ علم

[مولانا شبیر احمد عثمانی]

وادریغا! آج قلم کو اس ذات گرامی کا مرثیہ لکھنا ہے جس کا قلم عمر بھر قرآن وحدیث کے اسرار وحکم کے کشف وتحقیق میں گُہر افشانی کرتا رہا۔آج زبان خامہ کو اُس کی ماتم سرائی کا فرض انجام دینا ہے جو زندگی بھر ملت بیضا کی جراحتوں کے لیے مرہم رسانی کی فکر میں لگا رہا۔جس کی زبان قرآن کی ترجمان تھی اورجس کا نطق نوامیس شریعت کا بیان۔حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا سانحۂ وفات اگرچہ ''وطن سے دور'' پیش آیا لیکن الحمد للہ کہ دیار غیر میں نہیں جہاں غالب کے بقول بے کسی کی شرم کے رہ جانے کی تمنا ہوتی۔بے شمار فرزندان توحید نے نماز جنازہ پڑھی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو بذات خود ایک انجمن ہو وہ وطن سے دور رہ کر بھی تنہا نہیں ہوتا۔وہ جہاں بیٹھتا ہے اپنی دنیا آپ پیدا کرلیتا ہے۔

دیوبند اگرچہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن مقامی اعتبار سے یہاں کے تین خاندانوں نے اس کو ہندوستان کے آسمان شہرت پر آفتاب وماہتاب بنا کر چمکایا

اور اسے مرز وبوم کی کلاہ افتخار کا کوہ نور بنادیا۔ایک مولانا نانوتوی کا خاندان جن کے فرزند ارجمند حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم تھے، دوسرا مولانا ذوالفقارعلی مرحوم کا خاندان جس کے گل سرسبد حضرت شیخ الہند تھے اور تیسرا خاندان مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم کا تھا جن کے دوصاحبزادے عارف عصر وشیخ طریقت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اورعربی کے بہترین ادیب اور فطری شاعرمولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ عہد حاضر کے اکابر علماوفضلا تھے۔ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی اسی خاندان کے لعل شب چراغ اورمولانا فضل الرحمٰن صاحب کے فرزندارجمند تھے۔

حضرت الاستاذ ماہ محرم ۱۳۰۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے والد ماجد ضلع بجنور میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر مامور تھے۔تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پائی،اپنی غیر معمولی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے طلبا میں ہمیشہ ممتاز اوراساتذہ میں موقر ومحبوب رہے۔۔دارالعلوم دیوبند کا یہ دور نہایت شاندار تھا۔ درس حدیث کی مسند حضرت شیخ الہند کے وجودگرامی سے مزین تھی ہی۔ اور اساتذہ بھی اپنے اپنے علوم وفنون کے ماہر اورنامور استاذ تھے۔اساتذہ ایسے اورشاگرد حضرت الاستاذ ایسا۔ پھرکمی کس چیز کی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ عنفوان شباب میں ہی اسلامی علوم وفنون کے بلیغ النظر مبصر بن گئے پھر چونکہ ذہانت آپ کا جوہر تھی اور خوش تقریری وخطابت ایک فطری ملکہ، اس بنا پر سب سے کمسن ہونے کے باوجود جلد ہی اکابر دیوبند میں شمار ہونے لگے۔حضرت الاستاذ کی ذات سے سلسلہ دیوبند کے دورآخر کی پوری تاریخ مربوط تھی۔آج وہ عہد زریں یادآ تا ہے توسینہ پر سانپ سالوٹ جاتا ہے کہ ہائے!ابھی کیا تھااورکیا سے کیا ہوگیا،خوشا خاک دیوبند کی زرخیزی وزہے سرزمین دارالعلوم کی مردم آفرینی! کہ انیسویں صدی کے نصف آخر اوربیسویں صدی کے ربع اول میں جو بزرگ اس خطہ سے اُٹھے ان کے نفوس قدسیہ نے یہاں کے ذروں کوہمدوش کوکب وانجم بنادیااورزمین چشمک زن آسمان ہوگئی۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعدحضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ جوانگریزوں سےلڑنے کے بعد مکہ معظّمہ میں جاکر قیام گزیں ہوگئے تھےانھوں نے اس ملک کی نئی صورت حالات کے ماتحت یہاں کے مسلمانوں کی دینی اور روحانی واخلاقی تباہ حالی کا جائزہ لے کرحضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح کعبۃ اللہ کے درودیوار سے لپٹ کر دیوبند کے لیے دعائیں مانگی ہوں گی کہ خدااس خطہ کو ہندی مسلمانوں کے لیے ’’مثـابۃ للناس وامنا ‘‘بنادے تاکہ اُن کی دینی نشاۃ ثانیہ کا سروسامان یہاں سے ہوسکے اورسیاسی طاقت وقوت سے یک بیک محروم ہوجانے کے بعدمسلمان جس دینی ابتری اورروحانی واخلاقی اختلال و پراگندگی کا شکار ہوسکتے تھے اس سے محفوظ ہوجائیں۔چنانچہ ان کی فغان نیم شبی وگریۂ صبح گاہی کا یہ اثر ہوا کہ یہاں یکے بعد دیگرے مسلسل ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے جواس ملت برگشتہ کے زخموں پر ٹانکے لگالگا کراس کے جسم میں دینی شعور وملی حیات کا خون پیدا کرتے رہے، دین قیم کی حفاظت وصیانت اورشریعت غرا کی ترقی واشاعت گویاایک امانت تھی جواس عہد سے لے کر اب تک سینہ بسینہ اور دست بدست ایک بزرگ سے اس کے جانشین دوسرے بزرگ کی طرف منتقل ہوتی رہی۔چنانچہ یہ ہی وجہ ہے کہ ایک چھوٹے سے قصبہ اور ایک مدرسے کی چہاردیواری کے اندر بندہوکر ان بزرگوں نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی ملی زندگی کونئی روح دینے میں جتنے مختلف نوع بنوع اور ہمہ جہتی کام کیے ہیں اتنے دیوبند کے سوااورکہیں کسی جگہ نہیں ہوئے۔

اب ایسا خوش نصیب تو شاید ہی کوئی ہوجس نے اس سلسلہ کی ابتدائی کڑیوں یا یوں کہیےاس عہد کے صدراوّل کو دیکھا ہو۔البتہ ایسے حضرات بحمداللہ کم نہیں ہیں جنہوں نے اس عہد کے دورآخری کی بہاریں...خوداپنی آنکھ سے دیکھی ہوں گی۔تصور کیجیے توایک نیا عالم ہی نظروں کے سامنے آجاتا ہے، ایک طرف حضرت شیخ الہند مولانا محمودحسن ہیں کہ مسندِ درس پرعلم وعرفان کے دریا بہارہے ہیں اور ساتھ ہی خلوتوں میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا تختہ اُلٹ دینے اور اس ملک کوفرنگی اقتدار سے آزاد کرادینے کے منصوبے سوچ رہے ہیں۔زبان قال اللہ اور قال الرسول کے لاہوتی نغموں سے سرشار ہے تودماغ انقلابی پروگرام سوچنے میں مصروف! کوئی اس کومحسوس کرے یانہ کرے لیکن ایک بالغ نظر انسان اس سےانکارنہیں کرسکتا کہ حضرت شیخ الہند کی یہ سرگرمیاں آئندہ آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعمیر میں نہایت موثر اورکارگر ثابت ہوں گی اور اس کے اثرات ایک عرصہ تک فضا میں محسوس کیے جاتے رہیں گے۔ دوسری طرف دیکھیے تو عارف ربانی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی تزکیۂ نفس وتجلّیۂ باطن کی محفل گرم کررہے ہیں، مسند افتاپر بیٹھتے ہیں تومعلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابن ہمام نے ایک دوسرے پیکر خاکی میں جنم لیا ہے۔علم وفن کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی جائے توحضرت الاستاذ العلامہ سیدمحمد انورشاہ کے روپ میں نظرآئے گا کہ حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم،ابن دقیق العید،ملاعلی قاری اورامام رازی وفارابی ان سب کے دل ودماغ نے مل جل کر ایک قالب میں ظہور کیا ہے۔شعروادب میں نظرآئے گا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کی زبان سے امراء القیس اور

نابغۂ دبیانی بول رہے ہیں، پھر جہاں تک عہد حاضر کے گوناگوں معاملات و مسائل کا اسلامی حل سوچنے اوران پر فکر کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں مولانا عبیداللہ سندھی عالم اسلام کے ایک مفکر جلیل کی حیثیت سے نظر آئیں گے۔ وعظ و ارشاد اوراصلاح وتزکیۂ نفس کی انجمن مولانا تھانوی کے دم سے زندہ اورروشن دکھائی دے گی، حضرت الاستاذ اسی گلزار سدابہار کے ایک گل صد رنگ وبلبل ہزار داستان تھے کہ جس محفل میں شریک ہوتے رونق محفل بن کر رہتے تھے، جس انجمن میں جابیٹھتے شمع انجمن بن جاتے تھے۔آہ صدافسوس کہ اب یہ محفل سونی ہوچلی ہے، حضرت مولانا مدنی مدظلہ العالی کو چھوڑ کر اس بزم کے سب ارکان عالم آخرت کوسدھار گئے اوراب یہ بساط زرنگار الٹتی ہوئی ہی معلوم ہوتی ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

۱۹۳۰ء میں موتمرالانصار نامی ایک انجمن کا جسے حضرت شیخ الہند نے قائم کیا تھا اورجس کے سیکرٹری مولانا عبیداللہ سندھی تھے، مرادآباد میں ایک نہایت عظیم الشان تاریخی جلسہ منعقد ہوا، اس میں حضرت الاستاذ نے ''الاسلام'' کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ گئی اورآپ کی پبلک شہرت کا باقاعدہ آغاز یہیں سے ہوا۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا سے آنے کے بعد آپ نے ۱۹۱۹ء کے آخر اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں سہارنپور، غازی پور، لکھنؤ، بنارس، کانپور، علی گڑھ ودہلی وغیرہ کے بڑے بڑے اجتماعات میں حضرت شیخ الہند کے ترجمان کی حیثیت سے جو بلند پایہ تقریریں کیں انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں آپ کی عظمت وبرتری کا سکہ بٹھادیا۔ تقریر وخطابت کے علاوہ تحریر وتصنیف کا ذوق بھی شروع سے ہی تھا چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے پرانے ماہناموں ''القاسم'' و''الرشید'' میں مستقل اور مسلسل مقالات کے علاوہ آپ نے ''العقل والنقل'' کے نام سے بھی ایک رسالہ تصنیف کیا جس کی علمی اور دینی حلقوں میں بڑی شہرت ہوئی۔ ان مشاغل کے ساتھ مسند درس بھی آپ کے فیض سے محروم نہیں رہی بلکہ ایک عرصہ تک خالصۃً لوجہ اللہ تمام علوم وفنون اورخصوصیت سے حدیث شریف کا درس دیوبند میں دیتے رہے۔ اس زمانہ میں حضرت الاستاذ کی زندگی بالکل درویشانہ اورمتوکلانہ تھی، دارالعلوم کی خدمت درس بالکل مفت انجام دیتے تھے اور معاش کا صرف یہ ایک ذریعہ تھا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب غالباً سترہ روپیہ ماہوار اپنی جیب سے مولانا کے گھر بھیج دیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں زیارت حرمین شریفین کے جذبۂ بے قرار سے مجبور ہوکر اپنا گھر فروخت کرکے حجاز چلے گئے اورواپس آکر حسب سابق درس میں مشغول ہوگئے۔ ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں اختلافات رونما ہوئے، ان کے نتیجہ میں آپ ایک جماعت کثیر کے ساتھ ڈابھیل منتقل ہوئے، چند سالوں کے بعد آپ کا انتخاب دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم کے عہدہ پر ہوا اوراب آپ پھر دیوبند آگئے لیکن سات سال کے بعد آپ کو اس عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا اور اب آپ دیوبند میں ہی خانہ نشین ہوکر رہنے لگے، یہاں تک کہ اگست ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کرکے کراچی تشریف لے گئے اورآخر کار ۱۳؍دسمبر ۱۹۴۹ء کی شام کو ریاست بھاولپور میں دو روز علیل رہنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ یہاں سے کراچی لایا گیا جہاں علم وفضل کا یہ پہاڑ سپرد خاک کردیا گیا۔

یوں تو مسلمانوں کی دینی اورملی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو براہ راست حضرت الاستاذ کے فیوض وبرکات سے مستفید نہ ہولیکن اس میں آپ کے سب سے زیادہ شاندار اوردیرپا کارنامے دو ہیں: ایک حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن کی تکمیل اوراس پر حواشی وفوائد اوردوسرا صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم۔ ارباب نظر جانتے ہیں کہ حضرت الاستاذ نے کس جامعیت، اصابت رائے اور دقت نگاہ کے ساتھ قرآن وحدیث کی خدمت کے یہ دونوں شاہکار مرتب کئے ہیں، موخرالذکر کا چرچا تو ہندوستان چھوڑ ممالک اسلامیہ تک میں ہے، مصر کے اکابر علم نے فتح الملہم کی داد دی ہے۔

فنون ظاہری میں درک وادراک اورجامعیت وکمال کے ساتھ آپ علوم باطنیہ سے بھی بہرہ وافر رکھتے تھے اس سلسلہ میں پہلے حضرت شیخ الہند سے بیعت ہوئے پھر پیرومرشد مالٹا کے اسیر ہوگئے تو آپ نے مولانا تھانوی سے رجوع کرلیا اور جب حضرت شیخ الہند واپس آئے تو پھر انھیں کی طرف رجوع ہوگئے۔ نماز انتہائی خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، خشیۃ اللہ اورشرم وحیا کا پیکر تھے، قلب نہایت نازک اوررقیق پایا تھا۔ لیکن تقریر کے وقت عقل کو کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہونے دیتے تھے، جو بات کہتے تھے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ بہت ناپ تول کر کے کہتے تھے۔ تحریک خلافت کا زمانہ حد درجہ اشتعال اور جذبات کی برانگیختگی کا عہد تھا لیکن اس زمانہ میں بھی کبھی تقریراً یا تحریراً کوئی ایسی بات نہیں کہی جو صرف جذبات کا نتیجہ ہو۔ حق بات کہنے میں ہمیشہ بے باک اور نڈر تھے۔ ہر معاملہ میں اپنی رائے صفائی اورآزادی کے ساتھ پیش کرتے تھے چنانچہ شاید لوگوں کو اب تک یاد ہو کہ دہلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے مقابلہ پر اور ۱۹۲۲ء میں گیا میں جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ

جلسہ کے موقع پر کونسلوں کے بائیکاٹ کے مسئلہ پر حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی مخالفت میں حضرت الاستاذ نے کس قدر ہنگامہ آفریں اورمعرکۃ الآرا تقریریں کی تھیں۔طبیعت کے مرنج ومرنجان تھے،کسی کو دکھ پہنچانا یاکسی کی بدخواہی کرنا اُن کے دائرہ تصور سے باہر تھا،جس سے جو وضع تھی اس کو ہرحال میں نباہتے تھے۔جمعیۃ علمائے اسلام کے قیام کے بعد بھی جب کبھی دہلی تشریف لاتے یہ ناممکن تھا کہ کتنی ہی عدیم الفرصتی ہو دوچار گھنٹہ کے لیے اپنے بھتیجے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی،ان کے بچوں اورہم خدام سے ملنے کے لیے دفتر برہان تشریف نہ لاتے۔

جہاں تک سیاست کاتعلق ہے حضرت الاستاذ اپنے مخصوص افتادِطبع کے باعث کبھی بھی اس میدان کے مردِدارورسن نہیں ہوئے البتہ خیالات وافکار میں وہ ہمیشہ حضرت شیخ الہند کی قایم کی ہوئی جمعیت علمائے ہند کے ساتھ رہے اوراس کی مجلس عاملہ کےممبر کی حیثیت سے اس کے فیصلوں میں برابر شریک وسہیم رہے۔آخر میں جب ہندوؤں کی بددماغی اوران کی تنگ نظری سے خوف زدہ ہو کرمسلمانوں کی اکثریت تحریک پاکستان کی ہمنوا ہوگئی تو حضرت الاستاذ بھی اس سے وابستہ ہوگئے۔اورآخر کاراس ملک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئے۔

تحدیث نعمت کےطور پر یہاں اس کا ذکرکرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ راقم الحروف کو جہاں اوراکابر دیوبند کی بارگاہ میں خصوصی تقرب کا شرف حاصل رہاہے جو بلاشبہ اس گنہگار کے لیے ذخیرۂ آخرت ہے،حضرت الاستاذؒ بھی خاص محبت کرتے اورشفقت فرماتے تھے۔اس میں جہاں دخل اس ہیچمرز کی استعداد کے ساتھ بزرگانہ حسن ظن کو تھا،اس بات کوبھی تھا کہ بھائی عتیق (مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی)کےساتھ خصوصی برادرانہ تعلق کی وجہ سے میں گویا عثمانی خاندان کا ہی ایک فرد بن گیا تھا۔جب کبھی ملاقات ہوتی،انتہائی شفقت اورمحبت کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے۔دیوبند جاتا توکئی کئی وقت کی دعوت کرتے اورخود اپنے ہاتھ سے عمدہ کھانوں کی قابیں میری طرف بڑھاکر ان میں سے کھانے کی فرمائشیں کرتے۔میری تقریروں اورتحریروں کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور اکثر دعائیں دیتے تھے۔ترک وطن کرجانے کے بعد ہم تہی دستان قسمت آپ کے فیوض وارشادات علمیہ سے محروم ہوگئے تھے یہاں تک اس مدت میں خط و کتابت کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔البتہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوا کہ کراچی سے ایک عزیز دوست نے لکھا تھا کہ:’’حضرت مولانا‘‘تم کو یادکرتے ہیں اورفرماتے ہیں کہ یہاں چلے آؤ۔اس کے جواب میں راقم الحروف نے اس دوست کوحکیم ناصرخسرو کاصرف یہ شعرلکھ بھیجا تھا:

حاجی برہِ کعبہ و من طالب دیدار
اوخانہ ہمی جوید و من صاحبِ خانہ

ایک عرصہ ساتھ رہنے کی وجہ سے بعض معاملات میں کئی مرتبہ شکوہ سنج ہونے کی نوبت بھی آئی لیکن حضرت الاستاذ کی شفقتوں کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ ان سے شکوہ سنج ہونے میں بھی ایک لذت ملتی تھی پھر دل میں خواہ کیسے ہی شکوے ہوں لیکن جہاں خندۂ زیرلب اورآنکھوں کی ایک خاص جنبش کے ساتھ آپ نے خطاب کیا،بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ دل میں شکایت وگلہ کا گویا کبھی احساس پیدا ہی نہیں ہوا۔آہ صد حیف!اب یہ شفقتیں خواب خیال وفکر رہیں گی:

وکنا کندمانی جذیمة حقبة من الدھر حتی قیل لن یتصدعا
فلما تفرقنا کانی ومالکا بطول اجتماع لم نبت لیلة معاً

حضرت الاستاذ کا حادثۂ وفات ملت اسلامیہ کےجسم پرایک ایسازخم کاری ہے جو عرصہ تک مندمل نہیں ہوسکتا۔اس حادثہ سےعلم شریعت کی دیوار میں جو شگاف پیدا ہوگیا ہے وہ مدت تک بند نہیں کیاجاسکے گا،ان کا وجود اس عہد ضلالت وگمراہی میں اللہ کی رحمت کاایک سایہ تھا۔وہ شریعت مصطفوی کے ناموس اوردین قیم کی آبرو تھے۔اللہ تعالیٰ ان کی قبرکونور سے بھرپور کرے اورآخرت میں صدیقین وشہداء کے ساتھ ان کا حشرفرمائے۔آمین [جنوری ۱۹۵۰ء]

---

[1] مولانا ۱۳۱۲ھ میں درجہ قرآن مجید میں داخل ہوئے اور۱۳۲۰ھ میں دورہ حدیث کی پوری جماعت میں اوّل درجے میں کامیابی حاصل کی۔۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم میں باقاعدہ مدرس مقرر ہوگئے اورکچھ عرصے کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری کےصدر مدرس بنا کر بھیجے گئے۔

<u>کیمرن،اے</u>

اے کیمرن

پچھلے دنوں بنگال چیمبرس آف کومرس کےصدر مسٹراے۔کیمرن کلکتہ کے قریب ایک مقام پراپنے مسلمان ملازم کی جان بچاتے ہوئے اُس کے ساتھ بڑی بے دردی سے ماردیے گئے۔اگرچہ مشرقی اورمغربی بنگال میں جو کچھ ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ واقعہ نہ کچھ زیادہ حیرت انگیز ہے اور نہ مقابلۃً کچھ زیادہ افسوسناک،لیکن اگرہم میں انسانیت کی حس بالکل ہی مرنہیں گئی ہے تو اس واقعہ کا ایک پہلو ہمارے لیے کس قدرعبرت انگیز وسبق آموز ہے۔

مسٹر کیمرن کون تھے؟ کس ملک کے رہنے والے تھے؟ اور جس شخص کی جان بچانے میں انھوں نے خود جان دے دی اس سے ان کا کیا رشتہ تھا؟ ظاہر ہے وہ یورپین تھے ہندوستان کے شہری نہیں بلکہ اجنبی ۔اُس قوم سے تعلق رکھتے تھے جس سے ہندوستانیوں نے ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد آزادی حاصل کی ہے اور جس کو انھوں نے سعی آزادی کے دور میں ہر تقریر اور ہر تحریر میں کیا کچھ بُرا بھلا نہیں کہا۔ پھر اُس ملک کے رہنے والے تھے جو ہمارے نزدیک خدا ناشناسی، مادہ پرستی، فحاشی اور عیاشی کا مرکز ہے۔ رہا اس شخص سے تعلق ! تو معلوم ہے کہ سوائے انسانیت کے ان کے اور ان کے نوکر کے درمیان کوئی اور مجانست نہیں تھی۔ یہ انتہائی امیر اور وہ انتہائی غریب، یہ گورا وہ کالا، یہ مغربی وہ مشرقی، ان کی زبان اور اس کی بولی اور، یہ یہاں کے اجنبی وہ یہاں کا شہری، یہ عیسائی وہ مسلمان، لیکن ان سب اختلافات کے باوجود انسانیت کا احترام اس شخص کے دل میں اس درجہ ہے کہ وہ ایک حقیر اور ادنیٰ سی جان کو بچانے کے لیے اپنی زندگی بے دریغ قربان کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ دخل نہ دیتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے۔

اس کے مقابلہ میں دیکھیے ہم مشرقی بنگال و مغربی بنگال کے ہندو مسلمان ہیں جو ایک ہی ملک کے شہری ہیں، ایک زبان اور ایک کلچر رکھتے ہیں۔ صرف ایک مذہب کا اختلاف ہے باقی سب چیزوں میں ایک دوسرے کے مجانس اور مماثل۔ پھر ہمیں روحانیت اور اخلاق اور خدا پرستی کا بھی دعویٰ ہے۔ ہم ایشیا کو اور اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو روشنی دکھانے کا عہد بھی کر رہے ہیں ہمیں اپنے اپنے مذہب کی عظمت و سربلندی پر بھی ناز ہے۔ تیس چالیس برس تک ہم نے گاندھی جی سے عدم تشدد کا سبق بھی پڑھا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ایک دوسرے کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ کیمرن تنہا نے ایک مجمع کا مقابلہ کیا۔ یہاں یہ عالم ہے کہ ایک شخص اپنے حریف کے چھرا بھونک کر بھاگ جاتا ہے اور اس کے ہم مذہب دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ غور کرو جہاں تک انسانیت کے احترام کا تعلق ہے یورپ اور ایشیا میں کتنا بڑا فرق ہے اور اگر ہم نے اس طرح عبرت حاصل نہیں کی اور اپنے آپ کو جلد نہیں سنبھالا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کل ہمارا انجام کیا ہوگا۔ [اپریل ۱۹۵۰ء]

شروانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے ۸۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جن اکابر علم وادب نے اس ملک میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سروسامان کیا تھا مولانا ان کے زمرہ میں ایک نوجوان رفیق کی حیثیت سے شامل تھے اس لیے انھوں نے اس دور کی بہار سامانیاں خود اپنی آنکھ سے دیکھی تھیں اور اپنی خداداد صلاحیت وقابلیت سے کام لے کر ان کی تعمیر وترقی میں خود بھی عملی حصہ لیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلما، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، دارالعلوم دیوبند، حیدرآباد کا محکمہ امور مذہبی، یہ سب ادارے مرحوم کی اصلاحی و تدبیری کاوشوں اور گوناگوں ہمدردانہ دلچسپیوں کے جولانگاہ تھے۔ دولت زر کی بہتات کے ساتھ دولت علم وفضل سے بھی مالا مال تھے۔ مرحوم کا کتب خانہ ہندوستان کا ایک بہترین کتب خانہ تھا جہاں ریسرچ اسکالر آکر مطالعہ وتحقیق کی تشنگی بجھاتے تھے۔ کتابوں کی حفاظت ونگرانی اور ان کی ترتیب وفہرست سازی کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ ضعف ونقاہت اور بیماری کے باوجود روزانہ پندرہ گھنٹے کتب خانہ میں پابندی کے ساتھ بیٹھتے اور مطالعہ کرتے تھے۔ متعدد کتابیں اور بہتیرے مقالات بھی ان کے قلم سے نکلے، اردو کے صاحب طرز ادیب تھے۔ فارسی اور عربی شعروادب کا شگفتہ ذوق رکھتے تھے۔ دین داری اور مذہبی شعائر وآداب کا احترام ان کی فطرت تھی۔ اخلاق و عادات، طور واطوار کے لحاظ سے اب سے ڈھائی تین سو برس پہلے کی اسلامی تہذیب و شرافت کا زندہ نمونہ تھے، خودداری کے ساتھ ملنساری، تمکنت کے ساتھ ارباب علم وادب کے ساتھ انکساری ان کی طبیعت کا جوہر تھا۔ انھوں نے اپنے علم وفضل سے بھی خلق خدا کو فیض پہنچایا اور دولت و ثروت سے بھی، ان چند درچند خصوصیات وکمالات کے جامع ہونے کے اعتبار سے مرحوم مسلمانوں کے اس دور میمون و مبارک کی یادگار تھے جب کہ لوگ ''صاحب السیادتین'' اور ''حامل الدولتین'' ہوتے تھے، اب جو اس چمن میں موسم خزاں کا دور دورہ اور بادصرصر کی تباہ کاریوں کا غلبہ ہے تو قع نہیں کہ ایسے جامع کمالات بزرگ پھر کہیں دیکھنے میں آئیں گے۔ صد حیف کہ جو مسند خالی ہوتی جاتی ہے اسے پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ حق تعالیٰ آں مرحوم کو بیش از بیش رحمتوں سے نوازے اور مقربین وصلحا میں مقام نصیب فرمائے۔ آمین

اس سلسلہ میں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بعض اخبارات نے اپنے تعزیتی نوٹ میں نواب صاحب مرحوم اور مولانا آزاد کے تعلقات کا بھی خاص

اہتمام کیا ہے۔ گویا مولانا آزاد کا ''صدیق'' ''حبیب'' ہونا بھی ایک فضیلت ہے حالانکہ گستاخی معاف! مولانا مدظلہ کے دیرینہ بلاکشان محبت کا تجربہ تو یہ ہے کہ مولانا کا ''صدیق'' ہونا فضیلت نہیں بلکہ ایک لطیف قسم کا ابتلا ہے۔

جس کے تم دلبر ہو جس دل میں تمہاری یاد ہو
وہ ہمیشہ خاک چھانے اور سدا برباد ہو

[ستمبر ۱۹۵۰ء]

سیماب اکبرآبادی، مولانا عاشق حسین

مولانا عاشق حسین سیماب اکبرآبادی

افسوس ہے پچھلے دو دن کے ہی آگے پیچھے سے اردو کی بساط شعروادب کے دو پرانے اور نامور مہرے اٹھ گئے۔ مولانا عاشق حسین سیماب اکبرآبادی اور مولانا احسان اللہ خاں تاجورؔ نجیب آبادی آج کل کے عام شاعروں کی طرح شاعر یا ادیب ہی نہیں تھے بلکہ صاحب فن استاذ، علم عروض ومعانی وبیان اور لغت وقواعد لسان کے بڑے مبصر اور ناقد بھی تھے۔ مولانا سیماب ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال کر گئے شاعری اٹھارہ انیس برس کی عمر سے ہی شروع کر دی تھی اس طرح گویا مرحوم نے پوری ایک نصف صدی اردو زبان وادب کی خدمت میں بسر کی۔ اس مدت میں سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں اور بے شمار مقالات، نظمیں وغیرہ ان کے قلم سے نکلیں۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا جو خط وکتابت کے ذریعہ ان کی فنی بصیرت ومہارت سے استفادہ کرتا رہتا تھا۔ ابتدا میں اگرچہ مرزا داغ سے مشورہ سخن کرتے تھے مگر جلد ہی ان کا اپنا ایک مخصوص رنگ قائم ہو گیا۔ کثرت مطالعہ وفکر عمیق نے ان میں شعروادب سے متعلق ایک مجتہدانہ شان پیدا کر دی تھی۔ وہ کسی کے مقلد نہیں تھے بلکہ ہر چیز اور ہر شعری وادبی مسئلہ کے متعلق اپنی ایک جچی تلی سنجیدہ اور متین رائے رکھتے تھے اور علیٰ وجہ البصیرت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے طوفانی اور انقلابی دور دیکھے جس نے ادب وشعر کی پرانی قدروں کو متزلزل کر کے رکھ دیا اور صورت ومعنی دونوں کے لحاظ سے شاعری کی دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا، لیکن مرحوم ایک چٹان بنے اپنے مقام پر کھڑے رہے یہاں تک کہ انقلاب فکر وسخن کی موجیں ان سے ٹکرائیں اور بالآخر راستہ کاٹ کر ان سے دامن بچا کر نکل گئیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو سکا کہ مرحوم طرز قدیم کے حامل ہونے کے ساتھ وقت کے جدید تقاضوں سے بھی بے خبر نہ تھے اور قدیم وجدید میں ہم آہنگی پیدا کر لینے کا ان میں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ آخر عمر میں قویٰ ضعیف ہو گئے تھے لیکن پھر بھی تصنیف وتالیف اور شعری وادبی اصلاح و ارشاد کے کاموں میں برابر مصروف رہے۔ اس بنا پر انھوں نے جو قلمی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے بلامبالغہ اس زمانہ کا کوئی ادیب اور شاعر اس میں اور قدرت کلام و جامعیت فن میں ان کا ہمسر وحریف نہیں ہو سکتا۔

قدرت کلام کا یہ عالم تھا کہ چند سال ہوئے انھوں نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کیا اور ندوۃ المصنفین کے رفقا کو بر بنائے تعلق خاطر ومودت قدیم دکھانے اور ان سے رائے لینے کے لیے دہلی میں آ کر تقریباً دو ہفتے قیام کیا تو میں نے پہلی ہی ملاقات میں کہا کہ میں قرآن مجید کے منظوم ترجمہ کا حامی نہیں ہوں، میرے نزدیک ایسی کوشش نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر اور گمراہ کن ہو سکتی ہے۔ اس پر مرحوم نے کہا کہ آپ پہلے میرا ترجمہ پڑھ لیجیے اور اس کے بعد کوئی رائے قائم کیجیے۔ چنانچہ میں اس پر رضامند ہو گیا اور روزانہ دو دو، تین تین گھنٹے نکال کر مرحوم کے ساتھ ہی میں نے ترجمہ از اوّل تا آخر پڑھا۔ اب میری حیرت کی انتہا نہ تھی جب میں نے دیکھا کہ ترجمہ بڑی حد تک اس قدر صاف اور رواں تھا کہ نظم اور نثر کا فرق ہی معلوم نہیں ہوتا تھا اور یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ قید وزن وقافیہ کی وجہ سے کسی جگہ بھی کوئی لفظ آگے پیچھے ہو یا کسی مناسب لفظ کی جگہ کوئی نامناسب لفظ رکھا گیا ہے۔ [فروری ۱۹۵۱ء]

تاجورؔ نجیب آبادی، مولانا احسان اللہ خاں

مولانا احسان اللہ خاں تاجورؔ نجیب آبادی

مولانا احسان اللہ خاں تاجورؔ ۱۸۹۳ء میں نجیب آباد ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، روہیلہ افغانوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر اسلامی علوم وفنون کی تکمیل کی۔ شعروشاعری اور لکھنے کا ذوق فطری تھا چنانچہ زمانہ طالب علمی میں بھی دارالعلوم دیوبند کے بلند پایہ علمی اور دینی رسالوں ''القاسم'' دوراوّل اور ''الرشید'' میں ان کے مقالات نکلتے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ لاہور پہنچے اور سر عبدالقادر مرحوم ایسے مربی اور مشفق کے فیض صحبت وتوجہ نے ان کو ایسا چمکایا کہ وہ جلد ہی نہ صرف لاہور بلکہ شمالی ہندوستان کی علمی اور ادبی محفلوں کی رونق وزینت بن گئے۔ وہ اردو کے بلند پایہ شاعر اور زبان کے ماہر ونقاد اور نامور ادیب کی حیثیت سے پنجاب کے اساتذۂ فن کی صف میں ایک نمایاں جگہ کے مالک ہو گئے۔ سینکڑوں

نوجوان ان کے فیض صحبت وتعلیم سے اردو کے نامور ادیب وشاعر ہوئے۔ وہ زندہ دلان پنجاب کے ادبی اکھاڑہ میں ایک پہلوان کی حیثیت سے رہتے تھے۔

وہ جس طرح دوستوں کے ساتھ انتہائی خلیق وملنسار اور ہمدرد تھے اسی طرح مخالفوں کو دنداں شکن جواب دینے میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے۔ لاہور میں رہ کر انھوں نے دولت بھی پیدا کی اور شہرت وناموری بھی حاصل کی۔ لیکن دیوبند میں چندسالہ قیام نے ان کے دل ودماغ پر ایسے گہرے نقوش ثبت کردیے تھے کہ وہ نام کے ساتھ ''فاضل دیوبند'' بڑے فخر کے ساتھ لکھتے تھے اور دیوبند کے حضرات اکابر تو اکابر معمولی منتسبینِ دارالعلوم پر بھی جان چھڑکتے اور ان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اگرچہ تصنیف وتالیف کے ذریعہ کوئی بڑا ذخیرہ انھوں نے یادگار نہیں چھوڑا ہے، تاہم ''انجمن ارباب علم پنجاب''، ''اُردو مرکز'' ایسے ادارے قائم کرکے اور ''ادبی دنیا'' اور ''شاہکار'' وغیرہ بلند پایہ رسالے نکال کر اور نوجوانوں میں صحیح اور شگفتہ ادبی وشعری ذوق پیدا کرکے انھوں نے اردو زبان وادب کی جو اہم خدمات انجام دی ہیں وہ عصر حاضر کے تاریخ ادب کا بے شبہ روشن باب ہیں اور انھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آج کل کے بعض کم ظرف اور بداصل وبدنہاد شاعروں نے شاعری کو ایسا بدنام کیا ہے کہ شاعری اور رندمشربی وآوارہ مزاجی دونوں لازم وملزوم سے بن گئے ہیں۔

سیمابؔ اور تاجورؔ دونوں نے اس فن شریف کے مرتبہ ووقار کو پوری طرح قایم رکھا، چنانچہ یہ دونوں حضرات ارباب فن ہونے کے ساتھ مشرقی آداب واطوار معاشرت کا بھی مکمل نمونہ تھے شرافت ان کا جوہر اور پاک طینتی ومروت ان کی خُو تھی، فن ان کے دم سے نیک نام تھا اور یہ فن کے وقار پر دم دیتے اور اخلاقی حیثیت سے بھی فن کا وقار کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ آہ صد حیف کہ اردو کی شبستان گل بدامان کے یہ پرانے چراغ بجھتے چلے جارہے ہیں اور ان کی جگہ نئے چراغوں کو روشن کرنے کا سامان کا کال پڑرہا ہے، جو جاتا ہے اپنی جگہ بالکل خالی چھوڑ کر جاتا ہے۔ واحسرتا!

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

حق تعالیٰ دونوں کی قبر ٹھنڈی رکھے اور مغفرت وبخشش کی نعمتوں اور رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

[فروری ۱۹۵۱ء]

حسرتؔ موہانی، مولانا

مولانا حسرتؔ موہانی

افسوس کہ آخر مولانا حسرت موہانی بھی چل بسے۔ مولانا کی شخصیت کا پیکر دو چیزوں سے بنا تھا ایک شعر وسخن اور دوسری سیاست۔ سیاست اس پیکر کے ساتھ جسم کی نسبت رکھتی تھی، اس بنا پر جب جسم مٹی میں ملا تو سیاست بھی فنا ہوگئی لیکن شعر وسخن اس پیکر کی روح تھی جو مرنے کے بعد باقی رہتی ہے اس لیے حسرت کی شاعری اب بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

مرحوم سیاست میں کبھی ایک روش میں قایم نہیں رہے وہ کبھی کسی پارٹی میں شریک ہوئے کبھی کسی میں، ان کی سیاست کا آغاز کانگریس میں شرکت سے ہوا اور اس کا خاتمہ لیگ کے پُرجوش کارکن ہونے پر ہوگیا۔ ان دونوں کی درمیانی مدت میں سیاسی اعتبار سے وہ کبھی کسی روپ میں نظر آئے اور کبھی کسی جامہ میں وہ دیکھے گئے لیکن ہر جگہ اور ہر مقام پر بیباک خلوص ان کا امتیازی وصف رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں سے وہ سیاسی اختلاف رائے رکھتے تھے وہ بھی ان کی قدر کرتے اور ان کا احترام ملحوظ رکھتے تھے، وہ خواہ کسی رنگ اور کسی بھیس میں ہوتے ان کا اندازِ قد الگ سے پہچان لیا جاتا تھا۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں ان کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ اس جدوجہد کی کوئی تاریخ مرحوم کے شاندار تذکرہ کے بغیر کامل نہیں ہوسکتی۔ ایک زمانہ تھا کہ حسرت کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا اور لوگ ان کے ایثار وقربانی، محنت وجفاکشی، برطانوی حکومت سے نفرت اور اس سلسلہ میں ان کی سخت ضد اور ہٹ کی داستانیں مزے لے لے کر اور جوش ومسرت کے ساتھ بیان کرتے تھے، لیکن مرحوم کے یہ وہ اوصاف وکمالات ہیں جن کو لوگوں نے خود ان کی زندگی میں ہی بھلا دیا تھا اور وہ آخر میں ''یوسف بے کارواں'' ہوکر رہ گئے تھے۔

حسرت کی شاعری جوانمٹ اور زوال ناآشنا ہے اس کا اصل جوہر حسن تغزل ہے۔ انھوں نے اپنے تغزل میں میرؔ کا سوز گداز، نسیمؔ کی سلاست وروانی اور جرأتؔ کی رنگینی وبے ساختگی ان تینوں کو اس طرح سمو دیا تھا کہ ان کی ترکیب و امتزاج سے حسرت کی شاعری کا ایک نہایت حسین وجمیل اور لطیف ودلکش مرقع وجود میں آیا جو اپنے مخصوص رنگ کے اعتبار سے ''باہمہ'' بھی تھا اور ''بے ہمہ'' بھی، جو تغزل کی روایات کہن کا آئینہ دار بھی تھا اور ایک خاص قسم کی انفرادیت کا حامل بھی۔

اس شاعری کے خدوخال وہی پرانے تھے لیکن اس کے تیور سب سے

انوکھے اورنرالے۔حسرت کے تغزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا عشق فرضی، وہمی اورمحض خیالی نہیں ہے بلکہ وہ زندہ ومتحرک اورحقیقی وواقعی ہے۔ ان کی غزلیں پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر کا دل حسن کے کسی ایسے ہیولیٰ کی زلف گرہ کا اسیر ہوگیا ہے جوصورت جسمیہ سے مجرد ہے اورجس کا اس عالم آب و گل میں کہیں وجود ہی نہیں بلکہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ شاعر جس حسن وعشق کی محاکات کررہا ہے وہ ہماری اسی دنیا کی مخلوق ہیں اور نہ صرف یہ کہ مخلوق ہیں بلکہ یہ بھی کہ ہم سے بہت قریب اورگویا کہ ہمارے پاس ہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب ایک اہل دل ان کا کلام پڑھتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس تغزل میں کہیں حسن سنجیدہ ہے اورمتین اورکہیں شوخ وبیباک، کبھی غرور وتمکنت سے آشنا اورکبھی عشق کی نالہ سامانیوں سے اداس وغمگین، کبھی غمزۂ پنہاں اورکبھی عشوۂ آشکار، کہیں شرم وحجاب اورخودداری وحیا آگینی اورکہیں جلوہ فروشی کی تمنا اورکرم پاشیوں کی آرزو۔اس کے بالمقابل عشق کا عالم یہ ہے کہ کبھی انتہائی باادب وپُر وقاراورکبھی سراپانیاز وافتادگی، کسی جگہ محوتحیراور پھر کبھی التفات حسن سے حوصلہ پاکر گستاخ وشریر، کہیں ہجوم غم والم سے سربگریباں اورکہیں نوید کامیابی سے انجم بداماں، پھرحسن وعشق میں جو رازو نیاز، چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، گلہ وشکوہ، عتاب ظاہر اور التفاتِ پنہاں الزام آشکار اور انفعالِ نہاں کی باتیں ہوتی ہیں، حسرت نے ان سب کی محاکات اس طرح پُر کی ہے کہ آنکھوں میں نقشہ پھر جاتا ہے ۔اُن کا اگر کوئی قصور ہے تو یہ ہے کہ جو باتیں پس پردۂ خلوت کہنے کی ہوتی ہیں وہ انھوں نے سربزم کہہ ڈالی ہیں لیکن جہاں حسن کا عالم بقول غالب کے یہ ہو کہ ؎

ہیں کتنے بے حجاب جو یوں ہیں حجاب میں

وہاں عشق کی کوئی ادائے نیازمندی وعبودیت ہی کیوں حجاب میں رہے، شاعر اگر واعظ بن جائے تو پھر وہ کم ازکم تغزل کا شاعر نہیں رہتا۔ بہرحال حسرت کے تغزل کی یہ ہی خصوصیت ہے جس نے ان کو ''تغزل کا شہنشاہ'' کہلایا اورکوئی شک نہیں کہ اس لقب کا جامہ ان کی شاعری کے قدوقامت پر بالکل چست آتا تھا اور وہ اس کے بجاطور پر مستحق تھے۔

مرحوم ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے ''تسمع بالمعیدی خیر من ان تـــراہ'' کا مصداق تھے لیکن غالباً فیضِ تصورات جمال لطیف نے ان کو باطنی اور روحانی واخلاقی کمالات کا پیکر بنا دیا تھا۔شاعر، فن کار اوراردو زبان وادب کے نقاد ومبصر ہونے کے علاوہ وہ غیرمعمولی کردار اورکیرکٹر کے انسان تھے۔نہایت سادہ، حلیم و بردبار پُرجوش کارکن اورمخلص اپنی بات کے پکے اوردھن کے پورے۔ہرحالت میں جری اورنڈر، تصوف اورطریقت کے رنگ میں غرق، مذہب کے دلدادہ وفریفتہ، حسن مجازی کے گن گاتے۔حسن مطلق کے ساتھ ان کی والہانہ فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس حسن کی جلوہ گاہ کی خاک چھاننے کے لیے بار بار حرمین شریفین پہنچتے تھے، اس طرح مرحوم نے غالباً سولہ حج کیے تھے۔حق تعالیٰ ان کو مغفرت ورحمت کی گوناگوں نوازشوں سے سرفرازفرمائے کہ ان کی یہ ساری نیکیاں اورریاضتیں صرف اسی ایک امید اورتمنا کے سہارے پر تھیں۔

[جون ۱۹۵۱ء]

خان، لیاقت علی

لیاقت علی خان

ماہ گزشتہ میں یہ خبر ہند اور پاکستان میں خصوصاً اوردوسرے ملکوں میں عموماً نہایت دکھ اوررنج کے ساتھ سنی گئی کہ پاکستان کے وزیراعظم جناب لیاقت علی خان ۱۶/اکتوبر کی شام کو چار بجے کے قریب راولپنڈی میں ایک عظیم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے بڑی سفاکی اور بے دردی کے ساتھ شہید کردیے گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بعض لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کی طبعی صلاحیتیں اورفطری خوبیاں کوئی مناسب ماحول نہ ملنے کی وجہ سے گوشۂ خمول وگمنامی میں پڑی سوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ عمر کا ایک طویل حصہ اسی طرح بسر ہوجاتا ہے لیکن پھر یکایک کوئی مناسب ماحول پیدا ہوتا ہے اور ان صلاحیتوں کے ظہور و بروئے کار آنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اوروہ ہی شخص جسے کم آدمی جانتے تھے ایک روز صبح کو اٹھتا ہے تو فضا اس کی شہرت وناموری کی داستانوں سے معمور نظر آتی ہے۔شہید مرحوم بھی اسی قسم کی ایک عظیم شخصیت کے انسان تھے۔وہ یوپی کے ضلع مظفرنگر کے ایک معمولی سے قصبے میں پیدا ہوئے، الٰہ آباد اورعلی گڑھ میں تعلیم پانے کے بعد ولایت چلے گئے، وہاں سے آکر اگرچہ وہ نوکری بڑی سی بڑی کرسکتے تھے لیکن ان کی طبیعت کو اس سے میل نہ تھا۔قوم کی خدمت کا جذبہ شروع سے ہی رکھتے تھے لیکن مزاج میں انقلاب پسندی اور ہنگامہ آفرینی بالکل نہ تھی، اس لیے حصول آزادی کی ان تحریکوں سے الگ رہے جن سے وابستگی حکومت وقت کے خلاف غیرقانونی بغاوت وسرکشی کے ہم معنی سمجھی جاتی تھی اورآئینی

طریقہ پر ملک اورقوم کی خدمت کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ ایک طرف آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس سے وابستہ رہے اوردوسری طرف یوپی کونسل میں قومی نقطہ خیال کی وضاحت وترجمانی کرتے رہے، اس حیثیت سے ان کی شہرت یوپی کے ایک مخصوص تعلیم یافتہ طبقہ کے دائرہ میں محدود رہی جس میں وہ نواب زادہ کے لقب سے معروف تھے۔ اس کے بعدانھوں نے بہت ترقی کی توایک طرف مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگئے اور دوسری جانب آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوگئے۔اس زمانہ میں اگرچہ ان کی شہرت یوپی کے حدود سے گزر کر دور دور تک پہنچی لیکن واقعہ یہ ہے کہ عوام کے دلوں میں اُن کی عظمت کا اب بھی ایسا گہرا احساس نہیں تھا جووالہانہ گرویدگی اور بزرگی کا بیساختہ اعتراف پیدا کردیتا ہے۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ایشیاء کی سرزمین میں ایک نئی ریاست کی تشکیل عمل میں آئی اورنواب زادہ اس کے پہلے وزیراعظم مقررہوئے تواب وقت آیا کہ ان کی اصل طبعی صلاحیتیں ابھریں اورقدرت نے ان میں ایک سنجیدہ فکر سیاسی مدبّر بننے کی جو اہلیت رکھی تھی وہ ظہور میں آئے۔چنانچہ قیام ریاست سے لے کر شہادت کے وقت تک یعنی کل چارسال کی مدت میں انھوں نے اپنی عمدہ اورجبلی صلاحیتوں کا جوعملی ثبوت دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت طوفانی اورحوصلہ شکن موجوں میں بھی اپنی کشتی کوسنبھالے رکھنے میں کامیاب ہوسکے۔انھیں عوام کا ایسا اعتماد حاصل تھا کہ جوبڑے بڑے سیاسی لیڈراور پرانے کارکن نہیں کرسکتے تھے وہ آسانی سے اسے انجام دے سکتے تھے۔اگرچہ سیاست کی وقتی مجبوریوں کے باعث تقریروتحریر میں کبھی کبھی ان کا لہجہ گرم اورتیز ہوجاتا تھا لیکن طبعاً وہ ٹھنڈے دل ودماغ کے انسان تھے۔قدم احتیاط سے اٹھاتے تھے مگر جب ایک مرتبہ اٹھا لیتے تھے تو پھراسے واپس نہیں لیتے تھے۔ان کے کیریکٹر کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ شدید اشتعال کی حالت میں بھی وہ اپنے دماغی توازن کے شیرازہ کودرہم برہم نہیں ہونے دیتے تھے اور افکار وآلام کے ہجوم میں بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ اوراطمینان کی کیفیت کھیلتی رہتی تھی۔ زیادہ لمبی چوڑی تقریروں اورجلد جلد اخباری بیانات دینے کے ماہرنہیں تھے،حاضر جوابی کے ساتھ رکھ رکھاؤ اور ظرافت کے ساتھ معنی خیزی ان کی ذہانت اور حاضر دماغی کی دلیل تھی۔ پرائیویٹ زندگی میں وہ کیسے ہی بے تکلف اوریارِشاطر ہوں لیکن پبلک لائف میں اپنے آپ کو لیے دیے رکھنا ان کی طبیعت کا جوہر تھا۔

اس زمانے میں جب کہ پوری دنیا اپنی تمام وسعتوں اور سیاسی وجغرافیائی حدبندیوں کے باجودسمٹ سمٹا کرمثل ایک خاندان یا قبیلہ کے ہوگئی ہے، مرحوم لیاقت علی خان ایسے صلح پسند اورٹھنڈے دماغ کے بلند پایہ سیاسی لیڈر کا دفعتہً انتقال کرجانا صرف پاکستان کا نقصان نہیں اورجن حالات کے باعث یہ انتہائی دردانگیز اورناگوار واقعہ پیش آیا ہے وہ صرف اس ریاست کے لیے بے حدتشویش انگیز نہیں بلکہ یہ نقصان پورے براعظم ایشیا کا نقصان ہے اوراسی طرح یہ صورتِ حال اس براعظم کے ہر ملک اور یہاں کی ہر ریاست کے لیے بے حدتشویش انگیز ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ پورے ایشیا اورخاص طور پر ہند میں اس واقعہ نے رنج اوردکھ کے ساتھ اضطراب وتشویش کی لہر دوڑادی ہے اورتھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تصادم افکار وخیالات کے باعث فضا میں جوتلاطم تھا وہ پُرسکون سا ہوگیا ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا یہ بھی ایک عجیب نکتہ ہے کہ جب کسی ملک یاقوم میں فتنہ و فساد کے عناصر اقتدارِغالب کے مالک ہوجاتے ہیں اورخیر کی طاقتیں ان کے مقابلہ سے عاجز آجاتی ہیں تواب اگر قدرت کواس ملک یاقوم کا قائم رکھنا منظور ہوتا ہے تووہ کسی مردِحق آگاہ وحق پسند کوکھڑا کردیتی ہے اوروہ اپنے خون کے قطروں سے شروفساد کے ان عناصر کی آگ کو بجھانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ چنانچہ کربلا میں جو کچھ ہوااس کے تکوینی اسباب کا جائزہ لینے کے بعد یہ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس وقت ملوکیت نے خلافت کوختم کرکے اسلام کے لیے جو عظیم خطرہ پیدا کردیا تھا، قدرت کے ازلی قانون کے مطابق اس کے دفع کرنے کی صورت بجزاس کے کوئی اورنہ تھی کہ اس عہد کی سب سے زیادہ گراں مایہ وبلند پایہ جان کوبھینٹ چڑھادیا جائے اورظاہر ہے کہ ایک جگر گوشۂ رسول سے زیادہ اورکس کی جان اس وقت زیادہ قیمتی اورگراں مرتبت ہوسکتی تھی۔مرحوم محمد علی جوہر نے اسی حقیقت کوکس بلاغت سے بیان کیا ہے:

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہرکربلا کے بعد

پھر ابھی تقریباً چار سال پہلے سب نے دیکھا ہمارا ملک مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ تنگ نظری ودرندگی کی آگ میں چاروں طرف سے کس طرح پھنس کررہ گیا تھا کہ حکومت تک اس پرقابو پانے میں ناکامیاب رہی تھی لیکن چونکہ قدرت کو اس ملک کا بقا منظور تھا اس لیے اس نے گاندھی جی کی شکل میں اس ملک کی سب سے زیادہ گراں قدر زندگی کو اس آگ کے شعلوں کے نذر کردیا، جس کا نتیجہ ہرایک کے سامنے ہے کہ ایسا ہوتے ہی شر وفساد کے دیوتاؤں کی پیشانی پر پسینہ سا آگیا اورانھوں نے شرما کرجھٹ اپنی تلواریں میان میں کرلیں۔

مرحوم لیاقت علی خاں کا قتل بھی کچھ اسی نوع کے حالات وواقعات میں ہوا ہے، مغلوب الجذباتیت کے باعث پاکستان میں جو یک بیک نہایت شدید قسم کی بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی غالباً اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوسکتے تھے، اگر اس ملک کی اس متاع عزیز کو قدرت کی طرف سے اپنی نقدِ جان پیش کرنے کی دعوت نہ دی جاتی۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مطلع پر شک وشبہ، بے اعتمادی و جذبات پروری کے جو بادل چھا گئے تھے وہ کچھ چھٹ سے گئے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی نیند کے ماتے کو جھنجھوڑ کر اچانک خواب سے بیدار اور غفلت سے ہوشیار کردیا گیا ہے، قرآن مجید کا ارشاد: وَ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّ ھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ [البقرہ:۲۱۶] اسی حقیقت کی طرف رہبری کرتا ہے۔ پس خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو قدرت کی طرف سے اس طرح کی نازل کی ہوئی عبرتوں اور تنبیہوں سے سبق لیتے ہیں اور اپنے کردار وفکر میں تبدیلی پیدا کرکے عدل و انصاف اور سچائی کے راستے پر گامزن ہوجاتے ہیں۔

ہم کو اپنے بھائیوں کے اس صدمۂ جاں کاہ میں ان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم شہید کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں اور رحمتوں سے سرفراز فرمائے اور جو امانت وہ قوم کے سپرد کرگئے ہیں وہ ہر بلا کی چشم زخم سے محفوظ رہ کر ایک صالح اور عدل پرور سوسائٹی کے پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔ [نومبر ۱۹۵۱ء]

حسن، مولانا سید مرتضیٰ

مولانا سید مرتضیٰ حسن

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ میں جناب سید مرتضیٰ حسن صاحب کم و بیش پچانوے سال کی عمر میں اپنے وطن چاندپور ضلع مرادآباد میں اور جناب نہال سیوہاروی نے کراچی میں وفات پائی۔ مولانا مرحوم اکابر علمائے دیوبند میں سے تھے۔ علاوہ علم وفضل کے بڑے خوش بیان مقرر، کامیاب مناظر اور واعظ تھے۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں مرحوم کی تقریروں کی جن میں حقیقت وظرافت دونوں کا خوش گوار امتزاج ہوتا تھا ملک بھر میں دھوم تھی۔ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ مہتمم اوّل دارالعلوم دیوبند سے نسبتِ روحانی تھی اور اس تقریب سے قطبِ وقت حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سے تعلقِ خاص رکھتے تھے اور قطبِ عالم حضرت مولانا گنگوہیؒ کی مجلس علمی وروحانی کے مخصوص ہم نشینوں میں داخل تھے، اس لیے ذکر ومراقبہ کا شغل بھی رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک مدرسۂ امدادیہ مرادآباد کے روح رواں رہے۔ ۱۹۲۰ء میں پھر دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات ہوکر چلے گئے۔ اب ادھر پندرہ سولہ سال سے عملاً خانہ نشین ہوگئے تھے۔ خود بزرگ تھے اور بزرگوں کی نشانی تھے، سینکڑوں ہزاروں علما جن میں مولانا سید سلیمان ندوی ایسے بلند پایہ عالم بھی شامل ہیں، ان کے فیض تلمذ سے مستفید ہوئے۔ حق تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ [جنوری ۱۹۵۲ء]

نہالؔ سیوہاروی

نہالؔ سیوہاروی

جناب نہالؔ سیوہاروی کی شہرت کا آغاز ''برہان کے شاعر خاص'' کی حیثیت سے ہوا جس میں تقسیم ہند سے قبل وہ بالالتزام غزلیں اور نظمیں لکھتے رہے۔ مرحوم کا ذوقِ شعر وسخن اور ملکۂ شعر گوئی فطری اور وہبی تھا جس کو انھوں نے خلاف طبع معمولی سی سرکاری ملازمت کے باوجود مسلسل مطالعہ اور مشق ومزاولت کے ذریعہ جلا دے کر اتنا اجاگر کرلیا تھا کہ ان کا شمار پختہ کار اور صاحب فن اساتذہ کے زمرہ میں ہونے لگا تھا۔ ان کے کلام میں دردوداثر، سوز وگداز، عمقِ خیال، نزاکتِ احساس اور لطافت وشستگیِ بیان، جو حسنِ شعر کی جان ہیں یہ سب اوصاف پائے جاتے تھے۔ علاوہ سینکڑوں منتشر غزلوں اور نظموں کے آزادی پر ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ مکتبۂ برہان سے اور نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ ''شباب و انقلاب'' کے نام سے دلی کے ہی کسی ایک مکتبہ کی طرف سے شائع ہوچکے ہیں۔

؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

[جنوری ۱۹۵۲ء]

عثمانی، مولانا یعقوب الرحمٰن

مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی

افسوس ہے کہ ہماری بزم احباب کی ایک شمع دل فروز اٹھ گئی یعنی مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی نے ۵۴ سال کی عمر میں ۱۰/فروری کو اپنے وطن دیوبند میں انتقال کیا۔ مرحوم دیوبند کے عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اس تقریب سے مولانا مفتی عزیز الرحمٰن اور حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھتیجے تھے۔ ذہانت وفطانت ان کا خاندانی ورثہ اور علم وادب کے ساتھ لگاؤ ان کا آبائی ترکہ تھا۔ اسلامی علوم وفنون کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی اور ہمیشہ اپنی جماعت میں ممتاز رہے۔ فراغت کے بعد دو ایک سال یہیں معین المدرس رہے

اور پھر حیدرآباد چلے گئے، جہاں پہلے عرصہ تک ورنگل کالج میں پروفیسر رہے اور اس کے بعد جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات کے استاذ ہوگئے۔ آخر ایک سال ہوا کہ یہیں سے پنشن لے کر وطن مالوف میں آبسے۔ عمائد دارالعلوم دیوبند نے مرحوم کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو جمعیۃ طلبائے دارالعلوم کا نگراں کار مقرر کردیا۔ اس عہدہ پر کام کرتے ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اجل کا پیام آپہنچا۔

قدرت نے مرحوم کو گوناگوں صلاحیتوں اور قابلیتوں سے نوازا تھا، حسن تقریر وخطابت کا جوہر ان میں فطری تھا اور طالب علمی کے دور میں بھی مسلسل مشق وتمرین کے ذریعہ انھوں نے اس میں اتنا کمال پیدا کرلیا تھا کہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ملک کے مختلف گوشوں میں جو جلسے ہوتے تھے ان میں دارالعلوم دیوبند کے نمایندہ کی حیثیت سے شرکت کرتے اور حاضرین سے حسن خطابت کی داد لیتے تھے۔ اردو میں شعر بھی کہتے تھے، تصنیف وتالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے، نئی معلومات کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کا بہت اچھا سلیقہ تھا۔ کلام اقبال کے والہ وشیدا تھے اور حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بعض خاص خاص ارباب ذوق طلبا اور غیر طلبا کو باقاعدہ اس کا درس بھی دیتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید کے ساتھ مرحوم کو بڑا شغف تھا۔ مختلف تفسیریں ہمیشہ ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں اور خود بھی اکثر قرآنی حقائق پر غور وفکر کرتے اور ان کا مذاکرہ رکھتے تھے! اسی شغف کا نتیجہ تھا کہ فرائض ملازمت کے علاوہ پرائیویٹ طریقہ سے محلّہ کی مسجد میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ دیوبند آنے کے بعد ان کی صحت بہت مضمحل ہوگئی تھی لیکن یہاں بھی پابندی اور بڑے ذوق شوق کے ساتھ انھوں نے اس مشغلۂ مقدسہ کو جاری رکھا۔ درس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ محلّہ اور آس پاس کے مسلمانوں مرد اور عورتیں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے اور فیض حاصل کرتے تھے۔ غالباً ان کا پروگرام قرآن مجید کی ایک مکمل تفسیر لکھنے بھی تھا اور اس کے لیے انھوں نے دیوبند میں ایک مستقل ادارہ قایم بھی کیا تھا اور اس سلسلہ میں 'فیض الرحمٰن' کے نام سے ایک کتاب شایع بھی کر چکے تھے، جس پر مختلف اخبارات اور رسائل میں بہت اچھا اظہار رائے کیا گیا ہے۔

اخلاق وعادات کے لحاظ سے وہ ایک گلِ سدابہار تھے، اخلاص ووفا کا پیکر اور محبت ومروت کی تصویر تھے، دوستوں کی محفل کی رونق اور چشم آشناؤں کی بزم کی زینت تھے۔ سانولا سلونا رنگ، متوسط قد وقامت، بڑی بڑی اور خمار آگیں آنکھیں، خندہ جبیں ولعل شکریں۔ جس سے جو تعلق اور ربط تھا اسے دم کے ساتھ نباہتے تھے۔ باتیں کرتے تو پھول جھڑتے تھے، کسی مسئلہ پر تقریر کرتے تو موتی بکھرتے، ہر بات میں ایک آن اور ہر آن میں ایک نئی شان تھی، مزاج میں لطافت اور طبیعت میں نفاست پسندی تھی، خوش خوراک وخوش لباس تھے۔ معاشی زندگی کے امروز میں فکر فردا سے بے نیاز رہتے تھے اور اس اعتبار سے وہ ہو بہو اس شعر کے مصداق تھے:

غمِ زندگی، رمِ زندگی، سمِ زندگی، دمِ زندگی
غمِ دم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری!!

اور یہی وجہ ہے کہ عمر بھر متوسط درجہ کی خوشحال زندگی بسر کرنے کے باوجود اب وہ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں تو اس طرح کہ ان کی بیوہ اور ان کے بچوں کے لیے بہ ظاہر کوئی وسیلہ معاش نہیں ہے۔ حق تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں صلحا وابرار کا مقام جلیل عطا فرمائے اور اپنی کریمی ورحیمی کے طفیل پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق اور ان کی مشکلات کو آسان فرمائے۔ آمین [مارچ ۱۹۵۲ء]

احمد، حافظ ضیاء الدین

حافظ ضیاء الدین احمد

افسوس ہے پچھلے مہینہ حافظ ضیاء الدین احمد صاحب ایڈیٹر ندائے حرم کراچی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم مدرسہ صولتیہ مکہ معظّمہ کے صدر دفتر کے انچارج تھے۔ قرول باغ دہلی میں ان کا دفتر دفترِ برہان کے پڑوس میں تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہم سے قرول باغ چھٹا تو مرحوم اس ملک کو ہی خیر باد کہہ کر کراچی میں جا بیٹھے۔ وہ اگرچہ ضابطہ کے عالم نہیں تھے لیکن بڑی اچھی سمجھ بوجھ اور اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت رکھتے تھے۔ مہمان نوازی، تواضع اور فراغ حوصلگی و سیر چشمی ان کی طبیعت تھی۔ قرآن مجید کے صرف حافظ ہی نہیں تھے بلکہ اس کے عاشق بھی تھے۔ روزانہ خود پابندی کے ساتھ اس کا ورد کرتے تھے اور اپنی اولاد کو بھی تلاوت قرآن کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو ابرار وصلحاء کا مقام عطا فرمائے اور مدرسہ صولتیہ کی اس شاخ کو مرحوم جیسے منتظم کے اٹھ جانے کے باعث کسی قسم کا چشم زخم پہنچنے سے محفوظ رکھے۔ آمین [مئی ۱۹۵۲ء]

حسین، ڈاکٹر ابرار

ڈاکٹر ابرار حسین

قارئین برہان کو یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنائی جارہی ہے کہ پچھلے

مہینے جولائی کی بارہ تاریخ کو دوپہر کے قریب برہان کے مدیر اعلیٰ برادر عزیز مولانا سعید احمد کے والد ماجد جناب ڈاکٹر ابرار حسین صاحب قبلہ مراد آباد میں رحلت فرما گئے۔انا للہ وانالیہ راجعون۔

مرحوم نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب اور نامور ڈاکٹر تھے بلکہ بہت سے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے اکابر کی یادگار سمجھے جاتے تھے۔مولانا سعید احمد کے تعلق سے وہ مجھے بھی اپنی اولاد کی طرح جانتے تھے اور اس تقریب سے مجھے بہت قریب سے ان کی زندگی کو پڑھنے کو موقع ملا، اوّل درجے کے متبع شریعت، راسخ العقیدہ، فرائض وواجبات ہی کے نہیں مستحبات وآداب تک کے پابند، بڑے فرض شناس اور عاشق رسول۔انقلاب ۴۷ء اور دہلی چھوڑ دینے کے بعد بھی تین چار دفعہ یہاں تشریف لائے، پیرانہ سالی اور انتہائی نقاہت کے باوجود اسی پہلی سی آن بان کے ساتھ پابند اوقات، ان کی خدمت میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اباجیؒ کے پاس بیٹھا ہوا ہوں اُسی انداز کی محبت، اُسی طرح کی بزرگانہ شفقتیں، ان کو دیکھ کر قلب میں عجیب طرح کا سکون محسوس ہوتا تھا، ہر ضروری بات میں مجھ سے مشورہ لیتے اور اس کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔مرحوم کی زندہ جاوید یادگار خود ان کے اکلوتے صاحبزادے مولانا سعید احمد ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے فیوض کو تا دیر قائم رکھے اور ایسی لائق وفائق اولاد ہر مسلمان کو نصیب ہو۔

میں نے جناب ڈاکٹر صاحب قبلہ مرحوم کے ضروری حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لیے برادر عزیز کو خط لکھا، جواب میں ان کی جو تحریر آئی ہے اس کے اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

''ابا کی پیدائش بچھرایوں میں ہوئی، والد کا نام حکیم غلام نیاز تھا جو مراد آباد ضلع کے مشہور طبیب تھے۔ مڈل پاس کر کے نواب حسن پور کے ہاں اتالیق ہو گئے۔مگر کچھ دنوں بعد خیال آیا کہ اس طرح زندگی گزارنا تو شیوۂ مردانگی نہیں ہے، اس لیے والد، والدہ اور سب گھر والوں کی مرضی کے خلاف چپکے سے آگرہ آ گئے اور آگرہ میڈیکل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ گھر والوں کو خبر نہیں کی تھی اس لیے ٹیوشن کر کے اپنے ذاتی اور تعلیم کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ چار سال اسی حالت میں گزرانے کے بعد جب ڈاکٹری کی ڈگری مل گئی تو گھر والوں کو اطلاع کی۔شروع ایام ملازمت میں منگلور، ہردوئی، جھانسی اور اعظم گڑھ میں رہے۔آخر آگرہ کے لوہامنڈی کے شفاخانہ میں ملازم ہو کر ایسے جمے کہ یہاں پچیس سال ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں ریٹائرڈ ہو گئے۔

منگلور کے زمانۂ قیام میں قاضی عبدالغنی صاحب مرحوم سے بیعت ہوئے، علمائے دیوبند کے نام کے عاشق تھے۔علی الخصوص حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی سے بے حد محبت تھی اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، حضرت میاں اصغر حسین صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب سے گہرے مراسم تھے۔دیوبند کے مشہور جلسہ دستار بندی میں بڑے ذوق شوق سے شریک ہوئے اور مولوی عبدالرحیم پشاوری، جو دورہ میں فرسٹ آئے تھے ان کو کچھ روپیہ نقد اور صحیح بخاری کی دونوں جلدیں اپنی طرف سے دی تھیں۔ ان کی دینداری اور نیکی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے آگرہ کے کامیاب اور مشہور ڈاکٹر ہونے کے باوجود مجھ کو انگریزی کے بجائے عربی پڑھائی اور عالم بنایا، حالانکہ اس پر ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا اور آگرہ میں ان کا مشہور پتہ یہی تھا کہ وہ ڈاکٹر جنہوں نے اس زمانہ میں اپنے لڑکے کو عربی پڑھائی ہے لیکن انہوں نے اس کی ذرہ پروا نہیں کی اور میری عربی تعلیم پر وہی خرچ کیا جو وہ میری انگریزی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے۔اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے کہ مجھ سے پہلے ابا کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے تھے، جن کا نوعمری میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بعد مسلسل سترہ سال تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی یہاں تک کہ انہوں نے ترک ملازمت اور ہجرت کا قصد کر لیا۔مگر جب قاضی صاحب مرحوم کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے منع لکھ بھیجا اور ساتھ ہی خوشخبری دی کہ ان کے ہاں لڑکا ہوگا۔چنانچہ اس بشارت کے چند سال بعد ۱۸ء[۱۹۰۸ء] کے رمضان کی ۷/ تاریخ کو صبح صادق کے وقت میں پیدا ہوا تو ولادت سے دو گھنٹہ قبل ابا نے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کو خواب میں دیکھا کہ لوہا منڈی کے شفاخانہ میں تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں: ''ڈاکٹر! لڑکا مبارک! اس کا نام سعید رکھنا۔'' چنانچہ ابا نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں بچہ کو دیوبند بھیج کر عالم بناؤں گا۔غرض کہ ایک معزز سرکاری عہدہ پر فائز ہونے، معقول آمدنی رکھنے اور آگرہ شہر کے خاص ماحول میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے کو عربی کی تعلیم دلائی۔آمدنی کافی تھی مگر پس انداز کچھ نہیں کرتے تھے۔دوست احباب کہتے کہ کوئی جائیداد خرید لیجیے۔تو فرماتے کہ اگر یہ لڑکا عالم باعمل ہو گیا تو بس یہی میری جائیداد ہے جو آخرت میں بھی کام آئے گی اور اگر میں نے جائیداد خرید بھی لی مگر لڑکا صالح نہیں ہوا تو پھر جائیداد میرے لیے عذاب جہنم ہو جائے گی۔

نماز باجماعت، روزہ اور اوراد وظائف کے سخت پابند تھے۔اب سے تین

چارسال پہلے تک جب کہ وہ بے حد کمزور ہوگئے تھے، تہجد اور اشراق تک کی نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ بقرعید کے دنوں میں کئی کئی بکرے کرتے اور صدقات و خیرات بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ کنبہ پروری، مہمان نوازی اور غریبوں کی مدد ان کا شعار تھا۔ حج خود کیا اور اپنی بیوی اور اولاد کو کرایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مدینہ کے ساتھ انہیں فطری محبت تھی۔ اہل مدینہ کے لیے ہر سال کچھ رقم بھیجتے تھے۔ خود بہت سادہ رہتے تھے، درویش صفت، اور فقر منش طبیعت پائی تھی۔ بیٹے کے ساتھ ان کو محبت نہیں عشق تھا، بات بات پر دعائیں دیتے اور بلائیں لیتے تھے اور اب بھی وہی معاملہ کرتے تھے جو ایک باپ اپنے دو برس کے بچے کے ساتھ کرتا ہے۔ تصوف کا خاص ذوق تھا اور اس فن کے مسائل پر عالمانہ گفتگو کرتے تھے۔ بحیثیت ڈاکٹر اپنے فن میں نہایت کامیاب اور دور دور تک مشہور تھے۔ قدرت نے دستِ شفا عطا فرمایا تھا، نبض دیکھتے ہی مرض کی پوری کیفیت فوراً معلوم کر لیتے تھے اور مریض کے کچھ بغیر ہی بتائے سب حالات وعوارض بیان کر دیتے تھے۔''

کم وبیش ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاری نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

ابرار حسین آنکہ بہ سالک طریقت — بہ سینہ اش منور از نور پاک ایزد
رحلت چو کردنا گہ بودم بفکر سالش — آمدند از غیبم مغفور پاک ایزد

۱۳۷۱ھ

[اگست ۱۹۵۲ء]

دہلوی، مفتی محمد کفایت اللہ

آہ مفتی اعظم ہند!

[مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی]

واحسرتا! ۳۱/ دسمبر ۱۹۵۲ء کو شب کے ساڑھے دس بجے یعنی ٹھیک اس وقت جبکہ ایک سال شمسی اپنی حیاتِ دوازدہ ماہ کی مقررہ مدت پوری کر کے ہمیشہ کے لیے گوشۂ عدم میں آسودۂ سکون ہوجانے کی تیاری کر رہا تھا علم وعمل کے آسمان کا ایک آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا۔ یعنی حضرتنا الاستاذ مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ دہلوی نے اسّی (۸۰) سال کی لگ بھگ عمر میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر جان جان آفریں کے سپرد کی! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب کا وجود گرامی اپنی چند در چند علمی وعملی خوبیوں اور گوناگوں دماغی واخلاقی کمالات کے باعث صرف ہندوستان اور پاکستان کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک متاع گرانمایہ اور سرمایہ بلند پایہ تھا کہ آج اس کے اُٹھ جانے پر جتنا بھی ماتم اور اُس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ حضرت مولانا خود جلیل القدر بزرگ اور بزرگوں کی یادگار تھے، انہیں دیکھ کر اور اُن کی صحبت میں دو چار لمحے گزار کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ قدرت نے اُن میں دل اور دماغ دونوں کی خوبیاں اور ان کے فضائل وکمالات کچھ اس طرح بیک وقت جمع کر دیے تھے کہ اُن کی ہستی ''اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم'' کا مصداق بن گئی تھی۔ وہ ایک طرف بہت بڑے عالم، مفسر، محدث اور فقیہ تھے تو دوسری جانب علوم عربیہ کے جامع تھے اور ان میں بہت ٹھوس استعداد رکھتے تھے۔ پھر معاملات میں سوجھ بوجھ اور سیاسی ودنیوی امور ومسائل میں ان کی فرزانگی ودانشمندی کا یہ عالم تھا کہ جس طرح علما کی بزم کے وہ صدرنشیں تھے اسی طرح ارباب سیاست وتدبیر کی محفل میں بھی اپنا مقام خاص رکھتے تھے ''جو بات کہتے تھے'' اور جو لفظ اُن کے قلم سے نکلتا تھا وہ اس قدر جچا تلا اور نپانپایا ہوتا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے نکتہ چیں کے لیے بھی اُس پر حرف گیری آسان نہ تھی۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے آں مرحوم کو سب ہی علوم اسلامیہ میں غیر معمولی درک و بصیرت اور فہم وفراست عطا فرمائی تھی۔ تاہم آپ کا اصل طغرائے امتیاز تفقہ فی الدین تھا۔ بڑے سے بڑا پیچیدہ مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا اور وہ قرآن وحدیث اور احکام فقہ کی روشنی میں اس کا صحیح حل اس طرح علیٰ وجہ البصیرت معلوم کر لیتے تھے کہ پھر کسی کے لیے اس کا خلاف کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ صفت تھی جس کے باعث ملت بیضاء نے ان کو مفتی اعظم کا خطاب دیا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خطاب کا جامہ ان کے تفقہ کے قامت موزوں پر بالکل چست آتا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کافی غور و خوض اور تفکر وتدبر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے اور اس تفکر کے وقت مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا تھا جو ان کی نظر توجہ سے اوجھل رہ گیا ہو اور پھر ان کا فیصلہ ایسا اٹل اور مستحکم ہوتا تھا کہ اس کو بدلوا دینا ممکن نہ تھا۔ اس حیثیت سے وہ بلاشبہ اسرار وغوامض شریعت کے بڑے محرم اور احکام وتعلیمات اسلام کے ایک دیدہ ور نباض تھے۔ ان کے فتاویٰ مختصر مگر نہایت جامع اور مدلل ہوتے تھے۔ وہ عام ارباب افتا کی طرح اپنی تحریروں میں کتب فقہ کی طول طویل عبارتوں اور مختلف اقوالِ ائمہ کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے مگر جتنا کچھ لکھتے تھے مسئلہ کی اصل روح اور اس کے اصل مغز کا حامل ہوتا تھا۔ اسی بنا پر ۱۹۲۶ء میں مکہ معظّمہ کی موتمر عالم اسلام

میں جمعیۃ علما ہند کے صدر وفد کی حیثیت سے انہوں نے شرکت کی اوراس کے بعد قاہرہ کی موتمر میں تشریف لے گئے توہرجگہ حجازومصر اورعالم اسلام کے دوسرے ملکوں کے علما وفضلا نے آپ کے غیر معمولی تفقہ فی الدین اور اصابتِ رائے کوتسلیم کیا اورآپ کی علمی عظمت و برتری کا اعلانیہ اعتراف کیا۔ قاہرہ کے دورانِ قیام میں آپ کی علمی سیادت کا اعتراف اس سے بڑھ کراور کیا ہوسکتا تھا کہ شیخ جامعہ ازہر علامہ مراغی جو اپنے عہدہ کی حیثیت سے شاہ مصر کے محل میں جانے کے علاوہ اورکسی مکان پر جانہیں سکتے تھے، حضرت مفتی صاحب کی مزاج پرسی کے لیے دومرتبہ آپ کی قیام گاہ پرتشریف لائے، نہ صرف علمائے مصر بلکہ پوری مصری قوم کی طرف سے یہ سب سے بڑا خراجِ عقیدت تھا جو عالمِ اسلام کی کسی عظیم المرتبت ہستی کو پیش کیا جاسکتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب طبعًا نہایت ٹھنڈے دماغ، سنجیدہ فکر، متین طبیعت اورمرنج ومرنجان مزاج کے بزرگ تھے۔ ہنگامہ آفرینی یا انقلاب پسندی سے ان کی طبیعت کوکوئی لگاؤ نہیں تھا۔لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ جدوجہد آزادی کے نہایت نازک دور میں جمعیۃ علماء ہند کے پہلے صدر کی حیثیت سے جب انہوں نے ایک نہایت اہم اور بھاری ذمہ داری اپنے سرلی تو اب وقت آیا کہ ان کی قوت عمل اور کیرکٹر کی پوشیدہ خوبیاں بروئے کارآئیں۔ چنانچہ کانگریس کی تحریکِ آزادی اور جمعیۃ علماء ہند کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تمام مدت میں جس تدبر، فراست، عزم و ہمت، استقلال و پامردی اور راہِ حق میں بے خوفی و بے باکی کا ثبوت دیا ہے، اسے دیکھ کر یہی کہا جاسکتا تھا کہ ''ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔''

حضرت مفتی صاحب کواگر رئیس العلماء یا امیر العلماء کہا جائے تو ایسا کہنا صورۃً ومعنیً، ظاہراً و باطناً، دونوں طرح بالکل موزوں ہوگا۔ کیوں کہ وہ جس طرح علم وفضل کے اعتبار سے سرخیلِ علماء تھے۔ معاشی خوشحالی اور مالی رفاہیت کے لحاظ سے بھی علما میں انہیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔انہوں نے ایک کتب خانہ قائم کرکے خود اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کی۔ پھر ان کی کتاب 'تعلیم الاسلام' کے مختلف حصے گھر گھر اس قدر مقبول ہوئے کہ اب تک لاکھوں کی تعداد میں ان کی اشاعت ہوچکی ہے اور ان کے ذریعہ ہزاروں روپیہ کا ان کو فائدہ ہوا۔ اس مالی رفاہیت اور معاشی فارغ البالی کے باعث وہ نہایت خودداری اور حد درجہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہتے تھے۔خرچ کرنے کے موقع پر بے دریغ خرچ کرتے تھے اوراس معاملہ میں بھی ان کا ہاتھ ہمیشہ اونچا اورارباب تموّل کی امداد سے بے نیاز ومستغنی رہتا تھا۔

مجموعی حیثیت سے حضرت مفتی صاحب کا سب سے بڑا جوہرکمال یہ تھا کہ انہوں نے قدرت کی بخشی ہوئی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کواپنی خاص توجہ اورمحنت سے اس طرح ابھارا اورانہیں پروان چڑھا کر اپنی شخصیت کی تعمیر اس انداز سے کی تھی کہ علم وفضل کے علاوہ وہ اندرون خانہ اور بیرون خانہ زندگی کے کسی کام میں عاجز اورتہی مایہ نہ تھے۔انہوں نے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی دنیا آپ پیدا کی تھی، جو دینی حیثیت سے جس طرح مکمل تھی دنیوی حیثیت سے بھی کہیں سے تشنہ اورخام نہیں تھی۔ چنانچہ گوناگوں علمی و عملی اورروحانی ومعنوی کمالات وفضائل کے علاوہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطاط بھی تھے اورخیاط بھی۔ایک بہترین انجینئر بھی تھے اورطباخ بھی،خوش لباس وخوش غذا تھے اور ورزشی جسم رکھتے تھے۔ملتان جیل میں بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا تو چندروز کی مشق میں ہی سب ساتھیوں پر بازی لے گئے۔حساب دانی میں مشکل سے کوئی عالم اُن کا حریف ہوسکتا تھا۔کبھی کبھی عربی، فارسی اوراردو میں شعر بھی کہتے تھے، بات چونکہ جچی تلی کہنے کے خوگر تھے اس بنا پران کی تقریر اگرچہ پُرمغز اور مدلل ہوتی تھی لیکن ہنگامہ آفریں اورولولہ انگیز نہیں ہوتی تھی۔ بزم احباب میں ایک بذلہ سنج مگر باوقار ومتین یار شاطر اور ارباب معاملہ کی مجلس میں ایک غائر النظر مدبر ومفکر تھے۔ اس حیثیت سے ان کی زندگی بے شبہ علوم دینیہ کے علماوطلبا کے لیے ایک کامیاب نمونۂ عمل اوراس بات کی شہادت تھی کہ علوم عربیہ واسلامیہ کا ایک بوریہ نشین طالب علم اگرچاہے اورکوشش کرے تو قوم کے عطیات اور چندوں سے، سرکاری ملازمت وغیرہ کی غلامی سے بے نیاز ہوکراپنی دنیوی زندگی بھی ایک معیاری اورخوشحال زندگی بنا سکتا ہے۔

صدحیف! کہ اب یہ بزرگ صورتیں۔ یہ علم وعمل کی جیتی جاگتی شکلیں، اسلام کی دیرینہ روایات کی حامل وعلمبردار یہ شخصیتیں، اپنوں اور پرایوں کا غم کھانے والی اور بنی نوع انسان کی ہمدرد وغم گسار یہ ہستیاں روز بروز عنقا ہوتی جارہی ہیں اورایک وقت آئے گا کہ لوگ ان صورتوں کے دیکھنے کوترسیں گے۔ بطنِ ارضی کا خزانہ سے ان سے مالا مال ہوگا لیکن مادرگیتی کی کوک ان سے خالی ہوگی۔ آئندہ نسلیں تاریخ کے صفحات میں ان کے تذکرے پڑھیں گی لیکن ظہر ارض پران کی سی ایک صورت وسیرت بھی نہ ملے گی۔اللھم اغفرہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ وامطرعلیہ شآبیب لطفك السنی و کرمك الھی تامۃً و کاملۃً۔ [جنوری۱۹۵۳ء]

احمد، حاجی شیخ رشید

آہ! حاجی شیخ رشید احمد صاحب مرحوم

۱۹۵۲ء جس کو ''عام الحزن'' کہنا چاہیے اس کی ابتدا بردار مکرم مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی کی وفات کے سانحۂ المناک سے ہوئی اور انتہا حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ قدس سرہ کے حادثۂ ارتحال پر، اسی سال برادر عزیز مولانا سعید احمد کے والد ماجد قبلہ ڈاکٹر ابرار حسین صاحب، محبّ باصفا حافظ ضیاء الدین صاحب مدیر ندائے حرم، قرول باغ کے غمگسار پڑوسی چودھری محمد بخش صاحب اور بچپن کے بے تکلف ساتھی قاری محمد طاہر صاحب ناظم دارالصنائع دارالعلوم دیوبند رخصت ہوئے، یہاں تک کہ ۲ دسمبر کی درمیانی شب میں مخدومی حاجی شیخ رشید احمد صاحب کی بھی رحلت کا حادثہ پیش آ گیا۔

حاجی صاحب سے میرے اور میرے بزرگوں کے تعلقات نہایت ہی قدیم اور نہایت ہی مخلصانہ تھے، کم وبیش ۴۵ سال سے شرفِ نیاز حاصل تھا، مسرت وغم کے ہر موقع پر ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔

ابھی کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب مارچ ۱۹۱۸ء میں بزرگان میرٹھ کا یہ قافلہ بڑے اہتمام وشوق سے میرے نکاح میں شریک ہونے کے لیے دیوبند آیا تھا۔ اسی کا یہ اثر ہوا کہ ۳۵ سال کے بعد جب گذشتہ ۲۸/۲۹ نومبر کو برخوردار مجیب الرحمٰن کی تقریب شادی ہوئی تو اس وقت جو بزرگ خاص طور پر یاد آئے اور جن کے شریک نہ ہونے کا قلب پر خاص اثر ہوا اُن میں ایک حاجی صاحب مرحوم ومغفور بھی تھے، انسان کی بے خبری وبے بسی کا بھی کیا عالم ہے اور اس دنیا کی عجوبہ کاریوں کا بھی کیا ٹھکانا ہے کہ ہم دیوبند میں تقریب کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے اور حاجی صاحب مرحوم ملاء اعلیٰ کے لیے رخت سفر باندھ رہے تھے۔ ''فیالِلاَسف''

مرحوم شروع میں الٰہی بخش اینڈ کمپنی میرٹھ میں ایک ملازم کی حیثیت سے آئے تھے پھر اپنی غیر معمولی قابلیت، محنت اور دیانت شعاری کی بدولت جلد ہی کمپنی کے شریکِ منفعت ہوگئے اور پھر چند سال کے بعد ایک باوفا اور باوقار شریک کی حیثیت سے الٰہی بخش اینڈ کو دہلی کے کاروبار کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے۔ آپ کی بہترین نگرانی میں حافظ فصیح الدین صاحب مرحوم کی اس تاریخی فرم نے جلد جلد ترقی کی منزلیں طے کیں اور اس کا شمار دہلی کی چوٹی کی فرموں میں ہونے لگا۔

حاجی صاحب کو قدرت نے جن گوناگوں صلاحیتوں اور قابلیتوں سے نوازا تھا قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار کی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ قومی اور ملّی کاموں میں بھی زبردست حصہ لینے لگے اور چند ہی سال میں دہلی کی شہری زندگی کے مختلف گوشوں پر چھا گئے، شہر کے سب سے بڑے سماجی ادارے میونسپل بورڈ میں ان کی خدمات نہایت نمایاں رہتی تھیں اور اس کے طریق کار میں ان کی رائے کا بڑا دخل ہوتا تھا، چونکہ اوّل درجے کے راسخ العقیدہ اور پابند اوقات مسلمان تھے دنیوی خدمتوں کے ساتھ علم دین کی خدمت بھی بڑے شوق اور ولولے سے کرتے تھے۔ سالہا سال حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے ساتھ مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مہتمم رہے اور مدرسہ کے تمام شعبے بڑی قابلیت سے چلائے، دہلی پنجابی مسلم ہائی اسکول اور فتح پوری مسلم ہائی اسکول کے برسوں سربراہِ کار رہے، مدرسہ سہارنپور کے سرپرست خصوصی اور دارالعلوم دیوبند کے مجلس شوریٰ کے سرگرم اور بیدار دماغ رکن تھے۔ بڑے صاحب خیر تھے اور اچھے کام میں کھلے دل سے حصّہ لیتے تھے، وضع داری کے پیکر، ذی مروت، بااخلاق، کشادہ دماغ وکشادہ جبین، رونق محفل اور بہار چمن۔

ندوۃ المصنفین سے خاص علاقہ رکھتے تھے اور اس کی خدمات کی سنجیدگی اور اہمیت کا قولی ہی نہیں عملی اعتراف کیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی کی بہار لٹی تو یہ سروِ گلستان بھی چٹا گانگ کی رونق بنا اور اسی شان اور آن بان کے ساتھ زندگی بسر کی، یہاں کی طرح وہاں بھی تمام دینی اور دنیوی مشاغل میں منہمک رہے، وہی سرکاری مناصب، وہی مدارس دینی کی دیکھ بھال، وہی اعمالِ صالحہ کی جستجو، وہی شوق حج وزیارت اور وہی کاروباری شغف۔ آخری ملاقات ۱۹۴۹ء میں مدینہ منورہ میں ہوئی تھی اور آخری مکتوب ''جامع المجد دین'' پر تنقید کے سلسلہ میں آیا تھا جس کی سطر سطر محبت واخلاص کے پھولوں میں بسی ہوئی تھی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

خاتمہ بھی ایسا ہوا کہ ہر مسلمان کو اس کی دعا کرنی چاہیے، اس سلسلہ میں مرحوم کے منجھلے صاحبزادے اور میرے مخلص دوست برادرم حاجی شیخ انیس احمد صاحب کے ایک طویل خط کی آخری سطریں سننے کے لائق ہیں: ''یکم دسمبر کی صبح فرمانے لگے کہ اب تو آپریشن بھی ہوگیا مواد بھی خارج ہوگیا۔ ڈاکٹر جو کچھ کر سکتے تھے کرلیا بخار پھر بھی ہونے لگا تم لوگ مجھ کو میری حالت پر چھوڑ دو جو حق تعالیٰ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔'' اسی دن ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کو جو بہت متقی، پرہیزگار اور صوم صلوٰۃ کے پابند ہیں خاص طور پر بلایا اور فرمایا کہ: ''سب ڈاکٹروں نے کوششیں کرلی ہیں اب میں چاہتا ہوں کہ آپ علاج کی ذمہ داری لے لیں

اور جو کچھ بھی ہو آپ کے ہاتھوں میں ہو، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو آپ ہی کے ہاتھوں شفا ہوگی کیونکہ آپ ماشاء اللہ متقی اور محتاط مسلمان ہیں۔'' ۲ دسمبر (۱۲۔۱۳ ربیع الاول) کی درمیانی شب میں حسب معمول صبح ۴ بجے اُٹھے ضروریات سے فارغ ہوکر تیمّم کیا۔اسی وقت وہی ڈاکٹر صاحب انجکشن لگانے آئے تو فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب پانچ منٹ ٹھہریئے۔میں نوافل سے فارغ ہوجاؤں تو انجکشن لگادیں، تہجد کے نوافل کے لیے نیت کی اوراسی حالت میں حرکت قلب بند ہوگئی، میں ان کے پاس موجود تھا، ڈاکٹر صاحب کو آواز دی وہ دوڑے نبض کا پتہ نہ ملا۔قلب کو دیکھا وہاں بھی کچھ نہ پایا۔ایک ہچکی آئی اور ساتھ ہی کلمہ طیبہ کی آواز بھی۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔آناً فاناً سب کچھ ہوگیا ایک منٹ پہلے بھی وہم وگمان نہ تھا کہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہورہے ہیں، انھیں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں جان دی اور ان کی خواہش پوری ہوئی کہ'' جو کچھ بھی ہو آپ ہی کے ہاتھوں ہو۔'' ڈاکٹر صاحب بھی حیران رہ گئے کہ اتنی آسانی سے جان نکلتی ہوئی میں نے کسی کی نہیں دیکھی۔''

اللہ پاک حضرت قبلہ کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازیں، حضرت مرحوم برہان بڑی پابندی سے پڑھا کرتے تھے اور جب رسالہ کے آنے میں دیر لگ جاتی تھی تو دریافت فرمایا کرتے تھے کہ اب تک رسالہ کیوں نہیں آیا۔برہان کی مطبوعات بھی برابر زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ [فروری ۱۹۵۳ء]

علی، آصف

آصف علی

افسوس ہے پچھلے چند گھنٹوں کے فصل سے ہندوستان کی عموماً اور دہلی کی خصوصاً دو نامور ہستیوں نے اس دنیا کو خیرآباد کہا۔آصف علی مرحوم نے وطن سے بہت دور دیار غیر میں جان جان آفریں کو سپرد کی لیکن وطن کی خاک نے یہ کشش دکھائی کہ ان کی نعش ہوائی جہاز کے ذریعہ سوئٹزرلینڈ سے دہلی پہنچی اور شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی اور وہ دونوں یہیں دفن ہوئے۔سیاسی مسلک کے علاوہ دلّی کی خاص وضع داری اور شرافت، خوش اخلاقی اور وسعت ظرف وعالی حوصلگی کے اعتبار سے دونوں میں بہت کچھ مشابہت ومماثلت تھی تاہم ہر ایک کی چند خصوصیات تھیں جن کے باعث دونوں اپنا اپنا الگ مقام رکھتے تھے۔آصف صاحب نہایت ذہین انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے خوش بیان مقرر اور ادیب تھے اور اردو زبان کے خوش گو شاعر بھی تھے، چنانچہ انجمن ترقی اردو ہند کے سہ ماہی رسالہ 'اردو' کے ابتدائی دور میں ان کی بعض نظمیں شایع ہوئی تھیں۔اردو طرز تحریر میں ان پر ٹیگوریت غالب تھی جس کا ثبوت ان کی کتاب 'پرچھائیں' سے ملتا ہے۔تحریک آزادی کے زمانہ میں ان کا شمار صف اوّل کے کانگریسیوں میں رہا۔آزادی حاصل ہونے کے بعد وہ امریکہ میں ہندوستان کے سفیر رہے پھر اڑیسہ کے گورنر بنادیے گئے اور اب آخر میں سوئٹزرلینڈ میں اپنے ملک کی سفارت کی خدمات انجام دے رہے تھے کہ اسی عہدہ پر داعی اجل کو لبیک کہا ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

[مئی ۱۹۵۳ء]

قدوائی، شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن قدوائی

شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی اگرچہ آصف علی صاحب کی طرح آل انڈیا شہرت کے مالک نہیں تھے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ نہایت مخلص قومی کارکن تھے۔ملک کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں وہ جیل بھی گئے، لیکن وہ طبعاً ہنگامہ پسند اور اسٹیج کے لیڈر نہیں تھے، خاموشی مگر نہایت مستعدی اور گرم جوشی کے ساتھ ٹھوس اور تعمیری کام کرنے کے عادی تھے۔انھیں سب سے زیادہ دلچسپی تعلیم بالغان کے کام سے تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے جس بیدار مغزی، تن دہی اور قوت تنظیم و عملی سرگرمی کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی تاریخ حیات کا روشن باب ہے۔اسی بنا پر یونیسکو کی طرف سے وہ انڈونیشیا میں تعلیم بالغان کے ناظم اعلیٰ بنا کر بھیجے گئے، وہاں سے واپسی پر دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیم منتخب ہوگئے۔اس حیثیت سے ان کا ایک یادگار کارنامہ یہ ہے کہ اردو زبان دلّی کی علاقائی زبان تسلیم کرلی گئی لیکن غالباً ان کی آزاد طبیعت وزارت کی گراں بار ذمہ داریوں کی متحمل نہیں ہوسکی۔اور وہ چند ماہ بیمار کر ۵۲، ۵۳ سال کی عمر میں ہی عالم جاودانی کو سدھار گئے۔نجی زندگی میں مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔نماز روزہ اور اسلامی شعائر کے پابند، نہایت سادہ اور بے تکلف، ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور خلوص کا تعلق رکھنے والے، بڑے ملنسار اور ہنس مکھ، متواضع اور بامروت، ذہین اور معتدل المزاج۔حق تعالیٰ ان پر اپنے انوار وبرکات کا نزول فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو مقام عطا فرمائے۔ [مئی ۱۹۵۳ء]

ابن سعود، سلطان

سلطان ابن سعود

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں عالم اسلام کی دو نامور شخصیتوں سلطان ابن سعود

اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس عالم آب وگل کو خیر باد کہہ کر عالم آخرت کی راہ لی۔ حجاز کی سرزمین قدس مہبط وحی، حامل بیت اللہ اور مولد و استراحت گاہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور اسی بنا پر اس کی خاک مسلمانوں کی جبین عقیدت وارادت کی افشاں اور اُس کا ذرہ ذرہ اُن کی آنکھوں کا تارا ہے۔ اس نسبت سے مسلمانوں کو سلطان مرحوم کے ساتھ بھی کہ وہ پاسبان حرم ہونے کا شرف رکھتے تھے، قلبی وروحانی تعلق تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم میں ذاتی طور پر چند در چند ایسے اوصاف وکمالات تھے جن کے باعث تمام مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی بڑی عزت وعظمت تھی۔ عادات وخصائل، طبعی میلان ورحجان اور ظاہر و باطن کے لحاظ سے وہ اور اُن کی حکومت متنبّی کے اس شعر کے مصداق تھے:

حسن الحضارة مجلوب" بتطرية وفي البدواة حسن غير مجلوب

مرحوم سیاسی اعتبار سے نہایت مدبر، بیدار مغز اور روشن دماغ و مستقل مزاج تھے۔ اُن کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ حجاز صحیح معنیٰ میں بلداًا مناً اور اس کا حرم درحقیقت مسلمانوں کے لیے حرم بن گیا۔ انھوں نے فتنہ پرور ومفسد قبائل کی سرکوبی کر کے پورے ملک میں امن وامان اس طرح قائم کر دیا تھا کہ ایک بڑھیا بھی تن تنہا اپنے مال واسباب کے ساتھ مکہ معظّمہ تک بے خوف وخطر سفر کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مرحوم نے حرمین شریفین کے باشندوں کے لیے دینی و دنیوی تعلیم کا بندوبست کیا اور اُن کی اقتصادی زبوں حالی جو اُن کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھی اُس کا مداوا اس طرح کیا کہ آج وہاں فارغ البالی اور معاشی رفاہیت وخوش حالی کا دور دورہ ہے۔ حجاج کی راحت وآسائش کا سلطان مرحوم کو خاص خیال رہتا تھا اور اس سلسلہ میں وہ ایام حج میں صحت وصفائی، پانی کی فراوانی اور دوسری اشیاءِ ضرورت کی فراہمی کا جو انتظام کرتے تھے وہ اُن کی فرض شناسی کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ انھی اوصاف وکمالات کی بنا پر اُنھیں عالم اسلام کا اعتماد حاصل تھا اور ہر جگہ انھیں بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اللہ آں مرحوم کو بخشش ومغفرت سے نوازے اور اُن کی قبر ٹھنڈی رکھے اور ان کے جانشین کو صحیح معنیٰ میں اُن کی طرح حرم کا امین و پاسبان بنائے۔ آمین

[دسمبر ۱۹۵۳ء]

ندوی، مولانا سید سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی طبقۂ علما میں وسیع النظر عالم، محققین میں بلند پایہ محقق اور مصنفین میں ایک گرامی مرتبت مصنف تھے، وہ جس طرح قدیم تعلیم یافتہ گروہ کے اکابر میں شمار ہوتے تھے اسی طرح تعلیم جدید کے طبقہ میں بھی اُن کو بڑا وقار اور مرتبہ حاصل تھا۔ ندوۃ العلما سے فارغ ہونے کے بعد مولانا شبلی جو مردم شناسی اور جوہر قابل کی قدردانی میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے، اُن کے فیضان تعلیم وتربیت نے مولانا سید سلیمان ندوی کو استاد کا جانشین بنا دیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے جانشینی کا حق جس خوبی سے ادا کیا ہے کسی شاگرد نے کم کیا ہوگا۔ انھوں نے سیرۃ النبی کے نام سے، جیسا کہ وہ خود فرماتے تھے، درحقیقت اسلام کی ایک نہایت مستند، مفصل اور مبسوط انسائیکلوپیڈیا لکھی۔ قرآن مجید کے تاریخی وجغرافیائی مباحث پر ان کی کتاب 'ارض القرآن' اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ''عرب وہند کے تعلقات''، ''عربوں کی جہاز رانی'' اور ''عمر خیام'' پر اُنھوں نے جو دادِ تحقیق دی ہے، وہ اُن کی قبائے علم وفضل کا تکمۂ زریں ہے۔ مستقل بلند پایہ تصنیفات کے علاوہ مختلف تاریخی، مذہبی، ادبی اور لسانی وتنقیدی مباحث پر اُن کے قلم سے وقتاً فوقتاً جو مقالات یا چھوٹے چھوٹے رسالے نکلتے رہے ہیں وہ ان مباحث کے طلبا اور علما کے لیے شمع راہ کا کام عرصہ تک دیتے رہیں گے۔ ان ذاتی علمی وتحقیقی کارناموں کے علاوہ آں مرحوم کا سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دار المصنفین میں اپنے فیض تعلیم وتربیت سے ارباب قلم علما کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس کے تصنیفی کارناموں کی بدولت اسلامی تاریخ، اسلامی علوم وفنون اور اسلامی ادبیات کا ایک گراں قدر ذخیرہ بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مولانا مرحوم نے اس حیثیت سے اردو زبان کی خصوصاً اور اسلامی علوم وفنون کی عموماً وہ شاندار خدمات انجام دی ہیں جن پر اردو زبان وادب کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے اور جو بہت سے ممالک اسلامیہ کے لیے لائق رشک ہے۔ مولانا کی تصنیفی زبان اردو تھی اُنھوں نے خود جو کچھ لکھا اسی زبان میں لکھا لیکن اُن کی تصنیفات وتالیفات اور اُن کے علم وفضل کی شہرت دوسرے ممالک میں بھی پہنچی اور وہ حجاز، مصر، ایران، ترکی اور افغانستان میں بھی بڑی قدر اور عظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ادھر کم وبیش پندرہ سال سے جب وہ حضرت مولانا تھانویؒ کے دامان ارشاد و ہدایت سے وابستہ ہوئے تھے، تصنیف وتالیف کے بجائے تصفیۂ نفس اور تزکیۂ باطن کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی تھی اور اس میں اس درجہ غلو ہو گیا تھا کہ اعمال و وظائف باطنی کے علاوہ وہ خود اپنے عمر بھر کے کارناموں کو غیر وقیع سمجھنے لگے

تھے۔ بہرحال اُن کے کارنامے علم وتحقیق کی دنیا میں ایک مستقل مقام رکھتے ہیں اور اُن کی افادیت مسلم ہے۔

مولانا مرحوم کی یہ خصوصیت بھی لائق ذکر ہے کہ خالص علمی اور تحقیقی کام کے ساتھ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تعلیمی اور سیاسی تحریکات میں بھی برابر کے شریک رہے۔ جلسوں میں صدارت کرتے تھے، تقریریں کرتے تھے اور ان تمام معاملات میں عملی شرکت کرتے تھے۔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے منکسر المزاج، خوش طبع اور بذلہ سنج تھے۔ بہت دھیمی آواز میں چھوٹے چھوٹے فقرے جو بعض صنعت ایہام کے حامل ہوتے تھے بولنے کے عادی تھے۔ مولانا کی وفات سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے اُس کا پُر ہونا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ دین وعلم کے اس مخلص خادم کو جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے۔ آمین۔

[دسمبر ۱۹۵۳ء]

علی، عبداللہ یوسف

عبداللہ یوسف علی

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں ہماری گزشتہ قومی زندگی کا ایک اور ستون گر گیا یعنی مسٹر عبداللہ یوسف علی نے لندن میں وفات پائی۔ مرحوم انگریزی زبان کے نامور انشا پرداز، مشہور ماہر تعلیم اور متعدد بلند پایہ کتابوں کے نامور مصنف تھے۔ انڈین سول سروس سے الگ ہونے کے بعد وہ دومرتبہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہوئے اور یہیں ان کے دل ودماغ میں یکا یک ایک عجیب مذہبی اور دینی انقلاب ہوا۔ جس کے باعث انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ ترجمہ کی زبان کس قدر اعلیٰ اور بلند پایہ ہے اس کی داد وہی دیں گے جن کو انگریزی زبان وادب کا ذوق ہے اور جو مختلف اسالیب کی باریکیوں سے واقف ہیں۔ ترجمہ کے علاوہ جگہ جگہ تفسیری نوٹ بھی بڑے فاضلانہ اور عالمانہ ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چوں کہ مرحوم نے ترجمہ کے وقت حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے اردو ترجمہ قرآن کو خاص طور پر پیش نظر رکھا تھا اس بنا پر اب تک انگریزی میں جتنے بھی تراجم شائع ہو چکے ہیں صحت عقائد کے لحاظ سے صرف مرحوم کا ہی ایک ترجمہ ان سب میں ایسا ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ مرحوم کو درحقیقت قرآن مجید کے ساتھ عشق سا ہوگیا تھا اور اسی کا اثر تھا کہ وہ اسی زمانہ میں حرمین شریفین کی زیارت اور حج بیت اللہ کی سعادت وشرف سے بہرہ یاب ہوئے۔ واپسی پر جب کبھی وہ سر پر عقال اور بدن پر جُبہ وعبا کے ساتھ نظر آتے تھے تو بڑے بھلے لگتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے طلبا کو نماز کی اور دیگر شعائر اسلامی کی پابندی واحترام کی بڑی تاکید کرتے رہتے تھے۔ جمعہ کی نماز کالج کی مسجد میں کبھی کبھی خود بھی پڑھاتے تھے، ورنہ نماز سے پہلے یا نماز کے بعد وعظ تو اکثر ہی کہتے تھے۔ عادات واخلاق کے لحاظ سے بڑے خلیق وملنسار مگر حد درجہ باحمیت وخوددار اور ہمدرد وغم گسار تھے۔ ضابطہ پسندی اور اصول پروری ان کی فطرت تھی۔ حق تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے اور ان کے مراتب بلند کرے۔ [جنوری ۱۹۵۴ء]

سہارنپوری، مولانا مفتی حافظ عبداللطیف

مولانا مفتی حافظ عبداللطیف سہارنپوری

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا مفتی حافظ عبداللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور نے چند ماہ کی علالت کے بعد وفات پائی۔ جناب مفتی صاحب صاحبِ علم تھے اور صاحبِ باطن بھی۔ فقہ کی جزئیات پر بڑی گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ اخلاق وعادات اور مکارم وشمائل ذاتی کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ ان کے حسن قابلیت وانتظام کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں وہ تیز وتند آندھیوں میں بھی مدرسہ کا چراغ جلائے بیٹھے رہے اور اس کو بہر طور قائم وزندہ رکھا، مدرسہ کے ساتھ آں مرحوم کو محبت نہیں، عشق تھا چنانچہ اسی کی خاطر انھوں نے پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت کے باوجود پچھلے دنوں برما کا طویل وصبر آزما سفر کیا اور اگرچہ وہاں سے کامیاب وبامراد واپس ہوئے لیکن اپنے ساتھ ایک عارضہ لگالائے اور آخر اسی عارضہ میں جان جاں آفریں کو سپرد کر کے راہی ملک بقا ہوگئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔

[ستمبر ۱۹۵۴ء]

عبدالرحمٰن، شمس العلماء مولانا الحاج

شمس العلماء مولانا الحاج عبدالرحمٰن

ارباب علم وادب کے حلقہ میں یہ خبر بھی افسوس اور رنج کے ساتھ سنی جائے گی کہ بروز جمعہ ۳۰/ جولائی کو صبح چار بجے شمس العلماء مولانا الحاج عبدالرحمٰن سابق صدر شعبۂ عربی وفارسی دہلی یونیورسٹی نے کراچی میں وفات پائی۔ مولانا تقسیم سے کچھ پہلے سے گوشہ نشین ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ ورنہ ایک زمانہ میں ان کی بڑی شہرت تھی اور ادارۂ معارف اسلامیہ اور اورینٹیل کانفرنس وغیرہ علمی انجمنوں کے جلسوں میں ان کے مقالات کی دھوم ہوتی تھی۔ طرز قدیم کے تعلیم یافتہ تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اوّل لاہور میں کوئی معمولی ملازمت کی اور وہیں کے قیام کے زمانہ میں ''پیسہ اخبار'' کے لیے مقدمہ ابن خلدون کا اردو ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کو شایع ہوئے کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ دہلی کے سینٹ اسٹیفنس کالج میں عربی لیکچرر کی جگہ خالی ہوئی۔ مولانا نے یہ سمجھ کر کہ اس جگہ پر کسی ایم۔اے کا ہی تقرر ہوگا خود کوئی درخواست نہیں بھیجی۔ لیکن مولانا کے ایک دوست نے ازخود مولانا کی طرف سے درخواست لکھ کر دلّی روانہ کردی اور درخواست کے ساتھ مقدمہ ابن خلدون کے اردو ترجمہ کا ایک نسخہ بھی منسلک کردیا اس کے بعد کالج کی انتخابی کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اس کے ایک ممبر مولوی نذیر احمد دہلوی مرحوم بھی تھے، ظاہر ہے کہ ترجمہ ابن خلدون کا قدردان مولوی صاحب سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا تھا۔ انھوں نے جب اس کو دیکھا تو پھڑک گئے اور کمیٹی سے کہا کہ اگرچہ امیدواروں میں بڑے بڑے ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی ہیں لیکن عبدالرحمٰن کو کوئی نہیں پہنچتا۔ آخر مولوی نذیر احمد مرحوم کی رائے پر ہی فیصلہ ہوگیا۔ اب مولانا کو لاہور میں اچانک تقرر نامہ ملا تو سخت حیرت زدہ ہوئے بعد میں ان کو اصل واقعہ کی پوری صورت حال کا علم ہوا۔ بہرحال مولانا یہاں تشریف لے لائے اور آخر تقریباً تیس سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۳۹ء میں کالج سے بڑی عزت و ناموری کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔

مولانا اگرچہ کالج میں عربی اور فارسی کے لیکچرر تھے اور کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد دہلی یونیورسٹی میں اس شعبہ کے صدر بھی رہے۔ لیکن ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے عہد کے بڑے نامور مورخ اور محقق بھی تھے چنانچہ عربی فارسی کے ساتھ سالوں تک تاریخ میں ایم۔اے کلاس کو مغلیہ دور حکومت پر لیکچر دیتے رہے۔ مولانا کے یہ لیکچر اس قدر پراز معلومات، محققانہ اور بصیرت افروز ہوتے تھے کہ کالج کے پرنسپل اور تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر اسپیر بھی کبھی کبھی لیکچر سننے آتے تھے۔ اس کے علاوہ کالج کے جو طلبا تاریخ میں پی ایچ۔ڈی کرنے کے لیے کیمبرج یا آکسفورڈ یونیورسٹی جاتے تھے وہ بھی وہاں سے برابر مولانا سے خط وکتابت کے ذریعہ علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا کے ایک تلمیذ خاص ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی حال وزیر تعلیم پاکستان گورنمنٹ نے اپنی مشہور کتاب ''دہلی سلطنت'' میں اس کا بڑی شکرگزاری کے ساتھ تذکرہ بھی کیا ہے۔ کسی بحث کے متعلق وہ کوئی رائے بڑی تحقیق وتدقیق اور کامل غور وخوض کے بعد قایم کرتے تھے مگر جب ایک رائے قایم کرلیتے تھے تو پھر کوئی شخص ان کو اس رائے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ عربی شعر وادب اور اسلامی تاریخ پر بھی بڑی گہری اور دقیقہ رس نگاہ رکھتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں لندن کی اورینٹیل کانفرنس میں دہلی یونیورسٹی کے نمایندہ کی حیثیت سے شرکت کی اور پروفیسر مارگولیوتھ کے بالمقابل ''شعرِ جاہلی'' پر عربی زبان میں ایسا شاندار اور محققانہ مقالہ پڑھا کہ خود مارگولیوتھ نے اس کی داد دی اور جب مولانا لندن سے واپسی میں چندروز کے لیے مصر میں قیام فرما ہوئے تو مولانا کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کے پہنچنے سے قبل ان کے مقالہ کی شہرت مصر پہنچ چکی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین خود مولانا سے ملنے ان کے ہوٹل میں آئے اور ڈنر پر مدعو کیا اور مصر کے اخبارات ورسائل نے بھی مولانا کے فوٹو کے ساتھ ان کے مقالہ کے بعض اجزا شایع کیے۔ مولانا مصر سے حجاز مقدس گئے اور وہاں زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوکر دہلی واپس آگئے۔

اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب تھے۔ چنانچہ مرحوم کی کتاب ''مرآۃ الشعر'' اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد دونوں کے طرز انشاء نے مل جل کر مولانا عبدالرحمٰن مرحوم کے طرز نگارش کا روپ دھارا تھا۔ جب ان کی کتاب ''مرآۃ الشعر'' چھپی ہے تو اردو زبان کی دنیائے شعر وادب میں ایک بھونچال سا آگیا تھا اور ملک کی ادبی فضا صدائے احسنت ومرحبا کے نعروں سے گونج اٹھی تھی۔

مولانا کے ساتھ راقم الحروف کے تعلق کا آغاز اگرچہ بحیثیت استاد وشاگرد ہوا لیکن جلد ہی یہ تعلق فرزندی وپدری تعلق کی طرح مقدس، استوار اور پختہ ہوگیا اور الحمدللہ کہ ان کے آخری سانس تک رہا، اس لیے مولانا کے علمی وادبی کمالات اور اخلاق وشمائل پر ایک مستقل مقالہ لکھنے کا ارادہ ہے۔ سطور بالا کا مقصد صرف اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع واعلام ہے۔ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے اور ان کی قبر ٹھنڈی رکھے کہ یوں بھی بڑے متقی، متشرع، پابند وضع اور انتہائی بامروت وصاحب خلق عمیم انسان تھے۔ [ستمبر ۱۹۵۴ء]

قدوائی، رفیع احمد

رفیع احمد قدوائی

تمام ملک میں بڑے رنج واندوہ کے ساتھ سنا گیا کہ جناب رفیع احمد صاحب قدوائی نے اچانک ۲۴/اکتوبر کی شام کو نئی دہلی میں وفات پائی۔ بڑے آدمی، عام آدمیوں بلکہ ذی حیات کی طرح پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں اور ان کا ماتم بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن قدوائی صاحب کا مرنا ملک کے ہر طبقہ

اور ہر گروہ میں، مردوں اور عورتوں کو، بوڑھوں اور جوانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا ان کا کوئی قریبی اور بہت ہی عزیز رشتہ دار ان سے باتیں کرتے کرتے اچانک ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا ہے اور اب وہ پھر کبھی واپس نہیں ملے گا۔ سبب یہ ہے کہ مرحوم اپنے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے جتنے ایک بڑے انسان تھے اپنے حد درجہ خلوص، مسلسل خدمت اور بے لوث حبِ وطن کے باعث اتنے ہی ہر دلعزیز بھی تھے۔ وہ جس طرح جنگ آزادی کے میدان کے بہادر سپاہی تھے اسی طرح ایک بیدار مغز مدبر حکمراں بھی تھے۔ دونوں حالتوں میں ان کے ہر عمل کا محرک ان کا جذبۂ خدمت ملک وقوم تھا وہ جس طرح ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے اپنے ذاتی عیش وآرام کے خیال سے کوسوں دور رہے اسی طرح وزارت پر فائز ہونے کے بعد وہ راحت وتن آسانی کے تصور سے ناآشنا وبیگانہ تھے۔ ان کی زندگی سرتاسر عمل اور حرکت تھی۔ بولتے کم تھے اور کام زیادہ کرتے تھے۔ صاف دماغی اور بے تعصبی کے ساتھ ہر مسئلہ پر غور کرتے تھے اور آخر جب کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے تھے تو عمل کی اپنی پوری طاقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ اسے کر ڈالنے پر تل جاتے تھے۔ ملک کے سب سے پیچیدہ مسئلہ خوراک کو انھوں نے جس کامیابی کے ساتھ حل کر دیا وہ اس ملک کی تاریخ مابعد آزادی میں یادگار رہے گا۔ اس کارنامہ کو دیکھ کر سیاسیات واقتصادیات کے ہر طالب علم کو محسوس کرنا چاہیے کہ کسی ملک کی بڑی سے بڑی گتھی کو سلجھانے کے لیے افلاطون وارسطو کی عقل اتنی درکار نہیں جتنی کہ قدوائی کا خلوص، بے غرضی، دیانت، جدوجہد اور حوصلہ مندی ہے۔

ایک انسان کا کیرکٹر اور اس کی اخلاقی عظمت حقیقتاً اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے حریفوں اور دشمنوں کے ساتھ کوئی معاملہ کرتا ہے ورنہ دوست کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ تو ہر شخص کرتا ہی ہے۔ قدوائی صاحب کی سیرت و شخصیت کو جب اس معیار پر پرکھا جاتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ بے شبہ غیر معمولی حوصلہ وظرف کے انسان تھے۔ ان کی حیات سیاسی کا ہر لمحہ جنگ و پیکار میں بسر ہوا۔ لیکن اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ اپنے کسی دشمن سے انتقام تو کیا لیتے اپنے اثر واقتدار سے وہ اس کو جو فائدہ پہنچ سکتے تھے انھوں نے اس میں کبھی بھی کوئی دریغ نہیں کیا۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں اپنے چاروں طرف مخالفتوں اور نکتہ چینیوں کا ہجوم رکھتے ہیں لیکن جوں ہی ان کی روح قفس عنصری سے آزاد ہوتی ہے ان کے بڑے سے بڑے دشمنوں کی بھی آنکھیں بے ساختہ نم ناک واشک فشاں ہوجاتی ہیں۔ قدوائی مرحوم دراصل اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں مہینوں تک ان کا مکان مسلمان پناہ گزینوں کا ایک اچھا خاصا کیمپ بنا رہا جہاں ڈیڑھ سو دو سو آدمی روزانہ دونوں وقت ان کے دسترخوان پر ہوتے تھے اور علاوہ کھانے کے دوسری اشیاء ضروریہ بھی پاتے تھے۔ ان میں خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو چند روز پہلے تک مرحوم کے شدید ترین نکتہ چینوں اور سخت مخالفوں میں سے تھے لیکن کیا مجال کہ مرحوم کی روش یا ان کے طرز معاملہ سے کہیں کسی جگہ بھی موافق ومخالف، اور دوست دشمن کا فرق محسوس ہوسکے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قدوائی صاحب کا واقعۂ مرگ ناگہانی ملک کے لیے ایک بڑا المناک اور ناقابل تلافی حادثہ ہے۔ لیکن اگر دنیا کا ہر حادثہ اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ اس سے عبرت ونصیحت حاصل کریں تو اس حادثۂ غم فزا سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو عبرت پذیر ہونا چاہیے۔

ہندوؤں کو محسوس کرنا چاہیے کہ وطن پرستی، قوم پروری اور خدمتِ ملک کسی خاص فرقہ یا مذہب کا اجارہ نہیں ہے اور نہ وہ کسی ایک گروہ یا جماعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ شرافت اور نیکی کی طرح یہ صرف قدرت کا فیض ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے اس سے محروم کردے۔ قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے انھیں پانچ چھ برسوں میں اس نے کس طرح اس حقیقت کو عملاً واضح اور نمایاں کر دیا ہے کہ ہندو اگر وطن دشمنی پر اُتر آئے تو وہ گوڈسے بن سکتا ہے اور اس کے برخلاف اگر مسلمان وطن دوستی اور قوم پروری پر آمادہ ہوجائے تو وہ رفیع احمد قدوائی ہوسکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن دوستی اور قوم پروری کا معیار ''مذہب'' ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسی طرح جن مسلمانوں کو بعض اوقات فرقہ پرستی کے تکلیف دہ مظاہر دیکھ کر دل شکستگی اور مایوسی ہوتی ہے انھیں سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں قابلیت، عمل اور مخلصانہ خدمتِ انسانیت، یہ تین ایسے اوصاف وکمالات ہیں کہ ہر مخالفت اور دشمنی، ہر تعصب اور تنگ نظری پر آخر غالب اور فاتح ہوکر رہتے ہیں۔ سونا اگر واقعی سونا ہے تو عقل کا اندھا کب تک اسے پیتل کہہ کر ٹھکرا سکتا ہے، دنیا میں صرف اخلاقی طاقت ہی ایک ایسا حربہ ہے کہ جو دشمن تلوار سے فتح نہیں ہوسکتے ان کی گردنیں بھی اس طاقت کے سامنے خم ہوجاتی ہیں۔

رفیع احمد قدوائی، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت وبخشش کی دولت ونعمت سے سرفراز فرمائے۔ ان کی موت سے اگر ہندو اور مسلمان دونوں یہ سبق لے سکے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کی موت بھی ملک وقوم کی مضبوط وپائیدار تعمیر وترقی میں

بڑا کام کرگئی اورواقعہ بھی یہ ہی ہے کہ ایک بڑے انسان کی موت بھی اس کی زندگی کی طرح بےاثر و بےنتیجہ نہیں رہتی۔ [نومبر۱۹۵۴ء]

بھٹناگر، سرشانتی سروپ

سرشانتی سروپ بھٹناگر

افسوس ہے پچھلے دنوں سرشانتی سروپ بھٹناگراور پنڈت کشن پرشادکول، ملک کی دونامور شخصیتوں نے وفات پائی اور ملک ان کی خدمات سے محروم ہوگیا۔اول الذکر ہندوستان کے نامور سائنٹسٹ تھے۔ کیمسٹری اور فزکس میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے، آزادی کے بعد سے ملک میں جوصنعتی ترقی ہوئی ہے اور سائنس نے جوفروغ پایا ہے اس میں سرشانتی سروپ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔پھر بڑی بات یہ ہے کہ وہ مرزا غالبؔ کے محبوب شاگرداور دوست منشی ہرگوپال تفتہ جن کومرزا نوشہ محبت میں مرزا تفتہ کہا کرتے تھےان کے نواسے تھے اور انھوں نے اردوشعروشاعری کا ذوق ورثہ میں پایا تھا۔ چنانچہ وہ اُردو کے صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔مشاعروں کی صدارت بھی کرتے تھے اور اپنے دوست احباب کوجن میں شامل ہونے کا فخر راقم الحروف کوبھی تھا،اپنے اشعار بڑے مزے میں سناتے تھے۔ سائنس اور شاعری کےلطیف امتزاج اورخاندانی روایات کے باعث وہ ہماری گذشتہ تہذیب اور کلچر کے سچے حامل اورعلم بردار تھے۔اب ان کی وفات سے جوخلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔

[فروری ۱۹۵۵ء]

کول، پنڈت کشن پرشاد

پنڈت کشن پرشادکول

پنڈت کشن پرشادکول لکھنؤ کے رہنے والے اورلکھنؤ کی پُرانی تہذیب اور روایات کی بڑی حسین یادگار تھے، اُردو زبان کے نکتہ سنج ونکتہ شناس، بلند پایہ ادیب اور بڑے صحیح الخیال اورنیک دل بزرگ تھے۔اُردو زبان اوراس کے ساتھ وابستہ کلچر اورتہذیب کے ساتھ اُن کوعشق تھا۔ یوپی میں اُردو کو علاقائی زبان بنانے کے لیے دستخطی مہم کی کامیابی زیادہ تر انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔اُردو سے متعلق ہرتحریک میں وہ سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔ چنانچہ وفات سے کچھ دن پہلے ہی انھوں نے بہار میں اردو کانفرنس کی صدارت کی تھی اوراس میں بڑا اچھا خطبہ پڑھا تھا۔ اگرچہ وہ اب خود دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے کردار وعمل اوراپنے اخلاق کاایک ایسا نقش چھوڑ گئے ہیں کہ نئی نسلیں اُن سے بہت کچھ سبق حاصل کرسکتی ہیں۔ [فروری ۱۹۵۵ء]

علی، مولانا محمد اعزاز

آہ! الاستاذ الاجل

۸/مارچ کے اخبار الجمعیۃ میں جب یہ خبر نظر سے گزری کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد اعزازعلی صاحب پرقلب کادورہ پڑگیا اوراس کی وجہ سے کچھ بے ہوشی رہی اوراب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دورے پڑرہے ہیں تواسی وقت ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ چٹان جب گرتی ہےتو مٹی کےتودہ کی طرح رِس رِس کے نہیں اچانک ہی گرتی ہے۔ چنانچہ دوسرے دن کااخبار آیاتو دل کے دغدغہ کی تصدیق ہوگئی اور جس خبرِ وحشت اثر کوسننے کے لیے کان تیار نہ تھے اس کا یقین کرنا پڑا۔ یعنی حضرت الاستاذ راہی ملک بقا ہوگئے۔اِنّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْنَ۔

دارالعلوم دیوبند شروع سے معدنِ لعل وگہر رہا ہے۔ کتنے ہی ذرے اس کی آغوش میں پلے اور بڑھے اورعلم وفضل کے آسمان پرآفتاب بن کر چمکے، کتنے چاند اورستارے اس کے آسمان پرطلوع ہوئے اوراپنی اپنی روشنی دکھا کراسی دارالعلوم کے دامن میں روپوش ہوگئے، کیسے کیسے گُہر ہائے آبدار اس کی خاکِ پاک سے اٹھے اورعلم وعمل،تقوی وطہارت اورزہد وورع کی بزم قدس کوجگمگا کر پھرخاکِ لحد میں جاملے۔آج وہ نہیں ہیں لیکن ان کی یادگاریں باقی ہیں خودان کا وجود فنا ہوگیا لیکن ان کے کارنامے زندہ ہیں اور وہ گویا خود زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں:

تلك آثارنا تدل علينا　　فانظروا بعدنا الى الآثار

دارالعلوم دیوبند اگرشاندارعمارتوں، درسگاہوں، اقامت خانوں اوروسیع و فراخ دروازوں اوراونچی اونچی دیواروں کا نام نہیں بلکہ درحقیقت وہ انھیں نفوسِ قدسیہ کاایک پیکرِ محسوس اور انھیں ارواحِ طیبہ کاایک مظہرِ مادی وجسمانی ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ حضرت الاستاذ اس عمارت کے ایک اہم ستون اوراس بزمِ انس وقدس کے ایک لعلِ شب چراغ تھے۔گزشتہ نصف صدی میں اس درسگاہ کوتعلیم و تعلم کے اعتبار سے جوشہرت وعظمت حاصل رہی ہے اس میں ایک بڑا حصہ حضرت مرحوم کا تھا۔

مولانا مرحوم علم وعمل، اخلاق وفضائل اورمکارم وشمائل کے لحاظ سے محاسن ومحامد کاایک گلدستۂ صدرنگ تھے۔لیکن آپ کاسب سے بڑا نمایاں وصف وامتیاز جس میں کوئی ہم عصر شریک نہیں ہوسکتا تھا وہ یہ تھا کہ آپ ''مثالی استاذ'' تھے۔

وقت کی پابندی کا یہ عالم نہ کہیں دیکھا نہ سنا کہ گھنٹہ ابھی بجا ہی ہے کہ مولانا درس گاہ میں موجود ہیں۔نہ ایک منٹ ادھر نہ ایک منٹ اُدھر۔ پھر جب تک درس گاہ میں ہیں کیا مجال کہ سوائے درس کے کوئی دوسری بات یا کوئی اور کام تو کرلیں، مسلسل پانچ پانچ اور چھ چھ گھنٹے سبق پڑھا رہے ہیں اور باضابطگی و باقاعدگی کی کیفیت یہ ہے کہ نہ ایک سبق کے گھنٹہ کا تداخل دوسرے سبق کے گھنٹہ میں ہوتا ہے، نہ نشست بدلتی ہے، نہ ٹیک لگاتے ہیں، نہ پان ہے نہ پانی، نہ ادھر ادھر کی کوئی بات، طالب علم نے عبارت پڑھی اور تقریر شروع ہوگئی۔عبارت پڑھنے میں اگر طالب علم نے غلطی کی ہے یا دوران تقریر میں وہ بے توجہی کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہے تو البتہ درس کے ساتھ ساتھ دو چار کلمات زجر و توبیخ کے اور دو چار لفظ نصیحت و تعبیر کے ضرور فرمادیے ہیں۔گھنٹہ جونہی بجا اور اس کے بعد اب کوئی دوسرا سبق نہیں ہے تو سیدھے کتاب اٹھا اپنے کمرہ میں تشریف لے گئے، بظاہر دیکھنے میں ایسے خشک کہ درس کے درمیان شاید ہی کبھی کسی نے انھیں ہنستا دیکھا ہو، دیر آمیز اور کم آمیز اتنے کہ طالب علم کے ساتھ بے تکلف ہونا تو جانتے ہی نہ تھے۔لیکن درحقیقت بے حد شفیق اور حد درجہ غم گسار تھے،جس طالب علم کو شوقین، ذہین اور محنتی پاتے تھے دل وجان سے اس کی خدمت کرکے خوشی محسوس کرتے تھے، خارج اوقات میں بھی اسے پڑھاتے ،چھٹی کے دن بھی درس دیتے، گویا ان کا بس نہ تھا کہ علم وفن کے نکات کسی طرح اسے گھول کر پلا دیں۔ پھر اپنے کام سے کام تھا نہ کسی سے کوئی غرض نہ واسطہ، نہ اِعزاز کی آرزو، نہ زیادہ تنخواہ کی طلب، ہمیشہ درویشانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کی، دن اور رات کا ایک ایک لمحہ علم اور دین اور طلبا کی خدمت کے لیے وقف تھا۔درس وتدریس کی ذمہ داریوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے،کبھی بغیر مطالعہ کے درس نہیں دیا۔ درس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور تحشیہ وتشریح کا کام بھی برابر کرتے رہتے تھے چنانچہ آج کون ایسا عربی کا طالب علم یا استاذ ہے جس نے دیوان متنبّی اور دیوان حماسہ پر مولانا کے حواشی اور ان کے مقدمات نہ پڑھے ہوں۔

مولانا کی شہرت کا آغاز بحیثیت عربی زبان کے ادیب کے ہوا،مفردات پر غیر معمولی عبور تھا۔علم معانی وبیان،عروض، صرف ونحو اور لغت یہ مولانا کے خاص فنون تھے۔دیوان حماسہ یا مقامات حریری پڑھاتے وقت جب ان علوم کے مسائل پر تقریر کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے جو اپنی موجیں چاروں طرف پھیلاتا ہوا اُمڈا چلا آرہا ہے اور جتنا وہ آگے بڑھتا ہے اس کی روانی اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے،بعد میں فقہ کی طرف توجہ کی اور مسند افتا کی ذمہ داری بھی آپ کے ہی سپرد ہوئی تو اس میں بھی اپنا وہ رنگ دکھایا اور جمایا کہ شیخ الادب کی طرح شیخ الفقہ بھی ہوگئے۔مولانا کا دارالعلوم سے تدریسی تعلق کم وبیش نصف صدی رہا،اس مدت میں دارالعلوم میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے،لیکن مولانا کا جس سے جو تعلق تھا سرِ مو اس میں فرق نہیں آیا اور وہ اپنے مشاغلِ یومیہ میں کچھ اس طرح مصروف رہے کہ گویا انھیں خبر نہ تھی کہ ان کی درس گاہ اور کمرہ سے باہر کیا ہو رہا ہے۔فروتنی اور انکساری اس غضب کی کہ اپنے خدامانِ خدام سے بھی اس طرح ملتے کہ گویا وہ خود خادم ہیں اور خادم مخدوم! ادھر کئی سال سے انابت الی اللہ کا غلبہ ہوگیا تھا مگر اس حالت میں بھی درس ومطالعہ کے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔انھیں دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ قدرت نے کام کرنے اور جفاکشی کی کس قدر غیر معمولی اور حیرت انگیز صلاحیت رکھی ہے۔اخیر عمر میں بہت ضعیف اور کمزور ہوگئے تھے، دو قدم چلنے میں سانس پھول جاتا تھا اور ہمارے قومی ادارے تو پنشن کے مفہوم ومعنیٰ سے ہی ناآشنا ہیں اس لیے اس ضعف اور کمزوری اور درازی سن کے باوجود مولانا اسی طرح اپنے فرائض منصبی انجام دیتے تھے۔

طبیعت کے حد درجہ مرنج ومرنجان تھے۔باتیں کم کرتے تھے۔مگر کسی مشورہ کے وقت جب کبھی کوئی بات کہتے تھے تو پوری قوت کے ساتھ اور جما کر کہتے تھے۔مزاج میں شرم وحیا اس قدر رچی اور بسی ہوئی تھی کہ اکثر درس میں بھی نگاہ نیچی رکھتے تھے۔تہذیب اور شائستگی کا یہ عالم تھا کہ بے تکلف سے بے تکلف مجمعِ احباب میں بھی کبھی کوئی نامناسب لفظ زبان پر نہیں آتا تھا، چھوٹے بچوں اور طالب علموں کو بھی تم نہ کہتے ،آپ سے خطاب کرتے تھے پھر ساتھ ہی نہایت بیدار مغز اور روشن خیال تھے۔اخبارات کا مطالعہ پابندی سے کرتے تھے اور عالمِ اسلام کے حالات وکوائف سے پورے باخبر رہتے تھے۔''برہان'' کے شروع سے مستقل خریدار تھے اور اس کے نظرات سے لے کر تبصروں تک ایک ایک لفظ پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے اور جب کبھی کہیں کسی جگہ ایک لفظ بھی نامناسب نظر آیا فوراً خط لکھ کر اس پر متنبہ فرماتے تھے۔

پانچ سال کے بعد اسی سال کی ۸/جنوری کو بمبئی میں ملاقات ہوئی تو فرطِ شفقت ومحبت سے فوراً سینہ سے لگالیا اور پھر شکایت کی کہ آپ نے تو دیوبند کو بالکل ہی بھلا دیا۔اب ادھر آتے بھی نہیں میں نے اپنی مجبوریوں کا ذکر کیا۔آہ کیا خبر تھی کہ بس زندگی میں یہ آخری ملاقات ہے اور اب اس کے بعد یہ شفقت بھری نگاہیں پھر کبھی نہ ملیں گی۔

رحمه الله رحمة واسعة وبرد مضجعه ونور مرقده۔

[اپریل ۱۹۵۵ء]

مدنی،مولانا عبدالحق

مولانا عبدالحق مدنی

افسوس ہے کہ بزمِ علم وعمل اور شبستان فضل وکمال کی ایک اور شمع گل ہوگئی، یعنی مولانا عبدالحق صاحب مدنی نے کم وبیش بہتر ۷۲ سال کی عمر میں ۲۱/ جولائی ۵۵ءکو بمقام دیو بندوفات پائی۔مولانا مرحوم کا آبائی وطن دیو بند ہی تھا۔ لیکن آپ کے والد ماجد جو اپنے زمانہ کے نامور ڈاکٹر تھے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ میں جا بسے اور دولتِ عثمانیہ میں کسی اچھے عہدہ پر متمکن ہوگئے تھے،مولانا کی پیدائش وہیں ہوئی،اسی نسبت سے مدنی کہلاتے تھے۔اگر چہ نسلاً ہندوستانی تھے لیکن سرزمینِ قدس میں پیدا ہونے اور وہیں تعلیم وتربیت پانے کی وجہ سے شکل و صورت، وضع قطع،اخلاق وعادات، طور طریق اورامیال وعواطف ان سب اعتبارات سے مرحوم خالصتاً اعلیٰ درجہ کے عرب تھے۔اردو بھی صاف اور شستہ بولتے تھے لیکن عربی زبان پر جو قدرت تھی وہ اُردو پر نہ تھی۔عربی صرف بولتے ہی نہ تھے بلکہ اس زبان کے بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ان کے اشعار میں بلا کی بے ساختگی اور طرفگی ہوتی تھی، اشعار فی البدیہہ کہنے کا بھی بڑا ملکہ تھا۔ پھر جس درجہ کے سخن سنج تھے اُسی مرتبہ کے سخن فہم بھی تھے۔تنقید کا ذوق نہایت بلند اور شُستہ تھا۔حجاز کے موجودہ نامور شعراء میں ایک خاصی تعداد مولانا مرحوم کے شاگردوں کی ہے۔

لیکن جیسا کہ مولانا خود فرمایا کرتے تھے ۔شعروادب کے ساتھ ان کا اشتغال زیادہ تر عہدِ شباب میں ہی رہا جس میں بڑا دخل مدینہ طیبہ کی خاص ادبی صحبتوں اور مجلسوں کا بھی تھا۔بعد میں قرآن وحدیث کا درس وتدریس اور انھیں میں انہاک وتوغل آپ کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بن گیا۔علی الخصوص قرآن مجید کے ساتھ تو عشق تھا۔اس کے وہ حافظ بھی تھے اور قاری بھی! آواز میں بڑا درد اور حد درجہ سوز وگداز تھا۔راقم الحروف کو یاد نہیں آتا کہ مولانا کی امامت میں کبھی جہری نماز پڑھی ہو اور آنکھیں پرنم اور دل پُرسوز نہ ہوگیا ہو۔اللہ نے لحنِ داؤدی عطا فرمایا تھا۔حجاز سے کراچی آ گئے تھے۔چند سال وہاں رہے اور اس کے بعد ؟ آباد کے پرانے مدرسۂ شاہی میں چلے آئے ۔یہاں مولانا نے درس وتدریس کا کام بھی کیا اور ؟ کا فرض بھی انجام دیا۔گذشتہ چند برسوں سے کہنا چاہیے مدرسہ صرف مولانا کے ہی ہمت ؟ اور اثر ورسوخ سے چل رہا تھا۔مدرسہ سے تعلق کے علاوہ شہر میں قرآن مجید کا درس بھی بڑی پابندی سے دیتے تھے جس سے اہلِ شہر کو بڑا فیض تھا۔

اخلاق وعادات کے لحاظ سے مولانا جس بلند کردار کے انسان تھے شاید ان جیسے لوگ ؟ گے۔حد درجہ خلیق وملنسار،متواضع اور منکسر المزاج ، چہرہ ہروقت شگفتہ رہتا تھا۔بے حد خوددار اور غیرتمند بھی تھے،حق بات برملا کہتے تھے اور پوری قوت کے ساتھ کہتے تھے۔اس معاملہ میں ان کو کسی کی خوشنودی اور ناخوشنودی کا مطلقاً خیال نہیں ہوتا تھا۔غالبًا مدینہ طیبہ کے ساتھ شرفِ انتساب کا ہی یہ اثر تھا کہ کسی کے ہاں دعوت کھا کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنا کہ خود کسی کی دعوت کرکے ہوتے تھے۔زندگی بہت صاف ،ستھری اوراُجلی رکھتے تھے،اچھا کھاتے تھے اور اچھا پہنتے تھے۔اُن کے ہاں کی دعوت دعوتِ شیراز نہیں بلکہ بڑی مکلّف ہوتی تھی۔اکثر عربی اور حجازی قسم کے حلوے اور کھانے وہ اپنے ہاتھ سے خود تیار کرتے تھے اور ان سے دوستوں کی تواضع کرکے بڑی مسّرت محسوس کرتے تھے۔ظاہر باطن بالکل یکساں تھا۔مصلحت کوشی ان کے لغتِ اخلاق میں ایک لفظِ بے معنی تھی، ان کا خلوص اور محبت اور ان کا انقباض وتکدر صاف اور عیاں رہتا تھا۔جس سے جو معاملہ تھا بے لوث تھا، جس سے دوستی تھی قلبِ مومن کی طرح بے غل وغش تھی اور جس سے دشمنی تھی فطرتِ باغی کی مانند بے توریۂ و ایہام تھی۔لیکن ان کی دوستی اور دشمنی دونوں اللہ کے لیے ہوتی تھی۔ دین میں ادنیٰ درجہ کی مداہنت گوارا نہیں کرسکتے تھے۔اس باب میں ان کی سخت گیری بسا اوقات تند مزاجی وتنک خوئی کا روپ دھار لیتی تھی۔لیکن نجی معاملات میں بڑے حلیم و بردبار اور فیاض وفراخ حوصلہ تھے۔جن سے ان کو تکلیفیں پہنچیں ان کے لیے بھی ہمیشہ دعائے خیر ہی کی ۔غرض کہ ان کی کس کس خوبی کو بیان اور ان کے اخلاق و مکارم کی کس کس ادا کا تذکرہ کیا جائے، آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور قلب نے ان کی صحبت میں بیٹھ کر جو کچھ محسوس کیا زبانِ قلم اس کی ترجمانی سے وامانده ہے۔اللہ اللہ یہ پرانے چراغ ایک ایک کرکے محفل سے اُٹھتے جاتے ہیں اور نئے چراغوں میں وہ روشنی نہیں۔پھر کون جانے کہ کل اس انجمن پر کیا گزرے گی۔اللہ بس باقی ہوس! اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں صدیقین و شہداء کا مقام جلیل عطا فرمائے۔

[اگست ۱۹۵۵ء]

دہلوی،خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی دہلوی

افسوس ہے گزشتہ ماہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے کم وبیش ۷۷ سال کی عمر میں چند روزہ علالت کے بعد اپنے وطن دہلی میں ہی وفات پائی۔ مرحوم عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔ دیکھنے میں کمزور ولاغر اورضعیف ونحنی انسان تھے لیکن ارادہ وعمل کی قوت بے پناہ رکھتے تھے۔ان کی تعلیم قدیم مسلمان خاندانوں کی روایات کے مطابق ہوئی۔لیکن جس کو اعلیٰ معیار کہا جاتا ہے اس حدتک نہ تھی۔انھوں نے اپنی زندگی نہایت ہی معمولی حالت سے شروع کی،یعنی ایک مزدور کی طرح سر پر کتابوں کا بوجھ لادکر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانااوراس طرح اپنی معاش پیدا کرنا ان کی معاشی زندگی کا سب سے پہلا قدم تھا۔لیکن اپنی محنت، استقلال، جذبۂ عمل اورذہانت کی وجہ سے وہ اس ادنیٰ ترین حالت سے ترقی کرکے ایک ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے جہاں ہرمذہب و ملّت کے لاکھوں انسان ان کی عزت کرتے تھے۔ بڑے بڑے والیانِ ریاست ان سے ملنے میں فخر اورمسرت محسوس کرتے تھے۔حکومتیں ان کی بات کو گوش توجہ سے سنتی تھیں اور بہت سے لوگ جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی، مرد وعورت، جوان و پیر سب ہی شامل تھے ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے باعث ان کے ایک ایک فقرہ اور جملہ پر سر دھنتے تھے۔ ۲۸ء یا ۲۹ء میں بزمانۂ قیام ڈابھیل ایک مرتبہ سورت شہر میں ایک مسلمان بوہرہ کی دکان پر جانے کا اتفاق ہواتو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ اوراس کا پورا گھرانہ خواجہ صاحب سے بیعت ہے اور اگرچہ یہ گھرانہ اردو پڑھنے کی استعداد نہیں رکھتا تھا تاہم اس کا معمول یہ تھا کہ خواجہ صاحب کے ہاں سے ''درویش'' نام کا جورسالہ نکلتا تھا، سال کے اختتام پراس کی جلد بندھتی تھی اور ایک مطلا جزدان میں وہ محفوظ رکھ دیا جاتا تھا۔عید بقرعید کے دن نمازعید کے بعد سب اہل خانہ کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ سب لوگ ایک جگہ جمع ہوکر خواجہ صاحب کا فوٹو اوراُن کے رسالۂ درویش کے مجلدات کی زیارت کرتے تھے اوران کو سرآنکھوں سے لگاتے تھے۔

مشہور شعر ہے:

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم　　قلم کش رابدولت می رسانم

خواجہ صاحب نے جو کچھ ترقی کی اس میں ان کی خواجگی کے علاوہ ان کے قلم کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ نثر اردو میں وہ ایک طرزِ نو کے موجد تھے۔زبان بڑی صاف، سلیس، شستہ و رفتہ لکھتے تھے۔ نثر میں شاعری کرنے کا ان میں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ نہایت ہی معمولی سے معمولی چیزوں پر مضمون لکھتے تھے لیکن اپنے حسنِ تخیل اورلطافتِ بیان کے آب و رنگ سے اسے باغ وبہار بنا کر پیش کردیتے تھے۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کی انشاء پردازی کا خاص جوہر تھا۔اس حیثیت سے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اردوزبان کے صاحبِ طرز نامور ادیب اورانشاء پرداز تھے۔ غدر دہلی کے افسانے ان کی مشہور کتاب ہے، ان میں ادبیت کے ساتھ ساتھ مرحوم دہلی اوراس کی پرانی روایات تہذیب وتمدن کا ماتم کچھ اس سوز وگداز کے ساتھ کیا ہے کہ ناممکن ہے کوئی شخص ان افسانوں کو پڑھے اوراس کی آنکھوں سے آنسورواں نہ ہوں۔ان کی ایک نہیں چھوٹی بڑی سیکڑوں کتابیں، مضامین اور مقالات ہیں جو زباں دانی، انشاء پردازی اورلطافتِ بیان کے جواہرات کا خزانہ ہیں۔ اس کے باوجود مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول خواجہ صاحب مرحوم پر یہ بڑاظلم ہواہے کہ ابھی حال میں اردوادب کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں منٹو، کنھیا لال، قرۃ العین اورکرشن چندروغیرہم کو تو خوب اچھالا گیا ہے لیکن خواجہ صاحب کا یاتو سرے سے تذکرہ نہیں، یا ہے تو بہت ہی سرسری، غالباً آج کل کے ادبی مذاق کی عدالت میں خواجہ صاحب کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ ان کی تحریروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے مذہب، اخلاق اورتصوف کا رنگ ہوتا تھا اور وہ آج کل کی ترقی پسندی کے ہواخواہوں میں نہیں تھے۔ بہرحال انھوں نے جوادبی ترکہ چھوڑا ہے وہ اپنی مستقل قدر وقیمت رکھتا ہے اوراس بناء پر یقین ہے کہ جس طرح نظیر اکبرآبادی ایک عرصہ تک بدنام بھی رہے اور گمنام بھی، لیکن بہرحال ایک وقت آیاجب ان کو اپنے کمال کی داد ملی۔اسی طرح ہمارے زمانہ کے ادیبوں کے نزدیک خواجہ صاحب کا وہ اعتبار نہ ہوجس کے وہ مستحق تھے لیکن ایک وقت آئے گا جب کہ خواجہ صاحب کی ادبی عظمت کا اعتراف کیا جائے گا۔

خواجہ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، نہایت خلیق، متواضع، ملنسار۔ ان کی باتوں میں بڑا رس ہوتا تھا۔ انتہا درجہ حاضر حواس اور بیدار مغز تھے۔ ہمدردی اورغم گساری ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔مخالف سے مخالف بھی ان سے بات کرتا تھا تو ان کی طرف کشش محسوس کرتا تھا۔مشہور تھا کہ خواجہ صاحب کو عمل تسخیر آتا ہے۔ممکن ہے یہ صحیح ہولیکن سب سے بڑا عمل تسخیر توایک انسان کے لیے اس کا اپنا کمال اوراس کے اخلاق ہیں اورخواجہ صاحب میں اس کی کمی نہیں تھی۔ اب یہ وضع داری شرافت، مروت اوردوسروں کی پاسداری اوررعایت سب عنقا ہوتے جاتے ہیں۔خواجہ صاحب کے اُٹھنے سے ہماری پرانی تہذیب اور کلچر کا ایک بڑا ستون گرگیا۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطافرمائے

اور جس ذاتِ گرامی کی نبیرگی پر وہ عمر بھر فخر کرتے رہے۔ اسی کے زمرۂ ارباب اخلاص ووفا میں ان کا حشر کرے۔ آمین۔ [ستمبر ۱۹۵۵ء]

کٹھوری، بشیر احمد

بشیر احمد کٹھوری

صدحیف کہ پچھلے دنوں ہماری بزم انس ومحبت کا ایک اور رکن ہم سے بچھڑ گیا۔ یعنی مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری المعروف بہ بھٹہ نے طویل علالت کے بعد وفات پائی۔ مولانا نے اگرچہ علوم عربیہ اور درس نظامی کی سیوہارہ، امروہہ اور مرادآباد میں باقاعدہ تکمیل کی تھی۔ لیکن ان کو کبھی ان علوم کے ساتھ اشتغال یا ان کے درس کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے نتیجہ کے اعتبار سے ان کو باقاعدہ وباضابطہ عالم کہنا بھی مشکل ہے۔ لیکن دماغ اور ذہن بلا کا رسا پایا تھا۔ ذہانت اور جودتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ علوم دینیہ واسلامیہ میں مشغول رہتے تو مولانا عبیداللہ سندھی بنتے۔ اور اگر انگریزی تعلیم حاصل کر لیتے تو سرعلی امام یا سر فضل حسین سے کم نہ رہتے۔ بڑے بڑے علما اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی مجلسوں میں جب کسی موضوع پر تقریر کرتے تھے تو اپنے منطقی استدلال اور برہانی طرزِ بیان سے چھا جاتے تھے اور پھر اُن کی تردید کرنا آسان نہیں رہتا تھا۔ معاش کے لیے انھوں نے کاروبار کا راستہ اختیار کیا اور اس میں اپنی ذہانت اور محنت سے اس درجہ ترقی کی کہ مٹی سے سونا پیدا کرنے لگے۔ اپنی اینٹوں سے سیکڑوں شاندار عمارتیں کارخانے اور فیکٹریاں بنا ڈالیں۔ لیکن خود ہمیشہ مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے اور انھیں کی طرح رہتے رہے۔ خلقِ خدا کی خدمت کا ان میں بے پناہ جذبہ تھا۔ جو شخص بھی ان کے پاس جس کام کے لیے پہنچ جاتا تھا ان کے در سے مایوس نہیں لوٹتا تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا اس جماعت میں بڑا وقار اور امتیاز تھا۔ کانگریس کے بھی بڑے بااثر اور سرگرم کارکن تھے۔ تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی کے زمانہ میں کئی بار جیل گئے جس سے ان کی صحت اور کاروبار کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن ان کے جوش، سرگرمی اور ولولۂ کار میں کبھی فرق نہ آیا۔ قلب ودماغ کی ان خوبیوں کے ساتھ ان میں اخلاقی جرأت بھی کچھ کم نہیں تھی۔ صوبہ اتر پردیش کی کونسل کے ممبر تھے اس حیثیت سے مقامی حکومت کی جس روش پر ان کو اعتراض ہوتا تھا اُس کو بڑی قوت اور بے باکی کے ساتھ بیان کرتے تھے اور اس میں کسی قسم کے خوف یا تعلق کے لحاظ کو دخل نہیں دیتے تھے۔ غرض کہ بڑی خوبیوں اور گوناگوں کمالات کے انسان تھے۔ صوبہ یو۔ پی کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں بشیر احمد ایسا عاقل وفرزانہ اور زیرک و ہوش مند انسان پیدا ہوا لیکن مولانا بشیر احمد کی بدنصیبی تھی کہ وہ یہاں پیدا ہوئے اور صرف بھٹہ ہوکر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت ورحمت کی بیش از بیش نعمتوں اور راحتوں سے سرفراز فرمائے کہ یوں بھی دینی، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ [ستمبر ۱۹۵۵ء]

عطا شیخ، مولانا شاہ محمد حلیم

مولانا شاہ محمد حلیم عطا شیخ

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ مولانا محمد شاہ حلیم عطا شیخ الحدیث ندوۃ العلما لکھنؤ نے ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ ضلع رائے بریلی کے مشہور قصبہ سلون کے باشندے تھے۔ جہاں کی مشہور خانقاہ میں آپ کے برادر بزرگ سجادہ نشین ہیں۔ گھر کے اچھے کھاتے پیتے تھے۔ لیکن ندوہ میں بہت معمولی طریقہ پر رہتے تھے۔ مرحوم عوامی شہرت کے عالم نہیں تھے اور نہ اپنے مزاجِ لا ابالی کی وجہ سے ہوسکتے تھے۔ لیکن درحقیقت بہت اونچے درجہ کے فاضل اور نہایت وسیع المطالعہ تھے۔ حدیث ان کا خاص فن تھا۔ صحیح بخاری کے ساتھ عشق رکھتے تھے اور پھر حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو کچھ پڑھتے تھے دماغ میں نقش ہوجاتا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ انھیں چلتا پھرتا کتب خانہ کہا کرتے تھے۔ ندوہ کے اساتذہ تک اپنے فن کے مشکل مسائل میں ان سے برابر استفادہ کرتے رہتے تھے۔

علمی کمالات کے علاوہ اخلاق وفضائل کے اعتبار سے سلفِ صالحین کا نمونہ تھے۔ ہر شخص سے بڑے تپاک سے ملتے تھے، چھوٹوں پر ان کی شفقت عام تھی، اپنے اساتذہ کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت سے کرتے اور استادزادوں سے ان کے خورد ہونے کے باوجود برادرانہ تعلق رکھتے تھے۔ کم وبیش ایک برس سے خون کے دباؤ کے عارضے میں مبتلا تھے۔ جولائی میں بہت شدید دورہ پڑا اور تقریباً ۴۸ گھنٹے بے ہوش رہے۔ ہر چند کہ بہتر سے بہتر علاج کیا گیا۔ لیکن چوں کہ وقت پورا ہوچکا تھا اس لیے کوئی افاقہ نہیں ہوا اور آخر وہ قیدِ حیات سے ہی آزاد ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور بیش از بیش ان کے مدارج بڑھائے۔ آمین [نومبر ۱۹۵۵ء]

کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

پچھلے دنوں یہ خبر ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں انتہائی حزن وملال کے

ساتھ سنی گئی کہ اردو زبان کے نامور ادیب ومحقق پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اپنے وطن غازی آباد میں ۹۱ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔آپ قبل از تقسیم انجمن ترقی اردو حیدرآباد ثم دہلی کے روح ورواں اور مولوی عبدالحق کے دستِ راست تھے۔ جتنے بڑے شگفتہ نگار، ادیب اورصاحبِ قلم تھے اتنے ہی بلند پایہ زبان و ادب کے محقق ومبصر تھے۔جو کچھ لکھتے تھے کافی غوروفکر اورمطالعہ کے بعد بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ لکھتے تھے۔انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ ''اردو'' میں اور ہفتہ وار اخبار ''ہماری زبان'' میں پنڈت جی کے مقالات بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ان کی تصانیف میں ''منشورات'' اور ''کیفیہ'' خاص طور پر بہت اہم کتابیں ہیں۔جن میں زبان و ادب کے مختلف مباحث پر بڑی محققانہ اور بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے اور بعض بڑے اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔

اردو کے ساتھ ان کو محبت نہیں عشق تھا اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔تقسیم کے بعد اس ملک میں اردو کی بے کسی دیکھ دیکھ کر انھیں بڑا ملال ہوتا تھا۔تاہم اس کے مستقبل کی طرف سے وہ مایوس نہیں تھے اوران کو یقین تھا کہ جس طرح ہر درخت اپنی زمین میں ہی پھلتا پھولتا اور بڑھتا ہے۔اسی طرح اردو زبان اس دیس کی زبان ہے وہ یہاں جتنی ترقی کر سکتی ہے کسی دوسرے ملک میں نہیں کر سکتی۔اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کی تحریک کے سلسلہ میں جو دستخطی مہم ہوئی تھی۔کیفی صاحب نے اس میں عملاً بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا۔پیہم علالت، امتدادِ سن اور ضعف کے باوجود وہ اردو کا کام کرنے سے کبھی نہیں تھکتے اور اُکتاتے تھے۔

یوں بھی بحیثیت انسان کے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔حددرجہ شریف، بامروت، باوضع، خود دار وغیور اور مرنج ومرنجان قسم کے بزرگ تھے۔جس سے جتنا اور جس قسم کا تعلق ہوتا تھا اسے ہر حالت میں نباہتے اور بعض اوقات اس کے لیے تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔شاعری بھی کرتے تھے۔لیکن ان کے ادبی کمالات کی فہرست میں شاعری درجۂ دوم کی چیز تھی۔غزل کی بہ نسبت نظم اچھی لکھتے تھے جس میں رنگینیٔ تخیل اور ندرتِ فکر کم اور زبان کی صفائی، ستھراپن اور روزمرہ زیادہ ہوتا تھا۔ان کی نظمیں عام طور پر صاف سپاٹ اور رواں ہوتی تھیں۔ان کے اُٹھ جانے سے زبان وادب کی بزم میں جو جگہ خالی ہوئی ہے توقع نہیں کہ وہ آسانی سے پُر ہو سکے۔آئندہ نسلیں ان کو یاد کریں گی اور ان کا نام بڑی عزت واحترام کے ساتھ لیں گی۔ضرورت ہے کہ ان کی کوئی مستقل یادگار قائم کی جائے تاکہ ان کی مستقل اور بلند خدمات کا کچھ تو اعتراف وتشکر اہل زبان کی طرف سے ادا ہو سکے اوران کی آتما کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ ''مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔'' [نومبر ۱۹۵۵ء]

سہیل، اقبال

اقبال سہیل

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ اقبال سہیل بھی چل بسے۔وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے باقیاتِ صالحات اور اُس عہد کی دیرینہ روایات کے حاملین میں سے تھے۔غیر معمولی ذہین وذکی تھے۔فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔وہ اگر وکیل نہ ہوتے یا مزاج لاابالی نہ ہوتا تو علم وادب کے میدان میں ان کی شہ سواری کا مقابلہ بہت کم لوگ کر سکتے تھے۔طبیعت حددرجہ دقیقہ رس اور دماغ بڑا نکتہ آفریں پایا تھا۔نغز گوئی کے ساتھ اشعار میں روانی غضب کی ہوتی تھی۔غزلوں اور نظموں کے علاوہ انھوں نے جو نعتیہ نظمیں لکھی ہیں وہ بھی بڑے معرکہ کی ہیں، نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔اگر کوئی صاحب اُن کے مضامین نثر ونظم کو مرتب کر کے یک جا شائع کر دیں تو یہ اردو ادب کی مفید اور لائقِ قدر خدمت ہوگی۔ورنہ ان ادبی جواہر پاروں کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔حق تعالیٰ مغفرت وبخشش کے فضلِ خاص سے نوازے۔ [دسمبر ۱۹۵۵ء]

جیراج پوری، مولانا حافظ محمد اسلم

مولانا حافظ محمد اسلم جیراج پوری

افسوس ہے مولانا حافظ محمد اسلم جیراج پوری بھی جو علم وادب کی صبح بہار کا ایک آخری جلوۂ گریز پا تھے۔ہم سے بچھڑ گئے اوراس خاکدانِ آب وگل کو خیر آباد کہہ کر رہ گزائے عالم آخرت ہو گئے۔مرحوم ہماری بزم علم وثقافت کے دور پیشین کی یادگار تھے۔ایک زمانہ میں اُن کے مضامین ومقالات کا بڑا چرچا تھا۔باقاعدہ اور وسیع المطالعہ عالم تھے۔ان کی تالیفات میں 'تاریخ الامت' جو چھوٹی چھوٹی کئی جلدوں میں ہے اس کو بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ چند ادبی اور تنقیدی مضامین اور سوانحی تالیفات بھی ان کی یادگار ہیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین معماروں اور بانیوں میں سے تھے اور آخر اسی کی خدمت کرتے کرتے جان جان آفرین کو سپرد کری۔قرآن مجید کے ساتھ بڑا عشق اور شغف تھا، اس کے وہ حافظ بھی تھے اور بڑی پابندی سے روز اس کی تلاوت کرتے تھے۔نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔راقم الحروف کو جب کبھی ان کے ہاں چائے پینے کا اتفاق ہوا ہے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ چائے کی پیالیاں صحیح وسالم پائی ہوں۔

بڑے قناعت پسند، گوشہ نشین، شہرت سے نفور اور حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج بزرگ تھے، جس سے جو وضع تھی بہرحال نباہتے تھے۔ حدیث کے بارے میں ان کا جو مسلک تھا اس کے باوجود ہم ارباب ندوۃ المصنفین کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے شگفتہ تھے اور وہ کبھی نجی ملاقاتوں میں اس طرح کی بحث نہیں اُٹھاتے تھے۔ یہ وضع داری اور شرافت، یہ مروت اور خوش خلقی اب عنقا ہوتی جارہی ہے۔ اب آئندہ ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے اور ان کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین

[جنوری ۱۹۵۶ء]

مرادآبادی، قاضی عبدالغفار

قاضی عبدالغفار مرادآبادی

افسوس ہے پچھلے دنوں قاضی عبدالغفار صاحب مرادآبادی بھی داعی اجل کو لبیک کہہ کر رہ گزائے عالم باقی ہوگئے۔ مرحوم اردو کے نامور اور صاحب طرز ادیب، کامیاب صحافی اور بڑے خوش فکر و پُر جوش قومی کارکن تھے۔ ان کی شہرت کا آغاز بحیثیت ایک اخبار نویس کے ہوا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مولانا محمد علی مرحوم سے باقاعدہ ٹریننگ لی تھی اور ہمدرد کے عملۂ ادارت میں شریک رہنے کے علاوہ خود اپنے بھی متعدد اخبار نکالے تھے۔ تحریک خلافت میں پیش پیش رہے اور قلم کے ساتھ زبان اور عمل سے بھی قومی خدمات انجام دیتے رہے۔ تحریک خلافت کے ختم ہوجانے پر لوگ کچھ اُن کو بھول سے چلے تھے کہ پھر یکایک 'لیلیٰ' کے خطوط' نے ان کو ادبی شہرت کے آسمان پر مہر نیمروز بنا کر چمکا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ''مجنوں کی ڈائری''، ''تین پیسہ کی چھوکری''، ''حیات جمال الدین افغانی'' اور ''حیات اجمل'' وغیرہ کتابیں لکھیں جو ان کی شہرت میں برابر اضافہ ہی کرتی رہیں۔ مرحوم بڑے شگفتہ نگار مصنف اور صاحب قلم تھے، اُن کی تحریروں میں شوخی کے ساتھ سنجیدگی کا بڑا لطیف امتزاج ہوتا تھا۔ طبیعت کی رنگینی کا اثر صفحۂ قرطاس پر بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اپنے فکر و خیال میں بڑے پکے اور سخت قسم کے انسان تھے۔ تجارت کے سلسلے میں یورپ بھی ہو آئے تھے اور وہاں کا سفرنامہ جو ''نقشِ فرنگ'' کے نام سے لکھا تھا وہ بجائے خود اردو زبان کا ایک شاہکار ہے۔ تقسیم کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کا علی گڑھ میں ازسرنو قیام ہوا تو قاضی صاحب اُس کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور آخر اسی انجمن کی خدمت کرتے کرتے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ بڑے ملنسار اور خوش خلق و خوش رو تھے، جس سے ملتے تھے اخلاص و محبت سے ملتے تھے۔ اس صدی کے ربع اوّل کی یوپی کی تہذیب و شائستگی اور مخلوط تمدن و شستگی کے بڑے اچھے نمونہ تھے، بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے اور مسکراتے تھے تو گل تر کے دامن پر شبنم کے قطرے بکھرتے تھے، ہماری پرانی سوسائٹی جس میں اب پت جھڑ کا دور دورہ ہے اُس کی ایک حسین یادگار تھے۔ اب یہ محفل سونی ہوتی جارہی ہے، پرانے بادہ آشام اُٹھتے جارہے ہیں اور نئے بادہ کشوں میں وہ وضع اور شان نہیں۔ باقی رہے نام اللہ کا! اللہ تعالیٰ مرحوم کو مغفرت و بخشش کی رحمتوں سے نوازے۔

[فروری ۱۹۵۶ء]

رضوی، سید ابوالنظر

سید ابوالنظر رضوی

افسوس ہے ہمارے حمیم صمیم سید ابو النظر رضوی کا ۸/ اپریل کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ موصوف امروہہ ضلع مرادآباد کے شرفا اور نامور رؤسا میں سے تھے، بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس نظامی کا بڑا حصہ مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں پڑھا تھا اور پھر آخر میں ایک سال دارالعلوم دیوبند میں رہ کر تکمیل کی تھی۔ اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز اور ادیب تھے۔ طبیعت میں روانی غضب کی تھی۔ تقسیم سے پہلے برہان میں اُن کے مقالات اکثر نکلتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے ادبی اور علمی رسالے بھی مرحوم کے مضامین فخر سے شایع کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں یکایک اپنی تمام جائیداد و املاک چھوڑ چھاڑ کر کراچی چل دیے۔ بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کو لے کر گئے تھے لیکن ایک بھی پوری نہیں ہوئی اور ہزاروں روپیہ ماہوار کا خرچ رکھنے والا وہاں عسرت و تنگدستی کا شکار ہوکر رہنے لگا۔ ان پیہم ناکامیوں اور مایوسیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تپ دق میں مبتلا ہوگئے۔ مرنے سے چند ماہ پہلے ایک خط میں کس حسرت سے لکھتے ہیں: ''قدرت کے کارخانے بھی عجیب ہیں۔ جب میرے پاس ریاست تھی، دولت تھی اور طاقت تھی اس وقت مجھ کو یہ موذی مرض نہ دیا کہ میں اس کا مقابلہ کرسکتا تھا، اب اس غریب الوطنی اور تنگدستی میں مجھ کو اس بیماری میں مبتلا کرکے سوائے اس کے کہ قدرت ''گربہ و موش'' کا تماشا دکھانا چاہے اور کیا فائدہ ہے؟''

بعض خاص اسباب کی بنا پر مذہبی خیالات میں عدم توازن پیدا ہوگیا تھا اور قرآن مجید میں بعض عجیب طرح کی تاویلات و توجیہات کرنے لگے تھے۔ یوں نہایت شریف، بامروت، دوست نواز، بے حد خلیق اور ملنسار تھے۔ مہماں

نوازی بڑی عالی ظرفی سے کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی لغزشوں اور غلطیوں سے درگزر فرما کر ان کو مغفرت وبخشش کی نعمت سے نوازے۔ آمین [مئی ۱۹۵۶ء]

گیلانی، مولانا سید مناظر احسن

آہ حبر امت!

الی اللہ اشکو لاالی الناس اننی ۔۔۔ اری الارض تبقی والا خلاء تذھب

وادریغا! جو خامۂ گوہر فشاں چالیس برس تک اسلامی علوم وفنون کے انمول موتی صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا اور لٹاتا رہا۔ گذشتہ ماہ جون کی ایک صبح کو یک بیک خاموش ہوگیا۔ وہ مسیحا نفس جو اپنے انفاس قدس سے اسلامی احساس وفکر کے تن بے جان کی عروقِ مردہ میں زندگی کا نیا اور تازہ خون دوڑاتا رہا۔ دین قیم کا وہ پیکر نجستہ گوہر جو اپنے لبِ اعجاز نما سے قال اللہ اور قال الرسول کا پیام حق التیام ایک عرصہ تک جھوم جھوم کے سناتا رہا۔ علم وفضل، عمل وکردار اور اخلاق وشمائل کا وہ پیکر حسین جو اس عہد میں اسلام کی چہاردہ صد سالہ تاریخ کی آبرو تھا اور جس کا نفس نفس گلبن دین محمدی کی عطر آفرینیوں کا امین و رازداں تھا۔ اچانک خاکِ لحد کی امانت بن گیا۔ ملت بیضا کی ایک متاع گراں مایہ لٹ گئی۔ بزم انس وقدس کا چراغ فروزاں بجھ گیا۔ یعنی حبر امت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اس عالم آب وگل کو خیر آباد کہہ کر عالم آخرت کی راہ لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا ضلع مونگیر (بہار) کے ایک گاؤں گیلانی کے خاندانِ سادات کے چشم وچراغ تھے۔ منطق اور فلسفہ کی تکمیل مولانا ابوالبرکات [کذا: برکات احمد] ٹونکی سے کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند پہنچے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے درس حدیث لیا۔ اپنی ذہانت وذکاوت، استعداد علمی اور صلاح وتقوکاری کے باعث دارالعلوم کے عمائد میں اتنا رسوخ پیدا کرلیا تھا کہ فراغت کے بعد وہیں معین المدرسین ہوگئے۔ اس زمانہ میں دارالعلوم کا ماہنامہ 'القاسم' بڑی آب وتاب سے نکلتا تھا، اس کی ادارت کی خدمت بھی آپ کے سپرد ہوگئی۔ اس دور میں آپ نے جو مضامین لکھے وہ خود بتا رہے تھے کہ یہ ستارہ ایک دن آفتاب بننے والا ہے۔ یہاں ماہوار مشاہرہ بطور وظیفہ تیس روپے ملتا تھا۔ بہت چاہا کہ کسی طرح پچاس روپے ہوجائے تو پوری زندگی ہی مدرسہ کی خدمت کے لیے وقف کردیں۔ لیکن قدرت کو تو بہت بڑا اور اہم کام لینا منظور تھا۔ دارالعلوم میں مستقل قیام کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اسی زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو حیدرآباد میں صدرالصدور امور مذہبی تھے اور جن کا وہاں طوطی بول رہا تھا، ان کی نگہ مردم شناس نے اس جوہر قابل کو تاکا اور حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا جامعہ کے شعبۂ دینیات کے صدر مقرر کردیے گئے۔

قیام حیدرآباد کا یہ عہد ہی مولانا کی زندگی کا وہ دور زرین تھا جب کہ علم و فضل کے آسمان کا یہ ماہ یکشبہ بدر کامل بنا اور اس کی ضیاباریوں سے علم وتحقیق کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا۔ یوں تو مولانا کیا نہیں تھے؟ ایک نامور محقق و مبصر اسلامیات، بلند پایہ مصنف، شعلہ بیاں خطیب، صاحب وجد وحال صوفی سب ہی کچھ تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ جس میں کوئی اور شخص اُن کا حریف نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فیضان تعلیم وتربیت سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسے افراد پیدا کردیے جو مغربی علوم وفنون کی اعلیٰ اسناد رکھنے کے باوجود آج اسلامی علوم وفنون کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور جن کی اسلامی تحقیقات کی گونج یورپ اور امریکہ کے علمی حلقوں میں ہے۔ جو کام خالص علمائے کرام کے کرنے کا تھا وہ یہ حضرات کررہے ہیں اور اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ کہ خود علماء کے طبقہ میں اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ پھر ان کی زندگیاں بھی اسلامی تعلیمات کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ مولانا گیلانی ہرگز یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے اگر انھوں نے اسلام کا مطالعہ علمی اور سائنٹفک طریقہ پر نہ کیا ہوتا اور اس بنا پر وہ مغربی علوم وفنون کے طلبا کو علمی طور پر اسلام سے متاثر نہ کرسکتے۔

علم وفضل، دقت نظر، وسعتِ معلومات اور قوت تحریر وتقریر کے علاوہ اخلاق وشمائل کے لحاظ سے وہ جس پایہ کے بزرگ تھے ان جیسے کم ہی ہوں گے۔ فقر ومسکنت، استغناء، تواضع وفروتنی، حسنِ کرم وجود وسخا، شفقت علی الخلق، کمال خودداری اور مروت، یہ مولانا کی فطرت وطبیعت کے جواہر خصوصی تھے۔ اب ایسی جامع کمالات ہستیاں کہاں ہوں گی۔ خامۂ اشکبار کے ان چند قطروں سے دل کی آگ کیونکر بجھ سکتی ہے۔ اگر مولانا کی یاد میں برہان کا کوئی خاص نمبر نہ بھی شایع ہوسکا تو انشاء اللہ ایک مفصل مضمون عنقریب شایع کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو صدیقین وشہداء کا مقام جلیل عطا فرمائے اور ان کی قبر پر رحمتوں کے بیش از بیش پھول برسائے۔ آمین [جولائی ۱۹۵۶ء]

بشیرالدین، خان بہادر مولوی

خان بہادر مولوی بشیرالدین

افسوس ہے کہ اسی مہینہ تعلیم جدید کی ایک نامور شخصیت نے بھی داغ

مفارقت دیا۔خان بہادر مولوی بشیر الدین، سرسید اوران کے رفقاء کے عہد کی یادگار تھے۔انتہاء درجہ مخلص،مسلمانوں کادرد رکھنے والے،پرلے درجے کے نیشنلسٹ، کٹر مذہبی اور دین دار، انتھک اورخاموشی کے ساتھ نہایت ٹھوس اور تعمیری کام کرنے والے۔یہ سب اوصاف وکمالات کسی ایک شخص میں مشکل سے ہی جمع ہوسکتے ہیں لیکن قدرت نے مرحوم کی ذات میں یہ سب اوصاف وکمالات بیک وقت جمع کردیے تھے۔ان کا اٹاوہ ہائی اسکول جواب ڈگری کالج ہے صرف اترپردیش کانہیں بلکہ پورے ہندوستان کاایک مثالی اسلامیہ ہائی اسکول تھا جس نے سینکڑوں بڑے بڑے اورنامور مسلمان پیدا کیے۔اس اسکول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ عمدہ اور بہترین تعلیم کے ساتھ اسلامی تربیت کا بھی خاص طور پرخیال رکھا جاتا تھا اوراسکول اور بورڈنگ کے اخراجات اس درجہ کم تھے کہ تھوڑی آمدنی رکھنے والے والدین بھی اپنے بچوں کو یہاں بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ تعلیم دلاسکتے تھے۔مرحوم نے کافی عمرپائی۔سوسال سے زیادہ کی عمر میں وفات ہوئی۔سالہا سال سے بالکل معذور ہوگئے تھے لیکن وضع میں ذرافرق نہیں آیا۔ان کا اخبار'البشیر' بھی برابر جاری رہا اوراسکول کی ترقی کے خیال سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہوئے۔اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کو جگہ عطافرمائے اورمسلمانوں کوتوفیق دے کہ وہ ان کی یادگار کونہ صرف یہ کہ باقی رکھیں بلکہ اور اس کوترقی دیں۔ [جولائی۱۹۵۶ء]

علی،سید مرتضیٰ

سید مرتضیٰ علی

افسوس ہے اس مہینہ میں ہمارے ایک نہایت عزیز اورمخلص دوست سید مرتضیٰ علی نے بھی دہلی میں وفات پائی۔مرحوم نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم کے نواسی داماد تھے۔حکومت ہند کے محکمہ دفاع میں اعلیٰ افسر تھے۔تقسیم کے بعد بھی یہیں رہے۔دلّی کی جامع مسجد کے قریب ان کا آبائی مکان تھا اُسی میں رہتے تھے اورجامع مسجد میں نماز اس پابندی سے ادا کرتے تھے کہ وفات سے پہلے سخت مجبوری کے باوجود انھوں نے نمازباجماعت ترک نہیں کی۔ادارہ ندوۃ المصنفین کے شروع سے محسن اوراس کے کاموں کے بڑے قدردان تھے۔اسلام کی محبت اورعشق میں سرشار رہتے تھے۔بڑے خلیق،متواضع،صاحبِ خیر،غیور و خوددار اور حد درجہ پابندِ وضع تھے۔اللہ تعالیٰ ان کوغریق رحمت فرمائے اور پسماندگان کوصبرجمیل کی توفیق ارزاں ہو۔آمین [جولائی۱۹۵۶ء]

لدھیانوی،مولانا حبیب الرحمٰن

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

افسوس ہے اس ماہ کی ۲ تاریخ کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک معمولی دورۂ قلب کے بعد۶۴برس کی عمراچانک رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔مولانا نے اپنے سب اہل خاندان کی طرح دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی۔لیکن چوں کہ وہ موروثی اورخاندانی طورپرایک مجاہد،بطل حریت اورزعیم قوم تھے اس لیے تعلیم سے فراغت کے بعد ہی عملی سیاست کی وادی پرخار میں کود پڑے۔اس تقریب سے ان کا تعلق کانگریس سے بھی رہا اورجمعیۃ علمائے ہند سے بھی، اس کے علاوہ مجلس احرار کے تووہ نفس ناطقہ یاعقل فعال ہی تھے۔خوش تقریری، خطابت،جرأت وبیباکی،ذہانت اورطباعی،ایثار وفداکاری یہ اُن کی وہ خصوصیات تھیں جن کے باعث وہ جہاں کہیں رہے اورجس محفل میں بیٹھے ممتاز اورنمایاں ہوکررہے۔عمرکے کم وبیش بارہ سال جیل میں کاٹے ہوں گے۔جہاں انھوں نے شدائد ومحن کا مقابلہ بڑی بےجگری اوربےخوفی کے ساتھ کیا۔آزادی کی صرصر انقلاب نے شہرت وناموری کے بڑے بڑے روشن چراغ بجھادیے ورنہ ایک زمانہ تھا کہ مرحوم کی لیڈری کاڈنکا بجتا تھا۔زندگی بڑی قلندرانہ اوردرویشانہ تھی یعنی ''نے غم دزدو نے غم کالا'' ایک معمولی سی تہمد،بغیر بٹنوں کے گریبان کھلا کرتہ اورسرپرچوگوشہ ٹوپی،جلوت میں اورخلوت میں،اندرون خانہ اور پبلک میں انھیں جہاں کہیں دیکھا اسی وضع میں دیکھا۔حددرجہ خلیق ومتواضع،بڑے سادہ اور بے تکلف،مگراپنی بات کے پکے اوردھن کے پورے۔تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سے تعلق کے باوجود پاکستان میں رہنے کے بجائے دلّی میں معہ اپنے خاندان کے آبسے تھے لیکن کچھ انقلاب روزگار اورکچھ ہجوم امراض وامتدادِسن،ان کا اثر یہ ہوا کہ آخر میں عملی سیاست سے دست کش ہوگئے تھے اورسلوک ومعرفت کا اُن پر اس حد درجہ غلبہ ہوگیا تھا کہ اُن کے سیاسی افکار میں بھی اشراقیت کارنگ ابھرآیا تھا۔عجیب اوصاف وکمالات کے بزرگ تھے۔ان کی کس کس خوبی کوبیان کیا جائے۔اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اوراعلیٰ علیین میں مقام جلیل عطافرمائے۔آمین [ستمبر۱۹۵۶ء]

بہاری،مولانا نورالدین

مولانا نورالدین بہاری

افسوس ہے ماہ گذشتہ میں مولانا نورالدین بہاری نے بھی وفات پائی۔مولانا دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔اُن کومعقولات اورمنقولات دونوں

کے ساتھ یکساں مناسبت تھی اور اس بناء پر اپنے ہم عصروں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پہلے اِدھر اُدھر کچھ دنوں مدرسی کی بلکہ ایک آدھ مدرسہ خود بھی قائم کیا۔اس کے بعد استخلاصِ وطن کی تحریک کے سپاہیوں میں شامل ہوگئے۔اس حیثیت میں وہ ہمیشہ صف اول کے سپاہی رہے۔اُن کا تعلق بیک وقت جمعیت سے بھی تھا اور کانگرس سے بھی اور دونوں جگہ اُن کو امتیاز خاص حاصل رہا۔

وہ نہایت سرگرم اور مخلص کارکن تھے۔تنظیمی صلاحیت اعلیٰ درجہ کی رکھتے تھے۔بڑے قاعدہ اور ضابطہ کے انسان تھے۔ذہانت، دوراندیشی اور حسن تقریر و خطابت کے اوصاف کے ساتھ ساتھ بڑے بے باک جری اور حق گو بھی تھے۔ جفاکش بلا کے تھے۔وجاہت طلبی شہرت پسندی اور تن آسانی سے اُن کو دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔کھانا، پینا، پہننا اوڑھنا نہایت معمولی قسم اور ادنیٰ درجہ کا رکھتے تھے۔ ہزار خوبیوں کی ایک خوبی جس کی مثال ہمارے قومی کارکنوں میں بہت کم ملے گی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے ایک پیسے کا بوجھ بھی قوم پر نہیں ڈالا۔خود محنت مزدوری کرکے اپنی معاش پیدا کرتے تھے، قرآن مجید کا درس دینا اُن کو ایسا محبوب مشغلہ تھا کہ اُس کو جہاں کہیں بھی اور جس حالت میں بھی رہے کبھی ترک نہیں کیا۔اس باب میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا جس کی وجہ سے اُن کا درسِ قرآن عوام میں بہت مقبول ہوتا تھا اور لوگ بڑے شوق سے اُس میں شریک ہوتے تھے۔لیکن اس درس کا کوئی معاوضہ لینا اُن کے نزدیک سخت گناہ تھا اور وہ ہمیشہ اُس سے اجتناب کرتے تھے۔ادھر چند برسوں سے بھوپال میں جا کر آباد ہوگئے تھے اور وہاں کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔وہیں ۲۲؍اور ۲۳ ؍ستمبر کی درمیانی شب میں کم وبیش ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ [اکتوبر ۱۹۵۶]

ندوی، مولانا عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی

گزشتہ مہینہ مولانا عبدالسلام ندوی کی وفات اردو زبان کے علمی اور ادبی حلقوں کے لیے ایک بڑا الم ناک سانحہ ہے۔مرحوم کا سب سے بڑا وصف اور کمال جس میں مشکل سے ہی کوئی اُن کا حریف ہوگا یہ تھا کہ وہ صرف ایک نامور مصنف، بلند پایہ ادیب اور نقد سخن کے بہترین جوہری تھے، اس حیثیت سے وہ لیلیٰ علم وادب کو مخاطب کرکے بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ:

''سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا''

۱۹۲۸ء میں امرتسر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ کے موقع پر راقم الحروف کو مولانا ابوالجلال ندوی اور مولانا نورالحق ندوی جو اُس وقت نئے نئے مصر سے واپس آئے تھے ان دونوں کی معیت میں مولانا مرحوم سے ملاقات کا پہلا اور آخری بھی، شرف حاصل ہوا تھا۔یہ ملاقات جس طرح ہوئی، مولانا کو جس وضع قطع میں دیکھا اور اُن سے جو گفتگو ہوئی، اگر کوئی اور ہوتا تو یقیناً بدگمان ہوجاتا لیکن میرے دل پر اُس کا خاص اثر ہوا اور اُن کے فطری مصنف اور ادیب ہونے کا جزم ہوگیا اور بے ساختہ زبان سے تمکین دہلوی کا یہ شعر نکل گیا:

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

مرحوم کی عبارت سادہ مگر شگفتہ اور بہت سلجھی ہوئی ہوتی تھی۔جس موضوع پر گفتگو کرتے تھے اُس کے تمام پہلوؤں کا مکمل تجزیہ کرکے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کرتے تھے، اس لیے اُن کا طرز نگارش صرف پڑھنے میں دلچسپ و دل نشین نہیں تھا بلکہ یقین آفرین بھی تھا۔مولانا شبلی نے اپنے شاگرد کے اس وصف طبعی کو پہلے ہی تاڑ لیا تھا اور وہ اس کے بڑے قدران تھے۔چنانچہ اُن کے مکاتیب میں مرحوم کی نسبت جو حوصلہ افزا تاثرات وخیالات ملتے ہیں وہ اُن کے کسی دوسرے شاگرد یہاں تک کہ سید صاحب کے متعلق بھی نہیں ملتے۔ بیسوں مقالات کے علاوہ مرحوم کی مستقل تصنیفات تاریخ وفلسفہ، اخلاق، شعروادب اور تنقید سے متعلق ہیں، اردو ادب کا ایسا قیمتی سرمایہ ہیں کہ زمانہ جتنا زیادہ گزرے گا اسی قدر ان کی آب وتاب زیادہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس مخلص و بے نفس خادم کو مغفرت ورحمت کی بخششوں سے نوازے اور جو دنیا میں سب سے بے گانہ رہا۔آخرت میں رحمت پروردگار کی آغوش اس کو اپنے ساتھ یگانگت کا شرف ومجد عطا فرمائے۔آمین [نومبر ۱۹۵۶ء]

خاں، مولانا ظفر علی

مولانا ظفر علی خاں

افسوس ہے مولانا ظفر علی خاں بھی چل بسے۔مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے قدیم طلبا میں اور اس ادارہ کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایات کے بڑے حامل تھے۔ اردو صحافت میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔وہ بیک وقت بلند پایہ صحافی، صاحبِ طرز ادیب، نہایت قادر الکلام شاعر، نامور ادیب اور ساتھ ہی صف اوّل کے لیڈر اور مجاہد تھے۔ایک زمانہ تھا کہ 'زمیندار' اخبار اور مرحوم کے اشعار کا گھر گھر چرچا تھا۔اُن کے فیض تعلیم وتربیت سے سینکڑوں ادیب، جرنلسٹ اور شاعر

ہوگئے۔شاعری میں انھوں نے شروع شروع میں اپنے استاد مولانا شبلی کا تتبع کیا لیکن اس مخصوص طرز کوانھوں نے اس درجہ ترقی دی کہ وہ اردو شاعری کی ایک مستقل صنف بن گیا۔الفاظ اُن کی مشتِ فکر میں موم تھے، جس طرح چاہا اُن سے کام لے لیا۔سخت سے سخت قوافی پر غیر معمولی قدرت تھی۔ذہن بے حد رسا اور طبیعت بلا کی موزوں تھی۔اگر وہ چاہتے تو گھنٹوں شعروں میں گفتگو کر سکتے تھے۔بے شمار اخباری مضامین ومقالات اورنظموں اورغزلوں کے علاوہ چند ادبی کتابیں جن میں سے بعض اور یجنل ہیں اور بعض تراجم اور'الفاروق' کی جلداوّل کا انگریزی ترجمہ اُن کی ادبی یادگاریں ہیں۔تہذیب وشرافت اوراخلاق واطوار کے لحاظ سے ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔اُن کی زندگی بڑے بڑے طوفانوں سے گزری تھی جن میں وہ چٹان کی طرح اپنے مقام پر کھڑے رہے۔اللہ تعالیٰ اُن کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔ [دسمبر۱۹۵۶ء]

جیون بخش، حاجی محمد اسمٰعیل

حاجی محمد اسمٰعیل جیون بخش

افسوس ہے پچھلے دنوں دہلی کے مشہور صاحب خیر بزرگ حاجی محمد اسمٰعیل صاحب جیون بخش نے عمر طبعی کو پہنچ کر وفات پائی۔موصوف مشہور فرم جیون بخش کے سب سے بڑے حصّہ دار اور اس کے روح ورواں تھے۔لیکن وہ جتنے متمول اور صاحبِ ثروت تھے اس سے کہیں زیادہ عابد وزاہد متقی اور پرہیز گار تھے۔دینی اور خیراتی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔نہایت خندہ جبیں اور صاحبِ باطن تھے۔چہرہ پرنور برستا تھا۔تونگری کے باوجود فقر ودرویشی ان کا شعار تھا۔اب ایسے دین اور دنیا کے جامع کم ہی ہوں گے۔حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اورابرار وصلحا کے ساتھ حشر فرمائے۔آمین۔ [اپریل ۱۹۵۷ء]

سبحانی، مولانا آزاد

مولانا آزاد سبحانی

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا آزاد سبحانی کا ۷۵ برس کی عمر میں گورکھ پور میں انتقال ہوگیا۔مرحوم کا اصل نام عبدالقادر اور وطن سکندر پور ضلع بلیا تھا۔ادھر ایک مدت سے گمنامی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ورنہ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں پورے ہندوستان میں ان کی شہرت کا طوطی بولتا تھا۔فلسفہ والٰہیات کے فاضل تھے۔خطابت وتقریر میں بعض حیثیتوں سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔شاعر بھی تھے۔مرحوم کی ایک غزل بچپن میں کبھی پڑھی تھی جواب تک یاد ہے:

پیام آیا ہے پیمانِ جفا کا نتیجہ کھل گیا جوشِ وفا کا
نکل آؤ ذرا پردہ سے باہر عقیدہ مٹ رہا ہے اب خدا کا
مزاجِ لاابالی اور جوانی خدا حافظ ہے ناموسِ حیا کا
خدا پر چھوڑ دو انجامِ کشتی قدم کیوں درمیاں ہو ناخدا کا
حدیثِ ضبط پروانہ ہے بے وقت زمانہ ہے فغانِ برملا کا
ترا آزاد پھر پابندِ غم ہے وہ پھر محتاج ہے لطف و عطا کا

لیکن افسوس ہے اپنی صلاحیتوں اورکمالات سے اسلام اور مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا سکتے تھے اپنی طبیعت کے عدم استقلال اور تلون کی وجہ سے نہ پہنچا سکے۔بحیثیت مجموعی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ۔
[اگست ۱۹۵۷ء]

سکروڈوی، مولانا سید محمد ادریس

مولانا سید محمد ادریس سکروڈوی

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی کا مظفر نگر میں انتقال ہوگیا۔مرحوم دارالعلوم دیوبند کے قدیم اساتذہ میں سے تھے یوں پڑھانے کو تو سب ہی کچھ پڑھا سکتے تھے لیکن ہیئت اُن کا خاص فن تھا۔ہنسی ہنسی میں اس فن کے اہم نکات بیان کرجاتے تھے۔بظاہر بڑے بھولے بھالے اور سیدھے لیکن درحقیقت نہایت ذی فہم اور بڑی سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔درس کے شغل کے ساتھ تھوڑا بہت کوئی نہ کوئی تجارتی کاروبار بھی کرتے رہتے تھے۔ہم لوگوں کے ساتھ خصوصیت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انورشاہؒ کے خاص خادم تھے۔دیرینہ تعلق وصحبت نے خادم ومخدوم میں بے تکلفی کی شان پیدا کردی تھی اورمرحوم حضرت الاستاذ کے تمام اعزا واقربا اور تلامذۂ خاص، یہ سب لوگ مرحوم کو اپنا عزیز سمجھتے اوراُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ رکھتے تھے۔انھیں دیکھ کر بے ساختہ حضرت الاستاذ یاد آجاتے تھے اورکوئی موضوع گفتگو ہو ہر پھر کے حضرت الاستاذ کا ذکر آ ہی جاتا تھا۔حق تعالیٰ رحمت ومغفرت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔آمین [نومبر۱۹۵۷ء]

مدنی، مولانا سید حسین احمد

کل شئ ھالک الا وجھه

آہ! کیوں کر کہئے کہ فلک علم وفضل کا آفتاب رخشندہ غروب ہوگیا۔بزم انس وقدس کی شمع فروزاں گل ہوگئی۔درج تقوی وطہارت کا لعل شب چراغ گم

ہوگیا۔شریعت وطریقت کے اسرار ورموز کا محرم جاتا رہا۔اخلاق ومکارم اسلامی کے ایوان میں خاک اُڑنے لگی۔جوکل تک لاکھوں انسانوں کے لیے طبیب عیسیٰ نفس تھا خود وہ موت کی آغوش میں جا سویا۔ملت بیضا کا سہارا، فرزندان توحید کی امیدوں کا مرجع، پیروان دین محمدی کی تمناؤں کا مرکز راہی ملک عدم ہوگیا۔یعنی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے ۵/ دسمبر کو بمقام دیوبند سہ پہر میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا کی وفات ایک فرد، ایک شخص اور ایک انسان کی موت نہیں ہے۔بلکہ ایک خاص دور، ایک عہد اور حیات ملّی کے صحیفہ کے ایک باب کا اختتام ہے۔حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت شیخ الہند نے اپنے مقدس ہاتھوں سے جو چمن لگایا تھا مولانا اس چمن کی آخری بہار تھے۔حضرت حاجی امداد اللہ اور نانوتوی نے شریعت وطریقت، علم وعمل اور تقدس وطہارت کی جو بزم سجائی تھی، اجل کی بادصرصر اُس کے چراغ بجھاتی رہی مگر ساتھ ہی چراغ سے چراغ بھی روشن ہوتے رہے اور بزم کبھی تاریک نہیں ہوئی لیکن اب اس بزم کا آخری چراغ بجھ گیا۔روشنی کی جگہ ظلمت نے لے لی۔تاریکی چھا گئی اور بزم کی بساط الٹ گئی۔

اسلام میں اعلیٰ اور مکمل زندگی کا تصور یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ساتھ فکر ونظر کی بلندی اور جہد وعمل میں پختگی اور ہمہ گیری ہو اور یہ سب کچھ تعلق باللہ کے واسطہ سے ہو۔مولانا اس دور میں اس معیار پر جس طرح پورے اُترتے تھے ہندوپاک تو کیا پورے عالم اسلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔علم و فضل کا یہ عالم کہ اسرار وغوامض شریعت وطریقت ہر وقت ذہن میں مستحضر۔کسی سائل نے کوئی مسئلہ پوچھا نہیں کہ معلومات کا سمندر ابلنے لگا۔چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی طرح حضرت مولانا کے مکتوبات بھی جو کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور جو سب کے سب بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، علم و فضل اور حکمت ربانی کا گنجینہ ہیں۔علوم شریعت وتصوف کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور سیاسیات کا خاص ذوق اور ان کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔بین الاقوامی سیاسیات حاضرہ اور علی الخصوص مشرق وسطیٰ اور ممالک عربیہ کی سیاسیات پر بڑی گہری اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے اور اس پر برابر غور وفکر کرتے رہتے تھے۔گزشتہ سال کلکتہ میں ناگا قبائل کا تذکرہ آ گیا تو مولانا نے ان قبائل کی تاریخ اور ان کی جغرافیائی پوزیشن پر اس قدر عالمانہ اور مبصرانہ تقریر کی کہ سننے والے حیران رہ گئے۔عربی زبان خالص عربی لب ولہجہ میں بولتے اور گھنٹوں اس میں برجستہ تقریر کر سکتے تھے۔ترکی زبان سے واقف اور مگدھی زبان سے آشنا تھے۔اس زبان کے بعض گیت اور اشعار یاد تھے۔سلوک ومعرفت میں یہ حال تھا کہ لاکھوں مسلمانوں نے تجلیۂ باطن کا فیض حاصل کیا اور روحانی مقامات طے کیے۔مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ نے ایک مرتبہ عالم جذب میں مولوی ظہیر الحسن ایم۔اے کاندھلوی مرحوم سے خود ان کے مکان پر فرمایا کہ میاں ظہیر! لوگوں نے مولانا حسین احمد کو پہچانا نہیں۔خدا کی قسم ان کی روحانی طاقت اس قدر بڑھ ہوئی ہے کہ اگر وہ اس طاقت سے کام لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں۔لیکن چوں کہ یہ عالم اسباب ہے اس لیے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس غرض کے لیے ان کو وہی طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں۔

جہد وعمل کے میدان میں مولانا کی زندگی سرتاپا ارباب عزیمت کی زندگی تھی۔مالٹا کی اسارت سے لے کر آزادی کے حصول تک یہ زندگی جو ورع و تقدس کی مکمل آئینہ دار تھی ہمیشہ دارورسن کے خطرات سے کھیلتی رہی۔مصائب و آلام اور شدائد ومحن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اُن کا مذاق اڑاتی رہی۔حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکتب خیال کے ایک فرد فرید ہونے کی حیثیت سے اپنے مرشد حضرت شیخ الہند کے ساتھ مولانا نے حریت واستخلاص وطن کی راہ میں دارورسن کو اُس وقت لبیک کہا جب کہ ابھی کانگریس کی زبان کامل آزادی کے لفظ سے آشنا بھی نہیں ہوئی تھی۔اس راہ میں طوفان آئے، زلزلے آئے، بجلیاں کوندیں، بگولے اُٹھے، کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے لیکن یہ مرد حق آگاہ حق پرست اپنے مقام پر کھڑا رہا اور اس کے پائے ثبات واستقلال میں ذرا برابر جنبش نہ ہوئی۔سیاسیات میں اس درجہ عملی انہماک وتوغل کے باوصف، جس کا مقصد وحید بھی دین قیم کا احیا اور اعلاءً کلمۃ اللہ تھا۔ظواہر شریعت میں تقشّف اور سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ اُس مجلس نکاح میں شرکت نہیں فرماتے تھے جس میں عام رسم ورواج کے مطابق دھوم دھڑکا، شاندار دعوت، مسرفانہ رسوم اور مہر حضرت فاطمہؓ سے زیادہ مہر باندھا جاتا ہو۔اگر حسن ظن کی بنا پر کسی ایسی مجلس میں شریک ہو بھی گئے تو جونہی کوئی ایسی بات علم میں آئی تو فوراً سخت غیظ وغضب کے ساتھ مجلس سے اٹھ کر چلے آئے۔نشست وبرخاست، کھانا پینا، وضع قطع ہر چیز میں آنحضرت ﷺ کے سنن عادیہ تک کا اتباع کرتے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے تھے۔دینی اور ملّی معاملات کے علاوہ نجی زندگی میں حد درجہ خوش مزاج، خندہ جبیں اور شگفتہ طبع تھے۔مہمان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ دونوں وقت کھانے پر اور ناشتہ پر لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔اُن کو کھلا کر قلبی راحت اور سکون محسوس کرتے تھے۔

متواضع اورمنکسر المزاج اس درجہ کہ بس عجز وتواضع اورانکسار کااس سے بڑھ کر تصور ہی نہیں ہوسکتا۔اس سلسلہ میں مولانا کے بعض واقعات ایسے ہیں کہ قلم کوان کاذکر کرتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔

مولانا جامعیت کمالات واوصاف کے اعتبار سے بے شبہ شیخ العرب والعجم تھے، وہ خودتو ۸۲ برس کی عمر میں رفیق اعلیٰ سے جاملے جس کے لیے کم وبیش پانچ ماہ سے ان کی روح ہروقت بے چین اورمضطرب تھی لیکن عالم اسلام یتیم ہوگیا۔ مولانا کی وفات ملت بیضا کے لیے ایک سخت اورعظیم حادثہ ہے جس کی تلافی کی بظاہر مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں۔نور اللہ مرقدہ وبردمضجعہ۔

[دسمبر ۱۹۵۷ء]

سکسینہ، رام بابو

رام بابوسکسینہ

افسوس ہے دسمبر کے آخری ہفتہ میں جناب رام بابوسکسینہ کاحرکت قلب بند ہوجانے سے بحالت سفر اچانک انتقال ہوگیا۔موصوف کواردو زبان وادب کے ساتھ عشق تھااوروہ اس کا بڑا وسیع اورگہرا مطالعہ رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ایک ذمہ دارسرکاری عہدہ کی چند درچند مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ادبِ اردو پرمتعدد ضخیم کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ان کی کتاب 'تاریخ ادبِ اردو' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس موضوع پر یہ کتاب اس پایہ کی ہے کہ ادبِ اردو کاکوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔اس کے علاوہ ''اردو کے انگریز شعرا'' نامی کتاب انھوں نے بڑی تلاش وجستجواورمحنت سے مرتب کی تھی۔ایک کتاب حال میں ہی ''مرقع شعراء'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔سنا ہے کہ دو کتابوں کے مسودے ابھی اورباقی ہیں جوغیرمطبوعہ ہیں،موصوف اب دنیا میں نہیں لیکن اُن کے یہ شاندارادبی کارنامے اُن کانام زندہ رکھیں گے۔

[جنوری ۱۹۵۸ء]

آزاد، مولانا ابوالکلام

آہ! ترکش مارا خدنگ آخریں

واحسرتا!ابھی حضرت شیخؒ کی جدائی کاغم تازہ ہی تھا اورامتدادِ روزگار کا مرہم اس غم کی جراحت سامانیوں کوکم نہیں کرسکا تھا کہ اچانک مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات حسرت آیات کاسانحۂ جاں گداز پیش آگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

عام پیرایۂ بیان میں لوگ کہتے ہیں کہ مولانا علوم قدیمہ وجدیدہ کے مبصر عالم تھے۔سحرطراز انشاء پرداز، بلند پایہ ادیب، جادوفشاں خطیب تھے۔فہم وتدبر، ذہانت وفطانت اُن کے اوصاف وکمالاتِ طبعی کاتکمۂ زریں تھے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب عنوانات مولانا کی اصل شخصیت کی ترجمانی اورعکاسی سے قاصر ہیں وہ بذاتِ خودایک تاریخ تھے اورتاریخ ساز بھی، وہ مستقل ایک عہد تھے اور عہد آفریں بھی۔انھوں نے اپنے دماغ اورزبان وقلم سے ایک عہد پیدا کیا جس کی ہمہ گیری اوروسعت کا یہ عالم تھا کہ اُس سے مذہب بھی متاثر ہوااورادب بھی، سیاست بھی اُس سے اثرپذیر ہوئی اورتہذیب وثقافت بھی۔اُن کاقلم ابرِ بہاراں بھی تھا اور برقِ شررفشاں بھی۔علم وحکمت اورشعروادب کے میدان کی طرف نکل گیاتوفروغِ نظراورایمان ویقین کے لالہ وگل کو پیغامِ نشوونما دیتا گیا اورچٹیل میدانوں کوگل وگل زار بناگیا۔اوراگراُس نے مذہب اورسیاست کی طرف رخ کیاتوفکر ونظر اوراحساس وشعور کی دنیا میں طوفان برپا کرگیا، جوگوشہ نشین تھے وہ اس آواز کوسن گھروں سے نکل پڑے ،جن پر غلامی کی غفلت ومدہوشی کاتسلّط تھا وہ جوش وولولۂ عمل سے سرشار ہوکرزندگی کاایک نیا خون اپنی رگوں میں دوڑتاہوامحسوس کرنے لگے۔وہ ہر بزم اورہرمحفل میں پہنچا اورہرجگہ صدرانجمن اورمیرمحفل ہوکررہا۔مذہب، سیاست اورادب، تہذیب اورمعاشرت ان میں کوئی منزل ایسی نہیں ہے جس کی طرف اُس نے رخ نہ کیاہواوراُس میں اپنے اجتہاد وتحقیق ،سنجیدہ فکراورنظر بلند کے لازوال نقوش نہ چھوڑ گیاہو۔

ایک شخص آج کل کے رسمی طریقۂ تعلیم سے ناآشنا ہونے کے باوجودمحض اپنی خداداد، غیرمعمولی ذہانت وفطانت اورذاتی مطالعہ وتحقیق سے کس قدراونچا ہوسکتاہے مولانا اُس کی برہان مبین اوردلیل روشن تھے اوراس طرح کی عبقریت (Geniusness) کی مثالیں دنیا میں کم ملیں گی۔چنانچہ جس طفلِ نوخیز نے سولہ برس کی عمر میں اردو کی اخبارنویسی سے اپنی زندگی شروع کی تھی وہ نوجوانی میں ہی اس قدر بلند اورسرفراز ہوگیا کہ جس محفل میں سن رسیدہ ملک کے اکابر وزعما یکجا بیٹھتے تھے وہاں بھی وہ کرسی صدارت پرمتمکن نظرآتا تھا۔اکابرعلما نے اُس کو''امام الہند'' کہا۔ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس نے تحریک آزادی کے سب سے زیادہ نازک دور میں اُسی کی قیادت میں جدوجہد کی آخری منزلیں طے کیں اورپھرآزاد ملک میں سب سے پہلا مرکزی وزیرتعلیم بھی وہی بنا۔یہ ایک

محکمہ تو محض رسمی طور پر تھا ورنہ اُس کا ناخن تدبر وفہم ملک کی پوری سیاسی گتھیوں کے ہی سلجھانے میں مصروف رہا۔ چنانچہ آج یہ شخصیت ہم میں موجود نہیں ہے تو ہر طبقہ اور ہر گروہ میں اُس کا ماتم بپا ہے۔ علماء رو رہے ہیں کہ اُن کا سرتاج اُٹھ گیا، علوم وفنون کے ماہر اشک فشاں ہیں کہ ایک عظیم الشان اسکالر جاتا رہا۔ وزیر اعظم نہرو ماتم کناں ہیں کہ اب مشورہ اور رائے کس سے لیں گے۔ وزیر داخلہ پنڈت پنت کو ملال ہے کہ مولانا کی وفات ملک کے لیے مہاتما گاندھی کے بعد سب سے بڑا حادثہ ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ کسی ایک شخصیت کے جامع اور ہمہ گیر ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ ہر شخص بلاتفریق مذہب وملت اپنے خاص نقطۂ نظر اور مذاقِ طبع کے ماتحت اُس کو مجموعۂ کمالات واوصاف سمجھے اور اُس کی وفات پر اشک فشاں وگریہ کُناں ہو۔

اگرچہ ملک کی آزادی کے بعد سے مولانا گوشہ نشین ہوگئے تھے اور عوام سے رابطہ باقی نہیں رکھا تھا لیکن اُس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں تھی کہ مولانا اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ ملک کے خاص حالات میں اُن کا پبلک میں آنا اور تقریریں کرنا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا بلکہ اُس سے تھوڑے بہت نقصان کا ہی خطرہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے ملک کی خدمت کا صحیح اور درست طریقہ یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ ملک کی تعمیری خدمات انجام دی جائیں اور اس سلسلہ میں پنڈت نہرو کو زیادہ سے زیادہ قوت بہم پہنچائی جائے اور اپنے صحیح مشوروں سے اُن کی مدد کی جائے۔ چنانچہ اس سیاست پر وہ آخر وقت تک عمل پیرا رہے۔ جو کچھ ان کو کہنا ہوتا تھا وہ پنڈت نہرو سے کہلاتے تھے اور جو کچھ انہیں کرنا ہوتا تھا پنڈت جی سے کراتے تھے۔ مولانا کے کیریکٹر کی یہ بھی بڑی اہم خصوصیت تھی کہ اُن کو اپنی زبان اور دل ودماغ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ خود اُن کے بقول انھوں نے سالہا سال کی مشق کے بعد اپنے اندر یہ کمال پیدا کرلیا تھا کہ کسی کی مدح وذم کا اُن پر مطلق کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور ہمیشہ اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے تھے۔ جب بولنے کی ضرورت ہوتی تھی تو بھرپور تقریر کرتے تھے اور جب بولنے کو مضر جانتے تھے تو بالکل چپ سادھ لیتے تھے۔ مولانا کے سیاسی مخالفین نے برا بھلا کہنے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی تھی لیکن سب جانتے ہیں کہ مولانا کی پیشانی پر غیظ وغضب کی ایک شکن بھی نہیں پڑی اور کبھی خلوت میں بھی کسی بڑے سے بڑے مخالف کا ذکر بدی کے ساتھ نہیں کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی موجودگی میں کسی کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ شرافتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ زبان کبھی فحش اور گندے لفظ سے آشنا نہیں ہوئی۔ غیور وخوددار اس پایہ کے تھے کہ والد مرحوم کی استخواں فروشی ہرگز گوارا نہیں کی حالانکہ اس ذریعہ سے بلا کسی محنت ومشقت کے لاکھوں کما سکتے اور ایک وسیع ومتمول طبقہ کے مرشدِ روحانی بن سکتے تھے۔ مولانا پر سخت قسم کی عسرت وتنگدستی کے دور بھی آئے۔ لیکن کیا مجال کہ زبان کسی کے سامنے اظہارِ احتیاج کے ننگ سے آلودہ ہوئی ہو۔ یہ وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اس زمانہ میں علما اور مشائخ اور عباد وصلحا میں عموماً ناپید ہیں پھر اور لوگوں کا کہنا ہی کیا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مولانا اکابر وزعمائے امت کی پرانی نسل کی آخری یادگار تھے، اس لیے مولانا کی وفات ایک شخص اور ایک بڑے آدمی کی موت نہیں۔ بلکہ پورے ایک عہد، ایک دور، ایک قرن کی موت ہے۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ عہدِ حاضر کا ایک باب ختم ہوگیا۔ بس سدا رہے نام اللہ کا۔ کل شی ھالك الا وجھہ۔ اس دنیا کی ریت یہی ہے جو آیا ہے اس کو جانا ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔ [مارچ ۱۹۵۸ء]

عبدالحق، افضل العلماء ڈاکٹر

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق

افسوس ہے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق بھی پچھلے دنوں ستاون ۵۷ برس کی عمر میں راہی ملک بقا ہوگئے۔ شمالی ہند کے عوام میں تو کم ہی لوگ ہوں گے جو مرحوم کو جانتے ہوں، البتہ جنوبی ہند میں ایک ایک بچّہ اُن سے واقف تھا اور مسلمان تو اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ جنوبی ہند کے ''سرسید'' کہلاتے تھے۔ کیوں کہ انھوں نے مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کے سات اسکول اور کالج مدراس میں اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ علوم قدیمہ وجدیدہ دونوں کے مبصر عالم تھے۔ پہلے کانپور کے ایک مدرسہ میں درس نظامی کی باقاعدہ تکمیل کی اور اس کے بعد انگریزی کے امتحانات کی طرف متوجہ ہوئے تو آکسفرڈ یونیورسٹی سے ڈی فل کرکے ہی دم لیا۔ واپسی پر پہلے محمڈن کالج مدراس کے پروفیسر عربی اور پھر پرنسپل مقرر ہوئے، اس کے بعد مدراس کے گورنمنٹ پریسیڈنسی کالج کے پرنسپل ہوئے۔ یہاں سے پنشن لینے کے بعد مدراس کے پبلک سروس کمیشن کے ممبر اور آخر میں صدر بھی ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو علمی اور عملی دونوں قسم کے کمالات سے نوازا تھا۔ علوم قدیمہ وجدیدہ کے نامور فاضل ہونے کے ساتھ صورۃً وسیرۃً نہایت راسخ العقیدہ مسلمان اور سچ مچ ایک مومن قانت تھے۔ نہایت جری اور دبنگ تھے، حق بات کے کہنے اور کرنے میں کسی کی ذرا پروا نہیں

کرتے تھے۔ برہان کے شروع سے خریدار اور ندوۃ المصنفین کے بڑے قدردان تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کچھ دنوں پرو وائس چانسلر بھی رہے تھے۔ انھیں دنوں میں کلکتہ یونیورسٹی کی ایک ضرورت سے کلکتہ تشریف لائے تو دیرینہ تعلق کے پاس خاطر سے غریب خانہ کو بھی شرف قدوم سے نوازا۔ ملاقات ہوئی اور شرف ہم طعامی بھی حاصل ہوا۔ اس کے بعد مرحوم نے علی گڑھ میں مسلمان طلباء کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں جو اقدامات کیے تھے وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ سنانے شروع کیے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ یہ روئداد سنتے سنتے بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ ''تو بس ڈاکٹر صاحب! آپ گئے، اب علی گڑھ میں نہیں رہ سکتے''۔ مرحوم نے پوچھا ''آخر کیسے؟'' میں نے عرض کیا'' میں نے جو کچھ کہا ہے اُس کو مجذوب کی ایک بڑ سمجھیے۔ اور مجذوب کا حال یہ ہے کہ بات تو پتہ کی کہتا ہے۔ لیکن ''کیوں'' اور'' کیسے'' سے واسطہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم علی گڑھ پہنچے اور وہاں سے غالباً ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی واپس ہوگئے۔ مدراس پہنچ کر مرحوم نے مجھ کو لکھا ''میں آپ کے علمی اور ادبی کمالات کا تو پہلے سے معترف تھا مگر اب آپ کی ولایت کا بھی قائل ہوگیا۔ اَللّٰھُمَّ زِدْفَزِدْ ''مرحوم اس زمانہ میں ''دین ودنیا بہم آمیز کہ اکسیر این است'' کا سب سے بہتر نمونہ تھے۔ پورے ہندوپاک میں ان جیسے لوگ کم ہی ملیں گے، حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور اُن کی قبر ٹھنڈی رکھے۔ آمین۔ [اپریل ۱۹۵۸ء]

خاں، ڈاکٹر

ڈاکٹر خاں

پاکستان میں ڈاکٹر خاں صاحب کا دردانگیز واقعۂ شہادت ایک ایسا سانحۂ عظیم ہے کہ شرافت وانسانیت اُس کا جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔ مرحوم ہندوستان کی جنگ آزادی کے صفِ اول کے سپاہی اور مجاہد تھے۔ اس راہ میں انھوں نے کامل عزم واستقلال اور ہمت وجوانمردی کے ساتھ جو سختیاں جھیلی ہیں اور پٹھانوں میں جو ڈسپلن اور ضبط ونظم پیدا کیا ہے وہ ان کے کردار اور صفتِ قیادت کا آئینہ دار ہے۔ مرحوم صرف جنگ آزادی کے مردِ میدان ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک مثالی حکمراں بھی تھے۔ سادگی، خلوص ودیانت، محنت وجفاکشی، حق پسندی وعدل گستری، بے لوث خدمتِ بنی نوع انسان۔ ان صفات وکمالات کے باعث پاکستان کی سیاست کے موجودہ دور اختلال وانتشار میں تنہا ایک مرحوم کی ذات تھی جن کو عوام کا اعتماد حاصل تھا اور جن کے خلوص ودیانت پر بڑے سے بڑا سیاسی مخالف بھی حرف گیری نہیں کرسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے اور ان کے مراتب بلند کرے۔ [جون ۱۹۵۸ء]

ندوی، مولانا سید ابوظفر

مولانا سید ابوظفر ندوی

ابھی یہ سطور لکھی جا رہی تھیں کہ اچانک اطلاع ملی کہ مولانا سید ابوظفر ندوی نے اپنے وطن دیسنہ (بہار) میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم پرانے دور کے ندوی تھے۔ تمام علوم اسلامیہ وعربیہ میں دسترس رکھتے تھے، لیکن تاریخ ان کا خاص فن تھا، چنانچہ مرحوم نے جتنے مقالات لکھے اور جتنی کتابیں تالیف کیں اُن میں سے اکثر وبیشتر اسی موضوع پر ہیں۔ اس فن کا بڑا عمدہ اور صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے، جو کچھ لکھتے تھے شگفتہ زبان میں لکھتے اور تحقیق کے ذریعہ فراہمی معلومات کا حق ادا کردیتے تھے۔ 'مختصر تاریخ ہند' اور 'تاریخ سندھ' دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوکر مقبول عام وخاص ہوچکی ہیں۔ ایک ضخیم کتاب ''تاریخ گجرات'' کے نام سے ندوۃ المصنفین کے زیرِ اہتمام طبع ہورہی ہے۔ مختلف کالجوں میں پروفیسر رہے اور اب ادھر سالہا سال سے احمدآباد میں گجرات اکاڈمی سے وابستہ تھے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بھانجہ یا بھتیجے تھے اور یوں بھی صورۃً وسیرۃً سید صاحب سے اس درجہ مشابہ تھے کہ ۵۵ء میں اپنی صاحبزادی کی شادی کے سلسلہ میں کلکتہ آئے اور پہلے سے کسی اطلاع کے بغیر اچانک راقم الحروف سے ملنے کی غرض سے دفتر میں تشریف لے آئے تو مرحوم کو دیکھ کر سید صاحب کی شکل وصورت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا اور بے قرار کرگیا، یہ بالکل پہلی ملاقات تھی مگر وہی بزرگانہ شفقت ومحبت، باتوں میں علمیت اور ذہانت کے ساتھ وہی بھولا پن اور سادگی، وہی غایتِ کرم اور توجہ۔ سمدھیانہ میں شادی کا ہنگامہ بپا تھا اس لیے شب غریب خانہ پر ہی بسر کی۔ احمد آباد سے بھی وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہتے تھے اور اُس میں بھی وہی مشفقانہ اور بزرگانہ انداز ہوتا تھا۔ میرے اور اپنے خانگی معاملات پر اس طرح گفتگو کرتے تھے کہ گویا ہم دونوں قریبی رشتہ دار ہوں۔ ان ذاتی اخلاق کے علاوہ بڑے متشرع اور متدین تھے، دو راتیں میرے مکان پر گزاریں مگر اُن میں بھی مسافر ہونے کے باوجود تہجد کی نماز ادا کی اور حسبِ معمول اوراد ووظائف کا ورد کیا۔ حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ اب ایسے بزرگوں سے دنیا خالی ہوتی جارہی ہے۔ آئندہ ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترسیں گی اور یہ لوگ کہیں نہ ملیں

گے۔ [جون ۱۹۵۸ء]

عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا حرکت قلب کے بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔موصوف اردواورانگریزی دونوں زبانوں کے نامور مصنف، ادیب اورایک بلند پایہ فلسفی تھے۔عرصہ تک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں شعبۂ فلسفہ کے صدر رہے۔ اُن کے فکر ونظر کا خاص موضوع فلسفۂ اقبال تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر متعدد وقیع اورمعلومات آفریں مقالات کے علاوہ انھوں نے ''فکر اقبال'' کے نام سے ایک نہایت بلند پایہ اور سلجھی ہوئی کتاب پچھلے چند برسوں میں لکھی تھی جو اقبالیات کے وسیع لٹریچر میں شاہکار کی حیثیت رکھتی تھی۔ اقبال کے علاوہ مولانا جلال الدین رومؔی کے کلام پر بھی اُن کی نگاہ بڑی گہری اور ٹھوس تھی۔اس سلسلہ میں اُن کی کتاب ''حکمت رومی'' بڑی وقیع اورخاص چیز ہے۔ علاوہ بریں اُن کی انگریزی کتاب ''اسلامک اڈیالوجی'' بھی مجموعی اعتبار سے بڑی لایق قدر ہے۔گذشتہ چند برسوں سے وہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈائرکٹر اورادارہ کے ماہنامہ ''ثقافت'' کے ایڈیٹر تھے۔ اُن کی تحریر شگفتہ اورمتوازن ومعتدل ہوتی تھی۔مزاج مرنج ومرنجان پایا تھا۔اُن کی وفات علم وادب کے لیے ایک بڑاسانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کومغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفرازفرمائے۔ [فروری ۱۹۵۹ء]

ملیح آبادی، مولانا عبدالرزاق

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

افسوس ہے۲۴/ جون کوصبح کے وقت بمبئی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا۶۵برس کی عمر میں انتقال ہوگیا،نعش بمبئی سے ملیح آباد لائی گئی اور بروز جمعہ ۲۶/ جون کوسپرد خاک کردی گئی۔

مرحوم اردواورعربی دونوں زبانوں کے نامورادیب،صحافی اورانشاء پرداز تھے۔عربی کی تعلیم مصر میں پائی تھی اورسید رشید رضا مرحوم جواپنے عہد کے اکابر علماء اورمحققین اورمصنفین میں سے تھے ان کے تلمیذ رشید تھے، اس لیے مرحوم عربی زبان بالکل مادری زبان کی طرح بولتے اورلکھتے تھے۔مصر سے واپس آکر کلکتہ سے عربی کاایک جریدہ ''الجامعۃ'' کے نام سے نکالا جوعربی کے اساتذہ اورطلباء میں بڑامقبول ہوالیکن یہاں مولانا ابوالکلام کے دامان دولت سے وابستہ ہونے کے بعد انھوں نے اردواخبارنویسی کواپنا مستقل نصب العین زندگی بنا لیا اور بڑی محنت کاوش اورمشق ومزاولت کے بعد اس میں بھی اپنا خاص ایک ایسا اسلوب پیدا کیا کہ اردو زبان کے بھی صاحب طرزادیب بن گئے۔ اُن کی تحریر صاف سپاٹ، بہت سلیس وعام فہم مگرساتھ ہی ولولہ انگیز اور پُرجوش ہوتی تھی۔اس سلسلہ میں وہ اوّلاً 'الہلال' اور'البلاغ' کی ادارت میں مولانا ابوالکلام کے رفیق رہے اور پھر کلکتہ سے ہی متعدد اخبار خوداپنے نکالے،تقسیم کے بعد اپنا اخبار روزانہ 'آزاد ہند' اپنے لایق فرزند احمد سعید صاحب ملیح آبادی کے حوالہ کرکے دہلی چلے گئے اور انڈین کونسل فارکلچرل ریلیشنز کے سہ ماہی عربی مجلّہ 'ثقافۃ الہند' کو بڑی قابلیت سے ایڈٹ کرتے رہے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیواسٹیشن دہلی کے عربی پروگرام کے بھی ڈائریکٹر رہے۔اخبارات ورسائل کی اڈیٹری کے باوجودتصنیف وتالیف اورترجمہ کا مشغلہ بھی رکھتے تھے چنانچہ متعدد کتابیں ترجمہ کیں اورکئی کتابیں تالیف کیں جن میں آخری ضخیم کتاب وہ ہے جومولانا ابوالکلام آزاد پر ہےاورغیرمطبوعہ ہے۔

ذاتی اخلاق واوصاف کے اعتبار سے مرحوم بڑے باوضع، بامروت، صاف دل اورصاف سینہ انسان تھے۔ اظہار رائے کے معاملہ میں بڑے نڈر اوربے باک تھے،تحریک پاکستان کے عہد شباب میں اپنی اس جبلت کے باعث انھوں نے بڑی بڑی سختیاں جھیلیں اورمصائب برداشت کیے۔لیکن عزم وہمت میں ذراجنبش پیدانہیں ہوئی۔طبعاً بڑے ہنسوڑ اورخوش مزاج تھے اورساتھ ہی بڑے رقیق القلب بھی۔مولانا ابوالکلام آزاد کے تو وہ عاشق زار ہی تھے اوراس لیے اُن کی وفات کے بعد وہ خود بھی اپنی زندگی سے بے زار ہوگئے تھےلیکن بہت سے لوگوں کو یہ سن کرتعجب ہوگا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی وفات کی خبر جب انھوں نے سنی تو اس طرح بے ساختہ بلک بلک کرروئے ہیں کہ دیکھنے والوں کوان پررحم آتا تھا۔اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

[جولائی ۱۹۵۹ء]

حسین، سید عنایت

سید عنایت حسین

افسوس ہے پچھلے دنوں دیوان سیّد عنایت حسین صاحب کاانتقال ہوگیا۔ مرحوم اجمیر میں درگاہ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے سجّادہ نشین تھے۔ اس نسبت سے اگرچہ وہ صوفی تھے اور جمعیۃ الصوفیاء ہند کے صدر بھی تھےلیکن

آج کل کے عام سجادہ نشینوں کے برخلاف شریعت کے احکام و آداب اور اتباعِ سنّت کا حتی الوسع بڑا لحاظ اور خیال رکھتے تھے۔خود بھی بڑے اچھے عالم تھے اور علماء کا احترام کرتے اور ان سے تعلقات رکھتے تھے۔ درگاہِ مذکور کا سجادہ نشین ایک چھوٹی موٹی ریاست کا مطلق العنان والی ہوتا ہے ۔لیکن دیوان صاحب مرحوم فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور مسلمانوں کے قومی وملی معاملات سے بڑی دلچسپی لیتے تھے ۔اخلاقی اعتبار سے بڑے خوش مزاج ،شگفتہ طبع ،متواضع اور بڑے خلیق تھے۔ان کا دروازہ ہر حاجت مند کے لیے کھلا رہتا تھا۔گفتگو بھی بڑی شیریں اور موثر ہوتی تھی۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور مدارج ومراتب بلند فرمائے۔آمین۔ [اکتوبر ۱۹۵۹ء]

رودولوی، چودھری محمد علی

چودھری محمد علی رودولوی

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں اردو زبان کی دو بڑی شخصیتیں بھی ہم سے جدا ہوگئی۔ایک چودھری محمد علی رودولوی اور دوسرے عبدالمجید سالک۔

چودھری صاحب اردو کے نامور ادیب، پختہ قلم اور کہنہ مشق انشاء پرداز تھے۔ایک زمانہ میں ان کی تحریریں بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ زبان دانی کے ساتھ ان کی تحریر کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ رکیک سے رکیک بات یا خیال کو اس انداز سے لکھتے تھے کہ ذوقِ سلیم کو گھناونی معلوم نہیں ہوتی تھی۔''اتالیق بی بی''، ''کشکول''، ''فقیر محمد علی شاہ'' ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد افسانے اور دو چار کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔طبعاً بڑے ہنسوڑ، زندہ دل اور شگفتہ انسان تھے۔تعلقہ دار ہونے کی وجہ سے زندگی بڑے عیش وآرام میں گزری۔ آخر عمر میں خوف خدا کا ان پر بڑا غلبہ ہوگیا تھا، نماز تو خیر پابندی سے پڑھنے ہی لگے تھے اور حج بھی کر آئے تھے مگر آخرت کے ڈر سے بے چین رہتے تھے۔اگرچہ خاندانی طور پر امامیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن تعصب ان میں نام کو بھی نہ تھا۔ اہل سنت والجماعت مسلمانوں کے ساتھ نماز انھی کے طریقے پر پڑھتے تھے۔اس سلسلہ میں ''میرا مذہب'' کے نام سے انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔خاتمہ بھی ایسا ہی اچھا ہوا۔۱۰/ستمبر کو بروز پنج شنبہ درود پڑھتے اور اللہ کے نام کا ورد کرتے کرتے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

الھم اغفرله وارحمه۔

[اکتوبر ۱۹۵۹ء]

سالک، عبدالمجید

عبدالمجید سالک

پنجاب نے اردو زبان وادب کی جو نادر شخصیتیں پیدا کی ہیں۔عبدالمجید سالک مرحوم کا نام ان حضرات کی صف اوّل میں تھا۔انھوں نے منشی فاضل کرکے بی۔اے کیا تھا، لیکن ذاتی مطالعہ، ذہانت اور شعروادب کے فطری ذوق کے باعث ادبی دنیا میں اس قدر شہرت حاصل کی تھی کہ ایک زمانہ میں 'زمیندار' اخبار میں ان کے فکاہات اور 'انقلاب' اخبار میں ان کے ''افکار وحوداث'' پنجاب میں گھر گھر بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے اور اخبار کھولتے ہی لوگ سب سے پہلے یہی چیزیں پڑھتے تھے۔غلام رسول مہر کی طرح مرحوم بھی مولانا ظفر علی خاں کے خاص تربیت یافتہ تھے۔اردو زبان کے محاورات وامثال پر بڑا عبور رکھتے تھے اور اس وصف خاص میں استاد سے بھی سبقت لے گئے تھے۔ انھوں نے مہر صاحب کے رفیق کی حیثیت سے اردو صحافت کا ایک ایسا معیار قائم کیا کہ آج بھی بہت سے اخبارات انھی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

اردو زبان کے بلند پایہ ادیب اور صحافی ہونے کے علاوہ بے تکلف اور فی البدیہہ شعر بھی کہتے تھے اور یہ غالباً مولانا ظفر علی خاں کی صحبت ہی کا فیض تھا۔اب ادھر چند برسوں سے سنجیدہ تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی دو کتابیں ''ذکر اقبال'' اور ''ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ ثقافت''، جس پر برہان میں تبصرہ بھی ہوچکا ہے، بڑی اچھی کتابیں ہیں۔طبعاً مرحوم بھی بڑے خندہ جبیں، خندہ رو، اور فرخندہ شمائل انسان تھے۔مزاج میں اعتدال پسندی اور میانہ روی تھی یہاں تک کہ سیاسیات میں بھی اُن کا مسلک معتدل ہی رہا۔وہ اردو کے ان چند خوش نصیب اخبار نویسوں میں تھے جنھوں نے محض اپنے قلم سے شہرت بھی خوب حاصل کی اور دولت بھی کافی کمائی۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب الکشمیریؒ سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور اسی تعلق سے راقم الحروف کے ساتھ ہمیشہ بڑے خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔تقسیم ہند کے بعد سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے نامہ وپیام برابر آتے رہتے تھے۔صحت اور تن وتوش کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کے پنجابی تھے۔انتقال ۶۴ برس کی عمر میں اچانک حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے ہوا۔ان کی وفات بے شبہ اردو زبان وادب کا ایک سانحۂ عظیم ہے۔حق تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ [اکتوبر ۱۹۵۹ء]

کاظمی، سید محمد احمد

سید محمد احمد کاظمی

افسوس ہے پچھلے دنوں محمد احمد صاحب کاظمی کا انتقال ہوگیا۔مرحوم مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری کے فرزند ارجمند اور ایک نامور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔الہٰ آباد ہائی کورٹ کے بڑے کامیاب ایڈوکیٹ اور ممبر پارلیمنٹ تھے۔ پارلیمنٹ میں وقف ایکٹ کے مصنف وہی تھے۔نیشنلزم گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔کانگریس کے علاوہ جمعیۃ علمائے ہند اور مجلس احرار کے بھی سرگرم کارکن تھے۔ اخلاقی اعتبار سے بڑے درویش صفت اور خداترس انسان تھے۔گذشتہ سال جب کہ حج کر کے آئے تھے اس وقت سے ان کی دین داری میں عظیم انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔آنحضرت ﷺ کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ نام نامی زبان پر آیا اور چشم پُرنم ہوگئی۔اسی جذبہ سے انگریزی زبان میں ایک ضخیم سیرت نبوی مرتب کررہے تھے جو افسوس ہے کہ نامکمل رہ گئی۔اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نعمتوں اور راحتوں سے نوازے۔ [دسمبر۱۹۵۹ء]

اسدؔ ملتانی

اسد ملتانی

گذشتہ ماہ نومبر میں جناب اسد ملتانی بھی کراچی میں وفات پاگئے۔مرحوم صاحب فن استادِ سُخن تھے۔قدرت کلام کا یہ عالم تھا کہ ہر صنف شاعری میں بے تکلف دادِ سخن دے سکتے تھے۔مگر اُن کا اصل میدان قومی شاعری تھا۔اس رنگ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متبع تھے۔سرکاری نوکری کی مصروفیتوں کے باعث ان کو اپنے حوصلہ کے مطابق شاعری کا زیادہ موقع نہیں ملا۔پھر بھی جتنا کچھ لکھ گئے ہیں صف اوّل کے شعراء میں اُن کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔طبعاً بڑے مخلص، منکسرالمزاج، مرنج ومرنجان قسم کے آدمی تھے۔اللھم اغفرلہ وارحمہ [دسمبر۱۹۵۹ء]

دہلوی، مولانا حافظ احمد سعید

مولانا حافظ احمد سعید دہلوی

قلم یہیں تک پہنچا تھا کہ اچانک مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ملی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔مولانا جمعیۃ العلمائے ہند کے بانیوں میں سے تھے اور اس کے پہلے جنرل سیکرٹری تھے۔اس حیثیت سے انھوں نے ملک میں دورے کیے اور جگہ جگہ تقریریں کیں، یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا زمانہ تھا۔مولانا کی تقریروں نے دھوم مچادی اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام تھا۔دلّی کی ٹکسالی زبان بولتے اور اسی میں گھنٹوں خاص لب ولہجہ کے ساتھ تقریر کرتے تھے۔اس لیے اُن کی گفتگو اور تقریر دونوں اس قدر شیریں اور شگفتہ ہوتی تھیں کہ بس ''وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی''۔قرآن مجید کے بہت اچھے حافظ تھے اور اُس کے ساتھ بڑا شغف رکھتے تھے۔نہایت آسان زبان میں قرآن کا ترجمہ وتفسیر لکھ رہے تھے جو غالباً پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ دینیات پر متعدد کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔متعدد بار حریت وطن کی راہ میں جیل گئے۔ طبعاً بے حد خلیق، ملنسار، خوش طبع اور بڑے بذلہ سنج بزرگ تھے۔ اگرچہ ادھر دو برس سے جمعیۃ کے صدر تھے لیکن چند درچند عوارض واسقام کے باعث برسوں سے گوشہ نشین ہوگئے تھے۔دلی سے باہر کے لوگ اُن کی تقریر سننے کو ترستے تھے مگر انھوں نے سفر کرنا بالکل ترک کردیا تھا۔عجب باغ وبہار انسان تھے۔ان کا فقرہ فقرہ زبان کی لطافت ونفاست کا مرقع ہوتا تھا۔دلّی وہ دلّی ہی نہیں رہی ہے۔اب ایسے بزرگ کہاں ملیں گے؟ کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب اور صدیقین وشہدا کا مقام جلیل عطا فرمائے۔آمین [دسمبر۱۹۵۹ء]

عبداللطیف، مولانا مفتی

مولانا مفتی عبداللطیف

افسوس ہے گزشتہ مہینہ مولانا مفتی عبداللطیف صاحب کا علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔مرحوم عوام میں مشہور نہ تھے لیکن ارباب علم کے طبقہ میں بڑی بلند شخصیت رکھتے تھے۔استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔علوم دینیہ میں بڑی پختہ استعداد اور ایک خاص درک وبصیرت کے مالک تھے۔سالہا سال جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں شعبۂ دینیات کے صدر رہے، وہاں سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ آگئے اور یہاں بھی یہی خدمت انجام دینے لگے، آخر اس سے بھی سبکدوش ہوکر خانہ نشین ہوگئے۔مگر مطالعہ اور درس کا مشغلہ آخر تک جاری رہا، چھوٹے بڑے چند رسالے اور دو ایک کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اٹھاسی برس کی عمر میں وفات پائی مگر قویٰ خاص طور پر دماغ آخر وقت تک کام کرتے رہے۔باطنی احوال وکوائف سے بھی ناآشنا نہیں تھے۔اللہ تعالیٰ مغفرت ورحمت کی بیش از بیش نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔آمین [جنوری۱۹۶۰ء]

حمید اللہ خاں، حاجی [نواب بھوپال]

نواب بھوپال حاجی حمید اللہ خاں

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں حاجی حمید اللہ خاں کا جو عام طور پر نواب بھوپال کے نام سے مشہور تھے انتقال ہوگیا۔مرحوم اپنی سمجھ بوجھ،علمیت ولیاقت اور تدبر و دوراندیشی کی وجہ سے تقسیم ہند سے پہلے کے والیان ریاست میں ایک ممتاز مقام و مرتبہ رکھتے تھے اور اسی وجہ سے حکومت میں ان کا بڑا وقار تھا اور پبلک میں بھی بڑے ہردلعزیز تھے۔مرحوم کی والدہ ماجدہ خود ایک مثالی خاتون تھیں۔انھوں نے بیٹے کی تربیت ایسے انداز سے کی تھی کہ وہ دوسرے والیان ریاست کے لیے نمونہ کا کام دے۔چنانچہ عام والیان ریاست کی اولاد کے برخلاف مرحوم نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تعلیم پائی اور یہاں جب تک رہے عام طالب علموں کی طرح سب سے گھل مل کر رہے۔ایک خاص خاندانی ماحول میں نشو ونما پانے کے علاوہ علی گڑھ کی فضا میں ان کی جو ذہنی و دماغی تربیت ہوئی اسی کا اثر یہ تھا کہ وہ قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی اور دینی معاملات میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے اور ان کاموں کی عملاً مدد کرتے تھے۔چنانچہ دارالعلوم دیوبند،مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،ندوۃ العلماء لکھنؤ،جامعہ ملیہ اسلامیہ دلّی،یہ سب ادارے مرحوم کے فیضِ کرم وتوجہ کے ممنون تھے۔مسلم یونیورسٹی کے چانسلر اور والیان ریاست کی انجمن کے صدر بھی رہ چکے تھے۔مرحوم کے ذاتی اوصاف وکمالات اور پھر اُن کی خاندانی روایات کی وجہ سے ''بھوپال'' ارباب علم وادب،مسلمان علماء وفضلاء، شعراء اور اصحاب فن کی امیدوں اور تمناؤں کا جولانگاہ بن گیا تھا۔ریاست بھوپال تو پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔تاہم اُن کی ذات سے بھوپال کی قدیم روایات کی بھولی بسری یاد،ذہن میں کبھی کبھی اجاگر ہوجاتی تھی۔اب یہ سہارا بھی گیا۔سدا رہے نام اللہ کا! خاتمہ بھی بڑا اچھا ہوا۔نماز پڑھتے پڑھتے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔اللھم اغفرلہ وارحمہ رحماً کبیراً۔ [مارچ ۱۹۶۰ء]

دلؔ شاہ جہاں پوری

حضرت دلؔ شاہ جہاں پوری

حضرت دلؔ شاہ جہاں پوری بڑے پایہ کے قدیم اساتذۂ شعروسخن میں سے تھے۔فنی اعتبار سے وہ مسلمہ طور پر جانشینِ امیر مینائی تھے۔نظام حیدرآباد نے بھی ازراہِ قدردانی اُن کو اعتبار الملک کا خطاب دیا تھا۔اُن کی شاعری کا اصل میدان تغزل تھا،اگرچہ قدرت ہر صنف پر رکھتے تھے۔''نغمۂ دل''اور''ترانۂ دل'' کے نام سے اُن کے دو مجموعے شائع ہوکر عوام وخواص میں مقبول ہوچکے تھے۔ اُن کے تلامذہ کی تعداد جن میں اب بعض خود استاد ہیں سینکڑوں تک پہنچی ہوگی۔ شعروسخن کے علاوہ موصوف اونچے درجے کے طبیب اور درس نظامی کے باقاعدہ فارغ التحصیل تھے۔اخلاقی اعتبار سے بھی بڑے بلند مرتبہ بزرگ تھے۔نہایت بامروت وسیر چشم،متواضع،خوددار اور غیور۔افسوس ہے پچھلے دنوں نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کے لطف ونوازش سے سرفراز فرمائے۔آمین [مارچ ۱۹۶۰ء]

ناظم سیوہاروی، قاضی ظہور الحسن

قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی

افسوس ہے گزشتہ مہینہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاری نے داعی اجل کو لبیک کہا۔مرحوم رشتہ میں راقم الحروف کے ماموں تھے۔بڑے ذہین، طباع،بذلہ سنج اور قادرالکلام شاعر تھے۔فن پر بڑا عبور تھا۔تاریخ گوئی میں تو شاید ہی اُن کا کوئی جواب ہو۔اس خاص کمال کی وجہ سے نظام حیدرآباد دکن کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوگئے اور عرصہ تک وظیفہ پاتے رہے۔غالباً ۱۹۲۸ء میں جب ''نظام'' گورنمنٹ انڈیا سے برار کا معاملہ طے کرنے دلّی آئے تھے تو مرحوم نے اس تقریب سے ایک عجیب وغریب قصیدہ لکھا تھا جس میں ۱۹ اشعار تھے اور ہر شعر سے سات طرح دلّی آنے کی تاریخ نکلتی تھی۔پھر لطف یہ تھا کہ ہر شعر کے پہلے حرف کو ملایئے تو اُسی بحر اور اُسی ردیف وقافیہ کا ایک شعر ہوجاتا تھا اور اس سے بھی سات طرح تاریخ برآمد ہوتی تھی۔نظام نے اس پر خوش ہوکر ان کے منصب میں اضافہ کردیا اور اب وہ مستقلاً حیدرآباد میں رہنے لگے تھے۔علاوہ بریں اُن کو تصنیف وتالیف کا بھی بڑا متنوع ذوق تھا۔تاریخ،فقہ،ادب وتنقید، لسانیات،شعروشاعری ان میں سے ہر موضوع پر انھوں نے کتابیں لکھی ہیں۔آخر میں اردو کی انسائیکلو پیڈیا لکھنی شروع کی تھی جو ناتمام رہ گئی۔اخلاقی اعتبار سے خوش مزاج اور خندہ رو بزرگ تھے۔لطائف وظرائف سینکڑوں کی تعداد میں یاد تھے اور انھیں موقع ومحل کے لحاظ سے مزے لے لے کر سناتے تھے۔نماز باجماعت پڑھتے تھے اور اورادووظائف کا شغل بھی رکھتے تھے۔بزرگان دیوبند کے صحبت یافتہ اور ان کے نام کے عاشق تھے۔دنیوی معاملات میں بھی بڑی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

[مئی ۱۹۶۰ء]

عثمانی، مولانا مطلوب الرحمٰن

مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی

افسوس ہے گذشتہ ماہ جولائی کی ۱۷/تاریخ کو بیاسی سال کی عمر میں جناب مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب عثمانی نے کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے ہزاروں مریدوں اور عقیدت مندوں سے دائمی مفارقت اختیار کی۔ مولانا دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان کے گوہر شب چراغ تھے۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے برادر خورد اور حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی سے عمر میں بڑے تھے۔ صورت شکل، قد وقامت اور رنگ میں اپنے چھوٹے بھائی سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ عربی اور دینیات کی تعلیم مشکوٰۃ تک پائی تھی۔ انگریزی میں میٹرک تھے۔ ذہانت اور طباعی اس خاندان کا ورثہ ہے اس لیے مطالعہ اور ذاتی غور وفکر کا نتیجہ یہ تھا کہ دینی اور دنیوی ہر قسم کے موضوع پر بڑی سنجیدہ، موثر اور دلنشین تقریر کرتے تھے۔

محکمۂ نہر میں عرصہ تک اوورسیر کے عہدہ پر کام کرتے رہے، لیکن طبیعت شروع سے سلوک وطریقت کی جانب مائل تھی۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بیعت تھے۔ حجاز میں حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد جب ہندوستان میں حضرت سے چند خصوصی تعلق رکھنے والے حضرات پکڑے گئے تو اُن میں مولانا مرحوم بھی تھے، پولیس نے بڑی سختیاں کیں اور سخت اذیتیں دیں لیکن حضرت شیخ الہند کی تحریک کے جو رازہائے سربستہ آپ کے سینے میں محفوظ تھے اُن کو شناسائے حرف وصوت نہ ہونے دیا۔ حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد مرحوم نے بڑے بھائی حضرت مفتی صاحب سے رجوع کیا اور روحانی تربیت حاصل کی۔ تحریک خلافت کے آخری دنوں میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اب ہمہ تن تبلیغ اسلام اور روحانی ارشاد وہدایت کے کاموں میں لگ گئے۔ مشرکانہ رسم ورواج اور بدعات سے سخت نفور تھے۔ اس سلسلہ میں برسوں بریلی میں مقیم رہے اور عام ابلاغ حق اور ارشاد وہدایت کے علاوہ اہل بدعات سے مناظرے بھی کرتے رہے۔ پھر انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے تو خاص اس غرض سے علی گڑھ آکر پڑ گئے۔ یہاں اساتذہ وطلباء سے گفتگوئیں کیں اور انھیں دین قیم کی دعوت پہنچائی۔ مولانا کی ان مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کے مریدان باصفا میں خود مسلم یونیورسٹی میں اور اس کے علاوہ پورے ہندوپاک میں ایک بہت بڑی تعداد جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ہے جو اسلامی زندگی کے اوصاف وکمالات سے مزین ہیں۔

انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سے اُن کی توقعات کیا تھیں؟ اور انھیں وہ کس راہ پر لگانا چاہتے تھے؟ اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ اپنے ایک مرید خاص کو جو مسلم یونیورسٹی کے ایک نہایت لائق اور نامور فرزند ہیں اپنے خط مورخہ ۲۲/ مارچ ۱۹۵۲ء میں تحریر فرماتے ہیں:

''خوب یادرکھو جب تک تینوں پہلو درست نہ ہوں (تزکیہ، مغربی اور اسلامی حکمت) تم لوگ میرے معیار پر (جو حقیقتاً معیار قرآنی ہے) کوئی مفید اور بڑا کام نہیں کرسکتے، یہی وہ معیار ہے جو اس وقت گم ہے اور اسی وجہ سے مسلمانوں کا جو کام بھی جو جماعت کرتی ہے وہ مطلوبہ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔''

تحریک پاکستان کے عہد شباب میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے سیاسی اختلاف رائے پیدا ہوگیا تھا مگر اس کے باوجود کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کی مجلس میں مولانا کے خلاف کوئی لفظ کہہ سکے۔ ایک مرتبہ کسی نے بھولے سے اس قسم کی کوئی بات کہی تو سخت طیش میں آکر فرمایا: ''تم یا کوئی اور کیا جان سکتا ہے کہ مولانا حسین احمد کیا ہیں؟ اور اُن کا کیا مقام ہے؟ میرا خود یہ حال ہے کہ میں محض مولانا کی تکلیف کے خیال سے کھدر پہنتا ہوں ورنہ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا۔'' ایک اور مجلس میں فرمایا: ''مولانا حسین احمد کا دل جتنا روشن ہے آج کسی کا نہیں ہے۔'' اس سے لوگوں کو عبرت ہونی چاہیے جو ذرا سے اختلاف رائے کی بنا پر اپنے مخالف کے تمام اوصاف وکمالات پر خاک ڈالتے ہیں اور اس کو مردود و جہنمی ہی بنا کر چھوڑتے ہیں۔

۱۹۲۸ء کا ذکر ہے۔ اس زمانہ میں مولانا مرحوم کے متعلق ایک عام چرچا تھا کہ جو شخص آپ سے بیعت ہوجاتا ہے اُسے دوسرے تیسرے ہی دن خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت ہوجاتی ہے۔ راقم الحروف بھی اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مرحوم سے بیعت ہونے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ جو سلوک وطریقت میں وقت کے امام تھے اور اس نالائق سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ آپ کو خبر ہوئی تو بلا کر ڈانٹا اور فرمایا کہ: ''خواب میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت نہ شریعت میں کوئی اہمیت رکھتی ہے اور نہ طریقت میں یہ مطلوب ہے۔ کسی مرشد کامل سے بیعت ہونے کا مقصد تزکیۂ نفس اور اتباع شریعت کو اپنی طبیعت بنالینا چاہیے، محض اس غرض سے بیعت کرنا وسوسۂ شیطانی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خود مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب کے ہاں بھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی اور نہ کسی مرید سے وہ اس طرح کا وعدہ کرتے یا اس کی امید دلاتے تھے۔

ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد زندگی محض توکل پر بسر کرتے تھے۔ خود اگرچہ درویشانہ طور پر سادہ اور بے تکلف رہتے تھے مگر بڑے سیر چشم اور فیاض طبع تھے۔غریبوں اور ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔باتوں میں بڑا رس تھا آنکھوں میں جذب کی کیفیت جھلکتی رہتی تھی۔ہر بات میں اتباع شریعت کا خیال مقدم رہتا تھا۔سرور کائناتﷺ کے ساتھ والہانہ عشق رکھتے تھے۔حضور اکرمﷺ کا نام نامی زبان پر آیا نہیں کہ ہر موئے بدن بارگاہ عقیدت و محبت میں سجدہ ریز نظر آتا تھا۔زبان لڑکھڑانے لگتی اور آنکھیں پُرنم ہوجاتیں۔نور اللہ مرقدہ [اگست ۱۹۶۰ء]

جگر مرادآبادی

جگر مرادآبادی

حضرت جگر مرادآبادی کا حادثۂ وفات جو ۹ ستمبر کی صبح کو گونڈہ میں ستر برس کی عمر میں پیش آیا، اردو شعر وسخن کی دنیا کے لیے اس درجہ المناک ہے کہ اس کی تلخی وشدت عرصہ تک محسوس ہوتی رہے گی۔یہی وجہ ہے کہ اُن کا ماتم ہندو وپاک میں جیسا ہمہ گیر ہوا ہے، اقبالؔ مرحوم کے بعد سے آج تک کسی شاعر کا ایسا نہیں ہوا تھا۔اردو شاعری کے دور جدید نے تغزل کے پانچ عظیم المرتبت مجدد پیدا کیے ہیں: اصغرؔ، حسرتؔ، جگرؔ، فانیؔ اور فراقؔ۔انھوں نے اردو غزل کو نیا آہنگ، نیا اسلوب دیا اور اُن تصورات سے اسے پاک وصاف کیا جو اب تک روایتی ورثہ کی حیثیت سے چلے آرہے تھے۔اس فہرست میں جگرؔ کا نمبر اگرچہ فکر وفن کے اعتبار سے اصغرؔ وحسرتؔ کے بعد آتا ہے لیکن ہردلعزیزی اور عام مقبولیت میں وہ سب سے بلند اور فائق تھے۔ہر شاعر کا کلام تدریجی ارتقا کی منزلوں سے گزر کر پختگی و پائیداری کے مرتبہ تک پہنچتا ہے جہاں اس کو انفرادیت حاصل ہوتی ہے لیکن بڑے شاعروں کے کلام میں تدریجی ارتقا کی مختلف کڑیوں کا معلوم کرلینا اس قدر آسان نہیں ہوتا جتنا کہ مرحوم کے کلام میں ہے۔المجاز قنطرة الحقیقه کا مقولہ اگر صحیح ہے تو حضرت جگرؔ کا کلام اس کی سب سے بڑی روشن دلیل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کو شہرت ومقبولیت پہلے عوام میں حاصل ہوئی، پھر طبقۂ خواص میں اُن کے فکر وفن کی عظمت وگیرائی کا اعتراف پیدا ہوا۔اُن کے ابتدائی دور شاعری میں حسن وعشق مجازی کے طبعی معاملات اور اُن کے راز ونیاز کی حقیقی تصویریں پوری آب وتاب اور عریاں شکل وانداز میں پائی جاتی ہیں، اس لیے ان تصویروں نے حسین ودلکش ترنم کے ساتھ مل کر عوام میں اور خصوصاً نوجوانوں میں ایک قیامت برپا کردی اور ہر شخص جگر کے اشعار کا مانا ہوا نظر آنے لگا۔لیکن وقت کے امتداد اور شعور وتجربہ کی مختلف آزمائشوں سے گزرنے کے ساتھ مرحوم کے فکر میں حسن کا تصور، مقید سے مطلق اور مجازی سے حقیقی کی طرف ترقی کرتا رہا اور اس بنا پر اُن کی شاعری کے علائم ورموز بھی لطیف سے لطیف تر ہوتے چلے گئے۔

ابتدا میں رندی وسرمستی اور حسن وعشق کی معاملہ بندی کی وجہ سے اُن کا رنگ فارسی میں حافظؔ شیرازی اور عربی میں عمر بن ابی ربیعہ کا تھا۔لیکن آخر میں اُن کے تغزل کا مزاج سعدیؔ اور عرفیؔ ونظیریؔ کا قرین بن گیا۔اس میں شک نہیں کہ جگر کو جگر بنانے میں مرحوم کے حسین ودلکش ترنم اور الفاظ کی موسیقیت کو بڑا دخل تھا۔ لیکن عروس اگر جمیل نہ ہو تو محض لباس حریر اہل نظر کے لیے کب تک فریبِ چشم و نگہ کا سامان ہوسکتا ہے؟

مرحوم اپنے بعض معاصر شعرا کی طرح نہ بسیار گو تھے اور نہ پُرگو۔لیکن یہ اُن کا عیب نہیں ہنر تھا۔اسی بنا پر ان کی غزل، قطعہ یا نظم کا انتخاب ہوتی تھی، ورنہ بسیار گوئی اتنی بُری بلا ہے کہ اُس کی وجہ سے مصحفیؔ، ناسخؔ اور آتشؔ کا ذکر نہیں، میرؔ ومومنؔ تک کے دیوان رطب ویابس سے پُر ہیں۔

شعری وفنی کمالات کے علاوہ اخلاقی اعتبار سے بھی عجیب وغریب خوبیوں کے بزرگ تھے۔اُن کا قلب سراپا سوز وگداز اور انسانی ہمدردی وغمگساری کا پیکر تھا۔مروت، وضعداری اور لحاظ وشرم اُن کا شیوہ تھا۔ایک عرصہ تک دختر رز کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے۔لیکن خشیۃ ربانی سے دل کبھی بھی بے پروا نہیں رہا۔ حضرت قاضی عبدالغنی صاحب منگلوریؒ سے بیعت تھے۔حضرت اصغرؔ گونڈوی اور والد مرحوم بھی انہیں سے بیعت تھے، اس لیے پیر بھائی ہونے کے رشتہ سے تینوں میں بڑا اخلاص اور عمیق تعلق تھا۔اسی تقریب سے حضرت اصغرؔ مرحوم کی طرح جگرؔ مرحوم بھی راقم الحروف کو بھتیجا سمجھتے اور ایک چچا کی طرح بڑی شفقت بزرگانہ رکھتے تھے۔دلّی یا کلکتہ میں جب کبھی آتے مجھ سے ضرور ملنے تشریف لاتے اور موقع ہوتا تو ایک دو وقت کھانا بھی کھاتے۔اُن کی مشہور غزل ہے:

بے چین ہے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہی بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

مرحوم نے یہ غزل خود دفتر برہان میں بیٹھ کر لکھی تھی اور برہان کو عطا کی تھی جو اسی ماہ کی اشاعت میں چھپ گئی تھی۔اسی بزرگانہ تعلق کی وجہ سے ہمیشہ ''سعید میاں'' کہہ کر بلاتے تھے۔رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ مکان پر کھانا کھا رہے تھے اس وقت حضرت اصغرؔ کی وفات کو پانچ، چھ مہینے ہوچکے تھے۔والد

صاحب نے اثنائے طعام میں کہیں اُن کا ذکر کر دیا۔اس پر مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیساختہ رونے لگے اور گریہ نے اس قدر طول پکڑا کہ پھر وہ ایک لقمہ نہیں کھا سکے۔

ادیبوں اور شاعروں کو عام طور پر زمانہ کی ناقدری کا شکوہ ہوتا ہے لیکن مرحوم کی خود زندگی میں وہ قدر ہوئی جو ارباب کمال کی عموماً مرنے کے بعد ہوتی ہے۔اُن کی قدر مرکزی حکومت نے بھی کی اور اسٹیٹ گورنمنٹ نے بھی۔ساہتیہ اکیڈیمی نے ''آتش گل'' پر پانچ ہزار روپیہ کا گراں قدر انعام دیا۔علی گڑھ یونیورسٹی نے اُن کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔بمبئی والوں نے ایک بڑی رقم کی تھیلی پیش کی۔شہرت وہردلعزیزی اور عظمت دومختلف چیزیں ہیں،ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم نہیں ہیں اور اس لیے ضروری نہیں کہ کسی شخص کے لیے ایک چیز پائی جائے تو دوسری بھی پائی جائے۔اقبالؔ اور اصغرؔ وحسرتؔ کی طرح مرحوم کو یہ دونوں باتیں بیک وقت حاصل تھیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بڑا دخل فن کاری کے علاوہ اُن کے کردار اور اخلاق کو بھی تھا۔جنگ کے زمانہ میں حکومت کا آلۂ کار بن کر بڑے بڑے ''وطن پرست'' شاعروں نے ہزاروں کے وارے نیارے کر لیے یا فلم کمپنیوں سے وابستہ ہو کر دولت مند ہو گئے لیکن جگرؔ نے اس ننگ وعار کو کبھی گوارا نہیں کیا۔اُن کی اسی بے نیازی اور استغناء کا نتیجہ تھا کہ دنیا اُن کے قدموں پر جھک گئی اور ہر شخص اُن کے کردار کی بلندی کا اعتراف کرنے لگا۔

مرحوم کی رقت قلب نے روحانی سوز وگداز کی شکل اختیار کر لی تھی اور اب آخر میں بسااوقات اُن پر جذب کی سی کیفیت طاری رہنے لگی۔محویت اور استغراق میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے والہانہ عشق تھا۔اسی کا نتیجہ تھا کہ حج وزیارت حرمین شریفین کا پورا سفر بڑے جذب وشوق کے ساتھ کیا۔انانیت اور خود پسندی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔عجز وفروتنی اور انکسار وتواضع شیوۂ طبعی تھے۔دین اور اُس کے شعائر کا احترام اس درجہ تھا کہ کسی سے اُس کے خلاف کوئی لفظ تک سننا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔وہ آخر میں جو کچھ بن گئے تھے اُس میں اُن کی طبعی صلاحیت واستعداد کے علاوہ اُن کے پیرومرشد اور حضرت اصغرؔ گونڈوی کے فیضان توجہ وتربیت کا بھی بڑا دخل تھا۔اب ایسے باکمال وباوضع لوگ کہاں ملیں گے؟ اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش کی رحمتوں سے نوازے۔

[اکتوبر ۱۹۶۰ء]

شفیع،مولانا محمد

مولانا محمد شفیع

افسوس ہے پچھلے دنوں مدرسۂ عبدالرب دہلی کے بہت دیرینہ صدر المدرسین جناب مولانا محمد شفیع صاحب کی ڈیڑھ سال کی مسلسل علالت کے بعد اپنے وطن دیوبند میں وفات ہوگئی۔مولانا نے عمر کافی پائی۔۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۶/ جمادی الاول ۱۳۸۰ھ میں انتقال ہوا۔لیکن آخر تک درس وتدریس اور مدرسہ کے اہتمام وانتظام کا کام حاضر حواسی اور پابندی سے کرتے رہے۔دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۱۶ھ میں فراغت کے بعد چند سال ادھر اُدھر رہے۔پھر اپنے وقت کے مشہور محدث مولانا عبدالعلی صاحب جو اُن کے استاد بھی تھے اُن کی دعوت پر مدرسۂ عبدالرب دہلی سے وابستہ ہوئے تو ساری عمر یہیں بتا دی،چنانچہ ساٹھ برس اس مدرسہ کی خدمت کرتے رہے۔حضرت شیخ الہندؒ کے داماد تھے۔حضرت مرحوم کی منجھلی صاحبزادی جو اخلاق وشمائل میں مشابہ ہونے کے باعث پدر بزرگوار کی نسبتہً زیادہ چہیتی بیٹی تھیں،مولانا سے منسوب تھیں اور اسی وجہ سے حضرت شیخ الہند کو بھی مرحوم کے ساتھ زیادہ لگاؤ تھا،غالباً اسی شفقت اور تربیت روحانی کا اثر تھا کہ عادات واطوار کے لحاظ سے اُن میں بعض ایسی خوبیاں پائی جاتی تھیں جو آج کل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں،درویشی اور قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑوں کے علاوہ تیسرا جوڑا کبھی بھی نہیں رکھا۔اپنے کمرہ میں بجلی کی روشنی کبھی گوارا نہیں کی،ہمیشہ کڑوے تیل کا دیا جلائے رہے۔کھانا بہت سادہ کھاتے تھے۔شہرت سے اس درجہ نفرت تھی کہ وفات سے پہلے اپنے خلف الرشید مولانا محمد رفیع کو بطور وصیت تاکید کی کہ ان کے انتقال کی خبر بھی کسی اخبار میں نہ چھپے۔علم دین کے پاسِ وضع کا اس درجہ خیال تھا کہ پہلے پہل میرا تقرر سنیٹ اسٹیفنس کالج میں ہوا جو مشن کالج ہے تو انھیں صدمہ ہوا اور برادر محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے جو مرحوم کے بھانجے ہیں اس کی شکایت کی۔مدرسہ کے ساتھ تعلق اس قدر گہرا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ دار وگیر میں مدرسۂ عبدالرب جس علاقہ میں واقع ہے یہ علاقہ مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا اور قرب وجوار میں کوئی مسلمان کہیں نظر نہ آتا تھا۔شہر میں آگ لگی ہوئی تھی لیکن عمائد جمعیت کے پیہم اصرار کے باوجود مولانا نے ایک منٹ کے لیے بھی مدرسہ سے باہر آنا گوارا نہیں کیا۔اس پوری مدت میں تن تنہا مدرسہ کے در ودیوار سے لگے بیٹھے رہے۔علاوہ ازیں بڑے عابد وزاہد اور صاحب معرفت وباطن تھے۔باتیں بھولے پن سے کرتے تھے مگر بڑی نصیحت

آموز اورحکیمانہ ہوتی تھیں۔اب ایسے علماء جو سیرت و عادت میں اسلاف کا نمونہ ہوں خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ برداللہ مضجعہ و نورضریحہ۔

[جنوری۱۹۶۱ء]

خان، ڈپٹی حبیب اللہ

ڈپٹی حبیب اللہ خان

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ مارچ کی ۱۴/ کوڈپٹی حبیب اللہ خاں صاحب کا ۹۷ برس کی عمر میں علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔مرحوم سرسید مرحوم کے خاص صحبت یافتہ اور اُن کا فیض اُٹھائے ہوئے تھے۔اُن کا حافظہ بلا کا تھا۔سرسید کی تحریک اوراس تحریک کے اعضاء وارکان کے حالات وسوانح کا جہاں تک تعلق ہے مرحوم اُن کی انسائیکلوپیڈیا تھے اور جب ذکر چھڑ تا تو اُس عہد میمنت کے عجیب وغریب واقعات مع پوری تفصیل وجزئیات کے مزے لے لے کرگھنٹوں سناتے تھے اخلاق وعادات ومروت، دینداری اورمذہب کے ساتھ وابستگی کے اعتبار سے سلف صالحین کانمونہ تھے۔ ۱۸۸۶ء سے انھوں نے روزنامچہ لکھنے کا جو اہتمام کیا تھا اُسے مرتے دم تک ترک نہیں کیا، اگر یہ چھپ گیا تو تحریک علی گڑھ سے متعلق بہت عجیب وغریب اورولولہ انگیز معلومات سامنے آئیں گی۔زندگی بالکل فقیرانہ اور درویشانہ تھی، حج بھی کرآئے تھے۔ساری عمر میں لے دے کرانھوں نے ایک بڑی کوٹھی ولایت منزل کے نام سے بنائی تھی اوروہ بھی یونیورسٹی کودے دی تھی، سالہائے دراز سے خوداُس میں بطورکرایہ دار رہتے تھے۔نماز،روزہ کے بڑے پابند تھے، اسلامی شعائر وآداب کادل وجان سے احترام کرنے والے تھے۔ موجودہ علی گڑھ کا مقابلہ سرسید کے علی گڑھ سے کرتے تھے جس کی اساس ''دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیراین ست'' پرقائم تھی تو یہ باتیں کرتے کرتے رو پڑتے تھے۔ غرض کہ عہد سرسید کی ایک بڑی حسین اورگراں قدرنشانی تھے۔آہ!اب بھلاایسے لوگ کہاں ملیں گے؟سدارہے نام اللہ کا۔اللھم اغفرلہ وارحمہ واسعة۔

[اپریل۱۹۶۱ء]

امجد حیدرآبادی

امجد حیدرآبادی

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں حضرت امجد حیدرآبادی کا ۸۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔مرحوم بڑے قادر الکلام اورنغز گوشاعر تھے۔نثراورنظم دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔لیکن رباعی گوئی اُن کا خاص فن تھا۔اس میدان میں وہ اپنا کوئی حریف نہیں رکھتے تھے،اس اعتبار سے وہ درحقیقت اردو زبان کے سرمد تھے۔ چنانچہ مولانا گرامی نے بجاطور پرکہاتھا:

امجد بہ رباعی ست فردا مجد — کلکِ امجد کلیدِ گنجِ سَرمد
گفتم کہ بودجوابِ سرمد امروز — روحِ سَرمد بگفت امجد امجد

بلند پایہ شاعرادیب اورمصنف ہونے کے علاوہ بڑے صاحب ِدل،صاحبِ معرفت،خوددار،غیور اور پابندِ وضع بزرگ تھے۔زندگی بالکل درویشانہ اورقلندرانہ تھی۔عسرت وافلاس سے ہمیشہ سابقہ رہا مگرارباب ثروت ووجاہت کے ساتھ نیازمندی کاتعلق رکھ کراپنے فن اورکمال کی توہین کبھی گوارانہیں کی۔سیلاب رودِموسیٰ کے واقعہ کے بعدجس میں اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھی ماں اورجوان بیوی بہہ گئیں اورغرق ہوگئیں تھیں وہ سوز وگداز مجسم اورپیکر عبرت ہوکررہ گئے تھے لیکن کیا مجال کہ تسلیم و رضا کی پیشانی پرکوئی بل بھی پڑا۔مولانا سید مناظر احسن گیلانی اورمرحوم میں بڑے مخلصانہ تعلقات تھے اوردونوں ایک دوسرے کی دل سے قدرومنزلت کرتے تھے۔مرحوم سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد میں مولانا کے مکان پرہی ہوئی تھی۔یہ ملاقات اگرچہ سرسری تھی، لیکن مرحوم کے حافظہ کا کمال یہ تھا کہ ۱۹۵۸ء میں جب سفرحیدرآباد کے سلسلہ میں موصوف کے مکان پرحاضر ہوا تو اگرچہ ضعیفی اورحافظہ اورمسلسل علالت کی وجہ سے بہت کمزور ہورہے تھے اور بینائی بھی بہت کمزور ہوچکی تھی،مگر بااین ہمہ میری آواز سنتے ہی فوراً زنانخانہ سے مردانہ میں آگئے۔ بڑی شفقت ومحبت سے خاطر تواضع کی، دیرتک باتیں کرتے اور برہان و ندوۃ المصنفین کی خدمات کاتذکرہ کرتے رہے۔ چلنے لگا تو اپنی تمام کتابوں کاسیٹ عطافرمایا، میں نے اُن کاہدیہ پیش کیا تو میرے سخت اصرار کے بعد بادل نخواستہ قبول فرمایا۔اُن کے خدارسیدہ اورصاحب جذب وحال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔جگر کے بعد یہ دوسرا زخم کاری ہے جواردوشعروزبان کوحضرت امجد کی وفات سے پہنچا۔اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمة واسعةً۔ [مئی۱۹۶۱ء]

عبدالعلی، ڈاکٹرسید

ڈاکٹرسید عبدالعلی

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ مئی کی ۷/ تاریخ کوناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ڈاکٹرسید عبدالعلی صاحب ۶۸ برس کی عمرمیں رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن اورگوناگوں اوصاف وکمالات کامخزن تھے اوراس حیثیت

سے ہمارے فاضل دوست مولانا سید ابوالحسن علی میاں کے صحیح معنی میں برادر اکبر تھے۔علم وفضل کا یہ عالم کہ علوم دینیہ اور اسلامیہ کی تکمیل ندوۃ اور دیوبند دونوں جگہ کی تھی جوان علوم کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر علوم جدیدہ کی طرف توجہ کی تو سائنس کے اعلیٰ درجہ کے گریجویٹ ہوئے اور ادھر طبیب فاضل وحاذق اور ادھر ایم۔بی۔بی۔ایس اور اس تقریب سے ایلو پیتھک طریقۂ علاج کے بھی ماہر، غرض کہ قدیم وجدید کا یہ امتزاج شاید ہی کسی اور جگہ اس نوعیت کا ملے۔علاوہ بریں نیک طینتی، پاک نہادی اور حسن اخلاق وشمائل میں ہوبہو سلف صالحین کا نمونہ، روحانیت اور انابت الی اللہ میں جنید وشبلی کو یاد دلانے والے، بے حد قانع، خوددار وبے نیاز، فیاض وسخی، کشادہ جبین وفرخندہ خو، کم سخن وکم گو۔ انھوں نے اپنے برادر خورد علی میاں اور اپنی اولاد کی جس جذبۂ دینداری وخداپرستی کے ساتھ تربیت کی اور جس کے نمونے آج ہر شخص کے سامنے موجود ہیں، وہ ہمارے ملک کے بہت سے اکابر علماء ومشائخ کے لیے مایۂ ہزار گونہ عبرت وموعظت ہے۔ برسوں سے ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔مرحوم کے عہد میں اس درسگاہ کے طلباء میں جو دینداری اور خالص اسلامی جذبہ پیدا ہوا وہ غالباً خود سید صاحب کے عہد میں نہ تھا! الغرض عجیب وغریب قسم کے علمی وعملی کمالات کے بزرگ تھے۔اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ابرار واتقیا کا مقام جلیل عطا فرمائے۔آمین

[جون ۱۹۶۱ء]

عبدالحق، ڈاکٹر مولوی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

افسوس ہے پچھلے مہینے ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ۹۲ برس کی عمر میں مری میں انتقال کیا اور کراچی میں دفن ہوئے۔وہ غالباً علی گڑھ کے سب سے پرانے طالب علم تھے جنھوں نے سرسید احمد خاں، مولانا شبلی اور مولانا حالی اور اُس زمانہ کے دوسرے اکابر علم وادب سے استفادہ کیا اور اُن کی صحبتوں اور مجلسوں سے فیض پایا تھا۔وہ ۱۸۷۱ء میں ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔یہاں مڈل تک تعلیم پائی، پھر علی گڑھ چلے آئے اور یہاں سے ۱۸۹۴ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد حیدرآباد منتقل ہوگئے جہاں اُن کی زندگی کے بہترین ایام بسر ہوئے۔ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے پھر انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز ہوئے۔اُس سے ترقی کی تو اورنگ آباد کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔اس کے بعد مولوی وحیدالدین سلیم کا انتقال ہوا تو اُن کی جگہ جامعۂ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔موصوف جہاں اور جس حیثیت میں رہے اپنی لیاقت وقابلیت، حسن کارگردگی اور فرض شناسی کے باعث نمایاں اور ممتاز ہوکر رہے لیکن قدرت نے جس اصل کام کے لیے پیدا کیا تھا اور جس کے باعث انھیں بڑی شہرت اور عظمت نصیب ہوئی وہ ابھی تکمیل کے لیے اُن کے واسطے چشم براہ تھا۔چنانچہ جب وہ انسپکٹر آف اسکولز تھے انہی دنوں (۱۹۱۲ء) میں انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔انجمن اب تک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو اتنی ترقی دی کہ وہ جلد ہی ایک مستقل انجمن بن گئی اور اس کی سرگرمیوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

انجمن کے سیکرٹری منتخب ہونے سے لے کر اپنی زندگی کے آخری سانس تک موصوف نے اردو زبان وادب کی ہمہ جہتی خدمات جس محنت واستقلال، عزم وہمت اور ایثار وقربانی کے ساتھ کم وبیش ایک نصف صدی تک انجام دی ہیں وہ صرف اردو زبان وادب کے حلقوں میں نہیں بلکہ تاریخ کے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بیک وقت اردو کے صاحب طرز ادیب اور محقق بھی تھے اور بلند پایہ خاکہ نگار ولغت نویس بھی، اونچے درجہ کے مؤلف ومصنف بھی اور مترجم بھی۔وہ خود بھی بے تکان اور پابندی سے کام کرتے تھے اور دوسروں سے کام لینا اور انھیں کام کا آدمی بنانا بھی خوب آتا تھا۔بڑھاپے میں اس مستعدی اور حاضر حواسی سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے کہ اچھے اچھے نوجوان بھی اُن کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے تھے۔انھیں اردو زبان کے ساتھ سچ مچ والہانہ عشق تھا اور اس کے لیے انھوں نے اپنی ہر چیز قربان کردی تھی۔تقسیم کے بعد موصوف دلّی سے کراچی منتقل ہوگئے (اور واقعہ یہ ہے کہ اُن کا یہ انتقال بہت ہی مجبوری کی حالت میں ہوا ورنہ وہ ہندوستان میں رہ کر اردو کے لیے مرجانے کی آس لگائے بیٹھے تھے) اور خیال تھا کہ وہاں اردو کو مخالفتوں سے واسطہ اور اپنوں کی بے توجہی کا گلہ نہ ہوگا۔لیکن اس کے برعکس انھیں وہاں بھی اردو کے لیے اپنوں اور بیگانوں سے وہی جنگ کرنی پڑی جو وہ ہمیشہ کرتے چلے آئے تھے۔ پاکستان کی موجودہ حکومت نے بے شبہ اُن کی قدرشناسی کی اور اب وہ اس قابل ہوئے تھے کہ حکومت کی توجہ اور امداد سے اردو کا کام خاطر خواہ انجام دے سکیں گے مگر اب اُن کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا تھا:

ہائے کس وقت ہوئیں دونوں مرادیں حاصل
یار بالیں پہ جو آیا تو قضا بھی آئی

[ستمبر ۱۹۶۱ء]

بخاری، مولانا سید عطاء اللہ شاہ

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ابھی مولوی عبدالحق کو دنیا سے سدھارے پورا ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ملتان میں وفات پاجانے کی خبر ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہ جی نجیب الطرفین یعنی والد اور والدہ دونوں کی طرف سے سید تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی، سید محمد شاہ بخاری اور سید عبدالغفار بخاری جو اکابر اولیاء وصوفیاء میں سے تھے اسی خاندان کے مورثان اعلیٰ میں سے ہیں۔ شاہ جی کے خاندان میں جو بزرگ سب سے پہلے ہندوستان آئے وہ سید اکمل الدین بخاری تھے جنھوں نے حضرت شاہ غلام علی دہلوی سے سند خلافت حاصل کر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں پنجاب کے ضلع گجرات میں مستقل بودوباش اختیار کر لی تھی۔ مرحوم کی والدہ سیدہ فاطمہ اور اُن کے دادا میر سید عبدالسبحان کشمیر سے منتقل ہوکر عظیم آباد پٹنہ میں آبسے تھے، ان کی بیٹی حضرت خواجہ باقی باللہ کی نواسی تھیں۔ اس طرح خواجہ شاہ جی کے ننھیالی بزرگوں میں شامل ہیں۔ شاہ جی کی والدہ کے انتقال کے بعد اُن کے والد سید ضیاء الدین نے بیٹے کو نانا نانی کے پاس چھوڑا اور گجرات لوٹ آئے جہاں عقد ثانی کر لیا۔ اس طرح شاہ جی کی ابتدائی تعلیم وتربیت پٹنہ میں ہوئی جو دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو زبان اور شعروشاعری کا تیسرا مرکز تھا اور اُسی کا اثر تھا کہ شاہ جی نسلاً پنجابی ہونے کے باوجود اردو زبان ٹکسالی بولتے اور اُس کے محاورات وضرب الامثال پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

مرحوم کسی مدرسہ کے باقاعدہ فارغ التحصیل نہیں تھے۔ انھوں نے عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں نانا سے پڑھیں۔ نانی سے اردو بول چال کی زبان سیکھی۔ شاد عظیم آبادی کے اس خاندان سے ذاتی مراسم تھے۔ اس تقریب سے شاہ جی کو بھی شاد عظیم آبادی کی صحبتوں میں بیٹھنے اور اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ذہانت وفطانت خداداد تھی نتیجہ یہ ہوا کہ کم عمری میں ہی پختہ ہوگئے، دماغ چمک اٹھا اور زبان منجھ گئی پھر پٹنہ سے نکل کر مختلف علماء سے وقتاً فوقتاً کبھی تفسیر، کبھی حدیث اور فقہ کا درس لیتے رہے لیکن وہ بھی بے ضابطہ اور بے قاعدہ۔

شاہ جی یوں تو علم وفضل اور سیرت واخلاق کی بہت سی خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے جن کی وجہ سے لوگ اُن کی دل سے قدر اور عزت کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا کمال جس میں کوئی اُن کا ہم عصر اُن کا شریک نہیں ہوسکتا تھا وہ ان کا کمال خطابت وتقریر تھا۔ گھنٹوں یکساں روانی، جوش اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ بولتے تھے اور کیا مجال کہ ایک شخص بھی اکتا کر مجلس سے اُٹھ جائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر نہیں کر رہے ہیں نشہ پلا رہے ہیں، سامعین تو سامعین فضا تک پر معلوم ہوتا ہے سُکر کا عالم طاری ہوگیا ہے۔ بڑے سے بڑا مخالف بھی اُن کی تقریر سنتا تھا اور جھومتا تھا۔ اُن کے پاس اعجاز بیان اور سحر خطابت کا ایسا کارگر حربہ تھا کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے اس سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکتے تھے لیکن اُن کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ تحریک خلافت، مجلس احرار، کانگریس اور جمعیۃ علماء، ہر میدان میں صرف ایک سپاہی بنے رہے دوسروں کے تابع رہ کر کام کیا لیکن کبھی خود قائد نہیں بنے۔ لیکن ہمارے نزدیک دینی اعتبار سے شاہ جی کے لیے اس سے بڑا کوئی دوسرا شرف اور مقام نہیں ہوسکتا تھا کہ جب انھیں امیر شریعت منتخب کیا گیا تو سب سے پہلے حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری نے جو اس زمانہ میں علم وفضل میں اللہ کی حجت تھے، شاہ جی کے ہاتھ پر بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ بیعت کی۔ یہ صرف دنیا کا ہی سب سے بڑا اعزاز نہ تھا بلکہ یہ بیعت انوری اس کی بھی ضمانت تھی کہ اللہ کے ہاں ان کا حسن عمل اور دینی ولولہ وجوش مقبول ہو چکا ہے اور آج وہ دنیا میں نہیں ہیں تو امید قوی ہے فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کی دعوت قدس کے خلعت فاخرہ سے سرفراز وشادکام ہو رہے ہوں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ۔ [ستمبر ۱۹۶۱ء]

چشتی، شاہ سلیمان احمد

شاہ سلیمان احمد چشتی

جو حضرات سلسلۂ امدادیہ چشتیہ صابریہ سے تعلق رکھتے تھے انہیں یہ معلوم کر کے بے حد افسوس اور رنج ہوگا کہ حضرت شاہ سلیمان احمد صاحب چشتی صابری نے جو درگاہ شاہ عہدالہادی وشاہ عبدالباری چشتی امروہوی رحمہما اللہ کے سجادہ نشین تھے۔ ۹۰ سال کی عمر میں یکم جنوری ۱۹۶۲ء مطابق ۲۳/ رجب ۱۳۸۱ھ کو اپنے وطن امروہہ ضلع مرادآباد میں وفات پائی اور اپنے جد امجد کے پائیں مزار دفن ہوئے۔ شاہ صاحب مرحوم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے اسلاف کی اولاد میں ہونے کے علاوہ معقول ومنقول کے زبردست عالم اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہوی کے شاگرد رشید تھے، سلسلۂ طریقت میں اپنے والد بزرگوار اور حاجی شاہ محمد ابراہیم اور جد امجد شاہ غلام مصطفےٰ چشتی صابری سے فیض یاب تھے۔ تصوف کا نہایت اعلیٰ مذاق اور اس کے دقائق و

رموز پر گہری نظر رکھتے تھے۔متبع کتاب وسنت،سیر چشم،متوکل،شب زندہ دار اور اسلاف کرام کی زندگی کا سچا نمونہ تھے۔ ان کے مریدین ومسترشدین کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن انھوں نے کبھی اس کو جلب زر کا ذریعہ نہیں بنایا۔اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں مقام جلیل اوراُن کے پوتے حکیم نظیر احمد صاحب کو جو اب سجادہ نشین ہوئے ہیں بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

[فروری۱۹۶۲ء]

علی،مولانا احمد

مولانا احمد علی

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا احمد علی اورمسٹر شعیب قریشی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔مولانا احمد علی حلقۂ دیوبند کے اکابر ومشائخ میں سے تھے۔بلند پایہ عالم، وسیع النظر مفکر اوردرویش صفت بزرگ ہونے کے علاوہ اونچے درجہ کے صاحب معرفت وباطن بھی تھے۔قرآن مجید کی تفسیر اوراُس کی تعلیم وتدریس سے خاص شغف تھااوراُس کا بڑااہتمام کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند اوردوسرے مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل طلبا اسی غرض سے لاہور جاتے اور چند ماہ قیام کرکے مولانا کے مخصوص درس قرآن سے مستفید ہوتے تھے۔پنجاب کے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات بھی موصوف کے زیر اثر تھے اوراُن کی اچھی خاصی تعداد اس درس میں پابندی سے شریک ہوتی تھی۔ پنجاب میں مولانا کی ذات جواحیاء دینی،روحانی واخلاقی تعلیم وتربیت اورنشر وتبلیغ علوم ومعارف قرآنیہ کے لیے وقف تھی۔ مرجع عوام وخواص تھی۔تقریر موثر اور دلپذیر ہوتی تھی مگر مجلس میں کم سخنی وکم گوئی اُن کی خوتھی۔زندگی بڑی سادہ تھی،تکلف، تصنع اورمادی آرائش وزیبائش سے نفرت تھی۔ان خوبیوں کے علاوہ مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے۔تحریک خلافت اوراُس کے بعد جدوجہد آزادی میں ہمیشہ جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ رہے۔مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے داماد تھے۔اس تعلق سے اُن کومولانا سے استفادہ کا زیادہ موقع ملا تھااوراُس کااثر اُن کے درس قرآن میں اورعام تقریروں اورگفتگوؤں میں بھی ظاہر ہوتا تھا۔قیام پاکستان کے بعد سے بڑے بڑے اہم مسائل رونما ہوئے اوربعض اوقات علماء کے لیے سخت ابتلا و آزمائش کے مواقع پیدا ہوگئے،مگرمولانا نے اعلان حق اوراعلائے کلمۃ اللہ میں کبھی بھی کوتاہی یا پہلوتہی سے کام نہیں لیا۔اُن کواس کی سزا بھگتنی پڑی۔مگر انھیں اس کی کبھی پروانہیں ہوئی۔اب ایسے علمائے حق کہاں ملیں گے؟ جوجاتا ہے اپنا صحیح جانشین وقائم مقام چھوڑ کرنہیں جاتا۔اللھم بردمضجعه وارحمه رحمةً واسعةً۔ [اپریل۱۹۶۲ء]

قریشی،شعیب

شعیب قریشی

مسٹر شعیب قریشی علی گڑھ اورآکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔انگریزی انشاء واخبار نویسی کا خاص سلیقہ اورملکہ رکھتے تھے،ایک زمانہ میں اُن کے اس وصف و کمال کی دھوم تھی۔تحریک خلافت میں علی برادران کے ساتھ رہے۔اسی تعلق سے جس سال مکہ معظّمہ میں عالم اسلام کی موتمر ہوئی ہے۔وفد خلافت کے ساتھ یہ بھی اُس میں شرکت کرنے اوراس بہانے حج وزیارت حرمین شریفین سے مشرف ہونے حجاز مقدس گئے تھے اور اسی زمانہ میں راقم الحروف نے ایک رفیق سفرطالب علم کی حیثیت سے مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا اوراُن کے علمی وادبی کمالات، دینی ذوق وشوق اوراخلاقی اوصاف سے متاثر ہوا تھا۔پہلے درویشی و قلندری کی زندگی بسر کرتے تھے۔پھر ریاست بھوپال میں وزارت کے عہدہ پر فائز ہوکر رئیسانہ جاہ وحشم سے رہنے لگے تھے۔آزادی کے بعد پاکستان میں متعدد ممتاز اور بلند عہدوں پر رہے اورآخر میں سب چیزوں سے الگ تھلگ ہوکر کئی ماہ کی سخت اورصبر آزما علالت کے بعد ایک شفاخانہ میں جان جان آفریں کو سپرد کرکے دنیا سے رخصت ہوگئے۔مولانا محمد علیؒ کے داماد تھے۔اس رشتہ کی وجہ سے مولانا کے ارادت مند اور ہندو مسلم دیرینہ رفقائے کار واحباب مرحوم کواپنا عزیز سمجھتے اورمرحوم بھی بربنائے وضعداری ان سب کے ساتھ اُسی طرح برتاؤ کرتے اورتعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ جس زمانہ میں وہ پاکستان کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے نئی دہلی میں مقیم تھے وہاں کی سوشل زندگی میں یہ خاص بات بڑی نمایاں تھی۔غفرله الله ورحمه [اپریل۱۹۶۲ء]

سیوہاروی،مولانا حفظ الرحمٰن

کل من علیها فان

آہ! کیونکر کہیے! جس کا کھٹکا شروع سے لگا ہوا تھا آخروہی ہوکر رہا۔آٹھ، نو مہینے کی اس درمیانی مدت میں رہ کر وہ کونسا اعلیٰ سے اعلیٰ علاج تھا جس میں کوئی دقیقہ اٹھا کے رکھا گیا نہ ہو۔سیکڑوں ختم بخاری شریف کے ہوئے۔ہزاروں لاکھوں، اللہ کے نیک بندوں نے دعائے شبانہ کی ۔ اکابر و بزرگان ملت نے غلاف کعبہ پکڑ کرمنتیں مانیں۔مگر جو مشیت کا فیصلہ تھا وہ ہوکر رہا اور۲/اگست کوآخری شب میں ملت اسلامیہ کے ترکش کا خدنگ آخریں،علم وفضل کے خزانہ

کا گوہر شب چراغ، درج شرف ومجد کا در تابندہ، اخلاق وفضائل کا پیکر، ملک اورقوم کی دساور کا متاع گرانما یہ اس عالم ناسوت کوخیرآباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے جداہوگیااوراور دنیا کوایک ماتم سرابنا گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون ۔عربی کے مشہورشعر میں قیس کی جگہ ''حفظ'' رکھ دیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ شعرعرصہ پہلے کسی نے اسی موقع کے لیے کہا تھا:

وما کان حفظ ھلکہ ھلك واحد

ولکنہ بنیان قوم تھدما

مولانا حفظ الرحمٰن یوں ہونے کو تو کیا نہیں تھے۔علوم وفنون اسلامیہ کے بلند پایہ عالم،متصوف،مصنف،ولولہ انگیز خطیب اورمقرر،جنگ آزادی کے سپہ سالار اور ہیرو،مخلص اور بے لوث خادم ملک وملت سبھی کچھ تھے۔مگر ملک کی آزادی کے بعد اُنھوں نے جو رول ادا کیا ہے اُس کی تاریخ اس قدر شاندار ہے کہ اس میں کوئی ایک شخص بھی اُن کا حریف وسہیم نہیں ہوسکتا۔بے لوث اورجانبازانہ خدمت کی وجہ سے اُن کے قومی کارناموں کا ریکارڈ اس درجہ بے داغ تھا کہ اُن کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر حرف گیری نہیں کرسکتا تھا۔اس کے علاوہ صاف دماغی اورمعاملہ فہمی کا یہ عالم تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور بلند پایہ ارباب سیاست کے مجمع میں بیٹھتے تھے اوراُن سے اپنی بات منوا کر اُٹھتے تھے۔ پھرحق گوئی اورجرأت کی یہ شان کہ جس چیز کوحق سمجھا اسے برملا کہا اور ہر جگہ کہا۔اس راہ میں اُن کو نہ اپنوں کی پروا ہوئی اورنہ پرایوں کی۔فکر کی بلندی وآزادی اور جرأت حق گوئی کے باوجود اُن کا ظرف اس درجہ وسیع اورقلب اس قدر فراخ اورکشادہ تھا کہ بغض وعناد کبھی کسی شخص سے نہیں رکھا۔دشمن سے بھی اسی خندہ پیشانی سے ملتے تھے جس سے اُن کے دوست بہرہ مند تھے اور وقت پڑتا تھا تو اُن کی جو مدد بھی وہ کرسکتے تھے بے دریغ کرتے تھے۔خدمت کی راہ میں اپنے اورغیر، دوست اور دشمن،موافق اورمخالف اُس کا امتیاز انھوں نے کبھی روا نہیں رکھا۔کام سے نہ کبھی گھبراتے اورنہ اکتاتے تھے۔اُن کی زندگی ایک مشین کی طرح تھی جو برابر متحرک رہتی تھی۔کھانا پینا،آرام اورراحت، چین اورسکون اس کی کبھی پروا نہیں کی۔یہ وہ خاص اوصاف وکمالات تھے جن کے باعث وہ عوام میں اورخواص میں،حکومت میں، ہندوؤں میں اورمسلمانوں میں، ہرطبقہ اور ہرگروہ میں بے حدعزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔اُن میں مقبول اور ہردلعزیز تھے اور اُن کی بات کا ہرایک پراثر ہوتا تھا۔اُن کی زندگی بالکل عوامی زندگی تھی، نہ درنہ دربان نہ کوئی روک ٹوک، ہرشخص اُن سے ہروقت مل سکتا تھا۔

یہ وہ اوصاف تھے جوآج بیک وقت مشکل سے کسی ایک شخص میں یکجا نظرآئیں گے۔اسی وجہ سے اُن کی شخصیت سب سے نمایاں اور برتر اور بڑی حسین ودلکش اور جاذب نظر تھی۔وہ صرف ''مجاہد ملت'' نہیں تھے جیسا کہ لوگ عام طور پر انھیں سمجھتے اورلکھتے تھے بلکہ درحقیقت اس خودغرضی کی مادی دنیا میں انسانی شرف ومجد کی آبرو، اعلیٰ اقدار حیات کی عزت اورشرافت ونجابت کی مکمل تصویر تھے۔اس لیے صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ملک ووطن کے ہرفرد اور ہرشخص کے لیے اُن کی زندگی نمونۂ عمل اورلائق تقلید تھی۔کانگریس اورجمعیۃ علماء کی ہنگامہ آفریں تاریخ میں بارہا ایسے نازک اور پیچیدہ مواقع آئے ہیں جب کہ اُن کے ناخن فہم وتدبر نے عقد ہائے مشکل کی گرہ کشائی کرکے ان دونوں اداروں کوعظیم خطرات سے بچا لیا ہے۔ چنانچہ۳/اگست کی شام کودلی کے دربار ہال میں تعزیتی تقریر کرتے ہوئے موجودہ صدر کانگریس شری سنجیواریڈی اورہوم منسٹرلال بہادر شاستری جی نے اوراس کے بعد ایک اور جلسہ میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے زعماء نے صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔وہ جمعیۃ علمائے ہند کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اورآخر تک رہے، پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے تو اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔وجہ یہی ہے کہ جس کام کووہ ہاتھ میں لیتے تھے اسے اس خوبی، تندہی اورخلوص وقابلیت سے انجام دیتے تھے کہ پھر اُن کی قائم مقامی کرنے کے لیے کوئی دوسرا شخص نظرنہیں آتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد یہ دوسرے شخص تھے جنھوں نے مدرسہ کے بوریوں پربیٹھ کرقدیم تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عام ہندواورمسلمانوں کے علاوہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کوبھی اپنی ذہانت وذکاوت، معاملہ فہمی ودوراندیشی اورقوت عمل سے اس درجہ غیرمعمولی طور پرمتاثر کیا تھا۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تعلیم قدیم وجدید کا فرق کوئی فرق نہیں ہے۔ دماغ روشن اوردل بیدار ہوتو ہر انسان ہرمجلس میں ممتاز اورقائد بن کررہ سکتا ہے۔

یہ تو مولانا کے وہ اوصاف وکمالات ہیں جواُن کی پبلک زندگی سے واقفیت رکھنے والا ہرشخص جانتا اورمحسوس کرتا ہے،ان کے علاوہ ہم پس رہروان کاروانِ عدم نے رفقائے کار کی حیثیت سے خلوت میں اورجلوت میں گھر میں اور دفتر میں۔غرض کہ زندگی کے ہرمرحلہ اورہرموڑ میں کم وبیش مسلسل چالیس برس تک مرحوم میں کیریکٹر کی بلندی،کردار کی پختگی،خوبی اورقلب ونظر کی پاکبازی وپاک طینتی کے جوحسین ودلکش اورگوناگوں مناظر دیکھے ہیں انہیں قلمبند کرنے کے لیے فرصت اورایک دفتر درکار ہے۔صحیح معنیٰ میں ہربڑے انسان کی

پبلک زندگی میں اُس کا جو کردار نظر آتا ہے وہ دراصل صرف ایک پرتو ہوتا ہے اُس کے جوہر فطرت وطبیعت کا جس کے سورج کا مطلع خود اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ آہ! اب اُن کی کس کس بات کو یاد کر کے روئیے اور کس کس خوبی کا تذکرہ کر کے دامان دل وفتا کو خونابۂ جگر کے قطروں سے لالہ زار بنائیے۔ان سطور کی تحریر کے وقت جب کہ قلب ودماغ پر حسرت کے ساتھ گمشدگی وحیرت کی جو کیفیت طاری ہے قلم آخر لکھے تو کیا لکھے:

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

اللہ اکبر! آپ کا شوق تیز رفتاری بھیا! اور ہر چیز میں یہاں تک کہ کھانے پینے، چلنے بولنے اور تقریر کرنے میں بھی اپنے ساتھیوں پر سبقت لے جانے کا جذبہ! آخر یاایتھاالنفس المطمئنة ارجعی الی ربك کی دعوت پر لبیک کہنے میں بھی وہی جذبہ کارفرما رہا نا! اور اس منزل میں بھی اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہنا طبع غیور کو گوارانہ ہوا۔اچھا خیر یہی سہی۔مگر پھر یہ طعنۂ پسماندگی کیسا! آپ عقلمندوں کے عقل مند اور فرزانوں کے فرزانہ تھے مگر آج عمر میں پہلی بار اور آخری بار بھی غالبؔ کے لفظوں میں آپ کو نادان کہنے کا جی چاہتا ہے ہر چند کہ اس گستاخی پر طبیعت شرمندہ اور منفعل ہی ہے۔

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

رحمه الله رحمة واسعةً [اگست۱۹۶۲ء]

رائے پوری، مولانا شاہ عبدالقادر

مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری

افسوس ہے ابھی حضرت مجاہد ملت کے ماتم کے آنسو خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ ملت اسلامیہ کے لیے ایک دوسرا حادثۂ جاں گداز پیش آ گیا اور طریقت و معرفت ربانی کا آفتاب غروب ہو گیا۔حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری اکابر مشائخ دیوبند کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔عمر کم وبیش ۹۰ برس کی پائی۔مگر چار برس پہلے تک قویٰ بڑے اچھے تھے اور انڈو پاک کے ہزاروں مسلمان بقدر استعداد اس سرچشمۂ روحانیت وانابت الی اللہ سے مستفید ہوتے تھے۔آپ کا اصل وطن گرداسپور تھا۔آغاز شباب میں ہی مرشد کی تلاش میں نکل پڑے اور آخر حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری جو حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خلیفۂ خاص اور اکابر دیوبند میں ایک ممتاز ورفیع مقام کے مالک تھے، اُن کی خدمت میں پہنچ کر گوہر مقصود پالیا۔چنانچہ آپ اس درگاہ قدس سے ایسے وابستہ ہوئے کہ پوری زندگی یہیں گزار دی۔تقسیم کے بعد ہی مشرقی پنجاب میں جو طوفان اٹھا اُس نے کتنی آبادیوں کو ویرانہ بنا دیا۔مگر شاہ صاحب تھے کہ اپنی جگہ پر کسی قسم کے خوف وہراس کے بغیر جمے رہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ اس نواح کی تمام مسلمان آبادی محفوظ رہی۔ مشائخ دیوبند کی ایک عام خصوصیت ہے سلوک ومعرفت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے ساتھ شریعت کے احکام واوامر اور سنت واسوۂ نبوی کا مکمل اتباع اور اس سے انحراف کا کسی حالت میں بھی روادار نہ ہونا۔یہ صفت حضرت مرحوم میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔اس عام خصوصیت کے علاوہ ہر بزرگ کے کچھ اپنے خاص احوال وکوائف ہوتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کمالات واوصاف نبوی میں سے اُس پر کسی خاص ایک وصف کا غلبہ ہوتا ہے۔مثلاً کسی میں صفت علم غالب ہوتی ہے اور کسی پر صفت خلق، کوئی شان جمالی کا مظہر ہوتا ہے اور کوئی شان جلالی کا۔اس اعتبار سے شاہ صاحب پر صفت فقر واستغناء، سادگی وبے تکلفی اور صفت محبت کا استیلا تھا۔محبت خود اپنے اندر مقناطیسی کشش رکھتی ہے، اس بنا پر جس شخص کو بھی حضرت کی خدمت میں حاضری کی سعادت میسر آ گئی خواہ کتنی ہی مختصر ہو، بس وہ اس درگاہ سے عمر بھر کے لیے وابستہ ہونے کا عہد ہی کر کے اٹھا اور وہیں کا ہو گیا۔

افسوس ہے راقم الحروف کو صرف ایک مرتبہ حضرت کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ پانچ، چھ برس کا ذکر ہے آپ کلکتہ تشریف لائے ہوئے تھے اور منیجر شیخ محمد یعقوب صاحب کے مہمان تھے۔مجھے اطلاع ہوئی تو شام کے چار بجے قیام گاہ پر حاضر ہوا مگر آپ اس وقت استراحت فرما تھے اس لیے ملاقات نہ ہو سکی اور میں واپس آ گیا۔ارادہ تھا کہ پھر کسی دن حاضر ہوں گا مگر میری فخر آمیز مسرت اور ساتھ ہی شرمندگی وندامت کی کوئی حد نہ رہی جب کہ دوسرے ہی دن نماز فجر کے بعد حضرت مرحوم اپنے میزبان اور چند اور عقیدت مندوں کے ساتھ اچانک غریب خانہ پر تشریف لے آئے۔میں نے اس پر سخت شرمندگی کا اظہار کیا تو غایت شفقت سے فرمایا: ''مجھے تو آپ کے پاس آنا ضرور تھا، آپ دین کا بڑا کام کر رہے ہیں۔''

آخر عمر میں اس درجہ معذور ہو گئے تھے کہ حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔مگر معمولات کی پابندی اسی طرح جاری تھی الاستقامة فوق الکرامة کی عملی تفسیر یہی ہے۔دسترخوان بڑا وسیع تھا اور خانقاہ کا دروازہ چشم پاسبان کی طرح ہر ایک کے لیے وا۔اشراق کے بعد عام مجلس ہوتی تھی جس میں کوئی کتاب پڑھوا کر سنتے

تھے۔ اسی مجلس میں ایڈیٹر برہان کی کتاب ''صدیق اکبرؓ'' حرفاً حرفاً پڑھوا کر سنی اور محبّ صدوق مولانا ابوالحسن علی میاں کی روایت کے مطابق کتاب ختم ہوگئی تو ناچیز مولف کے لیے خصوصی کلمات دعائیہ ارشاد فرمائے و کفی به فخرًا۔

صد حیف! ہدایت وارشاد کی مسندیں یکے بعد دیگرے خالی ہورہی ہیں، علم وتقوی کے پیکر نظروں سے اوجھل ہورہے ہیں، ذکر وفکر الٰہی کی محفلیں سونی ہورہی ہیں، اب یہ لوگ کہاں ملیں گے۔

الی اللہ اشکو لاالی الناس اننی اری الارض تبقی والاخلاء تذهب

تاہم سنت الٰہی یہی ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا رہے۔ روشنی کے جو مینارے ان اکابر نے نصب کیے ہیں ان کی حفاظت کرنا، مخلصانہ سعی پیہم کے ذریعہ انھیں قائم رکھنا یہ اخلاف کا فرض ہے اور حضرتؒ کے متوسلین ومعتقدین جن میں اس زمانہ کے بلند پایہ علماء اور ارباب باطن شامل ہیں اُن سے قوی توقع ہے کہ وہ اس خانقاہ کی قندیل ملک نزیل کو روشن وتابناک رکھیں گے۔ رحمہ اللہ رحمتهً واسعة [ستمبر۱۹۶۲ء]

خاں، مولوی محمد عبدالرحمٰن

مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں

افسوس ہے کہ مخدومی جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب صدر حیدر آباد اکاڈمی کی رحلت پر یہ کلماتِ تعزیت بہت تاخیر سے پیش کیے جارہے ہیں۔ مرحوم اپنے وقت کے بہت بڑے فاضل، علومِ جدیدہ کے محقق، ماہرِ فلکیات اور بہت سی قابلِ قدر انگریزی اور اردو کتابوں کے مصنف تھے۔ ندوۃ المصنفین سے نہایت گہرا اور مخلصانہ ربط وتعلق رکھتے تھے اور ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں ادارے کے تعارف اور اس کے حلقوں کی توسیع کے سلسلہ میں حیدرآباد جانا ہوا تو جن بزرگوں نے اس خدمت میں بیش از بیش حصّہ لیا تھا اُن میں مرحوم کا نام سرفہرست تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی بعض گراں قدر تالیفات کے مسودے بھی کسی معاوضے کے بغیر ''ندوۃ المصنفین'' کے حوالے کردیے، چنانچہ ''قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات''، ''تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر'' اور ''تحفۃ النظّار'' (خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ) جو مرحوم کی نہایت مفید، تحقیقی اور اہم تالیفات ہیں اسی ادارے سے شائع ہوئی ہیں۔

اس صدی کے شروع میں ''جامعہ عثمانیہ'' کے قیام کا جو خواب دکن کے اربابِ علم وفضل نے دیکھا تھا اس کی تعبیر میں جتنا عملی حصّہ خاں صاحب مرحوم کا تھا کسی دوسرے کا کم ہی ہوگا۔ مرحوم کم وبیش پچیس سال تک اس عظیم الشان ادارے کے نہ صرف صدر رہے بلکہ اپنے خلوص، محنت ودیانت، عزم وہمّت اور بے پناہ جذبۂ عمل سے اس میں زندگی کی روح پھونک دی، پھر وہ وقت بھی آیا کہ جامعہ کے تمام قدیم وجدید شعبوں میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے والا یہ فاضلِ اجل حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی سازشوں کا شکار ہوکر گوشہ نشین ہوگیا اور رفتہ رفتہ اس کے کارنامے طاقِ نسیاں کی نذر ہوگئے۔ مگر گردشِ لیل ونہار کی ستم ظریفی بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ ۴۷ء کے انقلاب کی آندھی اپنی تمام ہلاکت خیزیوں کے ساتھ آئی اور جامعہ عثمانیہ کی تمام بنیادی خصوصیتوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گئی۔ انقلاب! اے انقلاب! خاں صاحب مرحوم اگرچہ آج ہم میں نہیں ہیں اور جامعہ عثمانیہ بھی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے مرحوم ہوچکی ہے مگر اُن کے شاندار تعمیری کارنامے جو اُنھوں نے اپنے سیکڑوں شاگردوں اور فیض پانے والے اصحابِ علم کی ذہنی اور دماغی تربیت کے لیے انجام دیئے ہیں عبرت کدۂ دکن کی لوح پر ہمیشہ ثبت رہیں گے اور زمانے کا کوئی انقلاب اُن کو ہٹا نہیں سکے گا۔ رَحمهُ اللهُ رحمةً واسعةً۔ [اکتوبر۱۹۶۲ء]

خان، مولانا حکیم مقصود علی [نواب مقصود جنگ]

نواب مقصود جنگ مولانا حکیم مقصود علی خاں

اسی طرح کا دوسرا حادثہ نواب مقصود جنگ مولانا حکیم مقصود علی خاں صاحب کا پیش آیا۔ مرحوم ایک طبیبِ حاذق، ممتاز عالمِ دین اور بہترین خطیب و مقرّر تھے۔ زندگی کا بڑا حصّہ حیدرآباد میں بسر کیا اور کوئی شبہ نہیں کہ بڑی شان سے بسر کیا۔ ہوش مندی، معاملہ فہمی، صاف گوئی، جرأتِ حق اور پاسِ وضع میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ نظام دکن کے طبیبِ خصوصی اور مصاحبِ خاص ہونے کے باوجود حیدرآباد کی عوامی زندگی میں بھی پوری طرح دخیل تھے، ہر اجتماعی کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے اور ہر طبقے میں اُن کی رائے کا وزن محسوس کیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ ریاست کے ختم ہونے کے بعد بھی اُن کے مقامِ عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ عمر بھر طبِ یونانی کی بے لوث خدمت کرتے رہے، جہاں تک فن کا تعلق ہے سچ تو یہ ہے ان کی سرگرمیوں سے اس فن کے تنِ بے جان میں روحِ تازہ آگئی تھی، حیدرآباد کا طبیّہ کالج اور انجمن اسلامیہ اُن کی زندگی کے شاندار تعمیری کارنامے ہیں اور جب تک یہ ادارے قائم ہیں اُن کے جذبۂ خدمتِ خلق پر گواہی دیتے رہیں گے۔ ''دارالعلوم دیوبند'' ''جمعیۃ علماء ہند'' اور ''ندوۃ المصنفین'' سے بھی ربطِ خاص رکھتے تھے۔ پیرانہ سالی، ضعیفی اور معذوری کے باوجود طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے اور دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ

کی کارروائیوں میں جوانوں کی طرح حصّہ لیتے تھے اوراُن کے تجربے،خلوص اور حُسنِ تدبّر سے بہت سے نازک اور اُلجھے ہوئے مسئلوں میں مدد ملتی تھی۔

۱۹۵۰ء میں حیدرآباد میں جمعیۃ علماء ہند کا جو تاریخی اجلاس ہوا تھا اس کی کامیابی مرحوم ہی کی جدّ وجہد اوراثر ورسوخ کی رہینِ منّت تھی،صدر استقبالیہ کی حیثیت سے مرحوم نے اس اجتماع میں جو خطبہ پڑھا تھا اُس سے ان کے علمی پایہ اور سیاسی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

راسخ العقیدۃ قدیم عالم دین ہونے کے باوجود وقت کے تقاضوں کو بھی خوب پہچانتے تھے۔ یہی وجہ ہے ''ندوۃ المصنفین'' کی خدمات کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے اورشوق وذوق سے اس کی خدمت کرتے تھے۔ اب سے اٹھارہ سال پہلے ادارے کے کام کے سلسلے میں حیدرآباد جانا ہوا تو حکیم صاحب مرحوم نے بڑی محبت وشفقت سے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔جگہ جگہ خودتشریف لے جاتے تھے اورادارے کے مقاصد کی اہمیت واضح کرتے تھے۔ اس زمانے کے اسٹیٹ کے وزیراعظم نواب صاحب چھتاری اور فائنس منسٹر غلام محمد صاحب سے مرحوم ہی کے واسطے سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔اللہ تعالیٰ اُن کے مراتب بلند فرمائے۔اب اس وضع وانداز کے بزرگوں کو آنکھیں ڈھونڈتی ہی رہیں گی۔ [اکتوبر۱۹۶۲ء]

اسماعیل،حکیم محمد

حکیم محمد اسماعیل

حکیم محمد اسماعیل صاحب کے انتقال کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا،مرحوم نے بڑی تکالیف اٹھائیں،اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ [اکتوبر۱۹۶۲ء]

عبدالمجید،خواجہ

خواجہ عبدالمجید

افسوس ہے پچھلے دنوں ملک کے مشہور نیشنلسٹ خواجہ عبدالمجید صاحب بیرسٹر ایٹ لا کا انتقال ہوگیا۔مرحوم صفِ اوّل کے نیشنلسٹ مسلمان اور قومی کارکن تھے۔علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اوراُس کی تہذیبی روایات کے پورے حامل ہی نہیں بلکہ ترجمان تھے۔برسوں سے مسلم یونیورسٹی کورٹ اوراُس کی اکزیکٹیو کونسل کے بہت بااثر ممبر تھے اور یونیورسٹی کے معاملات میں بڑے جوش وخروش اور سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔بہت پرانے کانگریسی کارکن تھے اوراس لیے کانگریس کے عمائد اور پنڈت جواہرلال نہرو اورسابق صدر جمہوریہ دونوں خواجہ صاحب کا بڑا ادب اورلحاظ کرتے تھے مگرحق بات کہنے اورکرنے میں اُنھیں کبھی تامل نہیں ہوتا تھا۔بڑے مخلص،انتہائی وضعدار،شرافت ومروت اوراخلاق ومکارم کا نمونہ تھے، اُن کا دروازہ ہرضرورت مند کے لیے ہروقت کھلا رہتا تھا۔اب ادھر برسوں سے معذور تھے،مگرقومی کاموں میں اس کے باوجود تندہی سے منہمک رہتے تھے۔اب ایسے بزرگ کہاں ملیں گے۔اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت ورحمت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ [جنوری۱۹۶۳ء]

پرشاد،ڈاکٹر راجندر

ڈاکٹر راجندر پرشاد

خدا کا شکر ہے جو سفر ۹ر ستمبر ۶۲ء کوشروع ہوا تھا وہ بخیر وخوبی ۲۳رمئی ۶۳ء کو پورا ہوگیا۔اس مدت میں علم وادب اورملک وقوم کی بعض بڑی نامور اورمحبوب شخصیتیں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئیں،ان میں سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد،ڈاکٹر محی الدین زوؔر،خان بہادر مولوی محمد شفیع سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور،مولانا سعید انصاری اور جناب شفیق جونپوری خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔

گذشتہ چندماہ سے مکاتیب کناڈا نے نظرات کے صفحات پر قبضہ کررکھا تھا اس لیے ان حضرات کی رسمِ تعزیت برہان میں حسب معمول ادا نہ ہوسکی،جس کا افسوس ہے۔اوّل الذکر ملک کی تحریکِ آزادی کے بلند پایہ لیڈر، پہلے صدر جمہوریہ ہند ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاق واوصافِ ذاتی کے اعتبار سے بھی غیر معمولی شخصیت اورکردار کے انسان تھے۔سادگی، مذہبیت،خلوص، رواداری اور مروت و وضعداری اُن کے خاص اوصافِ کمال تھے اوراِس حیثیت سے وہ صحیح معنی میں گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے،علاوہ ازیں انگریزی زبان کے نامور مصنف اور اُردو،فارسی کے فاضل بھی تھے۔ [جون۱۹۶۳]

زوؔر،ڈاکٹر محی الدین

ڈاکٹر محی الدین زوؔر

ڈاکٹر محی الدین زوؔر دکن کے مولوی عبدالحق تھے،انھوں نے خودبھی بلند پایہ تحقیقی کتابیں لکھیں، اورادارہ ادبیات اُردو کے ذریعہ قدیم مخطوطات کواڈٹ کرکے اور چھاپ کراورنوجوان نسل میں اُردو ادب کا ذوق اورتحقیق کا جذبہ پیدا کرکے اورعوام میں مختلف طریقوں سے اُردو کومقبول بنا کر علماً وعملاً زبان اوراُس کے ادب کی وہ شاندار خدمات انجام دی ہیں کہ بابائے اُردو کومستثنیٰ کرکے کوئی

دوسرا شخص اُن کے حریف ہونے کا مدعی نہیں ہوسکتا۔ [جون۱۹۶۳ء]

شفیع، مولوی محمد [خان بہادر]

خان بہادر مولوی محمد شفیع

مولوی محمد شفیع ہندوستان میں پہلے شخص تھے جنھوں نے مشرقی علوم وفنون پر خالص مستشرقین کے انداز میں خود بھی مخطوطات کی تحقیق وترتیب اور مختلف تاریخی و ادبی موضوعات پر محققانہ مقالات لکھنے کا کام کیا اور اپنے فیض تربیت سے ایک ایسی نسل بھی پیدا کردی جو برصغیر ہندو پاک کے مختلف گوشوں میں اُسی نہج پر کام کررہی ہے۔ مرحوم کی مسلسل مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ عربی وفارسی ہندوستان کی یونیورسٹوں میں سب سے زیادہ باوقار شعبہ سمجھا جاتا تھا۔ ذاتی طور پر وہ خود بے حد محنتی اوراوقات کے بڑے پابند تھے، پھرخوش قسمتی سے اُن کو پروفیسر محمد اقبال اور حافظ محمود شیرانی ایسے رفیق اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور شیخ عنایت اللہ ایسے تلمیذ مل گئے، جنھوں نے اُردو زبان کے علمی سرمایہ میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بڑا قابلِ قدر اضافہ کیا اور اُس کا معیار اونچا کردیا ہے۔

مرحوم بُرہان اور ندوۃ المصنفین کے بڑے قدرداں تھے اور وقتاً فوقتاً اڈیٹر بُرہان کے نام خطوط میں حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے۔ چند برس ہوئے مرحوم کی علمی وتحقیقی خدمات کے اعتراف میں ''ارمغانِ علمی'' کے نام سے پنجاب یونیورسٹی نے ایک ضخیم کتاب شائع کی تھی جو مشرق ومغرب کے نامور فضلائے علوم مشرقیہ کے بلند پایہ مقالات کا بڑا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ اس کتاب سے مرحوم کے سوانح حیات اور اُن کے علمی کارناموں کا مفصل علم ہوسکتا ہے۔ [جون۱۹۶۳ء]

انصاری، مولانا سعید

مولانا سعید انصاری

مولانا سعید انصاری دارالمصنفین اعظم گڑھ کے قدیم رفیق تھے، اگرچہ وہ اپنی طبیعت کے تلوّن اور عدمِ استقلال کی وجہ سے کسی ایک جگہ جم کر کام نہیں کرسکے، تاہم دارالمصنفین کے ساتھ تعلق اور پھر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے ترجمان رسالہ 'ہندوستانی' کے اڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے جو کتابیں تالیف و ترتیب دیں اور جو مقالات لکھے وہ اُردو زبان کے سنجیدہ مصنّفین کی فہرست میں اُن کا نام شامل وباقی رکھنے کی ضمانت ہیں۔ [جون۱۹۶۳ء]

شفیق جونپوری

شفیق جونپوری

جناب شفیق جونپوری اُردو زبان کے نامور شاعر تھے اور اُن کا تعلق شعراء کے اُس گروہ سے تھا جو ترقی پسند شاعری کے اُس دور طمطراق میں بھی فکر وبیان کی پرانی قدروں کو سینہ سے لگاتے رہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے فنی کمال و صنعت گری کے ذریعہ اُن کو مزید جلا بخشی اور ان کی عزّت وآبرو قائم رکھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان حضرات کی وفات ملک وقوم اور علم وادب کے لیے بڑا حادثہ ہے، لیکن یہ دنیا یوں ہی چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ سدا رہے نام اللہ کا!

[جون۱۹۶۳ء]

سملکی، مولانا محمد بن موسیٰ

مولانا محمد بن موسیٰ سملکی

جو حضرات دارالعلوم دیوبند سے عموماً اور حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ الکشمیری سے خصوصاً تعلق ورابطہ رکھتے ہیں، اُن کو یہ معلوم کرکے بڑا صدمہ ہوگا کہ پچھلے دنوں مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی کا انتقال جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) میں ہوگیا، موصوف گجرات کے ایک نہایت معزز اور متمول خاندان کے چشم وچراغ تھے، اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو دولت اور دین دونوں نعمتوں سے مالا مال کیا ہے، چنانچہ تجارت کے سلسلہ میں یہ خاندان ایک عرصہ سے جوہانسبرگ میں مقیم ہے اور دین داری کے تقاضہ سے اس خاندان کو دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر سے دیرینہ وپختہ عقیدت وارادت مندی کا تعلق رہا ہے، اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ مرحوم دارالعلوم دیوبند آئے، اور چند سال رہ کر علومِ دینیہ و اسلامیہ کی تحصیل وتکمیل کی۔ راقم الحروف بھی اس زمانہ میں دیوبند میں زیرِ تعلیم تھا اور مرحوم ہم درس وخواجہ تاش تھے۔ مرحوم کا مقصد صرف رسمی طور پر پڑھنا پڑھ لینا نہیں تھا بلکہ روحانی اور اخلاقی تعلیم وتربیت حاصل کرنا بھی تھا، اس لیے اوقاتِ درس کے علاوہ وہ حضرات اکابر کی خدمت میں حاضر رہتے اور اُن کا فیضِ صحبت اُٹھاتے تھے۔ اس سلسلہ میں اُن کو حضرت شاہ صاحبؒ سے خاص تعلق پیدا ہوا، جس نے بڑھتے بڑھتے یہ صورت اختیار کرلی کہ گویا مرحوم حضرت الاستاذ کے خاندان کے ایک فرد ہی تھے۔ اُن کو حضرت کے ساتھ صرف عقیدت وارادت نہیں بلکہ درحقیقت عشق تھا، اور اس تعلق کی بنا پر حضرت الاستاذ کے تمام تلامذۂ خصوصی کے ساتھ بھی اُن کا معاملہ اور برتاؤ بالکل برادرانہ تھا۔ قدرت نے

انہیں سب کچھ دے رکھا تھا،اس لیے انھوں نے خود حضرتؒ کی زندگی میں آپ کی اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے متعلقین کی دل وجان سے عمر بھر وہ خدمت کی کہ کسی شاگرد نے کم کسی استاد کی ایسی خدمت کی ہوگی۔ اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ مرحوم نے حضرتؒ کی یادگار میں مجلسِ علمی کے نام سے ایک وقیع ادارہ لاکھوں روپیہ کے خرچ سے قائم کیا اور اسے ترقی دی۔ اس ادارہ کی طرف سے مختلف بلند پایہ کتابوں کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ کی جملہ تصنیفات وتالیفات اور افادات بڑے اہتمام اور انتظام سے شائع ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے جیسا کہ مرحوم نے راقم الحروف کو ایک مرتبہ لکھا تھا۔اُن کی تمنا یہ تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی زبان وقلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ بھی بغیر اشاعت کے نہ رہے، مرحوم کی آرزو یہ بھی تھی کہ حضرت الاستاذ کی ایک ایسی جامع سوانح عمری مرتب ہوجائے جو آپ کے شایانِ شان ہو،اس سلسلہ میں مجلسِ علمی نے نفحة العنبر کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے مگر اس سے حق ادا نہیں ہوتا،خود مرحوم کو بھی اس کا احساس تھا۔حضرت الاستاذ کی ایک جامع سوانح عمری جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک لکچرر ڈاکٹریٹ کے لیے راقم الحروف کی نگرانی میں بڑی محنت اور لگن سے مرتب کررہے ہیں، انشاء اللہ ضرور شائع ہوگی۔مگر افسوس ہے جس کو سب سے زیادہ اس کتاب سے خوشی ہوتی اب وہ دنیا میں نہیں رہا۔ ان اوصاف کے علاوہ مرحوم اسلام کے پُر جوش مبلّغ اور داعی بھی تھے اور اس راہ میں وہ بے دریغ دولت بھی خرچ کرتے تھے اور زبان وقلم سے بھی کام لیتے تھے۔متقی و پرہیز گار ہونے کے باوجود بڑے شگفتہ مزاج اور خندہ جبیں تھے،خیر خیرات اور مستحق حضرات کی امداد کے معاملہ میں پیش پیش رہتے تھے۔ چندسال سے نابینا تھے،مگر پھر بھی صبر وشکر اور قناعت کی زندگی گذار رہے تھے،لیکن آخر اُن کا وقت موعود بھی آگیا اور وہ رفیقِ اعلیٰ سے جاملے۔اللھم برد مضجعه وارحمهٗ۔

[جون ۱۹۶۳ء]

حسن، ڈاکٹر ہادی

ڈاکٹر ہادی حسن

افسوس ہے پچھلے دنوں علی گڑھ میں ڈاکٹر ہادی حسن کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرحوم مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے بڑے دیرینہ پروفیسر تھے،انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں کے بڑے خوش بیان مقرر اور فارسی شعروادب کے نامور محقق تھے، حافظہ بلا کا تھا،کسی کتاب کے صفحہ کے صفحہ بلا تکلف اپنی یاد سے پڑھ دیتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی ان کے علم وفضل اور تقریر وخطابت کی دھوم تھی۔ متعدد بلند پایہ کتابوں اور مقالات کے مصنف تھے۔ان کے فیضِ تعلیم وتربیت نے سینکڑوں نوجوانوں کو علم وفن کا استاذ اور ماہر بنا دیا۔ بیوی کی وفات اور یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بالکل گوشہ نشین اور زندگی سے بیزار ہوگئے تھے،مگر مطالعہ اور تصنیف وتالیف کا شغل پھر بھی جاری تھا۔خوداُن کا ذاتی کتب خانہ بڑی تعداد میں اہم اور بعض نادرالوجود کتابوں پر مشتمل ہے۔اللہ تعالیٰ مغفرت ورحمت سے نوازے!

[جون ۱۹۶۳ء]

حسن، سید صدیق

سید صدیق حسن

سخت افسوس ہے ۶ رستمبر کو یوپی گورنمنٹ کے سب سے زیادہ سنئیر آئی سی ایس،ممبر ریونیو بورڈ سید صدیق حسن صاحب نے اچانک داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔انتقال سے صرف پانچ روز پہلے یعنی یکم ستمبر کو عصر کی نماز کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلسِ انتظامیہ کا جلسہ تھا، مرحوم سے وہاں ملاقات ہوئی،حسب عادت بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے۔ جلسہ کے اختتام پر ہم سب کے ساتھ مسجد ندوہ میں مغرب کی نماز پڑھی، باہر نکلے تو راقم الحروف اور دوسرے حضرات کے ساتھ دس پندرہ منٹ بات چیت کرتے رہے اور پھر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو اپنے ساتھ لے کر کار میں بیٹھ کر رخصت ہوگئے۔ اس وقت دیکھنے میں کافی تندرست اور ہشاش بشاش تھے اور اس بات کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ بس اب عالمِ آب وگل میں پانچ دن کے مہمان ہیں۔ پاکستان میں ایک قریبی عزیز کا انتقال ہوگیا تھا، اُن کی تعزیت کرنے کی غرض سے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لاہور جارہے تھے،امرتسر پہنچ کر کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گزرنے کے لیے ایک متعلق افسر کی میز کے سامنے جاکر کھڑے ہوئے اور جیب سے پاسپورٹ نکال کر افسر مذکور کی طرف بڑھا رہے تھے کہ وقتِ موعود آپہنچا، یک بیک دل کی حرکت بند ہوگئی اور دھڑام سے زمین پر گر پڑے،لوگوں نے دیکھا تو مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔''انا لله وانا اليه راجعون''۔

مرحوم کی شخصیت عجیب وغریب کمالات واوصاف کی جامع تھی،حکومت کے اعلیٰ افسر ہونے کی حیثیت سے نہایت لائق وقابل، بڑے نیک نام اور

حکومت اور پبلک دونوں کی نگاہ میں معتمد اور قابلِ احترام تھے۔ ہر معاملہ میں سرکاری ہو یا غیر سرکاری اُن کی ایمان داری اور دیانت پر سب کا ایمان تھا۔ ضرورت مندوں کے ساتھ ہمدردی وغمگساری اور عملاً ان کی امداد واعانت اس قدر عام اور ہمہ گیر تھی کہ ایک ہم پیشہ ہندو دوست کی اس کی زندگی میں مدد کر کے اور اس کی موت کے بعد اُس کے بچّوں کو اپنی تربیت میں لے کر اور اُن کو اعلیٰ تعلیم دلا کر مرحوم نے انسانیت وشرافت کا جو غیر معمولی مظاہرہ کیا لکھنؤ کے باخبر اصحاب پر مخفی نہیں ہے۔ پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے، لیکن اس کا اکثر و بیشتر حصّہ غریبوں اور ضرورتمند اصحاب یا اداروں پر خرچ ہوتا تھا۔ دین داری کا یہ عالم تھا کہ کئی برس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اکزیکٹو کونسل کے ممبر رہے، میٹنگ کے درمیان جب کبھی ظہر، عصر کی نماز کا وقت آتا تھا مرحوم پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ جدید طبقہ میں اللہ کے فضل وکرم سے دین دار لوگوں کی کمی نہیں ہے، لیکن اگر معرفت وولایت کی حقیقت قلب کا سوز وگداز اور نظر کی پاکبازی ہے، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حال میں اس طبقہ نے دو بزرگ ایسے پیدا کیے ہیں جنھیں بے تکلف ولی اور صاحبِ باطن ومعرفت کہا جاسکتا ہے، ایک جنوبی ہند کے ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اور دوسرے یہ سیّد صدیق حسن۔ یہ دونوں خدا کو پیارے ہوگئے، مگر درحقیقت اسی طرح کے حضرات ہیں جن کے دم سے مذہب اور شرف ومجد انسانی کی عزت وآبرو اس زمانہ میں قائم ہے، اور ان کی پاک وصاف زندگیاں اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں کہ جو شخص فکر وعمل کے اعتبار سے سچّا اور پکّا مسلمان ہوتا ہے اُس کا وجود سرتاپا خیر وبرکت ہوتا ہے، اپنوں کے لیے بھی اور غیروں کے لیے بھی، مسلمانوں کے لیے اور ہندوؤں کے لیے بھی، ملّت کے لیے اور قوم ووطن کے لیے بھی، حکومت کے لیے اور عوام کے لیے بھی نام کے صدیق تھے، اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد بھی صدیقین وشہدا کا مقامِ جلیل عطا فرمائے، آمین! [اکتوبر ۱۹۶۳ء]

علی، مولانا حکیم سید محفوظ

مولانا حکیم سید محفوظ علی

افسوس ہے نومبر کی ۲/تاریخ کو ہماری جماعت دیوبند کے ایک نامور رکن مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحب نے کم وبیش ستر برس کی عمر میں دیوبند میں داعی اجل کو لبیک کہا اور رہ گزائے عالم آخرت ہوگئے۔ موصوف دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور علوم عقلیہ ونقلیہ دونوں میں کسی میں کم اور کسی میں زیادہ پختہ استعداد رکھتے تھے۔ فراغت کے بعد کچھ دِنوں مدرسہ میں بحیثیت معین المدرسین چند ابتدائی کتابوں کا درس بھی دیا۔ مگر طبیعت میں فنِ طب کی طرف شدید میلان پیدا ہوا تو دلّی کے نامور طبیب حکیم عبدالوہاب عرف نابینا مرحوم کی خدمت میں چند سال رہ کر اس شوق کی تکمیل اس خلوص، محنت اور انہماک سے کی کہ علماً وعملاً ایک ممتاز صاحبِ فن اور اُستاد کے لائقِ فخر ومعتمد علیہ تلمیذ رشید بن گئے۔ اب دِلّی سے رُخصت ہوکر دیوبند میں ہی انہوں نے مطب جمایا تو چند ہی مہینوں میں اُن کے حذاقتِ فن اور دستِ شفاء کی شہرت دُور دور تک پہنچ گئی۔ اور اُن کا مطب مرجع خواص وعوام ہوگیا۔ فنّی کمال ومہارت کے علاوہ اخلاقی اعتبار سے بھی بڑے خلیق ومتواضع، خوش طبع وخندہ رو اور غیرت وخودداری کے ساتھ حد درجہ مخلص وبے لوث انسان تھے یہی وجہ ہے کہ جس توجّہ سے وہ مریضوں کا علاج کرتے تھے اُسی توجّہ اور خلوص سے طلباء کو طِب کا درس خالصۃً لوجہ اللہ دیتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے قریبی عزیز تھے۔ اِس تعلق سے ہم خدام بارگاہ کے ساتھ غیر معمولی شفقت ومحبت اور التفات وتوجّہ کا معاملہ کرتے تھے۔ ان خدام میں میں سب سے کم عمر بھی تھا اور کم مایہ بھی، مگر اُن کا جوشِ التفات وکرم ان حدود کی پروا نہیں کرتا تھا۔ ہم اُن کو اپنا مخدوم ومحترم مانتے تھے اور وہ ہمارے ساتھ بالکل عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ گذشتہ اکتوبر کی ۲۸/تاریخ کو ایک کمیٹی کی میٹنگ کے سلسلہ میں دیوبند جانا ہوا تو عیادت کی غرض سے مرحوم کے مکان پر بھی حاضری ہوئی۔ وہاں یہ دیکھ کر طبیعت دھک سے رہ گئی کہ نہایت قوی ہیکل اور عظیم الجثہ ماہر فن طبیب جس کے دستِ شفاء سے ہزاروں مایوس العلاج صحت یاب ہوگئے، تین دن سے فالج کے شدید حملہ کے باعث مسلسل غشی کے عالم میں پڑا تھا اور صرف ایک سانس تھا جو تیزی سے چل رہا تھا۔

طبعاً شاہ خرچ واقع ہوئے تھے، جو آتا تھا خرچ کر ڈالتے تھے۔ بیسیوں، غریبوں، محتاجوں کی امداد مستقل طور پر کرتے تھے۔ خود زندگی سادہ تھی۔ روپیہ پیسہ کی قدر کبھی نہ جانی۔ اب ایسے غریب پرور فیاض طبع اور ماہرِ فن طبیب کہاں ملیں گے۔ اللھم اغفرلہ وبرِّد مَضْجَعَہٗ۔ [نومبر ۱۹۶۳ء]

کنیڈی

کنیڈی

گذشتہ مہینے مسٹر کنیڈی کا قتل دنیا کا سب سے زیادہ الم انگیز واقعہ بھی ہے

اورخصوصاً اس ملک کے حکمرانوں کے لیے سبق آموز وعبرت انگیز بھی! الم انگیز اس لیے کہ مسٹر کنیڈی اپنے دل ودماغ کے غیر معمولی اوصاف وکمالات کے باعث ایک نہایت وقیع اور بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔اُن کے یہی وہ کمالات تھے جنھوں نے دوبرس کے اندر ہی کم عمر وجوان ہونے کے باوصف ان کو بین الاقوامی دنیا کا ہر دلعزیز ہیرو اور لیڈر بنادیا تھا اور سبق آموز وعبرت انگیز! وہ اس لیے کہ ایک طرف دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ورمتمول اور ترقی یافتہ حکومت کا جوان وکم سال سربراہ ہے جس کے لیے عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے میں نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ اُس کے اسباب کی کمی ۔مگراس کے باوجود اپنے ملک کی مظلوم ومقہور اقلیتوں کی دادرسی کا اُس نے جوعزم اوراعلان کیا ہے اُس میں وہ اس درجہ سچا، پختہ اوراستوار ہے کہ اُس کی اپنی قوم سخت منحرف ہوکر اُس کی جان کی دشمن ہوگئی ہے لیکن اسے اس کی ذرا پروانہیں، وہ جوکہتا ہے اُسے کرگزرتا ہے۔یہاں تک کہ اسی راہِ حق وصداقت میں وہ جان بھی دے بیٹھتا ہے اور دوسری طرف اس ملک کے حکمراں ہیں کہ اقلیتوں کے دستوری حقوق کی حفاظت ونگرانی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں مگر اکثریت جس کی حمایت اُن کے اقتدار کا سہارا ہے اُس کی ناراضگی کے ڈر سے بہت سے زبانی اور کاغذی وعدے خوابِ پریشاں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ وہاں فرض شناسی ہے اور یہاں خودغرضی۔ وہاں ایمان داری، حق گستری اوراس کے لیے جاں سپاری ہے اور یہاں بے ایمانی کوتاہ نظری اور بزدلی ۔فاعتبروایااولی الابصار۔

[دسمبر۱۹۶۳ء]

نامی، مولانا محفوظ الرحمٰن

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی بھی وفات پاگئے ۔مرحوم دیوبند کے تعلیم یافتہ اور علماً وعملاً اس کی روایات کے حامل تھے۔ آزادی کے بعد اتر پردیش میں پارلیمنٹری سکریٹری بھی ہوگئے تھے اور اسی زمانہ میں راقم الحروف کواُن کے ساتھ قیام کرنے اور ان کی فیاضانہ مہربانی سے لطف اندوز ہونے کا متعدد بار موقع ملا تھا۔مگر یہ جامۂ تنگ ان کے قامت آزاد پر راس نہیں آیا۔اس لیے جلد ہی استعفاء دے دامن جھاڑ کر کھڑے ہوگئے اوراب انھوں نے اپنی زندگی مسلمان بچّوں اور بچّیوں کوقرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی تعلیم کے لیے وقف کردی جومرحوم کے نزدیک ملک کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کودین پرقائم رکھنے کے لیے بہت ضروری تھی۔چنانچہ اس سلسلہ میں ایک نئے طرز پرانھوں نے متعدد رسالے اور کتابیں لکھیں اوراُن کی اشاعت اورتبلیغ کے لیے دوردراز کے سفر کیے۔ کام ہمت اور طاقت سے بہت زیادہ تھا اس لیے اچانک فالج کا حملہ ہوا اور اس میں ایسے مبتلا ہوئے کہ ایک مرتبہ جو پڑے تو پھر اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔آخر پانچ چھ برس کی مسلسل معذوری اور بے بسی کے بعد گذشتہ ماہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے ۔رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ [دسمبر۱۹۶۳ء]

نہرو، پنڈت جواہر لال

آہ! لعلِ شب چراغِ ہند

[پنڈت جواہر لال نہرو]

افسوس ہے آخر وہی ہوا جس کا چند مہینوں سے کھٹکا لگا ہوا تھا،یعنی ۲۷رمئی کو ہمارے ملک کے محبوب وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو ۷۴ برس کی عمر میں اِس دنیا سے رخصت ہوگئے اور پورے ملک کو ماتم کدہ بنا گئے۔ دنیا میں عام طور پر بڑے آدمی دوقسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو دماغ اور ذہن کے اعلیٰ کمالات و اوصاف کے حامل ہوں اور دوسرے وہ جو قلب ونظر کے پاک اوراُن کی خوبیوں اوراچھائیوں کے جامع ہوں، ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ان دونوں قسم کے کمالات سے سرفراز ہوں۔ پنڈت جی کسی تیسری قسم کے بڑے لوگوں میں سے تھے، اُن کی زندگی سب لوگوں اورخصوصاً نوجوانوں کے لیے سرتاپا درس عبرت تھی۔ وہ ایسے گھرانہ میں پیدا ہوئے جہاں خدا کا دیا کیا کچھ نہیں تھا، بالکل عنفوانِ شباب میں جب وہ انگلینڈ سے اپنی اعلیٰ تعلیم ختم کرکے وطن واپس آئے تو حسن و شباب ،اعلیٰ تعلیم، بے پناہ دولت وثروت ،اعلیٰ خاندان اور وجاہت غرض کہ مادی اسبابِ عیش وتنعم میں سے ایسی کون سی چیز تھی جواُن کے پاس بافراط موجود نہ ہو، اوراس لیے زمانہ کے عام مذاق کے مطابق ان کے لیے بہت آسان تھا کہ ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے فلسفہ پرعمل پیرا ہوتے اور اپنی زندگی کونیّام کی خیالی جنت کے مادی پیکر میں گزار دیتے ۔لیکن ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ ان کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی تو اس پیرِ دانا کی پہلی نگاہ نے اِس نوجوان کی آرزوؤں اورتمناؤں کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کردیا اوراس نوجوان نے اُسی وقت پھولوں کی سیج اور شبستانِ عیش کے بجائے اپنے لیے خار زار آلام و مصائب اور قید ومحن کی راہ کا انتخاب کرلیا،اوراپنا سب کچھ اس کے لیے قربان

کردیا۔ اُس زمانہ میں پنڈت جی یا کسی شخص کو اس بات کا گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ملک اُن کی کوششوں کے صدقہ میں ان کی زندگی میں ہی آزاد ہوگا اور یہ اُس کے پہلے وزیراعظم ہوں گے۔ اِس بنا پر اس وقت اپنے آپ کو ملک کی آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کرنا اور اُس کی خاطر ہرقسم کے شدائد ومصائب برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہوجانا صرف اعلیٰ کردار اور انتہائی مخلصانہ جذبۂ عمل وایثار پر ہی مبنی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی کے سولہ برس جو عہدِ شباب کا بہت قیمتی سرمایہ تھے جیل خانہ کی آہنی سلاخوں کے پیچھے گزارے، مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ قوم بیدار ہوئی اور آخر ۴۷ء میں اُس نے غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

پنڈت جی اگرچہ ہندوستانی تھے اور ان کی تمام تر سرگرمیاں براہِ راست ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے وقف تھیں، لیکن اپنے فکر اور ذہن کے اعتبار سے وہ ایک عالمی انسان تھے اور اُن کے دل میں افریقہ اور ایشیا کے دوسرے مستعمراتی ملکوں کی آزادی کا جذبہ بھی اتنا ہی شدید تھا جتنا کہ خود اپنے ملک کے لیے تھا۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر وبیشتر اس کا اظہار کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی کانگریس کے پلیٹ فارم پر یا اُس کی تجاویز میں پنڈت جی کے اِس فکر کی جھلک نظر بھی آجاتی تھی۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ آج آپ اُن ممالک میں جایئے جو ماضی قریب میں برطانیہ یا فرانس یا ہولینڈ کے پنجۂ استعمار کی گرفت سے آزاد ہوئے ہیں تو وہاں کے عوام اور خواص بے تکلف اس کا اعتراف کرتے نظر آئیں گے کہ انھوں نے اپنے ملکوں میں آزادی کی جو تحریکیں چلائی تھیں اُن میں بہت کچھ رہنمائی اور مدد انھوں نے گاندھی جی اور جواہرلال نہرو سے حاصل کی تھی۔ اس بناء پر پنڈت جی صرف ہندوستان کے نہیں بلکہ بالواسطہ افریقہ اور ایشیا کے مستعمراتی ملکوں کی جنگِ آزادی کے بھی رہنما تھے۔ ملک کی آزادی اور ساتھ ہی اس کی تقسیم کے بعد ملک کو جو شدید ترین حوادث پیش آئے اُن سے ملک کو صحیح سلامت نکال کرلے جانا اور ملک میں ایک مضبوط اور غیر متزلزل حکومت قائم کرنا، اور فرقہ وارانہ جذبات کے انتہائی اشتعال اور بحران کے باوجود ملک کے لیے ایک سیکولر اور جمہوری دستورِ حکومت منظور کرالینا، یہ پنڈت جی کے سیاسی تدبّر اور ان کی بلند شخصیت کے غیر معمولی نفوذ واثر کی وہ روشن مثالیں ہیں جو اس ملک کی تاریخ میں عرصۂ دراز تک روشن رہیں گی۔

قدرت نے دل ودماغ اور حسن ووجاہت کی عجیب وغریب خوبیوں سے ان کو سرفراز کیا تھا کہ اپنوں میں اور بیگانوں میں، عوام میں اور خواص میں، بچوں میں اور بوڑھوں میں، جہاں کہیں اور جس کسی حیثیت میں گئے مقبول اور ہر دل عزیز ہوکر رہے، اُن کی شخصیت میں بلا کی کشش اور اُن کی ذات میں غضب کی جاذبیت تھی۔ دنیا میں اور بھی نامور لیڈر اور وزیراعظم ہیں جن کی شہرت اور عظمت کا سکّہ اُن کے ملکوں سے باہر بھی چلتا ہے لیکن اُن کی شہرت اور عظمت کی بڑی وجہ ان کے بے حد ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان کی عزت پنڈت جی کے دم سے تھی اور خود پنڈت جی کی عالمگیر شہرت ومقبولیت کا راز بجز اُن کے ذاتی وشخصی کمالات کے کوئی اور چیز نہیں۔ سب اُن کا سہارا لیتے تھے، مگر خود اُنھیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی، وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے کٹرقسم کے جمہوری انسان تھے اور حق یہ ہے کہ یہ وصف ان کا کمال بھی تھا اور کمزوری بھی! اور اسی وجہ سے بعض اوقات اُن سے شکایتیں پیدا ہوجاتی تھیں۔

ملک نے پنڈت جی کے عہدِ وزارت میں داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں میں مختلف وجوہ سے بڑی ترقی کی، لیکن ملک کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت یعنی قومی یکجہتی کی مہم اُن کی زندگی میں ناتمام رہی اور جیسا کہ محترم صدر جمہوریہ نے بھی اپنی تقریر میں اس طرف اشارہ کیا ہے، پنڈت جی اس کی حسرت ہی لے کر دنیا سے گئے، اس اعتبار سے پنڈت جی کی اس وقت موت پوری قوم اور پورے ملک کے لیے سخت ترین حادثہ ہے۔ آئندہ تاریخ بتائے گی کہ جو لوگ پنڈت جی کی امانت کے وارث اور اُن کے جانشین بنے انھوں نے کہاں تک اس جانشینی کا حق ادا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ [جون ۱۹۶۴ء]

<u>عمرالدین، پروفیسر محمد</u>

پروفیسر محمد عمرالدین

افسوس ہے پچھلے دنوں پروفیسر محمد عمرالدین کا ۶۲ برس کی عمر میں انتقال علی گڑھ میں ہوگیا، اور یہیں دفن ہوئے۔ مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی میں ۲۴ء میں داخل ہوئے تھے، اُس وقت سے دمِ آخر تک اُن کا رشتہ اس درس گاہ سے منقطع نہیں ہوا۔ انھوں نے تعلیم یہیں مکمل کی، پھر یہیں لکچرر، ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبۂ فلاسفی ونفسیات، وارڈن، اور پرووسٹ اور خدا جانے کیا کیا ہوئے۔ انھوں نے یونیورسٹی میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ اور انقلابات دیکھے تھے، اور اب آخر میں خود انقلاباتِ زمانہ کی عبرت انگیز تصویر بن کر رہ گئے تھے۔ اسلامی فلسفہ اُن کا خاص مضمون تھا، امام غزالیؒ کے فلسفۂ اخلاق پر انگریزی میں اُن کی ضخیم کتاب

چند سال ہوئے یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ بلا کے ذہین، بہترین منتظم، بے نفس و بے ریا، مجسم خلوص، پیکرِ وضع داری، اور نہایت سادہ اور بے تکلّف! راقم الحروف سے دیرینہ اور بڑے مخلصانہ تعلقات تھے، یونیورسٹی سے ملازمت کے تعلق کے اعتبار سے مرحوم اس چمن کی پرانی بہار کی آخری نشانی تھے۔ ''خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں''۔ [ستمبر ۱۹۶۴ء]

شہیدؔ فرنگی محلی، مولانا صبغۃ اللہ

مولانا صبغۃ اللہ شہیدؔ فرنگی محلی

افسوس ہے گزشتہ مہینہ جناب مولانا صبغۃ اللہ شہیدؔ فرنگی محلی لکھنؤ سے بقصدِ ڈھاکہ روانہ ہوکر کلکتہ پہنچے تھے کہ اچانک دو تین مرتبہ استفراغ ہوا، اور اس کے بعد ہی بیہوش ہوئے تو پھر ہوش میں نہ آئے، آخر تین روز تک اسی عالم میں رہ کر ہسپتال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی اور رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عمر ستر ۷۰ کے لگ بھگ ہوگی، مگر قویٰ اچھے خاصے تھے۔ وفات سے ایک ماہ قبل ہی لکھنؤ میں حسب معمول مکان پر حاضری دی تو ہمیشہ کی طرح نہایت گرم جوشی اور تپاک سے ملے، بچّوں اور بچّیوں کو بلوا کر سلام کرایا، پُرتکلّف چاء سے تواضع کی اور دیر تک اس شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے کہ اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اب دنیا میں ایک مہینہ کے اور مہمان ہیں۔ مولانا فرنگی محل کے ممتاز علماء میں سے تھے، ایک زمانہ میں آپ کی خطابت کی بڑی دھوم تھی، سیرت اور شہادت پر خصوصاً بڑی پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کرتے تھے۔ شاعر اور اردو کے زبان دان اور ادیب بھی اسی پایہ کے تھے، نعت گوئی میں خصوصاً بڑا کمال تھا۔ گفتگو بھی ایسی ہی شیریں و دل چسپ اور ادبی وعلمی لطائف وظرائف سے پُر ہوتی تھی۔ قدیم اودھ کی شرافت اور وضع داری، ہمدردی اور غمگساری مرحوم کی طبیعت اور جبلّت تھی۔ راقم الحروف جب کبھی مکان پر حاضر ہوتا تو اُن کے ہاں گویا عید آجاتی تھی، ہر خط دعاؤں سے اور شفقت بزرگانہ کے بیساختہ اظہار سے پُر ہوتا تھا۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کے آل واصحابِ کرام کے ساتھ عشق ومحبت اس درجہ تھا کہ بسا اوقات ذکر کرتے کرتے رو پڑتے تھے۔ مرحوم، بزرگانِ سلف کے اُس کاروانِ رفتہ کی بقیہ یادگاروں میں سے تھے جس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں مگر اب اُس کارواں کی گردِ کف پا بھی نظر نہیں آتی۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

حق تعالیٰ مغفرت ورحمت کی بخششوں سے نوازے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ [جنوری ۱۹۶۵ء]

فاروقی، خواجہ عبدالحی

خواجہ عبدالحی فاروقی

افسوس ہے پچھلے دنوں لاہور میں خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر رہ گزائے عالمِ جاودانی ہوگئے۔ مرحوم بلند پایہ عالم، مفسر اور اسلامیات کے فاضل تھے۔ تعلیم کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی تھی۔ عرصۂ دراز تک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں شیخ التفسیر رہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہوکر اسلامیہ کالج لاہور میں صدر شعبۂ علوم اسلامیہ ہوگئے تھے۔ طبعاً کم سخن اور مرنج و مرنجان مگر بڑے خلیق و ملنسار تھے، اللہ تعالیٰ رحمت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔ [مارچ ۱۹۶۵ء]

یوسف، مولانا محمد [امیر تبلیغی جماعت]

مولانا محمد یوسف

افسوس ہے مولانا محمد یوسف صاحب امیر تبلیغی جماعت اس خاک دان عالم کو الوداع کہہ کر رہ گزائے عالمِ جاودانی ہوگئے۔ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ تبلیغ و ارشاد اور دعوت الی الحق کے لیے وقف تھا، اس لیے موت بھی اسی حالت میں آئی۔ یکم اپریل کو مغرب کے بعد لاہور میں ایک مجمع کو خطاب کررہے تھے کہ تقریر کرتے کرتے اچانک غشی طاری ہوئی۔ رات بھر یہی کیفیت رہی۔ صبح کو چند منٹ کے لیے ہوش آیا تو صرف اتنا فرمایا ''بھائیو! اب میرا وقت پورا ہوچکا ہے آپ سب میرے لیے دعا کریں'' اتنا کہہ کر جو بے ہوش ہوئے تو پھر ہوش نہ آیا اور ۲/اپریل کو جمعہ کی نماز کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جنازہ ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی لایا گیا اور ۳/اپریل کو بستی نظام الدّین میں جہاں زندگی گزاری تھی تدفین عمل میں آئی۔

مولانا ہندو پاک کے اکابر علماء میں سے تھے۔ مطالعہ اور تحریر وتصنیف کا ذوق فطری تھا۔ ہزار مصروفیتوں کے باوجود روزانہ چند گھنٹے مطالعہ ضرور کرتے اور لکھتے تھے۔ چنانچہ 'حیات الصحابہ' کے نام سے عربی زبان میں ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ علم و عمل، اخلاق وعادات اور تقویٰ وطہارت میں علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ لیکن اُن کا نہایت عظیم الشان کارنامہ جو مسلمانوں کے موجودہ حالات میں ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے والد ماجد مولانا محمد الیاس

صاحبؒ کی وفات کے بعد اُن کے جاری کیے ہوئے تبلیغی کام اوراس کے نظم و نسق کو باقی رکھا بلکہ اُسے ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچادیا اور پھر اُسی شان اور اسی وضع کے ساتھ، چنانچہ اس جماعت کا نہ کہیں دفتر ہے نہ اس کے لیے عہدہ دار اور نہ اُن کا انتخاب، نہ صدر نہ سکریٹری، نہ خازن اور نہ کلرک اور نہ منشی، نہ اخباروں میں کوئی اعلان، نہ پوسٹر اور نہ پمفلٹ، نہ پروپیگنڈہ اور نہ کوئی دفترِ نشر و اشاعت، نہ چندہ کی اپیل، نہ اس کا کوئی اخبار یا رسالہ مگراس کے باوجود جماعت کے اجتماعات ہوتے تھے تو ہر طبقہ اور ہر گروہ کے مسلمان، عالم اور عامی، عوام اور خواص، امیر اور غریب، ملک کے دور دراز حصّوں سے کھنچ کھچا کر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے اور ذکر واذکار میں اوقات صرف کرتے تھے۔ جماعت کے دائرہ عمل کی وسعت کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ عرب وافریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان تبلیغی دوروں پر یہاں آتے تھے اور یہاں کے مسلمان اُن ملکوں میں دعوت وارشاد کا کام کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی ہر قسم کی رسمی تنظیم سے بالکل معرا ہونے کے باوجود لاکھوں انسانوں کا اس طرح ایک مرکز سے وابستہ رہ کر مکمل یک جہتی اور ڈسپلن کے ساتھ دیوانہ وار کام کرنا مادہ پرستی کے اس پر آشوب دور میں روحانیت وخداپرستی کا ایک حیرت انگیز کرشمہ وکارنامہ ہے۔ مولانا کی عمر ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ابھی غالباً پچاس برس کے بھی نہ ہوں گے۔ اُن کا حادثۂ وفات عالمِ اسلام کا ایک بڑاالمیہ ہے، لیکن اس جماعت کے کام کرنے کا انداز کچھ ایسا رہا ہے اور ہے کہ بڑی سے بڑی ایک شخصیت کی موت بھی اس کے کاموں پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اُمید ہے کہ جماعت کا کام برابر جاری رہے گا اور ترقی کرے گا۔ بَرَّدَاللّٰہ مثواہ وطاب ثراہ۔

[اپریل ۱۹۶۵ء]

میرٹھی، مولانا شیخ محمد عالم بدر

مولانا شیخ محمد عالم بدر میرٹھی

افسوس ہے ہماری بزمِ انوری کی ایک اورشمع فروزاں بُجھ گئی یعنی حضرت الاستاذ مولانا محمدانور شاہ الکشمیریؒ کے تلمیذِ رشید اور ہمارے دیرینہ رفیقِ کار اور ساتھی مولانا الشیخ محمد بدر عالم میرٹھی نے گزشتہ ماہ کے آخری ہفتہ میں تین برس کی مسلسل اور شدید علالت ومعذوری کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ مولانا کے والد ماجد پولیس کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ مگران کی نیکی اور دین داری کا یہ عالم تھا کہ اس ملازمت کے باوجود انھوں نے بیٹے کو عربی ودینی تعلیم کے لیے سہارنپور بھیجا، وہاں سے فارغ ہوکر مولانا دیوبند آئے اور حضرت الاستاذ کے درسِ بخاری میں شریک ہوکر کئی سال مسلسل سماع کیا اور درسی تقریریں قلمبند کیں۔ علاوہ ازیں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں صبح وشام یوں بھی حاضر رہتے اور برابر علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں مختلف علوم وفنون کے اسباق آپ کے سپرد ہوگئے۔ مولانا کی استعداد بڑی پختہ اوران کا ذوق ہمہ گیر تھا۔ منطق، فلسفہ، ادب، حدیث اور فقہ، ان میں سے ہر مضمون کی کتاب اس طرح پڑھاتے تھے کہ گویا وہ ان کا کوئی خاص فن تھا۔ ۲۸ء میں حضرت شاہ صاحب اپنی جماعت کے ساتھ ڈابھیل گئے تو مولانا بھی اس جماعت کے رکن رکین تھے۔ وہاں انھوں نے نہایت محنت اور توجہ سے بڑی سے بڑی کتابوں کا درس دیا۔ لیکن حضرت الاستاذ سے استفادہ کی تشنگی کم نہیں ہوئی، بلکہ اُس میں روز بروز اضافہ ہوتا اور یہ مسِ خام کندن بنتا رہا۔ یُوں بھی وہ حضرت الاستاذ کے عاشق تھے۔ صورت کے بھی اور سیرت کے بھی! ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ حضرت الاستاذ کے ہزاروں شاگردوں میں بڑے بڑے نامور علماء وفضلاء بھی ہیں اور محققین واساتذہ بھی، لیکن خاص فنِ حدیث میں جو جامعیت اور کمال (مولانا محمد یوسف بنوری کو مستثنیٰ کرکے) مولانا کے حصہ میں آیا وہ کسی اور کو نہیں ملا۔ چنانچہ 'فیض الباری علی صحیح البخاری' مطبوعۂ قاہرہ (مصر) اور 'ترجمان السُنۃ' (مطبوعہ ندوۃ المصنفین) کی ضخیم مجلدات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ سولہ سترہ برس کے بعد مدرسۂ تعلیم الدین جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل سے تعلق منقطع ہوا تو مولانا ندوۃ المصنفین سے براہِ راست متعلق ہوگئے اور دلّی میں مستقل قیام کرلیا، اسی زمانہ میں ملک تقسیم ہوااور عظیم تباہی وبربادی کے ساتھ لاکھوں انسان اِدھر کے اُدھر اور اُدھر کے اِدھر پہنچ گئے تو مولانا بھی ترکِ وطن کرکے کراچی پہنچے۔ مگر جلد ہی جی اچاٹ ہوگیا تو (غالباً ۱۹۵۰ء میں) پاکستان کو بھی خیر باد کہہ کر اُس سرزمینِ قدس میں پناہ لی، جس کے گلی کوچوں میں بارہا جبریلِ امین کو پرفشانی کرتے دیکھا گیا ہے۔

مولانا علومِ ظاہری میں کمال ومہارت کے ساتھ معرفت وسلوک میں بھی مرتبۂ بلند و مقامِ رفیع رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے حضرتِ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے دامانِ ارادت وعقیدت سے وابستہ ہوکر بڑے انہماک وتوجہ سے کسبِ فیض واستفادہ کیا اور حضرت مفتی صاحب خدا کو پیارے ہوگئے تو مولانا نے حضرت کے خلیفۂ مجاز مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی سے رجوع کیا۔ حضرت قاری صاحب کا مستقل قیام دلّی میں رہتا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا کا مشغلہ بجزاس کے کچھ نہیں تھا کہ دن میں صبح شام چھ

سات گھنٹے مطالعہ وتصنیف کے سلسلہ میں ندوۃ المصنفین میں گزارتے تھے اور اس کے علاوہ پوراوقت مجاہدہ وریاضت یا پیرومرشد کی خدمت میں گزارتے تھے۔طبعاً بڑے خوش مزاج، زندہ دل اور خندہ جبین تھے۔

دیوبند سے تعلق کے زمانہ میں شکار کا بڑا شوق تھا۔ برسوں معمول یہ رہا کہ جمعرات کے دن ظہر کی نماز پڑھی اور کارتوسوں کی پیٹی گلے میں ڈال اور بندوق اٹھا چل دیے اور عشاء کے وقت تک واپس آتے تھے۔اللہ نے حسنِ باطنی کے ساتھ حسنِ ظاہری سے بھی نوازا تھا۔خوش پوشاک وخوش خوراک تھے، اکثر قیمتی دوائیں بھی استعمال کرتے رہتے تھے۔معمولات کے سخت پابند اور انتہا درجہ باحمیت وغیرت مند تھے۔صاف گو اور صاف رَواِس بلا کے تھے کہ بعض اوقات اُن پر ''کھرّے پن'' کا گمان ہونے لگتا تھا۔

مدینہ طیبہ میں قیام کر لینے کے بعد بھی اگرچہ تصنیف وتالیف کا مشغلہ کچھ نہ کچھ جاری رہا لیکن اب مولاناؔ کے اوقات کا اکثر حصّہ تعلیم وتربیتِ باطنی اور تلقین وارشادِ روحانی میں صرف ہوتا تھا،عوام وخواص کے مرکزِ عقیدت تھے۔انڈو پاک کے مسلمانوں کے علاوہ افریقہ اور خاص حجاز کے علماء اور عوام بھی مولانا سے ارادت رکھتے اور فیضِ باطنی حاصل کرتے تھے۔خدا کی دین ہے ،جو بچّہ میرٹھ کے ایک پولیس افیسر کے گھر میں پیدا ہوا تھا،اس کے مقدر میں یوں علم وعمل، تقویٰ وطہارت اور فضائلِ اخلاق وکمالات کے آسمان پر مہرِ تاباں بن کر چمکنا، برسوں تک چمکتے رہنا اور آخر میں مہبطِ وحی وجلوہ گہِ نبوت سرزمین کی خاکِ پاک کا پیوند ہوکر وہیں ابدی نیند سوجانا لکھا تھا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

رحمۃُ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

[نومبر ۱۹۶۵ء]

زارزتشی، پنڈت تربھون ناتھ

پنڈت تربھون ناتھ زارؔ زتشی

اُردو زبان کے علمی اور ادبی حلقوں میں اس خبر کو بڑی حسرت اور افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ پچھلے دنوں پنڈت تربھون ناتھ زارؔ زتشی نے ۹۲ برس کی عمر میں دلّی میں انتقال کیا۔ پنڈت جی کشمیری پنڈت تھے،ان کا خاندان اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت میں دلّی میں منتقل ہوگیا تھا۔اس بناء پر یہ خاندان کشمیر اور دلّی دونوں کی خاص تہذیب اور کلچر، شرافت،علمی وادبی ذوق، حسن وجمال اور وسعتِ مشرب ایسے اوصاف وخصوصیات کا حامل ہے، پنڈت جی ان خصوصیات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہونے کے باعث ان سب میں ممتاز تھے۔سنسکرت کے علاوہ فارسی اور اُردو کے بھی نامور فاضل اور محقق تھے۔شعروشاعری میں مرزا داغؔ سے تلمذِ خصوصی رکھتے تھے۔ بلکہ غالباً وہ استاد کی آخری یادگار تھے،دلّی زبان اور اُس کی کہاوتوں اور محاورات پر انہیں جو عبور تھا اُس میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔اس سلسلہ میں یہ واقعہ دل چسپی سے سنا جائے گا کہ ۱۹۳۹ء میں جب پہلے پہل میرا تقرر سینٹ اسٹیفنس کالج دلی میں بحیثیت استاد کے ہوا اور دوسری کلاسوں کے ساتھ بی۔اے (فائنل) کی اُردو کلاس بھی مجھے پڑھانے کے لیے دی گئی تو ایک دن مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کی مشہور کتاب 'توبۃ النصوح' کلاس میں پڑھا رہا تھا کہ اچانک ''سفوپہ نادری چڑھی'' کا فقرہ سامنے آگیا۔اور چوں کہ مجھے اس کا مطلب معلوم نہیں تھا اس لیے میں نے کلاس ختم کردی اور میں سیدھا اپنے استاد شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے مکان پر پہنچا اور ان سے اس فقرہ کا مطلب دریافت کیا۔مولوی صاحب نے بہت کوشش کی، دماغ پر بہت زور ڈالا مگر بات نہ بنی۔اتنے میں مولوی صاحب کے جگری دوست خواجہ عبدالمجید دہلوی جو دلّی کی ٹکسالی زبان اور محاورات کے بڑے اور مسلّم ماہر تھے ادھر آنکلے، مولوی صاحب نے ان سے پوچھا لیکن حافظہ اور دماغ پر بہت کچھ زور ڈالنے کے باوجود انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔آخر خواجہ صاحب نے پنڈت زارؔ صاحب زتشی کا نام لیا اور مجھ سے کہا کہ تم وہاں چلے جاؤ،اب زارؔ زتشی کے سوا دلّی میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس کا مطلب سمجھا سکے۔میں فوراً زارؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا،حسب معمول بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔میں نے آنے کا مقصد بیان کیا تو اگرچہ وہ اُس وقت بڑی عجلت میں تھے اور کہیں جارہے تھے مگر مجھے وہیں لے کر بیٹھ گئے اور کم وبیش چالیس منٹ اس پر تقریر کی،تقریر کا حاصل یہ تھا کہ مغل بادشاہت کے آخری دور میں گنجفہؔ، چوسرؔ اور شطرنجؔ کی طرح اور بھی متعدد کھیل تھے جو کھیلے جاتے تھے،مگر اب کوئی اُن کا نام بھی نہیں جانتا۔اُنہی کھیلوں میں سے ایک کھیل تھا جس کی یہ اصطلاح ہے۔زارؔ صاحب نے ایک بڑا سا کاغذ لے لیا اور اُس پر پنسل سے نقشہ بنابنا کر سمجھاتے رہے کہ اس کھیل میں اتنے خانے ہوتے تھے، ہر خانہ میں ایک مہرہ ہوتا تھا جس کا نام اور کام دوسرے مہروں سے جدا ہوتا تھا۔چالیں اس طرح چلی جاتیں، اور شکست وفتح کا معیار یہ ہوتا تھا۔''سفوپہ نادری چڑھنا'' شکست کی علامت ہے، جیسے شطرنج میں ششدر ہو جانا۔زارؔ صاحب نے یہ پوری تقریر اس امنگ اور حوصلے سے کی کہ گویا جوانی کی

کسی شب کی کوئی دل چسپ کہانی انہیں اچانک یاد آ گئی ہے۔اللہ اکبر! اب یہ بساطِ دیرینہ اُلٹ گئی۔اور یہ پُرانی محفل اُجڑ چکی۔اب نہ دلّی وہ دلّی ہے، نہ اُس کی وہ زبان، نہ کلچر اور نہ وہ شرافت اور نہ تہذیب۔ پنڈت تربھون ناتھ زارؔ زتشی جن کے گھر کا بچّہ بچّہ، لڑکیاں اور عورتیں تک اُردو زبان کی عاشق اور شاعر ہیں، اس محفل کی آخر نشانی اور یادگار تھے۔سدا رہے نام اللہ کا۔ [نومبر ۱۹۶۵ء]

سیف الدین، ڈاکٹر سیدنا طاہر

سیّدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین

پچھلے دنوں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ سیّدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین صاحب نے ۷۷ برس کی عمر میں چند روز کی علالت کے بعد بمبئی میں وفات پائی، اناللہ وانا الیہ راجعون ۔مرحوم اگرچہ بوہرہ جماعت کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا یعنی داعی مطلق تھے۔اور اس حیثیت سے انھوں نے اس طبقہ کی دینی اور اخلاقی اصلاح اور تعلیمی واقتصادی فلاح وبہبود کے لیے بڑی ہی شان دار خدمات انجام دی ہیں، لیکن ان میں تعصب یا گروہ بندی کا جذبہ بالکل نہیں تھا، مسلمانوں کے دوسرے دینی اور تعلیمی اداروں سے بھی تعلق رکھتے اور اُن کی مالی امداد واعانت کرتے تھے۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دس بارہ برس سے چانسلر تھے اور صرف برائے نام نہیں بلکہ اُس کے معاملات سے خاطر خواہ دل چسپی لیتے اور ضرورت کے وقت اُس کی مالی مدد بھی کرتے تھے۔ان کی جود وعطاء اور فیاضی کا دامن نہایت وسیع تھا، اس باب میں مذہب، رنگ ونسل اور قومیت ووطنیت کا کوئی فرق وامتیاز نہیں ہوتا تھا۔علی گڑھ آتے تھے تو ایک روز چند گھنٹے صرف غریب اور حاجت مند طلباء سے ملاقات کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔اس وقت طلباء باری باری سے پیش ہوتے اور اپنی مراد پا کر واپس ہوتے تھے۔علم وفضل، تقویٰ وطہارت اور اخلاق وفضائل کے اعتبار سے بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ اسلامی شعائر اور آداب کا اس درجہ اہتمام ہوتا تھا کہ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں ایک طالبِ علم نے ننگے سر قرآن مجید کی تلاوت شروع کی تو فوراً اُسے ٹوکا۔ انہیں دنوں میں ایک روز مجھ کو خاص طور پر اپنی قیام گاہ پر بلایا اور تنہائی میں کم و بیش نصف گھنٹہ تک مسلمانوں اور خاص کر طلباء کے دینی اور اخلاقی انحطاط پر سخت تشویش اور رنج کا اظہار فرماتے رہے، اس کے علاوہ کلکتہ اور علی گڑھ میں اور بھی کئی مرتبہ شرفِ ملاقات حاصل ہوا ہے اور ہر مرتبہ طبیعت بڑی محظوظ ہوئی ہے۔ نماز بہت طویل اور اُس کے بعد اوراد و وظائف بہت دیر تک پڑھتے تھے، اور یہ معمولات سفر میں بھی ناغہ نہیں ہوتے تھے، ان حالات میں آپ کی وفات ایک عظیم قومی حادثہ ہے۔رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ [دسمبر ۱۹۶۵ء]

شاستری جی

شاستری جی

یار بالیں پہ جب آیا توقضا بھی آئی!

شب میں ریڈیو پر معاہدۂ تاشقند کی امید افزا خبر اور اُس کی تفصیلات سُنیں اور علی الصباح اچانک بے حد افسوسناک اور رنج دہ خبر شاستری جی کے سورگباش ہونے کی سُن لی، اُس وقت طبیعت میں اضطراب وکشمکش کی جو عجیب وغریب کیفیت پیدا ہوئی اُس کا اظہار مذکورہ بالا مصرعہ سے (بشرطیکہ اس کا مصرعۂ اولیٰ بالکل حذف کر دیا جائے) بہتر اور کسی پیرایۂ بیان سے نہیں ہوسکتا۔شاستری جی کی پوری زندگی جدوجہد، ایثار وقربانی اور آلام وشدائد پر صبر واستقامت کی زندگی تھی۔لیکن اُن کے ساتھیوں میں جو چیز اُن کے لیے مایۂ امتیاز تھی وہ ان کی مخلصانہ غیر معمولی سادگی تھی، چنانچہ وزیر اعظم ہونے کے بعد بھی وہ اپنے رہن سہن، طور طریق اور عادات وخصائل میں اسی پُرانے ڈگر پر قائم رہے۔وہ دل کے جتنے اچھے تھے ذہنی استعداد اور معاملہ فہمی کے اعتبار سے بھی اتنے ہی اچھے تھے۔لوگ پوچھتے تھے ''پنڈت نہرو کے بعد کون ہوگا؟'' لیکن شاستری جی نے ڈیڑھ برس کی قلیل مدّت میں ہی شہرت وعظمت کے ساتھ وہ ہر دل عزیزی حاصل کر لی تھی کہ لوگوں کو پنڈت جی پر زبان کھولنے اور اُن کے کارناموں پر بے دھڑک تنقید کرنے کا حوصلہ ہو چلا تھا۔اگرچہ اس میں دخل اس بات کا بھی تھا کہ ہندوستان اپنی سرشت اور خمیر کے اعتبار سے ایک مذہبی ملک ہے، اس بناء پر صحیح معنی میں ایک مذہبی شخص کے ساتھ طبعی طور پر ان کو جو لگاؤ ہوسکتا ہے وہ لامذہب کے ساتھ نہیں ہوسکتا، گو وہ اپنے ذاتی اوصاف وکمالات کے باعث کیسی ہی عظیم شخصیت کا مالک ہو۔

معاہدۂ تاشقند جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں امن وامان اور دوستی کے ساتھ رہنے کی ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز ہے۔اگرچہ اس کی تحریک اور اس سلسلہ میں غیر معمولی جدوجہد کا سہرا مملکتِ روس کے وزیر اعظم کے سر ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس کی ترتیب وتکمیل شاستری جی اور صدر ایوب کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو تاریخ میں یادگار رہے گا اور اس کی وجہ سے آئندہ نسلیں ان کا نام عزت اور شکرگزاری کے ساتھ لیں گی۔صدر ایوب تو خدا

اُن کی عمر دراز کرے اس معاہدہ کو عملی شکل دینے کے لیے بقیدِ حیات ہیں۔لیکن شاستری جی کے خلوص اوراُن کے جذبۂ امن پسندی کی داد اس سے بڑھ کراور کیا ہوسکتی تھی کہ خوداُن کی متاعِ حیات عہدنامۂ تاشقند کی نذر ہوگئی:

یوں عبادت ہوتو زاہد ہیں عبادت کے مزے

کوئی دستاویز اورکوئی اعلان اپنے مضمون اورعبارت میں خواہ کتناہی دلآویز و دل کش اور لائقِ تعریف ہوعملاً اُس کی کوئی حیثیت اُس وقت تک تسلیم نہیں کی جاسکتی جب تک دونوں فریق ایمان داری کے ساتھ اُس کی اہمیت و واقعیت پریقین رکھنے کے ساتھ اُس پرسچّے دل سے عمل پیرا ہونے کا عزم بالجزم نہ رکھتے ہوں، دنیا میں تخریب بہ نسبت تعمیر کے، بناؤ کی بہ نسبت بگاڑ اوروصل کے بجائے فصل ہمیشہ بہت آسان رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غصّہ جوعموماً نفرت ،عناد اوردشمنی کا نتیجہ ہوتا ہے وہ جب بڑھتا اور حد سے تجاوز کرتا ہے توصرف افراد واشخاص نہیں بلکہ بسااوقات قومیں کی قومیں خود اپنے غصّہ کی آگ میں جل مرتی اور اپنی تلوار سے اپنا گلا کاٹ لیتی ہیں، تاریخ میں ایک دونہیں اس کی سینکڑوں مثالیں نظر آسکتی ہیں۔ پھرآج تواس سے انکار ہی نہیں کیاجاسکتا کہ اس زمانہ میں جنگ کا نتیجہ یہ توہوسکتا ہے کہ دونوں مٹ جائیں اورکسی تیسری طاقت کے غلام بن جائیں،لیکن یہ ہرگزنہیں ہوسکتا کہ ایک فاتح بن جائے اور دوسرا مفتوح ،ایک غالب ہواوردوسرا مغلوب ،پس جب معاملہ یہ ہے توقطعِ نظر اس سے کہ انسانیت کے اقدارِ اعلیٰ کا تقاضہ اور مطالبہ کیا ہے، عافیت اورسلامتی کا راستہ یہی ہے کہ سب قومیں اورخصوصاً دو بالکل قریبی اور پڑوسی ملک آپس میں میل جول، اورمحبت و رواداری کے ساتھ رہیں۔اگرچہ عہدنامۂ تاشقند کی مخالفت میں وہاں بھی آوازیں بلند ہورہی ہیں، اور یہاں بھی، یہاں کم اوروہاں زیادہ، لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ دونوں ملکوں کی اکثریت اورعلی الخصوص سنجیدہ وفہمیدہ حضرات نے اس کی اہمیت وضرورت اوراس کی افادیت کوتسلیم کرلیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہدنامہ کے بعد سے دونوں ملکوں کے اخبارات، پریس اورریڈیو کی زبان بہت کچھ بدل گئی، اور اُس میں بڑی سنجیدگی پیدا ہوگئی ہے،ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ جس تحریر کوآج امن کے راستہ کا پہلا قدم کہا جارہا ہے وہ دونوں حکومتوں کے مخلصانہ اشتراک وتعاون سے جلد ہی سچّی دوستی اورحقیقی امن وعافیت کی تکمیل کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

[فروری ۱۹۶۶ء]

محروم، پروفیسر تلک چند

پروفیسر تلک چندمحروم

افسوس ہے پروفیسر تلک چندمحروم بھی ستتر (۷۷) برس کی عمر میں گزشتہ مہینہ دہلی میں رہ گزاے عالمِ جاودانی ہوگئے۔ موصوف فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے کہنہ مشق قادر الکلام اور بڑے پُر گوشاعر تھے، اُن کی فنی استعداد بھی بڑی پختہ اوراعلیٰ تھی۔انہیں غزل اورنظم دونوں پر یکساں قدرت تھی،لیکن طبیعت کونظم سے زیادہ لگاؤ تھااورنظم بھی کسی ایک خاص صنف کی نہیں بلکہ ہرصنف اور ہرنوع کی۔رباعیات اورقطعات بھی کثرت سے لکھے ہیں۔نظم کے علاوہ نثر بھی شستہ ورواں اور چٹکیلی لکھتے تھے۔ پھر جتنے بڑے شاعر، ادیب اورمصنّف تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے،تقسیم کے وقت وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہوئے اور کیسے کچھ مصائب برداشت کیے،لیکن کیا مجال! انسانیت وشرافت کی پیشانی پرایک ہلکا سابل بھی پڑا ہو۔اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیں یقین ہے پروفیسرمحرومؔ کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ [فروری ۱۹۶۶ء]

شریف، پروفیسرایم۔ایم

پروفیسرایم۔ایم شریف

پروفیسرایم۔ایم شریف اگرچہ اصلاً پنجابی تھےلیکن درحقیقت وہ تھےعلی گڑھ کا سرمایۂ گراں پایہ۔ وہ یہاں طالبِ علم رہے، پھرفلسفہ کے پروفیسراورصدر شعبہ ہوئے۔یونیورسٹی کے پرووائس چانسلربھی بنے اوراپنے علم وفضل، اخلاق وعادات اورہمدردی ومحبت کے باعث یونیورسٹی کی سوسائٹی میں نہایت مقبول اور ہردلعزیز ہوکر رہے،تقسیم کے بعدعلی گڑھ کی یہ دولت پاکستان منتقل ہوگئی تواب اُن کے تحقیقی اورتصنیفی جوہر کھلے، چنانچہ ادب، فلسفہ اوراسلامیات پرانھوں نے انگریزی اور اُردو میں اتنی فکرانگیز اورمحققانہ کتابیں اورمقالات لکھے جوایک مصنف کے فخرکرنے اوراس کوعلم وادب کی دنیا میں زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی ہیں۔ اسی بناء پراُن کو پاکستان میں علمی اعزاز بھی بڑے سے بڑاحاصل ہوا،ادارۂ ثقافتِ اسلامی کے ڈائرکٹر ہوئے، پاکستان فلاسفکل کانگریس کے صدر چُنے گئے،پنجاب یونیوسٹی میں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین مقرر ہوئے۔ان کاقلم بڑا شگفتہ نگاراور باغ وبہار تھا۔طبعًا اپنے نام کی طرح نہایت شریف اوراعلیٰ اخلاق وکردار کے انسان تھے۔راقم الحروف کی پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی تھی جبکہ مسلم یونی ورسٹی کی انجمن تمدن وتاریخِ اسلامی کی دعوت پر۴۰ء میں راقم نے یونیورسٹی

کے یونین ہال میں عمر میں پہلی مرتبہ ''مسلمانوں کے زوال کے اسباب'' پر تقریر کی تھی اور پروفیسر محمد شریف مرحوم نے اُس جلسہ کی صدارت کی تھی۔ تقسیم کو داد دیجیے کہ موصوف کا انتقال ہوگیا اور اس کی اطلاع ہم کو کئی ماہ کے بعد ابھی پچھلے دنوں لاہور کے ماہنامہ ثقافت کے چار مہینوں کے یکجائی نمبر سے ہوئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

[جولائی ۱۹۶۶ء]

نیاز فتح پوری

نیاز فتح پوری

نیاز صاحب فتح پوری بھی اکاسی (۸۱) برس کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ موصوف کی ساری عمر شعروادب کے چمن زار میں گلگشت کرتے گزری، اگرچہ انھوں نے مورخ، عالمِ دین، ماہرِ نفسیات، ان میں سے ہر ایک کا روپ دھارنا چاہا لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ وہ عربی اور انگریزی سے آشنا، فارسی میں پختہ استعداد اور اُردو زبان کے صاحبِ طرز انشا پرداز ادیب، نغز گو شاعر اور بلند پایہ نقاد تھے۔ اُن کا تعلق اُردو زبان وادب کی اُس نسل سے تھا جو اب آفتابِ لب بام ہے۔ یہ نسل اب ختم ہورہی ہے، لیکن اس نے اپنے فیضِ قلم وانشا سے ہزاروں چراغ روشن کردیے ہیں جو آج برِصغیر میں اُردو کے سرمایۂ ادبیات میں گراں قدر اضافہ کررہے ہیں۔ کتنے نوجوان ہیں جو ''نگار'' اور ''شہاب کی سرگزشت'' وغیرہ جیسی موصوف کی کتابیں اور مقالات پڑھ پڑھ کر ادیب ہوگئے۔ اس لحاظ سے کوئی شبہ نہیں وہ اُردو کے معمار تھے اور تاریخِ ادب میں اُن کا نام اور کام قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

[جولائی ۱۹۶۶ء]

نیازی، مولانا عبدالسلام

مولانا عبدالسلام نیازی

افسوس ہے پچھلے دنوں دہلی میں اسّی (۸۰) نوے (۹۰) برس کی عمر میں مولانا عبدالسلام نیازی کا بھی انتقال ہوگیا۔ مولانا عجیب وغریب خصوصیات کے بزرگ تھے اور کم از کم راقم کی نظر سے آج تک کبھی کوئی شخص اس انداز اور ادا کا نہیں گزرا۔ صورت شکل کے لحاظ سے ڈاڑھی مونچھ صاف، دراز قامت، کسرتی اور دُہرا بدن۔ مگر منطق وفلسفہ میں درک وبصیرت اس درجہ کہ صدرا اور شمس بازغہ، حمداللہ اور قاضی ناخنوں میں پڑی ہوئی۔ قرآن سے غیر معمولی شغف، حضور پُرنورؐ کے ساتھ عشق کا یہ عالم کہ نامِ نامی زبان پر آیا نہیں کہ جی بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ زورِ تقریر وخطابت اس بلا کا کہ فقرہ فقرہ پر فصاحت وبلاغت صدقہ۔ عرفیؔ، جامیؔ اور خاقانیؔ وغیرہم کے ہزاروں اشعار برنوکِ زبان، جھوم جھوم کر پڑھتے اور ان کی تشریح کرتے تھے۔ اقلیدس سے حضورؐ کی ختمِ نبوت کے اثبات پر جب تقریر کرتے تھے تو اللہ اکبر! جوش وخروش اور زور وروانی کا کیا منظر ہوتا تھا! محسوس ہوتا تھا کہ ہر شے پر سکتہ طاری ہوگیا اور دم بخود ہوکر رہ گئی ہے۔ خودداری اور استغنا اس درجہ کا کہ سرِ اکبر حیدری ایسے لوگ آتے تھے اور یہ شخص تعظیم تک کے لیے کھڑا نہ ہوتا تھا۔ ہمیشہ مجرد رہے۔ عطر بنا کر گزر بسر کرتے تھے۔ تحفہ یا نذرانہ قلیل ہو یا کثیر، امیر پیش کرے یا غریب کبھی ہرگز قبول نہیں کرتے تھے، اور اگر کبھی کوئی اصرار کرتا تھا تو غصّہ میں بھبک کر اُس کو نہایت مغلظ گالیاں دینے لگتے تھے۔ نماز بے حد خشوع وخضوع سے پڑھتے اور تہجد تک کی پابندی کرتے تھے۔ کبھی کسی کے مکان پر نہیں گئے، ہمیشہ خانہ نشین رہے۔ اللھمّ اغفرلہ وارحمہ۔ [جولائی ۱۹۶۶ء]

خاں، مولانا بشیر احمد

مولانا بشیر احمد خاں

افسوس ہے پچھلے دنوں دارالعلوم دیوبند کے نہایت لائق وفائق اور مشہور استاذ مولانا بشیر احمد خاں صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا۔ مولانا ریاضیات اور ہیئت میں برِصغیر ہندوپاک کے علماء میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فقہ اور حدیث میں بھی اُن کی نظر وسیع تھی، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں ان فنون کی اونچی کتابیں اُن کے زیرِ درس رہتی تھیں اور کبھی کسی طالب علم نے اپنی بے اطمینانی کا اظہار نہیں کیا۔ علوم وفنون میں اس درجہ مہارت اور اُن میں شغف کے ساتھ مولانا میں نظم ونسق اور دنیوی معاملات ومسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کرنے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم تھی۔ اسی بناء پر چند ماہ ہوئے اُن کا انتخاب نائب مہتمم کے عہدہ کے لیے ہوا تھا۔ عمر اگرچہ ستّر (۷۰) کے لگ بھگ تھی، لیکن قویٰ مضبوط اور عام تندرستی بہت اچھی تھی۔ ۲۱/اگست کو مجلسِ عاملہ کی میٹنگ میں وہ شروع سے آخر تک شریک رہے اور اُس کا کبھی وہم بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ دو دن کے بعد ہی مولانا یک بیک راہی عالمِ بقا ہوجائیں گے۔ یوں بھی عابد مرتاض اور خندہ جبین وخوش اخلاق تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نوازشوں سے نوازے اور اُن کے درجات اونچے کرے آمین۔ [اکتوبر ۱۹۶۶ء]

خان، ڈاکٹر عبدالبصیر

ڈاکٹر عبدالبصیر خان

قاہرہ سے واپسی پر دوسری اندوہناک خبر اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبدالبصیر خان کی وفات حسرت آیات کی سُنی جو پہلی خبر سے کم دلدوز نہیں تھی۔ موصوف اپنے مضمون (ZOOLOGY) میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنے شعبہ کے صدر اور پروفیسر تھے، پراکٹر بھی رہ چکے تھے۔ طبعًا نہایت شریف، سچّے اور خدا ترس انسان تھے۔ مرنا ہر ایک کو ہے لیکن اُن کی وفات جن حالات میں ہوئی ہے وہ حددرجہ صبر آزما تھے، اس لیے ہمیں اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اُن کی موت صرف موت نہیں بلکہ شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صدیقین وشہداء کا مقامِ جلیل عطا فرمائے اور ان کی نوجوان بیوہ اور دو کمسن بچّوں کا حافظ وناصر اور نگہبان ہو، آمین۔ [نومبر ۱۹۶۶ء]

حسن، مولوی مجید

مولوی مجید حسن

افسوس ہے پچھلے دنوں مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ بجنور کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے اپنے اخبار کے ذریعہ ملک وملّت کی جو عظیم اور طویل خدمات انجام دی ہیں اُن کو ہندوستانی صحافت کی تاریخ کا کوئی طالبِ علم نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اُن کی پوری زندگی جدوجہد اور محنت ومشقت کی تفسیر تھی اور اس اعتبار سے وہ آج کل کے نوجوانوں کے لیے ایک لائقِ تقلید نمونہ تھے۔ علمائے دیوبند کے بڑے گرویدہ اور نہایت مخیّر وسیر چشم انسان تھے، اللہ تعالیٰ اُن کی قبر ٹھنڈی رکھے۔ [جنوری ۱۹۶۷ء]

پوتا، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

پوتا، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

بُرہان اور ندوۃ المصنّفین کے احباب کو یہ معلوم کرکے صدمہ ہوگا کہ گزشتہ ماہ دسمبر کی ۷/تاریخ کو مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کا اکلوتا پوتا دس برس کی عمر میں تین چار دن کی علالت کے بعد سب کو داغِ مفارقت دے گیا۔ بچّہ نہایت ذہین وطباع اور ہونہار تھا، تعلیم بھی بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہورہی تھی، ایک نہیں کئی کئی گھروں کا چشم وچراغ اور رونقِ خانہ تھا۔ موت برحق ہے لیکن اُس غنچۂ ناشگفتہ کو کیا کہیے جس نے عالمِ آب وگِل میں داخل ہوکر ابھی زندگی کا ارمان کیا ہی تھا کہ موت کے دستِ ستم نے اُس کو خوابِ عدم میں پہنچا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اجعلہ لنا اجراً وذخراً وشافعاً ومشفعاً۔

[جنوری ۱۹۶۷ء]

خاں، میر عثمان علی (نظام حیدرآباد)

میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد

افسوس ہے گزشتہ ماہ کی ۲۴/کو میر عثمان علی خاں نظام حیدآباد کا انتقال ہوگیا۔ وہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے جدّ امجد نے جو ریاست ۱۷۱۳ء میں قائم کی تھی اس کے ساتویں فرماں روا تھے۔ یہ ریاست تو انقلابِ روزگار اور حوادثِ ایام کے بہت سے مرحلوں سے گزرتی ہوئی ۱۹۵۶ء میں ختم ہوگئی تھی۔ نظام 'داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع' کی حیثیت سے اس ریاست کی یادگار تھے۔ اب یہ یادگار بھی مٹ گئی۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

مرحوم بحیثیت فرماں روا کے اور بحیثیت انسان کے بھی بڑی خوبیوں اور اوصاف وکمالات کے مالک تھے۔ ان کے عہد میں ریاست نے ہر شعبہ میں غیر معمولی ترقی کی علی الخصوص تعلیم اور علوم اسلامیہ کی نشرواشاعت اور اسلامی تہذیب وثقافت کی سرپرستی میں انھوں نے جو عظیم الشان کارنامے عثمانیہ یونیورسٹی، دائرۃ المعارف اور دارالترجمہ کی صورت میں انجام دیئے ہیں انہوں نے بغداد کی خلافت عباسیہ کی یاد تازہ کردی اور ہندوستان میں اسلامی ثقافت کا کوئی مورّخ انہیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان کا ابرِ کرم حیدرآباد سے باہر ہندوستان کے مختلف گوشوں پر بھی برستا رہا اور عرب وحجاز کی سرزمین پر بھی قطرہ افشاں ہوا۔ انہوں نے حیدرآباد کو ایک خاص قسم کا کلچر دیا جو بڑا حسین اور دل نواز تھا اور جس کی مٹی مٹائی کچھ یادگاریں اب بھی وہاں نظر آسکتی ہیں۔ ان کی شخصیت عجیب وغریب قسم کی مجموعہ اضداد اور اسی بنا پر ایک طلسم تھی۔ ایک طرف وہ دنیا کے سب سے بڑے دولتمند مشہور تھے اور قومی وتہذیبی معاملات میں نہایت فیاض اور سخی۔ لیکن دوسری جانب جہاں تک ذاتی اور نجی اخراجات کا تعلق ہے وہ اس درجہ سادہ اور کفایت شعار تھے کہ اس کے عجیب وغریب قصے اور کہانیاں زبان زدِ عوام وخواص تھے۔ اردو اور فارسی میں مشغلہ شعر گوئی کے ساتھ انہیں دین اور مذہب سے بھی لگاؤ تھا اور علماء کے بڑے قدردان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرما کر مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

[مارچ ۱۹۶۷ء]

اہلیہ، مولانا محمد انور شاہ الکشمیری

اہلیہ، مولانا محمد انور شاہ الکشمیری

حضرت الاستاذ مولانا محمد انور الکشمیری کے ہزاروں تلامذہ اورارادت مندوں کو جو برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ معلوم کر کے بڑا ملال ہوگا کہ حضرت موصوف کی اہلیہ جنھیں ہم سب ''اماں جی'' کہا کرتے تھے، جون کے آخری ہفتے میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس خاکدان سے رخصت ہوگئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ بڑی خوبیوں اوراعلیٰ صفات وکمال کی خاتون تھیں۔حضرت شاہ صاحب ایسے شوہر کی وفات کے بعد انھوں نے زندگی جس صبر ورضا اوراستقلال وتوکل کے ساتھ بسر کی ہے وہ انھی کا حصہ تھی۔کئی برس سے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔سعادت مند اولاد نے بڑے سے بڑے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا کے نہیں رکھی لیکن وہ کینسر ہی کیا جس سے مریض جانبر ہوجائے۔اس مرض سے مرحومہ نے جو غیر معمولی تکلیف برداشت کی ہیں وہ یقیناً ان کے لیے درجۂ شہادت کی ضامن ہیں۔ اپنی اولاد معنوی کے ساتھ وہی تعلق رکھتی تھیں جو خود حضرت الاستاذ کو تھا۔ان کا نفس وجود ہم لوگوں کے لیے سرمایۂ خیر وبرکت تھا۔ افسوس اب یہ بھی ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور صدیقین اورشہداء کا مقام عطا ہو۔آمین۔ [جولائی ۱۹۶۷ء]

رحمانی، خواجہ محمد علی شاہ

خواجہ محمد علی شاہ رحمانی

افسوس ہے کہ گزشتہ جون میں ''برہان'' کے خاص مضمون نگار اوررفیق خواجہ محمد علی شاہ صاحب رحمانی کی سہارنپور میں وفات ہوگئی۔مرحوم کی صحت عرصے سے ٹھیک نہیں تھی اس کے باوجود علمی ریسرچ کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہرالعلوم سہارنپور کے ممتاز فاضل تھے۔السنۂ مشرقیہ کی بھی بہت سی ڈگریاں ان کے پاس تھیں۔اکابر دیوبند خاص طور پر حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ اورحضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم سے والہانہ تعلق رکھتے تھے اوران حضرات کی علمی خصوصیات پران کی گہری نظر تھی۔ پختہ استعداد، واضح العقیدہ مسلمان تھے۔طبیعت میں قناعت اور خودداری کا جوہر نمایاں تھا۔ پوری زندگی گوشہ نشینی اور خدمت علم میں بسر کردی۔ جس روز ان کی رحلت ہوئی اسی روز کچھ دیر کے بعد ان کے والد ماجد کا سانحہ ارتحال پیش آ گیا۔ان کے والد صاحب خانقاہ رحمانی سہارنپور کے سجادہ نشین تھے اورعوام ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔رحمهما الله رحمة واسعة۔

[ستمبر ۱۹۶۷ء]

غریب، حاجی احمد

حاجی احمد غریب

دوسراافسوس ناک سانحہ جولائی میں حاجی احمد غریب صاحب کا ہوا۔حاجی صاحب بمبئی کے مشہور صاحب خیر تھے۔ملّی اوراجتماعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے۔حجاج کی خدمت سے عشق تھا، بمبئی کی انجمن خدام النبی کے روح رواں تھے۔صابوصدیق کا مسافرخانہ کا انتظام بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ابھی چندسال ہوئے اس تاریخی مسافرخانہ کی اوپر کی منزل بڑے اہتمام سے تعمیر کرائی تھی۔جمعیۃ العلماء ہند کے زیر اہتمام ۱۹۵۴ء میں جو دینی تعلیمی کنونشن بمبئی میں ہوا تھا اس کا اہتمام بھی مرحوم ہی نے کیا تھا۔

ندوۃ المصنفین سے بھی خاص تعلق رکھتے تھے اوراس کی خدمات کی قدر کرتے تھے۔ایک سال سے زیادہ ہوا کہ کراچی چلے گئے تھے، وہیں ۱۴/ جولائی کو اچانک دل کا دورہ ہوا اور جاں بحق ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اوران کے نیک دل بھائی حافظ محمد صدیق صاحب حجازی اورتمام متعلقین کو دولت صبر سے نوازے۔ [ستمبر ۱۹۶۷ء]

ندوی، مولانا مسعود علی

مولانا مسعود علی ندوی

افسوس ہے گزشتہ ماہ اگست کی ۲۷ کو مولانا مسعود علی صاحب ندوی اسّی (۸۰) برس کی عمر میں کئی سال کی علالت وازکاررفتگی کے بعد رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔مرحوم ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل اورمولانا شبلی کے تلامذہ میں سے تھے۔دارالمصنفین اعظم گڑھ جو آج ایشیا کا عظیم الشان اسلامیات کا ادارہ ہے اُس کے علمی سربراہ اورروح رواں اگر مولانا سید سلیمان ندوی تھے تو تنظیمی اور تعمیری حیثیت سے مرحوم اس کے میرکارواں تھے۔ قدرت نے انھیں انتظامی صلاحیتیں اعلیٰ درجہ کی بخشی تھیں اورانھوں نے ان صلاحیتوں کو دارالمصنفین کے لیے وقف کردیا تھا۔ چنانچہ ادارہ کی مطبوعات کی اعلیٰ کتابت وطباعت، اُس کی شاندار اورخوشنما تعمیرات اورکاروباری حیثیت سے اُس کا خودکفیل ہونا، یہ سب مرحوم کی کوششوں اورحسن سلیقہ وانتظام کا نتیجہ ہے۔یوں بھی بڑے خوش مزاج،

مہمان نواز اور موقع شناس انسان تھے۔ ملک کے مشہور ہندو مسلم زعما سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ادھر چند برسوں سے مسلسل علالت کے باعث عضو معطل سے ہوگئے تھے۔ لیکن جب تک دارالمصنفین قائم ہے اُن کا نام زندہ اور روشن رہے گا۔ اللہ تعالیٰ انھیں مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

[اکتوبر ۱۹۶۷ء]

وصی اللہ، مولانا شاہ

مولانا شاہ وصی اللہ

آہ کیوں کر کہیے کہ ۲۵/نومبر کو حج وزیارت حرمین شریفین کو جاتے ہوئے مظفری جہاز میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحب بھی رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات کے وقت عمر ۷۵ برس تھی۔ علوم دینیہ واسلامیہ کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی تھی اور حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ جن حضرات نے مولانا کا یہ زمانہ دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی رشد وہدایت کے آثار طالع روشن سے ہویدا تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بزرگ نے فرمایا بھی تھا کہ اگر کسی کو مادرزاد ولی دیکھنا ہو تو وصی اللہ کو دیکھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی حضرت تھانویؒ کی خدمت میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ آخر کار یہ رنگ اس درجہ غالب ہوا کہ برسوں کی ریاضت اور محنت ومشقت کے بعد اپنے پیرومرشد کے نہایت ممتاز خلیفہ اور جانشین ہوگئے۔ شروع میں آپ کا مرکزِ ارشاد وہدایت فتح پور تھا۔ پھر الہٰ آباد منتقل ہوگئے اور اب گذشتہ چند برسوں سے بمبئی میں بھی قیام رہنے لگا تھا۔ آپ جس درجہ کے عارف باللہ اور محرم اسرار طریقت تھے اُسی درجہ کے عالم اور مبصر علوم دینیہ واسلامیہ بھی تھے۔ قرآن مجید سے طبعاً بڑا شغف تھا اور تفسیر آپ کا خاص فن تھا، چنانچہ روزمرہ کے معمولات میں درس قرآن بھی شامل تھا جس کی پابندی سے سختی فرماتے تھے اور اوراد و وظائف اور ارشاد وہدایت کے دوسرے مشاغل کے ساتھ مطالعہ کتب کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا یہاں تک کہ سفر میں بھی کتابوں کا بکس ساتھ چلتا تھا، درس یا گفتگو میں کوئی بات بغیر حوالہ کے نہیں فرماتے تھے۔

شاہ صاحب کو معمولی سے معمولی باتوں میں اتباع سنت نبوی اور تعمیل شریعت کا اہتمام رہتا تھا۔ درحقیقت آپ کا تصوف بجز اُس احسان کے کچھ اور نہ تھا جس کی تعریف میں زبان وحی ترجمان سے ارشاد ہوا: ان تعبدالله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔

اسی بنا پر حضرت مرحوم کے ہاں طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ وہ شریعت کے احکام پر ہی زیادہ یقین اور پختگی واستواری کے ساتھ عمل کرنے کا نام ہے۔ اسی کا نام تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن ہے اور پیغمبروں کی بعثت و دعوت کا مقصد اساسی بھی یہی ہے۔ شاہ صاحب کے شب وروز اسی دعوت اور اسی کی تعلیم وتربیت کے لیے وقف تھے۔ اصلاح نفس اس انداز سے فرماتے تھے کہ مریض کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور اچھا ہوجاتا تھا۔ کتنے ہی واقعات ہمارے علم میں ہیں کہ بڑے سے بڑا منکر خدا ومذہب آپ کے سامنے آیا اور آپ نے ابھی اسے صرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا کہ تائب ہوکر مومن راسخ بن گیا۔

فروری ۱۹۶۵ء میں چند روز کے لیے علی گڑھ بھی تشریف لائے تھے۔ ایک روز سہ پہر کو حاضر خدمت ہوا۔ آپ کو اطلاع ہوئی تو فوراً اندر بلالیا، کمرہ میں داخل ہوا تو سینہ سے لگالیا اور کچھ پڑھتے رہے پھر میری گردن کو بوسہ دیا اور لے کر بیٹھ گئے۔ کمرہ میں اُس وقت جو لوگ موجود تھے ان کو میرے پہنچتے ہی باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ کم وبیش ۲۰ منٹ گفتگو ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد چائے اور مٹھائی وغیرہ طلب فرمائی۔ زندگی میں حضرت شاہ صاحب سے میری یہ پہلی ملاقات بھی تھی اور آخری بھی۔ لیکن اس وقت سے لے کر حج کے لیے روانگی تک اس گناہ گار پر پیہم الطاف وعنایات اور توجہات خصوصی کی جو بارش ہوتی رہی ہے اور جس کے شاہد عینی حضرت کے مرید خاص اور میرے نہایت عزیز دوست حکیم سید افہام اللہ صاحب ریڈر طبیہ کالج علی گڑھ رہے ہیں وہ میری حیات مستعار کا سرمایۂ سعادت و افتخار ہے۔ آہ صد افسوس! اب یہ غیر معمولی توجہ وشفقت بزرگانہ کہاں ملے گی! نور الله ضريحه وطاب ثراه۔ [دسمبر ۱۹۶۷ء]

بلیاوی، علامہ محمد ابراہیم

علامہ محمد ابراہیم بلیاوی

واحسرتا! حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی وفات حسرت آیات کے ٹھیک ایک ماہ بعد یعنی ۲۷ر دسمبر کو دن میں گیارہ بجے کے قریب ہمارے نہایت شفیق استاذ، دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور ناظمِ تعلیمات علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بھی واصل بحق ہوگئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ عمر ۸۵ برس تھی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے دارالعلوم دیوبند سے متعلق تھے اور شروع سے اکابر اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ حضرت مرحوم کا خاص فن جس میں بے شبہ وہ امامت کا مقام رکھتے تھے، منطق تھا۔ خوش قسمتی سے راقم الحروف نے دارالعلوم

دیوبند میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم اُن اساتذہ سے حاصل کی ہے جن میں سے ہرایک اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھا۔ چنانچہ فلسفہ میں صدرا اور شمس بازغہ مولانا رسول خاں صاحب سے پڑھیں اور منطق کی اعلیٰ کتابوں میر زاہد ملا جلال، حمداللہ اور قاضی کا درس مولانا محمد ابراہیم صاحب سے لیا۔ اُس زمانہ میں ان دونوں حضرات کی مہارتِ فن وجلالتِ علم کا طوطی بولتا تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ مولانا رسول خاں صاحب پر فن حاوی تھا اور علامۂ مرحوم فن پر حاوی تھے۔ چنانچہ وہ دن آج بھی آنکھوں میں گھوم رہے ہیں کہ حمداللہ یا قاضی کا درس ہورہا ہے، کوئی طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے، حضرت علامہ عمامہ برسر اور چادر یا شال دربر پلونتھی مارے بیٹھے ہیں۔ اور اُس تبسم کے ساتھ جو چہرہ پر ہروقت کھیلتا رہتا تھا، پان چبارہے ہیں، کتاب سامنے تپائی پر رکھی ضرور ہے لیکن نگاہ اُس پر نہیں ہے اور اگر کبھی ہے بھی تو بس اُڑتی سی۔ ادھر طالب علم نے عبارت پڑھنی ختم کی اور ادھر آپ نے تقریر شروع کی۔ زیر بحث مسئلہ وجود کا ہو یا علم کا یا جعل بسیط اور جعل مرکب کا، غرض کہ مبحث کیسا ہی دقیق اور غامض ہو، تقریر بہرحال سکون واطمینان اور کامل خوداعتمادی کے ساتھ ہوتی تھی۔ زبان نہایت شُستہ اور لب ولہجہ بے حد پُروقار، اگرچہ ظرافت سے خالی نہیں لیکن وسعت اور دقتِ فکر ونظر کا یہ عالم! معلوم ہوتا تھا ایک بحرِ بیکرانِ علم موجزن ہے۔ پہلے جو کچھ مصنف نے کہا ہے اور جو کتاب میں ہے اُس کا مطلب بیان فرماتے تھے، اس کے بعد مسئلہ زیر بحث کے متعلق متقدمین اور متاخرین کی آرا مع تمام دلائل وبراہین کے اور آخر میں خود اپنی رائے اور فیصلہ نہایت مدلل ومبرہن طور پر ظاہر کرتے تھے۔ بسا اوقات ایک ہی مسئلہ پر کئی کئی روز مسلسل تقریر ہوتی تھی۔

اگرچہ حضرت الاستاذ کی شہرت منطق میں تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علوم عقلیہ کی طرح علوم دینیہ میں بھی بنوغ ونفوذ کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ حدیث اور فقہ کی انتہائی اور آخری کتابوں کا درس دینا شروع کیا تو اس میں بھی وہی کمال کر دکھایا۔ راقم الحروف کو جب کبھی کوئی علمی اشکال پیش آتا تھا تو آپ کی ہی طرف رجوع کرتا تھا اور آپ چٹکی بجاتے میں اس طرح اسے حل فرمادیتے تھے کہ دل میں کوئی خلش باقی نہیں رہتی تھی۔ ابھی ڈیڑھ دو برس پہلے کی بات ہے ایک دن صبح کو ناشتہ ساتھ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا حضرت! جن مقامات پر سورج کئی کئی مہینہ کے بعد طلوع ہوتا ہے وہاں پنج وقتہ نماز ادا کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ وقت نماز کے لیے سبب وجوب ادا ہے تو جب سبب ہی نہیں تو وجوب کس طرح ہوسکتا ہے؟ میں ہکا بکا رہ گیا جب حضرت الاستاذ نے جواب میں فوراً فرمایا ''وقت'' سبب کہاں ہے؟ صرف ایک علامت ہے اور فقدان علامت سے ذی علامت کا فقدان لازم نہیں آتا۔

اب ادھر عرصۂ دراز سے حدیث اور تفسیر کے ساتھ اشتغال زیادہ ہوگیا تھا، انھیں کا درس دیتے تھے اور انھیں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ انابت الی اللہ اور روحانی کمالات ومزایا کی طرف بھی توجہ زیادہ ہوگئی تھی۔ طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، خوش طبع اور فیاض وسیر چشم تھے۔ خوش خوراک اور خوش غذا بھی تھے، آئے دن دعوتیں کرتے رہتے تھے اور وہ بھی بہت پرتکلف۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں فرد تھے، کوئی کیسا ہی منطق قسم کا آدمی ہو اُن کے سامنے پیش نہیں جاسکتی تھی۔ دیوبند کے حلقہ میں ہمیں نہیں معلوم کہ اُن کے سوا کسی اور کو بھی ''علامہ'' کے لقب سے عام طور پر پکارا یا دکھایا گیا ہو۔ ان کی وفات سے اکابر دارالعلوم کی ایک نسل کا خاتمہ ہوگیا اور اس سے مدرسہ کو جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی ناممکن ہے۔

عمر اگرچہ نوے (۹۰) کے پیٹے میں تھی لیکن قویٰ اب بھی اچھے تھے۔ درس بھی دیتے تھے اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے انتظامی امور بھی سرانجام دیتے تھے۔ شوریٰ کے جلسوں میں گھنٹوں بیٹھے رہتے اور اُس کی کاروائی میں شروع سے آخر تک پوری حاضر حواسی کے ساتھ شریک رہتے تھے اور دوسرے معمولات بھی جاری تھے۔ ۲۶/نومبر سے شوریٰ کا جلسہ شروع ہورہا تھا اُس میں شرکت کی غرض سے ہم ۲۵/کو ہی دیوبند پہنچ گئے تھے اور وہاں ظہر کی نماز کے بعد ایک کمیٹی کی میٹنگ میں بیٹھے تھے کہ اچانک حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی وفات کا ٹیلیگرام بمبئی سے وصول ہوا۔ حضرت الاستاذ کو مکان پر جب یہ اطلاع پہنچی تو حضرت شاہ صاحب کے ساتھ غایت درجہ کے روحانی اور باطنی تعلق کے باعث آپ پر اس کا بہت غیر معمولی اثر ہوا اور صاحبِ فراش ہوگئے۔ چنانچہ شوریٰ کا جلسہ تین دن تک رہا مگر آپ کسی ایک نشست میں بھی شریک نہ ہوسکے۔ بہ ظاہر اسباب شاہ صاحب کا حادثۂ وفات ہے۔ حضرت الاستاذ کی صحت کے اچانک سقوط، حملۂ فالج اور پھر موت کا سبب ہوا ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً وجعل الجنۃ مثواہ۔ [جنوری ۱۹۶۸ء]

ابراہیم، حافظ محمد

حافظ محمد ابراہیم

افسوس ہے جنوری کے تیسرے ہفتہ میں حافظ محمد ابراہیم صاحب ایک طویل علالت کے دہلی میں وفات پاگئے۔ نماز جنازہ شاہ جہانی جامع مسجد میں

پڑھی گئی اوراس کے بعد تدفین نگینہ میں ہوئی۔انتقال کے وقت عمر ۷۷۔ ۷۸ برس کی ہوگی۔ مرحوم علی گڑھ کی پرانی نسل کے ایک فرد تھے۔یہیں فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین کے ساتھ بی۔اے اورپھرایل۔ایل۔بی کیا۔اپنی ذہانت،طباعی اور لیاقت کے باعث اساتذہ اورطلباء میں ہمیشہ نیک نام اورہر دل عزیز رہے۔ دیوبند کے مکتبۂ فکر کے زیراثر قوم پرورانہ خیالات اور جذبات شروع سے رکھتے تھے۔ چنانچہ جن لوگوں نے مرحوم کا عہد طالب علمی دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ مرحوم اس زمانہ میں بھی سرسید کے سیاسی افکار کے مخالف تھے اور اس پر اپنے ساتھیوں سے محبت کرتے تھے۔علی گڑھ سے فراغت کے بعد اپنے وطن نگینہ میں پریکٹس شروع کی اورایڈوکیٹ کی حیثیت سے بہت جلد صوبہ بھر میں مشہور ہوگئے لیکن نیشنلسٹ فطرتاً تھے۔اس لیے تحریک موالات شروع ہوئی تو اُس میں بڑھ چڑھ کرحصہ لیااور پھر جنگ آزادی کا دورآیا تو ہمیشہ اُس کے ہراوّل دستہ میں رہے۔اس سلسلہ میں جیل گئے اوردوسری پریشانیاں بھی اٹھائیں لیکن پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔ پھر جب قومی وزارتوں کا عہد شروع ہوا تو پہلے اتر پردیش میں اور پھر مرکز میں وزیر رہے،آخر میں پنجاب کے گورنر تھے۔ بیماری کے باعث اس سے مستعفی ہوکرگھر آ بیٹھے تھے اوریہی بیماری آخرجان لیوا ثابت ہوئی۔ نہایت خوش خلق، مہمان نواز اور فیاض و سیرچشم تھے۔اللہ تعالیٰ مغفرت ورحمت کی نعمتوں سے سرفرازفرمائے۔آمین [فروری ۱۹۶۸ء]

<u>عبدالباقی</u>

عبدالباقی

۲۵رفروری کے الجمعیۃ میں پہلےصفحہ کی پہلی اور نمایاں خبر میں عبدالباقی، مدیر ہفت روزہ ''کاروانِ وطن'' کے حادثۂ وفات کی اطلاع اچانک پڑھی تو جی دھک سے ہوکر رہ گیا۔اب ادھرتیس بتیس برس سے تو ہم دونوں ایسے تھے کہ گویا کبھی رسم و راہ ہی نہیں تھی۔ برس دو برس میں راہ چلتے یاکسی پارٹی یاجلسہ میں مڈبھیڑ ہوگئی تورسمی طور پرعلیک سلیک اورمزاج پرسی ہوئی اور ہم دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔چنانچہ اسی نوع کی مرحوم سے آخری ملاقات پچھلے دنوں جامعہ اسلامیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ہوئی تھی۔جلسہ کے ختم پرعصرانہ کاانتظام تھا۔صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب ایک چھوٹے سے شامیانہ کے نیچے جامعہ کے وائس چانسلر مجیب صاحب اوردوچار اورمعززمہمانوں کے ساتھ چائے نوشی سے فارغ ہوکر جب اپنے پرانے دوستوں، رفقائے کاراور ہم چشموں کے ساتھ میل ملاقات کی غرض سے مجمع عام میں داخل ہوئے تو عبدالباقی مرحوم میرے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ذاکر صاحب نے پہلے مجھ سے مصافحہ کیا اور خیریت پوچھی، پھرباقی صاحب کی طرف فرشتوں کی سی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ متوجہ ہوئے۔مصافحہ کیا اور دریافت فرمایا:''کہیے باقی صاحب !آج کل آپ کیا کر رہے ہیں''۔باقی صاحب ایک نیم خنداں کیفیت کے ساتھ بولے ! ''ایک ہفت روزہ اخبارنکال رہاہوں،''کاروانِ وطن''اس کا نام ہے''۔ یہ سن کر ذاکرصاحب آگے بڑھ گئے۔تھوڑی دیر کے بعدمجمع منتشر ہوگیااورسب اپنی اپنی راہ چل پڑے۔اُس وقت خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ باقی صاحب سےآخری بازدیداورملاقات ہے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ہاں تواِدھرتیس پینتیس برس سے مرحوم سے جان پہچان کچھ واجبی سی رہ گئی تھی۔ ورنہ اس سےقبل جب کہ وہ نئے نئے میدانِ صحافت میں اُترے تھے ہم دونوں اور تیسرے عبدالوحید صدیقی جوآج کل اُردو ڈائجسٹ ''ہُما'' کے منیجنگ پرو پرائٹر ہیں۔ایک دوسرے کےخصوصی دوست اور ہم پیالہ وہم نوالہ ساتھی تھے عبدالباقی وطناً بہاری تھے۔میرے نزدیک چہرہ پرملاحت اور بھولا پن اورطبیعت میں جودت وذہانت بہارکےلوگوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔عبدالباقی کوبھی ان سے بہرہ وافر ملاتھا۔اگرچہ جسمانی فربہی بحدّ افراط تھی لیکن اس کے باوجود یہ شخص ذہانت اورطباعی کا پتلا تھااور کام کرنے پرجب آجاتا تھاتو ایک ہی نشست کےساتھ کرسی پربیٹھاہواگھنٹوں مسلسل کام کرتا رہتا تھا۔تعلیم تمام تر جامعہ ملیہ میں پائی تھی اوراسی لیے نام کے ساتھ بی۔اے (جامعی) لکھتے تھے،جامعہ نے اچھے اچھے اربابِ قلم پیدا کیے ہیں۔لیکن عبدالباقی اُن چند اربابِ قلم میں سے تھے جوجامعہ کی قبائے افتخار کاتکمۂ زرّیں کہے جاسکتے ہیں۔یوں توانگریزی میں بھی لکھتے لکھاتے تھے لیکن اُردو میں ان کا ایک خاص نہج اور اسلوب تھا۔منطقی استدلال،معلومات کی فراوانی اورحُسنِ ترتیب کے ساتھ عبارت اس درجہ پرزور، ولولہ انگیز، شگفتہ اور بیساختہ ہوتی تھی کہ لوگ پڑھتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ مرحوم نے صحافتی تربیت لاہور میں مولانا ظفرعلی خاں مرحوم کے زیرسایہ پائی تھی، اوریہیں سےاپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیاتھا۔یہ اُس عہد میمنت عہد کی بات ہے جبکہ میں جان دادۂ دلفریبیٔ لاہور تھا۔سال بھرمیں ایک مرتبہ پندرہ بیس دن کے لیے یہاں آنا تولازمی تھاہی۔اس کے علاوہ ذراساکوئی بہانہ درکارتھا کوئی موقع ہوا اور لاہور پہنچا۔خواہ چند گھنٹوں کے لیے ہی ہو۔پھر یہ ناممکن تھا کہ کسی دن میں لاہور میں ہوں اورعصر کے بعدنگینہ بیکری میں احباب کے ساتھ چائے پی کر

سیر و تفریح کے لیے لارنس گارڈن نہ جاؤں۔ انھیں دِنوں میں عبدالباقی سے ملاقات ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ ملاقات گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ یہیں میں نے ان کا وہ زمانہ دیکھا جبکہ ''زمیندار'' کی ادارت سے سبکدوش ہوکر انھوں نے اپنا روز نامہ ''آزاد'' نکالا ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ اخبار نویسی کی دنیا میں ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔ ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' پنجاب کی فضا پر چھائے ہوئے تھے اور ظفر علی خاں اگرچہ بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن قلم میں جوانی کے کس بل اب بھی موجود تھے۔ پھر غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کے نام کا طوطی الگ بول رہا تھا۔ بایں ہمہ عبدالباقی کا ''آزاد'' کچھ اس طنطنہ اور طمطراق کے ساتھ نکلا کہ نگاہیں خیرہ ہوگئیں اور بڑے بڑے چراغوں کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ لیکن ''آزاد'' جس شدّت و حدت کے ساتھ چمکا تھا اتنا ہی ''شعلۂ مستعجل'' ثابت ہوا۔ اور جلد ہی بند ہوگیا۔ اب کسی نے کہا کہ مینجمنٹ بہت ناقص تھا وہ آمد و خرچ میں توازن قائم نہیں رکھ سکا، کوئی بولا ''مالیہ میں غبن فاحش ہوا ہے''۔ اور کسی کسی کی زبان سے یہ بھی نکلا کہ لاہور کی پنجابی ٹولی جو اس سے پہلے سیماب اور ساغر کو نہ جمنے دے سکی تھی عبدالباقی اور اس کے ''آزاد'' کو بھی برداشت نہ کر سکی اور سازش کر کے اخبار کو بند کرا کے ہی دم لیا۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں، اصل حقیقت کیا تھی؟ اللہُ اعلم و علمہٗ اَتَمّ۔

اب آزاد کیا بند ہوا، عبدالباقی پر لاہور کی زمین ہی تنگ ہوگئی، انھوں نے اب دہلی میں پڑاؤ ڈالا، جہاں وہ ایک پناہ گزین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے ان کا یہ دور بہت قریب سے دیکھا ہے۔ عسرت اور تہی دستی کا یہ عالم تھا کہ خدا کی پناہ! نہ پیٹ بھرنے کو آذوقہ اور نہ سر چھپانے کو مکان، وہ تھے اور ایک ان کی بیوی اور دس بارہ برس کا شاید ان کا بھتیجہ عبدالمقیت نام! میرے اور مرحوم کے ایک مشترک دوست کا گھر ان کا پناہ گاہ تھا۔ اس کے بعد میرا ان کا ساتھ نہیں رہا۔ اس لیے تفصیلاً نہیں بتا سکتا کہ کہاں رہے اور کیا کیا کرتے رہے۔ البتہ اجمالاً اسی قدر معلوم ہے کہ انھوں نے کچھ دنوں کے لیے بہار میں سرکاری نوکری بھی کر لی تھی۔ لیکن زندگی کا عام ڈھنگ یہ ہی بن گیا تھا کہ اجرت پر اخباروں اور رسالوں کے لیے مضامین لکھتے تھے۔ اُردو میں، اور انگریزی میں بھی۔ کبھی کبھی اپنا اخبار بھی نکالتے تھے۔ کبھی کسی اخبار یا رسالے سے ملازمت کا تعلق بھی پیدا کر لیتے تھے۔ اپنے خیالات میں بڑے سخت تھے لیکن طبیعت میں تلوّن اور عدم استقلال تھا، اس لیے جم کر کسی ایک جگہ بھی نہیں رہے۔ پھر مزاج اس درجہ قلندرانہ اور غمِ فردا سے بے نیاز تھا کہ جو کچھ ملا اڑا دیا۔ خود کھانے کے حد درجہ شوقین تھے۔ کل کیا ہوگا؟ اس کی انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے معاشی اعتبار سے ہمیشہ پریشان حال رہے۔

عبدالباقی اس درجہ کے صحافی، ادیب اور نقّاد تھے کہ اگر وہ پاکستان میں ہوتے یا یہاں رہ کر ہندی میں لکھتے ہوتے یا انگلینڈ کے کسی اخبار سے منسلک ہوکر انگریزی میں ہی لکھتے تو مالا مال ہوجاتے، ان کے پاس ایک بلڈنگ بھی ہوتی اور موٹر کار بھی۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کا یہاں تعلق اُردو اخبار نویسوں کے اُس بدنصیب اور قابلِ رحم طبقہ سے تھا جو ہزار ہا ہزار صفحات لکھ کر ادب و انشاء، سیاست و مذہب، علم و فن و مزاح کے چمن میں نئے نئے پھول کھلاتا ہے لیکن نہ تاریخِ ادبِ اُردو میں اُن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ نہ ان کے مضامین کا انتخاب کہیں چھپتا ہے، نہ سماج میں ان کو وہ مقام ملتا ہے جو ایک لیڈر کے لیے مخصوص ہے۔ جب تک ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں اور دماغ کام کرنے کے قابل ہے لوگ ان کے مضامین پڑھتے اور واہ واہ کرتے ہیں۔ لیکن اِدھر اخبار ردّی خریدنے والے کے نذر ہوجاتے ہیں اور اُدھر جب اُن پر بڑھاپا آیا اور از کار رفتہ ہوگئے پھر کوئی ان کو اور ان کے بچّوں کو پوچھتا بھی نہیں۔ اور ان کے پاس اتنا اندوختہ اور پس انداز ہوتا نہیں کہ اس کے سہارے زندگی کے یہ دن بِتا دیں۔ غرض کہ یہ وہ مظلوم طبقہ ہے جو اپنی جوانی اور صحت کو قوم کی خاطر لُٹا دینے کے باوجود محروم کا محروم رہتا ہے۔ نہ اسے بقائے دوام ملتی ہے اور نہ معاشی رفاہیت اسے نصیب ہوتی ہے۔ سرمایہ دار اس کی محنت سے سونے اور چاندی سے کھیلتے ہیں اور اس کے لیے بڑھاپے میں جوانی کے ماتم کے سوا کوئی اور مشغلہ نہیں ہوتا۔

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

عبدالباقی اسی بدنصیب طبقہ کا ایک فرد تھا، وہ دنیا سے رخصت ہوگیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ کیسی کیسی حسرتیں، تمنّائیں اور آرزوئیں اپنے ساتھ لے گیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

[مارچ ۱۹۶۸ء]

شاہدی، پرویز

پرویز شاہدی

افسوس ہے کہ گزشتہ مئی میں اردو کے مشہور شاعر پرویز شاہدی کلکتہ میں انتقال کر گئے۔ عمر ۵۷ برس کی پائی۔ اصل نام محمد اکرام حسین تھا۔ نسباً سید تھے، وطن پٹنہ تھا اور ۱۹۱۰ء میں وہیں پیدا ہوئے تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں

ایم۔اے کیا تھا۔اسی زمانہ میں کسی جذباتی صدمہ سے دوچار ہوئے اور کلکتہ میں سکونت اختیار کرلی ادھر بارہ تیرہ برس سے کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر تھے اور اُن کی وجہ سے اس شعبہ میں جیسے زندگی کی نئی روح پیدا ہوگئی تھی۔شعر گوئی کا ملکہ فطری تھا، چنانچہ اُن کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ دس برس کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔انھیں قدرت تو دونوں پر تھی لیکن ان کو فطری مناسبت بہ نسبت نظم کے غزل سے زیادہ تھی۔یہاں تک کہ اُن کی نظم بھی غزل کا آہنگ رکھتی تھی۔اپنی عمر اور شاعری دونوں کے عہد شباب میں ''ترقی پسند'' ہوگئے تھے لیکن چونکہ طبیعت میں سلامتی اور ذوق میں استواری تھی اس لیے اُن کی ''ترقی پسندی'' صرف افکار تک محدود رہی۔شاعری اور خصوصاً غزل کی قدیم روایات سے انھوں نے رشتہ منقطع نہیں کیا۔جتنے اچھے شاعر تھے ترنم بھی اتنا ہی ولولہ انگیز اور موثر تھا۔کلکتہ میں جب پہلی بار (غالباً ۱۹۴۹ء میں) اُن کی معرکہ آراء نظم ''تضاد''

میں عدوئے قہرمانی تو رفیق شہریاری
مری زندگی جہادی تری زندگی فراری
تجھے خار و خس کی سطوت پہ یقین پائداری
مرے ہر نفس میں رقصاں مرا عزم شعلہ باری
تری آنکھیں سہمی سہمی تری فکر لرزی لرزی
مری روح بپھری بپھری کہ لگائے ضرب کاری

سنی ہے تو پورے مجمع میں جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ گویا طبل جنگ بج چکا ہے اور فوج مارچ کرنے والی ہے، یہی واقعہ میری اور اُن کی دوستی کا نقطۂ آغاز تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دوستی اس درجہ مستحکم اور مضبوط ہوتی چلی گئی کہ وہ میرے نہایت عزیز اور مخلص دوست ہوگئے۔جنوری ۱۹۶۷ء میں چند روز کے لیے میں کلکتہ گیا اور اُن کو اس کا علم ہوا تو کہلا بھیجا کہ میں آج کل صاحب فراش ہوں خود نہیں آسکتا لیکن تم مجھے آکر اپنی صورت ضرور دکھا جاؤ۔چنانچہ میں گیا تو بستر سے بمشکل تمام اُٹھ کر سینہ سے لپٹ گئے۔بس یہ میری اور اُن کی آخری ملاقات تھی۔

اُن کے کلام کا ایک مجموعہ ''رقص حیات'' کے نام سے عرصہ ہوا چھپا تھا لیکن ضرورت ہے کہ انجمن ترقی اردو یا کوئی اور ادارہ ان کا تمام کلام خاطر خواہ اہتمام و انتظام سے شایع کرے۔پرویز کی شاعری صرف ایک نغمہ دلنواز نہیں بلکہ کاروان حیات کے لیے بانگ درا بھی ہے۔ [جولائی ۱۹۶۸ء]

یوسفی، مظفر شاہ خاں

مظفر شاہ خاں یوسفی

سخت افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ ہمارے عزیز دوست اور ندوۃ المصنفین کے پُرانے رفیق مظفر شاہ خاں صاحب یوسفی اچانک راہی ملک بقا ہوگئے۔موصوف کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہوگی۔صحت بہت عمدہ تھی اور مضبوط توانا جسم رکھتے تھے۔شب کے کسی حصّہ میں کچھ کرب و بے چینی محسوس ہوئی، پلنگ سے اُٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگے، اسی عالم میں گر پڑے اور بیہوش ہوگئے اور صبح تک جان جان آفریں کے سپرد کردی۔مرحوم بڑے قابل اور لائق فائق تھے۔اُردو اور ہندی دونوں میں ایم۔اے تھے، روسی زبان کا امتحان بھی اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا تھا۔اُردو اور ہندی کے شگفتہ نگار ادیب تھے۔تقسیم سے پہلے اُن کی دو کتابیں ادارہ سے شائع ہوئی تھیں، ایک عرصہ سے ماہنامہ ''آجکل'' کے عملہ ادارت سے وابستہ تھے۔اسی درمیان میں ایک اسکالرشپ پر دو برس امریکہ میں بھی رہ آئے تھے اور وہاں سے واپسی پر کناڈا، تمام یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی سیاحت کرتے ہوئے وطن پہنچے تھے اور اب پھر دوبارہ ڈاکٹریٹ کے لیے امریکہ جانے والے تھے کہ آخرت کا سفر پیش آگیا۔اخلاقی اعتبار سے نہایت شریف، بڑے دوست نواز، ملنسار اور خلیق ومتواضع اور شائستہ اطوار تھے۔اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے اور اُن کے بچّوں وبیوہ کا حامی وناصر ہو۔آمین۔

[اگست ۱۹۶۸ء]

کیرانوی، مولانا محمد جلیل

مولانا محمد جلیل کیرانوی

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ اگست میں حضرت شیخ الہندؒ کے دو منتسبین، مولانا محمد جلیل کیرانوی استاذ اور مولانا محمد مبارک علی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند واصل بحق ہوکر اس جہانِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔اوّل الذکر (المتولد ۱۳۱۸ھ) نے اگرچہ دورۂ حدیث حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کے عہد میں تمام کیا تھا لیکن درحقیقت پروردہ تھے حضرت شیخ الہند کے گھرانے کے ہی۔نو برس کی عمر تھی کہ اُن کے والد حضرتؒ کے سپرد کر گئے تھے۔یہ اس آستانۂ قدس کو ایسے چمٹے کہ مرتے دم تک اسے نہ چھوڑا۔اس لیے حضرت شیخ الہند کے خادم خاص اور شریکِ جلوت وخلوت تھے اس بناء پر حضرت شیخ الہند کی مشہور ''ریشمی خطوط'' والی تحریک کے جزوکل سے خوب واقف اور اس کے محرمِ

اسرار تھے۔اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے بڑے مصائب اورشدائد برداشت کئے لیکن تحریک کا بھید آشکارنہیں کیا۔حضرتؒ کی وفات کے بعد ادہر ادہرمدرس رہے۔آخرمیں دیو بندآ گئے تھے اوردرس کی خدمات انجام دیتے تھے۔

[ستمبر۱۹۶۸ء]

علی،مولانا محمد مبارک

مولانا محمد مبارک علی

مولانا محمد مبارک علی صاحب جن کی عمرچھیاسی برس کے قریب ہوگی حضرت شیخ الہند کے شاگردِ خاص اورآپ سے بیعت بھی تھے اورحضرت کی اسارتِ مالٹا کے بعد حضرت الاستاذ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے تجدیدِ بیعت کرلی تھی اورحضرت مفتی صاحب کے خدام خاص میں شامل ہوکرحضرت موصوف ہی سے طریقہ نقشبندی میں اجازت بیعت و ارشاد حاصل کی۔ایک عرصہ تک ٹونک میں صدرمفتی رہے اورریشمی خطوط کی تحریک سے بھی تعلق خاص رہا۔ غالباً ۱۹۱۹ء میں مدراس (پرناہٹ) تشریف لے گئے تھے اورپھر بریلی کے قدیم مدرسہ مصباح العلوم میں صدارت درس کی خدمت انجام دی۔اب کم وبیش اڑتیس سال سے دارالعلوم دیوبند میں نائب مہتم کے عہدہ پرفائز تھے۔اہتمام و انتظام میں دسترس کے علاوہ کبھی کبھی حدیث کی کسی کتاب کا درس بھی دیتے تھے۔ تقویٰ وطہارت اوراخلاق وشمائل کے لحاظ سے سلف صالحین کا نمونہ اورمثال تھے۔صدحیف!دنیااب ایسے حضرات سے خالی ہوتی جارہی ہے۔تغمد ھمااللہ بمغفرته ورحمته ۔ [ستمبر۱۹۶۸ء]

ندوی،پروفیسرنجیب اشرف

پروفیسرنجیب اشرف ندوی

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں ممبئی میں پروفیسرنجیب اشرف ندوی کا اور کراچی میں مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی کا انتقال ہوگیا۔پروفیسر اشرف کا اُٹھان بڑا شاندارتھا اُنھوں نے معارف میں جومقالات لکھے تھے اور رقعات عالمگیری کی تحقیق وترتیب اوراُس پرمستقل ایک جلد میں مقدمہ لکھ کر انھوں نے جس قابلیت کا ثبوت دیا تھا اُس کی وجہ سے ان سے بڑی توقعات تھیں۔لیکن احمد آباداور پھرممبئی کی آب وہوانے ان کو بجھا سا دیا تھا پھر بھی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے ڈائرکٹراورانجمن کے سہ ماہی رسالہ ''نوائے ادب'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی علمی وادبی سرگرمیاں کسی نہ کسی صورت میں جاری رہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہی انھوں نے ''لغت گجری'' ترتیب دی تھی ۔ بہرحال اُن کے دم سے اردو زبان سے متعلق تحقیق وریسرچ کا ممبئی میں چرچا تھااور اس بناپر اُن کی وفات علم وادب کی دنیا کاایک بڑاسانحہ ہے۔ [اکتوبر۱۹۶۸ء]

شہابی،مفتی انتظام اللہ

مفتی انتظام اللہ شہابی

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی مصنف یاادیب نہیں، لکھنے کی مشین تھے۔ بہت لکھتے تھے اور جلد لکھتے تھے۔ بلامبالغہ سینکڑوں مضامین ومقالات اورایک درجن سے زیادہ کتابیں ان کی قلمی یادگار ہیں۔ ان کا اصل فن تاریخ نگاری تھا لیکن مذہب، تصوّف اورادب وشعر کا میدان بھی ان کے رہوارِقلم کی جولانگاہ تھا۔آگرہ جواُن کا مولد اوروطن اصلی تھا، اس کی علمی،ادبی اورسیاسی تاریخ سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔بُرہان اورندوۃ المصنفین سے ان کو دلی تعلق اور لگاؤ تھا۔ ۴۹ء کے شروع میں راقم الحروف کے کلکتہ چلے جانے کے بعد چندمہینوں تک مرحوم بُرہان کی ادارت سے وابستہ بھی رہے تھے۔اب ادہر چندمہینوں سے بتقاضائے عمر ان میں ضعف واضمحلال بہت زیادہ پیدا ہوگیا تھا۔لیکن اس پربھی کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔طبعاً بڑے خوش مزاج اورشریف وبااخلاق انسان تھے۔اس کا افسوس عمر بھر رہے گا کہ پچھلے دنوں نظیرا کبرآبادی پرایک مقالہ لکھنے کی فرمائش کے سلسلہ میں آگے پیچھے ان کے دو خط بڑے شدید تقاضہ اور اصرار کے آئے لیکن مصروفیتوں کے باعث تعمیل نہ ہوسکی۔اللہ تعالیٰ دونوں کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔آمین [اکتوبر۱۹۶۸ء]

فیض آبادی،مولانا حمیدالدین

مولانا حمیدالدین فیض آبادی

سخت افسوس ہے ہمارے عزیز دوست اور فاضل رفیق مولانا سید حمید الدین صاحب فیض آبادی ۱۵؍اور ۱۶؍نومبر کی درمیانی شب میں مظفرنگر کے قریب کار کے ایک نہایت شدید حادثہ کا شکار ہوکر ڈرائیور کے ساتھ خود بھی اسی وقت جان بحق ہوگئے۔ انا للہ واناالیہ راجعون۔مولانا کے ساتھ کار میں اہل خانہ بھی تھے ۔ان میں سے آٹھ نوبرس کا ایک نواسہ اس درجہ شدید زخمی ہوا کہ چارروز تک مسلسل بیہوش رہنے کے بعد آخروہ بھی جل بسا۔اہلیہ اور صاحبزادی بھی شدید مجروح ہوگئی تھیں۔مولانا اسعدمیاں کے خسر تھے۔اور جو بچہ زخموں کی

تاب نہ لاکر دنیا سے رخصت ہوگیا وہ مولانا کا جگر گوشہ تھا اور مولانا مرحوم کی اہلیہ اور صاحبزادی علی الترتیب موصوف کی خوشدامن اور اہلیہ ہیں، اس بنا پر مولانا اسعد کے لیے یہ حادثہ کس درجہ صبر آزما نا اور جانگسل ہوگا لیکن اس موقع پر انھوں نے جس غیر معمولی صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔

مولانا حمیدالدین صاحب کا وطن فیض آباد کے ضلع میں تھا۔ ابتدائی تعلیم وہیں کہیں پانے کے بعد دیوبند آگئے تھے، علوم وفنون کی تکمیل یہیں کی تھی۔ آخر میں دورۂ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں پڑھا۔ دارالعلوم دیوبند میں یہ مجھ سے جونیر تھے لیکن اپنی نیکی، ذہانت، اور استعداد علمی کے باعث مدرسہ کے ممتاز طلبا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کو عربی زبان وادب، منطق وفلسفہ اور فقہ و حدیث سب کے ساتھ یکساں مناسبت تھی لیکن فراغت کے بعد فقہ وحدیث کے ہی ہوکر رہ گئے۔ چنانچہ انہیں مضامین کا درس دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں کئی برس ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز رہے۔ پھر ۴۹ء میں میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل مقرر ہوا تو میں نے ان کو لکچرر فقہ وحدیث کی جگہ پر بلالیا۔ چند سال یہاں کام کرنے کے بعد استعفادے کر دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے۔ لیکن ابھی ان کا استعفا منظور نہیں ہوا تھا کہ چند فتنہ انگیزوں نے میرے خلاف ایک ہنگامہ برپا کردیا اور صورت حال ایسی پیدا ہوگئی کہ میری درخواست پر مولانا پھر کلکتہ واپس آگئے اور اس وقت سے لے کر وفات تک اسی درسگاہ سے وابستہ رہے۔ ۵۸ء میں لکچرر کے عہدہ سے ترقی کرکے پروفیسر تفسیر وحدیث ہوگئے تھے لیکن میرے کلکتہ چھوڑنے کے بعد مدرسۂ عالیہ کے حالات میں جو ابتری پیدا ہوئی، اس کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مولانا مرحوم کو پھر لکچرر کے عہدہ پر واپس کردیا گیا اور پروفیسر کی جگہ پر ایک ایسے صاحب کا تقرر ہوگیا جو مولانا سے بھی جونیر تھے آخر اسی لکچرر کی پوسٹ پر وہ دنیا سے رخت سفر باندھ گئے۔

مولانا بڑے عابد وزاہد، متشرع اور صاحبِ صلاح وتقویٰ عالم تھے۔ گفتگو کم کرتے تھے لیکن جو بات کہتے تھے جچی تلی کہتے تھے۔ کئی برس سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے، مجلس کے جلسوں میں پابندی اور اہتمام سے شریک ہوتے اور بحث میں دل چسپی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ ان کا یہ سفر بھی مجلس شوریٰ کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے تھا۔ کلکتہ سے دہلی آئے اور دہلی سے دیوبند جارہے تھے۔ اخلاق وعادات کے لحاظ سے بڑے خوش مزاج متواضع اور وضعدار تھے، جس سے جو رسم تھی اسے بہرحال نباہتے تھے۔ اس زمانہ میں جبکہ مستند اربابِ علم ودین کا قحط یوں ہی کچھ کم نہیں ہے، مولانا کی وفات علوم دینیہ کے حلقوں کے لیے ایک شدید حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مدارج ومراتب بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا ہو۔ آمین۔

[دسمبر ۱۹۶۸ء]

جعفری، رئیس احمد

رئیس احمد جعفری

پچھلے دنوں پاکستان میں ہمارے ایک اور فاضل اور عزیز دوست رئیس احمد جعفری کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے تعلیم ندوہ اور جامعہ دونوں میں پائی تھی لیکن تکمیل کسی ایک جگہ بھی نہیں کی۔ تحریر کا شوق اور سلیقہ شروع سے تھا اور آدمی تھے بڑے ذہین اور طباع! اس لیے اپنے مطالعہ اور محنت کے بل بوتہ پر اردو زبان کے نامور ادیب اور مصنف بن گئے۔ ان کا قلم ہی ان کے لیے ذریعہ معاش تھا، اس لیے اگرچہ کوئی ڈھنگ کا علمی اور تحقیقی کام نہیں کرسکے لیکن افسانہ وناول سے لے کر مذہب اور تاریخ وفلسفہ تک ہر موضوع پر چھوٹی بڑی کتابیں اس کثرت سے لکھی ہیں کہ اس وصف خاص میں ان کا کوئی معاصر ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ان کا قلم بڑا شگفتہ اور رواں دواں تھا ان کے ساتھ میرا ذاتی تعلق یہ تھا کہ مرحوم کے نانا سید امتیاز احمد صاحب (ریاض خیرآبادی مرحوم کے حقیقی بھائی) آگرہ میں کوتوال شہر تھے۔ ان میں اور میرے والد صاحب قبلہ میں نہایت گہرے برادرانہ تعلقات تھے۔ کوتوال صاحب کے متعلقین ہمارے ہاں آتے اور ہفتوں قیام کرتے تھے۔ اسی طرح ہم لوگ ان کے ہاں جاتے اور ہفتہ دو ہفتہ ٹھہرتے تھے۔ رئیس احمد جعفری کوتوال صاحب (جن کو میں خالو کہتا تھا) کی پہلی بیوی کی لڑکی کے بطن سے تھے۔ ان تعلقات کے باعث مرحوم جب تک دہلی میں رہے برابر آتے جاتے رہے۔ جب کبھی ملتے تھے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ آخری مرتبہ دہلی آئے اور میں ان دنوں ہندوستان سے باہر تھا تو لاہور جاتے ہوئے دفتر برہان میں میرے نام ایک خط چھوڑ گئے جس میں لکھا تھا بڑی حسرتوں اور تمناؤں کے ساتھ آیا تھا کہ تم سے ملاقات ہوگی مگر مایوس جارہا ہوں۔ اب میں بیمار رہنے لگا ہوں، نہ جانے کتنی اور باقی ہے۔ البتہ یہ تمنا ضرور ہے کہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ تمہیں اور دیکھ لوں۔'' صد حیف تمنا پوری نہیں ہوئی، اور وہ خدا کو پیارے ہوگئے۔ اللھم اغفرلہٗ وارحمہ۔

[دسمبر ۱۹۶۸ء]

نظام الدین، محمد

محمد نظام الدین

ابھی قلم یہیں تک پہنچا تھا کہ ڈاکٹر محمد نظام الدین کے انتقال کی خبر حیدآباد سے ملی۔ مرحوم عرصہ تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدآباد میں فارسی کے پروفیسر اوردائرۃ المعارف کے ڈائرکٹر رہے اوراس حیثیت سے انھوں نے اسلامی علوم وفنون کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔وہ پروفیسر براؤن کے خاص شاگرد تھے اور عربی وفارسی کے نامور اساتذہ اورفضلاء کی اس پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو اب آفتابِ لب بام ہے۔ستر برس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔لیکن اس عالم میں بھی علمی کام کرتے رہتے تھے۔چنانچہ ابھی چندماہ ہوئے انھوں نے دوکتابیں سلوک الملوک فضل بن روز بن نبھان اور جوامع الحکایات ازعوفی آڈٹ کرکے شائع کی تھیں۔علمی اورتحقیقی کمالات کے علاوہ بڑے مہذب شائستہ اورخدا ترس انسان تھے۔اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔آمین۔

[دسمبر ۱۹۶۸ء]

عثمانی، مولانا لقاءاللہ

مولانا لقاءاللہ عثمانی

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کاان کے وطن پانی پت میں انتقال ہوگیا۔عمراگر چہ اسی (۸۰) برس سے زیادہ تھی لیکن قویٰ اچھے تھے۔شب کے آخری حصہ میں ان پر دل کا دورہ پڑااورصبح تک مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا تحریکِ خلافت اور پھرتحریک آزادی دونوں کے ممتاز زعما میں تھے اوراس جرم میں عمر کے سات برس قیدوبند کی سختیاں برداشت کرچکے تھے۔ان کا ساجری، بےخوف اور بےلوث ہونا سخت مشکل ہے۔ستمبر ۱۹۴۷ء کا تصور کیجیے، ملک کوتقسیم ہوئے ابھی دوہفتے ہوئے ہیں پورامشرقی پنجاب قتل وغارت گری کی آگ میں جل رہاہےاور پانی پت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔مسلمان قافلہ درقافلہ روانہ ہورہے ہیں یہاں تک کہ شام آئی جب کہ پورے پانی پت میں صرف ایک مولانا تنہامسلمان رہ گئے۔عزم واستقلال اور پھرمخلصانہ خدمتِ خلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ جولوگ مسلمان کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے وہ بھی مولانا کے گرویدہ اورخدمت گزار ہوگئے۔طبعًا نہایت شگفتہ مزاج اورعملاً بڑے عابد و مرتاض تھے۔مجھ پر ہمیشہ بڑی شفقت فرماتے تھے۔چند برس ہوئے علی گڑھ اپنی آنکھ بنوانے کی غرض سے آئے ہوئے تھےاوراپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم تھے۔میں حاضر ہواتوحسبِ معمول غیرمعمولی شفقت بزرگانہ کے ساتھ پیش آئے اور جس چارپائی پر وہ بیٹھے تھے میں اس کی پائینتی کی جانب بیٹھنے لگاتو فرمایا کہ یہ ہر گزنہیں ہوگااور ہاتھ پکڑکرزبردستی سراہنے بٹھایا۔میں نے عرض کیاحضرت! آج یہ خلاف معمول اس درجہ تکلف کیوں؟ چمک کر جواب دیا''ہوں !تمہاری کتاب 'صدیق اکبرؓ اللہ کے ہاں مقبول ہوگئی ہےاور یہ مجھے خواب میں دکھایا گیا ہےتو کیااب بھی میں تمہاری تعظیم نہیں کروں گا''۔اللہ اللہ! اب ایسے بزرگ اورسلف صالحین کے صحیح نمونہ کہاں ملیں گے۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔آمین۔ [فروری ۱۹۶۹ء]

نانوتوی، مولانا مفتی محمود احمد

مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی

افسوس! گزشتہ مہینہ ہمارے شبستان دارالعلوم دیوبند کے دو اور روشن چراغ بجھ گئے۔مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی ناتوتہ کے ایک اعلیٰ اور شریف خاندان کے فردِفرید تھے۔تعلیم دیوبند میں پائی تھی، اولاً حضرت شیخ الہند اور پھرحضرت الاستاذ مولانا محمد انورشاہ الکشمیر ی سے خاص استفادہ کیااوران سے تلمذخصوصی کاتعلق رکھتے تھے۔علم وفن کی پختہ استعداد وزہد وورع اوراخلاق فاضلہ، یہ تینوں اوصاف بزرگان دیوبند کے امتیازی کمالات تھے۔مفتی صاحب بھی ان کے جامع تھے۔لیکن انھوں نے فقہ اورحدیث کواپنا خاص فن بنالیا تھااور ان میں ان کی نظر بڑی دقیق اور غامض تھی۔ایک عرصہ سے اجین میں قیام پذیر تھے۔وہاں کی مسلم اورغیرمسلم آبادی کوانھوں نے اپنے علم وفضل اور کردار سے کس درجہ عقیدت مند بنالیا تھااس کااندازہ اس سے ہوگا کہ جب ان کا جنازہ اٹھاہےتو تنگیِ وقت کے باوجودکم وبیش پندرہ ہزار آدمی اس کے جلوس میں تھے اوران میں جن سنگھی بھی تھے۔دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے دیرینہ رکن تھے اور اس کی ہرممکن خدمت کواپنا فرض سمجھتے تھے۔حضرت شاہ صاحب سے عقیدت کیا ان کے نام کے عاشق تھے۔مجلس میں جب کبھی حضرت الاستاذ کاذکر چھڑ جاتا تو دوسروں کی باتیں بڑی توجہ اوردل چسپی سے سنتے اور پھر جب خود بولنا شروع کرتے توعالم ہی عجیب ہوتا جس کوسن کردل ودماغ دونوں روشن ہوجاتے تھے۔

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ۔

[فروری ۱۹۶۹ء]

حفظ الرحمٰن، قاری

قاری حفظ الرحمٰن

قاری حفظ الرحمٰن صاحب کم وبیش تیس برس سے دارالعلوم دیوبند میں درسِ تجوید وقراءت کی خدمت انجام دے رہے تھے اب ادھر ایک عرصہ سے اس شعبہ کے صدر تھے۔ انڈو پاک کے قراء میں ان کی شخصیت بڑی ممتاز اور نمایاں تھی۔ چنانچہ عام طور پر انہیں شیخ القراء کہا جاتا تھا اور واقعی وہ اس کے مستحق تھے۔ فن میں مہارت وبصیرت کے علاوہ قدرت نے آواز بھی ایسی پرسوز وگداز دی تھی کہ جہاں کہیں پڑھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ لحنِ داودی کے نغمے برس رہے ہیں اور فضا سرتاپا سماعت بن گئی ہے۔ فالج میں کئی برس سے مبتلا تھے لیکن کام چل رہا تھا۔ آخر وقت موعود بھی آپہنچا اور رباب ہستی بے نغمہ وصوت ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر ٹھنڈی رکھے اور مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

[فروری ۱۹۶۹ء]

حسین، ڈاکٹر ذاکر

ڈاکٹر ذاکر حسین

افسوس ہے ڈاکٹر ذاکر حسین بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ وہ ہماری قومی تعلیم کے معمارِ اوّلین، اس ملک میں سیکولرزم کی آبرو اور جمہوریت کا وقار تھے۔ ان کی وفات سے ہماری قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی عرصے تک نہ ہو سکے گی۔ کم وبیش بہتّر (۷۲) سال کی عمر پائی۔ ۳؍مئی کی صبح کو اچھے خاصے تندرست اُٹھے۔ حسبِ معمول فجر کی نماز ادا کی، اس سے فارغ ہوکر کچھ مطالعہ کیا، اخبارات پڑھے، پھر ہلکا پھلکا ناشتہ کیا۔ یہ سب کرتے کراتے گیارہ بجے کا عمل ہو چکا تھا اور وہ روزانہ معمول کے مطابق طبّی امتحان کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑا۔ ایک سے ایک قابل ڈاکٹر موجود تھے ہی فوراً اپنی جیسی ساری تدبیریں کرڈالیں لیکن وقتِ مدعو آپہنچا تھا۔ اس کے سامنے کچھ پیش نہ چلی اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی قومی زندگی کے دو دَور ہیں، ایک جامعہ کے ساتھ وابستگی سے لے کر تقسیم تک، اور دوسرا اس کے بعد سے وفات تک۔ پہلے دور میں جو ایک ربع صدی پر پھیلا ہوا ہے مرحوم کا کردار ایک ہیرو، نہایت حوصلہ مند جرنیل اور عظیم الشان رہنما کا کردار رہا ہے۔ انھوں نے جرمنی سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ اس کے علاوہ تعلیم بھی ان کا خاص مضمون رہا تھا۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں تقریر وتحریر کا ملکہ اور سلیقہ خداداد تھا۔ غرض کہ علمی اور فنی حیثیت سے ان کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کے باعث وہ شہرت، عشرت اور راحت کی زندگی بڑی آسانی سے بسر کرسکتے تھے، لیکن انھوں نے محنت ومشقت اور عسرت کی زندگی اختیار کی۔ ابھی جرمنی میں تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی مرحوم وغیرہ نے جو جامعہ ۱۹۲۰ء میں قائم کی تھی۔ وہ مالی پریشانیوں کی صید زبوں ہے اور اس کو بند کردینے کے منصوبے ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے، انھیں اس کا علم ہوا تو فوراً کہلا بھیجا کہ جامعہ کو ہرگز بند نہ کیا جائے اور وہ عنقریب ہندوستان پہنچ کر ایک نہایت قلیل مشاہرہ پر اپنے آپ کو مع اور دو تین رفیقوں کے جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کردیں گے۔ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اور جس کا عہد کیا تھا وہ کرکے دکھادیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ دَورِ حیات ایک اعلیٰ مقصد کے لیے غیر معمولی ایثار وفدا کاری، حیرت انگیز عزم وہمت اور جذبہ عمل اور سخت ترین دشواریوں کے باوجود مسلسل جدوجہد کا دور ہے۔ اس زمانے میں جامعہ دلّی کے علاقہ 'قرول باغ' میں کرایہ کے چند مکانوں میں قائم تھی۔ اس کی سند کو حکومت میں کوئی اعتبار حاصل نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب اسی علاقے کے ایک چھوٹے سے مکان میں جس کا کرایہ پندرہ روپیہ ماہوار تھا، رہتے اور صرف پچھتر (۷۵) روپیہ ماہوار تنخواہ لیتے تھے۔ زندگی بے حد سادہ اور معمولی تھی۔ اس دور میں ان کو بارہا سخت حوصلہ شکن حالات وحوادث کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہمّت کبھی نہیں ہاری اور طوفانوں کا مقابلہ کمال پامردی اور استقامت کے ساتھ کرتے رہے۔ بے شبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ملک کی ایک نہایت اہم اور عظیم الشان یونیورسٹی کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی تعمیری جدوجہد کا ایک ایسا شاہکار ہے جو تاریخ کے صفحات میں ان کا نام ہمیشہ روشن رکھے گا اور دنیا ان کو ایک عظیم انسان کی حیثیت سے یاد کرے گی۔

مرحوم کی زندگی کا دوسرا دَور جو تقسیم کے کچھ دنوں بعد سے شروع ہوتا ہے اس میں وہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ مرحوم کو جامعہ سے جو محبت تھی اور جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین ماہ وسال قربان کردیے تھے اس کے پیشِ نظر ان کے لیے جامعہ کو چھوڑ دینا کسی طرح گوارا نہیں ہوسکتا تھا لیکن تقسیم کے باعث یہاں کے مسلمانوں اور ان کے اداروں کے لیے جو حالات غیر متوقع طور پر پیدا ہوگئے تھے ان سے علی گڑھ کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، اس بنا پر مرحوم نے وقت کا ایک ضروری مطالبہ سمجھ کر گورنمنٹ کی طرف سے علی گڑھ کی پیشکش کو قبول کرلیا۔ گویا اب تک انھوں نے جامعہ کے لیے اپنی ہر چیز

قربان کی تھی لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ وہ کسی اور چیز کے لیے جامعہ کو قربان کر دیں۔علی گڑھ میں وائس چانسلری کے بعد وہ بہار کے گورنر ہوئے۔پھر نائب صدر اور اس کے بعد صدر۔جامعہ سے تعلق کے زمانے میں مرحوم کی زندگی ایک خالص عوامی زندگی تھی۔جامعہ سے ان کا رشتہ ٹوٹا تو وہ عوامی زندگی سے دُور ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخری بارہ برس میں تو ان کا عوام سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ ایک انسان جب کسی ذمہ دار عہدے پر ہوتا ہے تو کچھ لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں اور کچھ ناراض، اس بنا پر اس کے خلاف کچھ نہ کچھ شکایتوں کا ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ یہ شکایات ڈاکٹر صاحب سے ہوئیں، لیکن یہ شکایات بجا ہوں یا بے جا، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مرحوم کی شخصیت بڑی پُر وقار و پُر عظمت تھی، وہ بھاری بھرکم ہونے کے ساتھ دلکش اور جاذب بھی تھی۔قدرت نے ان کو حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کے جوہر سے بھی اس طرح نوازا تھا کہ ان کی شخصیت میں مقناطیسیت کی خاصیت پیدا ہوگئی تھی۔شرافتِ نفس، مروت اور شگفتہ طبعی اُن کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھی۔علم و فضل، ذہانت و ذکاوت اور جودتِ فکر کے ساتھ شیریں گفتاری کا یہ عالم تھا کہ بات کرتے تو مُنہ سے پھول برستے تھے۔خندہ روئی اور فرخندہ جبینی ان کی فطرت تھی۔ان کو قدرت نے اس دنیا میں وہ سب کچھ دیا جو اہلِ دنیا کے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایۂ فخر و نازش ہوسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دل کے غنی دنیوی تکلفات و تعیّشات سے بالکل بے پروا اور اسی طرح سچ مچ صوفی اور درویش صفت انسان تھے۔ان کی طبیعت میں خاکساری، وضعداری، انسانیت نوازی اور عام محبت و ہمدردی کا جو جذبہ تھا، صدارت کے زمانے میں بھی اس میں فرق نہیں آیا۔وہ وقت سے لڑ بھی سکتے تھے اور اس سے سمجھوتہ بھی کر سکتے تھے۔ان کی زندگی کا پہلا دوران کی پہلی استعداد و صلاحیت کا مظہر ہے اور دوسرا یعنی آخری دور دوسری صفت کا۔اللھم اغفرلہٗ وارحمہ۔ [مئی ۱۹۶۹ء]

آلم مظفرنگری

آلم مظفرنگری

افسوس ہے کہ شاعر بُرہان جناب الم مظفرنگری گزشتہ ۲۹ مئی کو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے، مرحوم کو بُرہان سے جو تعلقِ خاص تھا اُس کا اندازہ اس آخری خط سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے ایک غزل کے ساتھ ۲۶ اپریل کو تحریر فرمایا تھا۔ اب آلم صاحب جیسے مخلص، سادہ مزاج، پختہ کلام، باکمال ادیب و شاعر کو آنکھیں ڈھونڈتی ہی رہیں گی، بطور تبرک غزل کے ساتھ مرحوم کا آخری خط بھی شائع کیا جارہا ہے۔ [ع، جون ۱۹۶۹ء]

خط

۲۴ فردوس منزل، مظفرنگر

24/4/69

مولانا آداب۔ اگرچہ مضمحل ہوں مگر ابھی زندہ ہوں۔آپ نے مجھے مُردوں میں شمار کرلیا میری کئی غزلیں آپ کے دفتر میں ہیں مگر کئی ماہ سے برہان میں ایک بھی غزل نہیں چھاپی گئی۔آج ایک تازہ اور غیر مطبوعہ غزل پیش کررہا ہوں ماہ اپریل کے برہان میں لگوادیجیے۔جب تک لکھنے کا یارا باقی ہے ضرور آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔

غالبؔ و ذوقؔ کے سہروں کا موازنہ نظرِ اقدس سے گزرا ہوگا یہ الجمعیۃ میں چھپا تھا سچ کہیے ایسا مضمون غالبؔ کی صدسالہ برسی پر کسی اور نے بھی لکھا یا نہیں اور حضرات نے اچھے اچھے مضامین لکھے لیکن وہ زیادہ تر سیاسی تھے، ایک ادیب اور مکمل شاعر کو ایسی باتوں سے بھلا کیا واسطہ اس کا کمال تو ادب و شعر تک محدود ہے۔حکیم صاحب سے سلام کہیے اور غزل کاتب کو لکھنے کے لیے دے دیجیے۔

نیازکیش
آلم مظفرنگری

عبدالناصر، جمال

الرئیس جمال عبدالناصر مرحوم

صدر ناصر جمال عبدالناصر دنیا کے ان عظیم المرتبت لوگوں میں سے تھے جو اپنے بلند اور عظیم کارناموں کے باعث تاریخ میں اپنے لیے ایک مقام ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ تاریخ کو ایک نیا موڑ بھی دیتے ہیں اور اسی بناء پر ان کی شخصیت محض ایک تاریخی نہیں بلکہ تاریخ ساز شخصیت ہوتی ہے۔انھوں نے ۵۲ء میں برسرِ اقتدار آ کر اپنے ملک کو شہنشاہیت کی زنجیروں سے آزاد کیا اور عوام کا معیار زندگی اونچا کیا۔۵۶ء میں نہر سویز کو قومیالینا اور کروڑوں روپے کے خرچ سے اسوان ڈیم کی تعمیر کردینا مرحوم کے دو ایسے عظیم کارنامے ہیں جنھوں نے اقتصادی اعتبار سے مصر کی تقدیر بدل دی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ملک میں زرعی، زمینی تعلیمی اور اقتصادی اصلاحات بھی نافذ کیں اور صنعت و حرفت کو فروغ دیا اور پھر خود ان کی زندگی نہایت سادہ عوامی اور اخلاقی اعتبار سے بہت

بلند تھی۔ان سب چیزوں نے مصر کے عوام کو ان کا ایسا گرویدہ بنادیا تھا کہ ۶۷ء کی جنگ میں شدید شکست کے بعد جب انھوں نے ساری ذمہ داری اپنے سر لے کر حکومت کی صدارت سے استعفا پیش کیا تو عوام ایک پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی اور آخر انھیں استعفا واپس لینا پڑا۔ مرحوم صرف اپنے ملک کے نہیں بلکہ پوری عرب دنیا اور افریقی اقوام کے بھی سب سے زیادہ قابل اعتماد، نہایت فعال اور بڑے جرّی اور ہوش مند لیڈر تھے۔ان میں سے بعض ملکوں کے سربراہوں کی سیاست خواہ کچھ ہی ہو لیکن عوام ہر ملک کے صرف ان کی عزّت ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ دل وجان سے محبّت کرتے تھے۔چنانچہ ان کی اچانک اور بے وقت موت پر کروڑوں انسانوں نے بے ساختہ جو گریہ وماتم کیا ہے وہ تاریخ میں کم ہی لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔غلطیوں اور فروگزاشتوں سے کوئی فرد بشر خالی نہیں ہے اور پھر جو شخص جتنا بڑا ہوتا ہے اس کی مخالفت بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔ لکھنے والے کتابیں لکھیں گے اور ان میں نقد وتبصرہ کے نقطۂ نظر سے ان کے کارناموں کا جائزہ لیں گے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ مرحوم ایک نہایت غیر معمولی اور انقلاب آفریں شخصیت کے مالک تھے اور ان کی وفات سے عرب اور افریقہ کی سیاست میں جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ عرصہ تک پر نہ ہوسکے گا۔اللھم اَغفرلَہ وارحمہ۔ [س ع، فروری ۱۹۷۰ء]

آزاد، اسرار احمد

اسرار احمد آزاد

افسوس ہے پچھلے دنوں ہمارے ادارۂ ندوۃ المصنفین کے دو پرانے ساتھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔جناب اسرار احمد آزاد اردو زبان کے ادیب اور نامور اخبار نویس تھے یوں انھوں نے غالباً کسی یونیورسٹی سے باقاعدہ کوئی سند نہیں لی تھی لیکن محض اپنی ذاتی محنت اور شوق سے اردو اور ہندی کے علاوہ انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچا لی تھی کہ اس زبان کے اخبارات و رسائل اور کتابیں بے تکلف پڑھ اور سمجھ لیتے تھے۔سیاسیات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ادارہ کے ابتدائی زمانہ میں مکتبۂ برہان کی طرف سے ان کی کتاب ''بین الاقوامی سیاسی معلومات'' شایع ہوکر بڑی مقبول ہوئی تھی۔مرحوم نظر ثانی کرکے اس پر برابر اضافہ کرتے رہے چنانچہ اس کتاب کا آخری ایڈیشن جو شایع ہوا ہے وہ تین نہایت ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور بے شبہ یہ کتاب اردو زبان کے پورے لٹریچر میں اپنی نوعیت کی ایک ہی ہے۔اس کے علاوہ مرحوم بہت جلد اور بہت اچھا لکھتے تھے۔ ان کی ساری زندگی جرنلزم کے نذر ہوگئی ورنہ اگر ان کو معاشی اطمینان حاصل ہوتا اور تصنیف وتالیف میں لگے رہتے تو اردو زبان کے ذخیرہ میں بہت کچھ قابل قدر اضافہ کرسکتے تھے۔اخلاقی اعتبار سے ان کی زندگی سراپا ایثار تھی۔خود مجرد رہے، محنت مزدوری کی اور ایک بھائی کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ اپنی توجہ مرکوز رکھی۔سری نگر میں روزنامہ ''چنار'' کے ایڈیٹر تھے، دھرا دول میں انتقال ہوا۔اللہ تعالیٰ مغفرت عطا فرمائے۔ [فروری ۱۹۷۱ء]

یوسف، قاری محمد

قاری محمد یوسف

قاری محمد یوسف صاحب ندوۃ المصنفین کے یوم تاسیس سے ۱۹۵۱ء تک ادارہ سے برابر وابستہ رہے لیکن ان کا تعلق دفتر سے تھا اس سے بھی بڑھ کر ہم لوگوں سے ان کا بڑا تعلق یہ تھا کہ وہ خود دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی جو حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب (والد ماجد مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی) کے خلیفۂ مجاز اور ایک بلند پایہ صوفی اور عارف باللہ تھے، ان کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۳۷ء سے پاکستان جانے تک قاری اور مترجم کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو سے برابر وابستہ رہے اور بہت مقبول تھے۔ترک وطن کے بعد حیدرآباد سندھ میں ناظم تعلیمات اسلامی کی حیثیت سے برسوں کام کیا۔ دوتین سال سے بعض خانگی حوادث کے باعث خانہ نشین ہوگئے تھے۔انتقال کے وقت ۷۲۔۷۳ برس کی عمر ہوگی۔اللھم اغفرلہ وارحمہ۔
[فروری ۱۹۷۱ء]

روش صدیقی

روش صدیقی

افسوس ہے گزشتہ ماہ جناب روش صدیقی بھی رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔ مرحوم بلند پایہ اور صاحب فن شاعر تھے۔ان کی شہرت کا آغاز رومانی نظموں سے ہوا جو اس زمانہ کے مشہور ادبی رسالوں میں بڑے اہتمام سے چھپتی تھیں اور جنہیں وہ اپنی خاص پرجوش آواز میں لہرا لہرا کر پڑھتے تھے۔بعد میں ان کی شاعری حکمت وفلسفہ اور انسانی ووطنی مسائل وآلام کی ترجمان بن گئی لیکن ان کا کلام غامض اور دقیق ہوتا تھا اور الفاظ اور تراکیب پر شکوہ وباوقار، طبیعت میں روانی اور جدت پسندی بلا کی تھی۔اخلاقی اعتبار سے بڑے باوضع، ملنسار اور مذہبی حیثیت سے صوم وصلوٰۃ کے اور اوراد و وظائف تک کے پابند تھے۔انتقال سے چھ

سات روز پہلے (۱۴/جنوری) کوشام کے وقت نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اچانک ملاقات ہوگئی تو حسب معمول بڑے تپاک سے ملے اور معانقہ کیا۔کافی ہشاش بشاش اور مگن تھے۔اس وقت اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اس عالم آب وگل میں وہ بس اب چندروز کے اور مہمان ہیں اور ان سے یہ آخری دید وشنید ہے۔شاہ جہاں پور کے ایک مشاعرے میں گئے تھے وہیں دل کا دورہ ہوا اور جاں بحق ہوگئے۔اللہ تعالیٰ ان کی قبر کوٹھنڈی رکھے اور ان کے پسماندگان کا حامی وناصر ہو۔آمین [فروری ۱۹۷۱ء]

جاپان والا،الحاج شیخ فیروز الدین

الحاج شیخ فیروز الدین جاپان والا

افسوس ہے پچھلے مہینے کی ۷/تاریخ کوسہ پہر کے وقت محترم الحاج شیخ فیروز الدین صاحب جاپان والے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔مرحوم دہلی کی پنجابی برادری کی بزرگ ترین شخصیت تھے۔ابھی اپریل کے شروع میں کلکتہ جانا ہوا تھا تو معمول کے مطابق ان سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔کولوٹولہ نمبر ۸۰ بلڈنگ کا بڑا حصہ پچھلے سال منہدم ہوگیا تھا، اس لیے اس مرتبہ قیام مدح ہاؤس ۱۶۔ذکریا اسٹریٹ میں ہوا اور میزبان حاجی قاسم جادوت صاحب تھے۔

کولوٹولہ نمبر ۸۰ کی نسبت سے یہ مکان فاصلے پر ہے شیخ صاحب یا پیادہ چل کر یہاں تشریف لاتے تھے اور دیر تک بیٹھتے تھے۔بڑھاپے کی وجہ سے قدرتی طور پر ناتواں تھے لیکن ان کی صحت کی عام رفتار کودیکھ کر کہیں دور دور بھی یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ اس قدر جلد دنیا سے جارہے ہیں۔

آخری ملاقات ۱۸/اپریل کی صبح کو ہوئی تھی،حسبِ معمول بہت سی باتیں ہوئیں خاص طور پر انسانی اعمال اور ان کے نتائج پر دل پذیر گفتگو رہی۔مرحوم اس فلسفے پر بھرپور یقین رکھتے تھے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس دنیا میں کسی نہ کسی رنگ میں اس کا بدل ضرور سامنے آتا ہے، وہ مکافاتِ عمل کے اس پہلو پر زیادہ زور دیتے تھے اور باربار کہا کرتے تھے کہ قانونِ مکافات کوصرف آخرت پر چھوڑ کر بے فکر نہ ہوجانا چاہیے۔ان کی باتیں دل چسپ اور اثر انگیز ہوا کرتی تھیں۔مجھ سے بے تکلف تھے اس لیے زیادہ کھل کر باتیں کیا کرتے تھے اور قلندرانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔ اس روز دورانِ گفتگو مشہور عالم، محدث اور صوفی شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کے واقعہ کا ذکر آگیا جس کوسن کر دیر تک سر دھنتے رہے۔میں نے کہا کہ شیخ نے لکھا ہے کہ جس روز میری بیوی ......اکھڑے اکھڑے تلخ وترش لہجے میں مجھ سے بات کرتی ہے تو سمجھ جاتا ہوں کہ میں نے ضرور کوئی ایسا عمل کیا ہے جس کا بدلہ آج اس صورت میں مل رہا ہے اور پھر حدیث ۔اِنـمـا ھِـیَ اعـمـالـکم تُرَدُّ اِلَیکم ''(یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جوتم پرلوٹائے جارہے ہیں) کی تشریح فرمائی۔

مرحوم کے مزاج میں عجلت زیادہ تھی، چاہتے تھے جو کام کرنا ہے اس میں دیر نہ ہونی چاہیے اور ان کا یہ انداز زندگی کے ہرگوشے میں نمایاں تھا۔امورِ خیر میں بھی یہی شان تھی، بڑے بڑے کام منٹوں میں کرگزرتے تھے۔طبیعت کے اسی انداز کی وجہ سے بیٹھے بیٹھے ایک دم سے گھبرا کر اٹھ جایا کرتے تھے چنانچہ اٹھے اور فرمایا ''مفتی صاحب میں چلا''، خیال تھا کہ ۱۹/کو پھر ملاقات ہوگی۔مگر تشریف نہیں لائے بعد میں ان کے بڑے صاحبزادے محمد احمد صاحب سے معلوم ہوا کہ '' کمزوری زیادہ محسوس کررہے تھے شاید اسی لیے آپ کے پاس نہیں پہنچ سکے'' میں پروگرام کے مطابق ۱۹/کی شام کوکالکا میل سے دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد محمد احمد صاحب دہلی آئے اور دو ہفتوں سے زیادہ قیام کیا۔دوران قیام میں ان کو اطلاع ملی کہ والد صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پیشاب کی نالی کے غدود بڑھ گئے ہیں،فلاں تاریخ کوآپریشن کے لیے ہسپتال میں داخل ہورہے ہیں۔محمد احمد صاحب یہ اطلاع پاتے ہی کلکتہ روانہ ہوگئے اور ٹرین چونکہ کئی گھنٹہ تاخیر سے پہنچی اس لیے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ہسپتال میں داخل ہوچکے تھے۔شیخ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے محمد یوسف صاحب فیروزی بی۔اے۔گھر پر موجود تھے، انھوں نے اعلیٰ پیمانے پرتمام ضروری انتظامات کر دیے۔کئی روز کے بعد میرے پاس محمد احمد صاحب کا خط آیا کہ آپریشن پوری طرح کامیاب رہا، میاں صاحب ہوش میں ہیں اور ہنس ہنس کر اشارے سے باتیں کررہے ہیں۔دوسرا خط آیا کہ حالت ہرطرح قابلِ اطمینان ہے ہسپتال سے جلد مکان پرآجائیں گے۔کچھ وقفے سے تیسرا خط آیا کہ آج بخیریت ہسپتال سے آگئے ہیں اور میرے ہی پاس ہیں۔طبیعت نارمل ہوتی جارہی ہے، نقاہت میں بھی تخفیف ہورہی ہے۔ادھر مجی مولانا حکیم محمد زماں صاحب کا خط آیا کہ شیخ صاحب کوآپ کا سلام پہنچادیا ہے اور آپ کی طرف سے مزاج پرسی بھی کردی ہے وہ بھی آپ کوسلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں ''فکر کی کوئی بات نہیں ہے میں ٹھیک ہوں۔'' اتنی تفصیلی اور قابل اطمینان اطلاعات کے بعد ہم لوگوں کے لیے کسی خاص پریشانی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔۷/جون کی شام کو کسی ضروری میٹنگ میں گیا ہوا تھا اور واپسی ۹ بجے شب کے بعد ہوئی تھی۔ دفتر میں

قدم رکھا تو محمد احمد صاحب کا تار رکھا ہوا ملا کہ ''والد صاحب سہ پہر کو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے''۔ تار پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے تو حواس گم ہوگئے اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چالیس سال کے تعلقات اور لیل ونہار کی سرد و گرم گردشوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ مرحوم کے برادر نسبتی شیخ محمد عمر صاحب لیس والوں کو فون کیا۔ اس وقت تک ان کو حادثے کی خبر نہ تھی۔ چند منٹ بعد ان کو بھی تار مل گیا اور ہم لوگ دیر تک مرحوم کے اخلاق، خصائل و عادات اور غیر معمولی خصوصیات کا تذکرہ کرتے رہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۲، ۸۳ سال کی تھی۔ دولت وثروت اور ہر طرح وسائلِ راحت وآسائش کے باوجود سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ مکان اور دکان پر کئی کئی کاریں رہتی تھیں۔ لیکن موٹر سواری کے پابند نہیں تھے۔ اکثر ٹرام پر بھی سفر کرتے تھے اور پیدل بھی چلتے تھے۔ انتہائی خوش خوراک اور خوش لباس ہونے کے باوجود سادگی پسند تھے۔ نفاست کے ساتھ سادگی ان کی زندگی کا خاص جوہر تھی۔ ان کی غرباء پروری، مہمان نوازی، کشادہ دستی، تواضُع حُسنِ سلوک اور بے لوث محبت وشفقت کی وجہ سے سب ہی ان کے گرویدہ تھے۔ سوسائٹی کے ہر طبقے میں ان کا احترام تھا۔ ضرورت مندوں کی روزانہ اور ماہانہ مدد کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ کتنی ہی بیواؤں کے وظیفے ان کے یہاں سے جاری تھے۔ اپنے پیسے سے کتنے ہی لوگوں کے کاروبار جاری کرادیے، کتنے ہی لوگوں کو قرض حسنہ اور عام اعانت سے نوازا۔ کبھی کبھی تو مصارف خیر کی جستجو میں ان کا انداز والہانہ ہوجاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ملی کاموں کے لیے خواہ وہ اجتماعی ہوں یا انفرادی ان کا دل ہمیشہ کھلا رہتا تھا بلکہ خدمت کرکے پھول کی طرح کِھل جاتے تھے۔ کلکتہ کے اورینٹل چیمبر آف کامرس کے بانی اور سرپرست تھے۔ ان کے لائق صاحبزادے شیخ محمد یوسف صاحب فیروزی آج بھی اس کے روح رواں ہیں۔ کوبے (جاپان) میں شاندار اور لائق دید تاریخی مسجد کی تعمیر کرائی اور اس میں خود ہی پہلی اذان دی۔ ان کے اعتقاد کی لطافت اور پاکیزگی کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فرمایا کرتے تھے ''میں نے جاپان سے بہت کچھ دولت کمائی جی چاہتا تھا کہ اس دولت کا کچھ حصہ اسی سرزمین پر خرچ ہو۔'' اس مسجد کا فوٹو شوق سے دکھایا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند، جمعیۃ العلماء ہند دہلی، اسلامیہ ہسپتال کلکتہ اور ندوۃ المصنفین دہلی کے خاص معاون تھے بلکہ ندوۃ المصنفین تو کہنا چاہیے کہ ان کے دامنِ جود وسخا کے سایہ ہی میں پروان چڑھا۔ اس طرح کے علمی ادارے ملک کی تقسیم سے پہلے حیدرآباد اور بھوپال جیسی ریاستوں کی اِعانت اور سرپرستی سے چلتے تھے۔ اور تقسیم کے بعد حکومت ہند اور حکومت کشمیر نے بعض تصنیفی اداروں کی سرپرستی کی۔ لیکن ندوۃ المصنفین کے لیے شیخ صاحب کی ذات ہی سب کچھ تھی اور اس پر طرہ یہ تھا کہ اس اعانت کو کبھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ان کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ان کی مدد سے کتنا عظیم الشان تعمیری کام وجود وظہور میں آیا ہے۔ وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ مفتی صاحب اور ان کے رفیق جو کچھ کہہ رہے ہیں ملت کے لیے مفید ہی ہوگا۔

اس وقت ماضی کی تاریخ کا ایک ایک واقعہ یاد آرہا ہے، ۱۳۵۲ھ میں حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرّہٗ کے وصال کے بعد ان کی یادگار میں ہم لوگوں نے تصنیف وتالیف کا ایک ادارہ دیوبند میں قائم کرنا چاہا اس کے لیے ابتدائی تجویزیں مرتب کیں۔ پمفلٹ کی شکل میں ایک تعارف نامہ شائع کیا اور اس مقصد کے لیے دیوبند ہی میں ایک اجتماع طلب کیا۔ اس اجتماع میں دہلی، پنجاب اور یوپی کے بڑے بڑے علماء نے جن کو حضرت شاہ صاحبؒ سے تعلقِ خاص تھا شرکت کی تھی۔ یہ اجتماع اس مکان میں ہوا تھا جس میں اب ماہنامہ تجلّی کے مدیر عزیز عامر عثمانی رہتے ہیں۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا احمد سعید صاحبؒ، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا حبیب الرحمٰنؒ لدھیانوی اور بہت سے اکابر دیوبند اس اجتماع میں شریک تھے۔ تمام حضرات حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ والا صفات سے محبت وعقیدت کے جذبے میں سرشار تھے اور اس اجتماع کی ایک ایک تقریر کیف واثر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بہرحال اس ادارے کا نام ''مجلس علمی'' قرار پایا۔ اس کے بعد کام کو آگے بڑھانے کے لیے میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور بعض اکابرِ دیوبند دہلی آئے اور کوٹھی حاجی علی جان میں ایک بڑا نمائندہ اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں فرم حاجی علی جان کے مالک حاجی عبدالغفار صاحب مرحوم کے علاوہ حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ، امام صاحب جامع مسجد، خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحبؒ اور دیگر عمائد دہلی کے علاوہ جناب خواجہ حسن نظامی صاحبؒ نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ خواجہ صاحب کو چونکہ حضرت شاہ صاحب سے شرفِ تلمّذ حاصل تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کو ایک ایسے ادارے کے قیام سے دلچسپی تھی جو ان کے استاذ کی علمی یادگار کے طور پر قائم کیا جارہا تھا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے اس جلسے میں نہایت پراثر اور دلچسپ تقریر فرمائی تھی اور حضرت شاہ صاحبؒ جیسے یگانۂ روزگار عالمِ دین اور محدث کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا تھا۔ یاد آتا ہے خواجہ

صاحب نے اسی مجمع میں اعلان فرمایا تھا کہ ''مجلس علمی'' سے سب سے پہلے حضرت استاذ کی جو کتاب شائع ہوگی اس کے تمام مصارف وہ ادا کریں گے، غالباً ''مشکلات القرآن'' کا ذکر تھا۔لیکن حالات نے ایک نئی کروٹ لی،انہی دنوں میں بہار کے ہولناک زلزلے کی خبر آگئی اور طے کیا گیا کہ سردست اس مہم کو ملتوی رکھاجائے اور کچھ وقفے کے بعد دہلی اوردوسرے شہروں کا دورہ کیاجائے۔اس عرصہ میں جوہانسبرگ جنوبی افریقہ کے مشہورلکھ پتی تاجر اور عالم اور ہمارے قدیم مخلص دوست حاجی محمد موسیٰ صاحب کو''مجلس علمی'' کے قیام کی اطلاع ہوئی توانھوں نے اس پراصرار کیا کہ مجلس علمی کے لیے چندے کی ضرورت نہیں ہے اس کو ہم چلائیں گے۔مولانا محمد موسیٰ مرحوم کو حضرت شاہ صاحبؒ سے جو غیر معمولی عقیدت وشیفتگی تھی یہ اسی کا تقاضا تھااور مالی مشکلات کا ان کے سامنے کوئی سوال ہی نہیں تھا۔اسی کے ساتھ ان کی رائے ہوئی کہ مجلس کا دفتر دیوبند کے بجائے ڈابھیل ہوگا۔ادھر ہم لوگ اپنے محدود پیمانے کے مطابق دیوبند میں کام شروع کرچکے تھے اورحضرت الاستاذ کی آخری تالیف ''خاتم النبیین'' (فارسی کی) جوحضرت نے بسترِ علالت ہی پر تصنیف فرمائی تھی، کتابت بھی کرا دی تھی۔مگرصورتِ حال کے تمام گوشوں پرغور کرنے کے بعد یہی بات قرار پائی کہ مجلس کا دفتر ڈابھیل ہی منتقل ہوجائے۔میں اسی سال حج کو چلا گیا، واپس آیا تو معلوم ہوا کہ حاجی محمد موسیٰ صاحب ''مجلس علمی'' کو اپنے خاص ذوق کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔وہ خاص ذوق یہ تھا کہ حضرت الاستاذ کی جو نادر تحقیقات، متداول فروعی مسائل سے متعلق ہیں ان کو شائع کیاجائے اورساتھ ہی ساتھ عربی کی وہ قلمی کتابیں جو حنفی مذاق سے مطابقت رکھتی ہیں طبع کرائی جائیں۔ظاہر ہے یہ کام اپنی جگہ نہایت اہم اور مفید تھا لیکن ہم لوگوں کا ذوق دوسرا تھا، ہماری خواہش یہ تھی کہ قدیم حقائق ومسائل کووقت کے جدید قالب میں اپنی مادری زبان اردو میں پیش کیا جائے اور جزوی وفروعی مسائل پرزیادہ زور نہ دیا جائے ''مجلس علمی'' کے قالب میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔

ادھرہم لوگوں نے لٹریچر کے ذریعہ سے ملک وملّت کی ٹھوس تعمیری خدمت کا جو نقشہ بنایا تھا اس کو بروئے کارلانے کی ظاہری اسباب میں کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی ۔زیارت بیت اللہ سے فارغ ہوکر قیام کے ارادے سے دہلی آگیا۔ان دنوں مولانا سعید احمد مدیر برہان مدرسہ عالیہ فتح پوری کے اورنٹیل سیکشن کے استاذ تھے اورمحلّہ سوئیوالان میں رہتے تھے۔ مجھے مولانا ہی کی کشش یہاں لائی تھی۔وہ بھی کیا زمانہ تھا،مولانا کو شائد ۴۵ روپے ماہانہ ملتے تھے،جن میں سے آٹھ روپے ماہانہ کرایہ مکان کے نکل جاتے تھے،باقی میں مجھ سمیت پورے گھر کا گذر ہوجاتا تھا۔قیامِ دہلی کا یہ زمانہ مختلف حیثیتوں سے سبق آموز اور تاریخی زمانہ تھا۔ایڈورڈ پارک میں مغرب کی نماز کی بہت بڑی جماعت ہوتی تھی، ہر طبقے کے لوگ جماعت میں شریک ہوا کرتے تھے،انہی میں حاجی محمد اسماعیل صاحب جیون بخش مرحوم بھی تھے۔ ان کے ساتھ حافظ محمد ادریس صاحب جملانے بھی آیا کرتے تھے۔ حاجی محمد اسمٰعیل صاحب سے تو قدیم تعلق تھا۔لیکن حافظ محمد ادریس صاحب مرحوم سے یہیں تعارف ہوا اور یہ تعارف بہت جلد تعلقِ خاص کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ ایک روز نماز سے فراغت کے بعد حافظ صاحب کہنے لگے، تمہاری کلکتہ میں بہت ضرورت ہے تیار ہوتو تحریک کروں۔ میں نے مولانا سعید احمد کے علاوہ دیگر احباب سے بھی مشورہ کیا۔سب کی یہی رائے ہوئی کہ مجھے کلکتہ جانا چاہیے۔قیام دہلی کے دنوں میں بارہا یہ بات سننے میں آئی تھی کہ کلکتہ میں ایک ملک التجّار شیخ فیروز الدین صاحب ہیں،ان سے ملاقات اور تعارف ہوجائے تو تصنیف وتالیف کے ادارے کی اسکیم کھڑی ہوجائے گی۔ یہ ۱۹۳۳ء کے وسط کا زمانہ تھا، دوستوں کے مشورے کے مطابق کلکتہ کے لیے تیار ہوگیا۔یاد آتا ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ نے بھی کلکتہ کے بعض مخلصوں کو میرے متعلق خطوط تحریر فرمائے تھے۔بہرحال حاجی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم نے سفر کے انتظامات کیے اور میں بہت جلد روانہ ہوگیا۔میرے کلکتہ پہنچنے کے ۶ مہینے کے بعد مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب بھی انجمن تبلیغ الاسلام سراج بلڈنگ میں تشریف لے آئے اوراس طرح دو قدیم دوست جن کے یک جا ہونے کی اب کم ہی توقع رہ گئی تھی پھر جمع ہوگئے۔انجمن تبلیغ الاسلام مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں قائم تھی۔ میں کولوٹولہ کی مسجد میں درس قرآن دیتا تھااور مولانا سراج بلڈنگ میں ہم دونوں کی یک جائی سے کلکتہ کی فضا میں عجیب رنگ پیدا ہوگیا تھا اور ہمارا حلقۂ تعارف بھی وسیع ہوگیا تھا۔ وقت گذرتا گیااور مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے شدید قسم کے دردسر کے دوروں کی وجہ سے دوسال کے بعد کلکتہ چھوڑ دیا اورامروہہ تشریف لے آئے۔مولانا کی جدوجہد سے امروہہ کے دوحریف مدرسے مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد اور مدرسہ اسلامیہ چلّہ ایک لڑی میں منسلک ہوگئے تھے اورمولانا ان دونوں درس گاہوں کے مہتمم بنادیئے گئے تھے۔مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد کلکتہ سے میرا جی بھی اکھڑنے لگا تھا،پھربھی رہتا رہا۔ان دنوں میں شیخ فیروز الدین صاحب کم سے کم سال میں چھے مہینے جاپان رہتے تھے،جب بھی تشریف لاتے

ملاقات ہوتی ۔لیکن یہ ملاقات خیریت اورمزاج پرسی کی حد سے آگے نہیں تھی۔ میں ۱۹۳۳ء کے وسط سے ۱۹۳۷ء کے آخر تک کلکتہ رہا اورتصنیف وتالیف کے ایک ایسے ادارے کی ضرورت واہمیت کے متعلق جس کی اساس قدیم صداقتوں پر ہومگر جس کا روپ نیا ہو، قریبی دوستوں شیخ عبدالحمید صاحب اورحاجی اسرار احمدصاحبؒ وغیرہ سے مسلسل گفتگو ہوتی رہی، لیکن ان حضرات کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی پھر بھی کام کی اہمیت اور مجھ سے ذاتی تعلق کی وجہ سے شوق سے مدد کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

شائد ۱۹۳۷ء کے وسط میں جب کہ شیخ فیروز الدین صاحب جاپان سے نئے نئے تشریف لائے تھے۔ایک روز ظہر کی نماز کے بعد میں نے ان سے عرض کیا آپ سے ضروری بات کرنی ہے چند منٹ علیٰحدہ مرحمت فرمادیجیے۔ ہنس کر فرمانے لگے ''ضرور'' شائد اگلے ہی روز ظہر ہی کے بعد موصوف سے بات ہوئی۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر ملاقات کا مقصد ظاہر کردیا یعنی یہ کہ ایسا ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ہے جس کے لیے کلکتہ نہیں دہلی مناسب مقام ہے آپ سے اعانت کی درخواست ہے۔فرمانے لگے مفتی صاحب یہ کام حکومتیں کرسکتی ہیں، عام لوگوں کے بس کے نہیں ہوتے، پھر بھی تعمیل حکم کے لیے حاضر ہوں۔ میں نے کہا سرِ دست دوہزار روپیہ عنایت فرمادیں ،کچھ دوسرے لوگ بھی مدد کرنے کے لیے آمادہ ہیں، غالباً دوسرے دن دوہزار روپے کا چیک کولوٹولہ ۸۰ میں میرے پاس بھیج دیا۔ شیخ عبدالحمید صاحب اورحاجی اسرار احمد مرحوم سے پہلے بات ہوچکی تھی۔ چنانچہ ان حضرات نے بھی دودو ہزار روپے قسطوں میں دینے کا وعدہ کرلیا۔اس کے بعد حاجی محمد الدین تاجر چرم سے بات ہوئی۔حاجی صاحب کے یہاں صرف عربی مدارس کی اہمیت تھی، وہ جدید لٹریچر کے ذریعہ سے مِلّت کی خدمت کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی میرے کہنے سے ہاں کرلی۔میں نے ان کے صاحبزادے حاجی محمد حسین مرحوم کوخزانچی بنایا اورقم ان کے پاس جمع کرادی۔ وجود میں آنے سے پہلے کسی اسکیم کے لیے ارزانی کے اس زمانہ میں اتنی رقم کا جمع ہوجانا معمولی بات نہیں تھی۔میں نے اس موقع کوغنیمت جانا اورمتعلقین کوکلکتہ ہی چھوڑ کر دہلی آ گیا۔ یہاں مولانا سعید احمد پہلے سے موجود ہی تھے،صرف مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کوامروہہ سے لانے کا مرحلہ تھا۔اس زمانے کی دہلی اس وقت کی دہلی نہیں تھی، چندروز کی تلاش کے بعد قرول باغ میں ایک مناسب مکان کرایہ پرمل گیا۔یہ مکان مولانا سعید احمد کے شیدی پورہ والے مکان کے قریب تھا۔ جیسے ہی مکان کا انتظام ہوا میں مولانا حفظ الرحمٰن کی خدمت میں امروہہ پہنچا اورصورت حال کی تفصیل بتائی۔جیسا کہ مرحوم کی عادت تھی ایک دم تیز ہونے لگے اورفرمایا: مفتی صاحب !کہیں اتنی تھوڑی رقم سے ادارے چلا کرتے ہیں یہ آپ کیا کررہے ہیں۔ میں نے عرض کیا: مولانا! ابھی ادارہ قائم نہیں ہوا ہے اس کا نام بھی تجویز نہیں ہوا ہے،صرف ایک اسکیم ہے۔کسی خیالی اسکیم کے لیے پہلے ہی مرحلے میں اتنی رقم کامل جانا معمولی بات ہے؟ ادارہ اگراب قائم نہ ہوا تو پھر کبھی نہ ہوسکے گا۔ہماری گفتگو رات کے بارہ ایک بجے تک رہی اور بالآخر مولانا دہلی تشریف لانے کے لیے آمادہ ہوگئے،اب اس داستان کو یہیں چھوڑیے۔کتاب کا دوسرا ورق پڑھیے:

ادارہ باضابطہ قائم ہوگیا اور میرا ذاتی کتب خانہ جو حدیث،تفسیر، فقہ اور تاریخ کی منتخب کتب پر مشتمل تھا کلکتہ سے دہلی منتقل ہوگیا۔ ادارے کے نام کا سوال آیا تو مختلف ناموں پرغور ہوا۔ دوستوں نے بہت سے نام تجویز کیے مولانا حامدالانصاری غازی رفیق ادارہ نے ''ندوۃ المصنفین'' تجویز کیا اور ہم سب اس نام پرمتفق ہوگئے۔ادارہ تو قائم ہوگیا، اس کے اغراض ومقاصد بھی شائع ہوگئے، اخبارات میں اظہار رائے بھی ہونے لگا۔لیکن تردد یہی تھا کہ یہ شاہانہ کام اس معمولی روپے سے کیسے چلے گا ابھی شائد مشکل سے ایک مہینہ ہوا ہوگا کہ جنوری ۱۹۳۸ء کی شدید سردی میں شیخ صاحب دفتر میں تشریف لائے، جاڑے کے کچھ قیمتی تحفے ساتھ تھے۔ بیٹھتے ہی فرمانے لگے ''مفتی صاحب'' آپ نے تو واقعی ادارہ قائم کرلیا میں نے تو صرف آپ کے شوق کو دیکھ کر وہ رقم پیش کی تھی،اچھا بتایئے آپ کی فوری ضرورتیں کیا ہیں؟ میں نے ابتدائی ضروریات کی تھوڑی سی تفصیل بتائی، کرایہ مکان، فرنیچر، لائبریری اور کچھ متفرق ضرورتیں۔ اسی وقت ایک سال کے کرایہ کا وعدہ فرمالیا،فرنیچر کا کام بارہ ہندوراؤ کی چھوٹی مسجد کے امام صاحب کے سپرد کیا اور اُس نشست یا دوسری نشست میں سات ہزار روپے کا وعدہ لائبریری کے لیے فرمایا۔ ان کے وعدے اور عطا کا فاصلہ بہت تھوڑا ہوا کرتا تھا، شائد وعدے کے اگلے ہی دن اس رقم کا بھی چیک بھیج نہیں دیا خود لے کرتشریف لائے۔اسی کے ساتھ ''جیون بخش فیروز الدین فرم'' سے جس کا موجودہ نام ''جیون بخش محمد جان'' ہے ایک مستقل ماہانہ رقم مقرر فرمادی جو سالہاسال تک جاری رہی۔

۱۹۳۷ء سے انقلاب ۱۹۴۷ء تک کوئی قابل ذکر منزل ایسی نہیں آئی کہ مرحوم نے ادارے کی تعمیر اورتوسیع وترقی میں بڑھ چڑھ کرحصہ نہ لیا ہو۔ مجھے یہ ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ مرحوم شیخ فیروزالدین اگر ندوۃ المصنفین کی

اعانت اتنی فراخ دلی اور کشادہ دستی سے نہ فرماتے تو ادارہ اتنے بڑے پیمانے پر اتنی شاندار علمی خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ مرحوم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے صاحبزادوں شیخ محمد احمد صاحب فیروزی اور شیخ محمد یوسف صاحب فیروزی کو ان کے نقوشِ قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

[جولائی ۱۹۷۱ء]

حبیب، پروفیسر محمد

پروفیسر محمد حبیب

افسوس ہے گذشتہ ماہ جون کی ۲۲ تاریخ کو پروفیسر محمد حبیب نے ۷۳ برس کی عمر میں علی گڑھ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ موصوف ہماری نسل کے اُن معدودے چند اکابر علم وادب میں سے تھے جن کے زورِ قلم، وسعت مطالعہ اور مجتہدانہ فکر ونظر نے یورپ اور امریکہ کے علماء اور فضلاء کو بھی متاثر کیا تھا۔ وہ جتنے بڑے اسکالر تھے بحیثیت انسان کے بھی اتنے ہی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ طلباء کی تعلیمی، علمی، مالی غرض کہ ہر قسم کی اور ہر وقت خدمت ان کا دین وایمان تھا۔ طبیعت بالکل درویشانہ پائی تھی۔ نام ونمود اور دکھاوے کا نام ونشان نہ تھا۔ نہایت خلیق، ملنسار، متواضع انسان تھے۔ ان کے بعض افکار وآراء سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اور ہمیں بھی تھا لیکن ان کی شرافت، انسانیت دوستی اور جذبۂ خدمت خلق ہر شک وشبہ سے بلند تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل عمیم سے ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

[اگست ۱۹۷۱ء]

محمود، مولانا سید

مولانا سید محمود

پچھلے دنوں مدینہ منورہ میں مولانا سید محمود صاحب کا بھی انتقال ہوگیا۔ مولانا بڑے عالم اور متقی وپرہیزگار بزرگ تھے۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے بردارِ خورد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم اور تقویٰ کے ساتھ کاروباری سمجھ بوجھ کے باعث دولت وثروت بھی ایسی وافر عطا فرمائی تھی کہ اس حیثیت سے بھی سعودیہ عرب میں ان کی شخصیت ممتاز اور نمایاں تھی، وہ طبعاً نہایت مخیّر، فیاض اور کشادہ دست تھے۔ ہر کارِ خیر میں پیش پیش رہتے تھے۔ پبلک کے علاوہ حکومت پر بھی ان کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ متعدد تعلیمی وصنعتی ادارے ان کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے۔ آمین

[اگست ۱۹۷۱ء]

خیر بہوروی

خیر بہوروی

پچھلے دنوں ہمارے دوست جناب خیر بہوروی بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مرحوم اردو کے قدیم اور روایتی خدمت گزار تھے اور اردو ادب کی خدمت ہی ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا۔ شروع میں انجمن ترقی اردو کے مرکزی دفتر میں مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ کام کیا اور مولوی صاحب کے مضبوط دست و بازو ثابت ہوئے۔ پھر جب انقلاب ۱۹۴۷ء کی لپیٹ میں آکر ''انجمن'' کا دفتر دہلی سے علی گڑھ منتقل ہوا تو وہاں قاضی عبدالغفار صاحب کی رفاقت میں آرگنائزر کی حیثیت سے انجمن کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ خیر صاحب اردو کے پرجوش، تجربہ کار اور مخلص کارکن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن ترقی اردو سے رسمی قطع تعلق کے بعد بھی اردو ادب کی خدمت میں اسی طرح لگے رہے۔ اب ایک عرصے سے ان کی سرگرمیوں کا مرکز لکھنؤ کا ''لاری ہاؤس'' ہوگیا تھا، مستقل طور پر وہیں قیام پذیر تھے۔ لکھنؤ کے ادبی اجتماعات کی رونق ان کے دم سے قائم تھی۔ ''میرا کاڈمی'' کے سکریٹری کی حیثیت سے بڑی جاں فشانی اور لگن سے کام کررہے تھے۔ انھوں نے اس اکاڈمی کے ذریعہ میرؔ اور غالبؔ پر بعض ایسے تحقیقی کام بھی کیے جو اردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہیں گے، یہ کام ابھی مکمل نہیں ہوئے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا۔

مرحوم عرصے سے مسلسل علیل تھے، شائد ایک آنکھ بھی خراب ہوگئی تھی لیکن بُڑھاپے اور بیماری کے باوجود قوم کے اس خادم کے ارادے جوان تھے۔ خیر صاحب کو ندوۃ المصنفین کے کاموں سے بھی خاص دل چسپی تھی اس کے حلقہ معاونین کی توسیع کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔ یوں بھی بڑے باوضع تھے، جس سے جو تعلق قائم ہوگیا اس کو آخر تک خوب صورتی سے نبھایا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ جناب مقبول احمد صاحب لاری سے بجا طور پر توقع ہے کہ ''میرا کاڈمی'' کی بدستور سرپرستی فرماتے رہیں گے، اور خیر صاحب جو کام نامکمل چھوڑ گئے ہیں ان کو مکمل کرانے کی سعی کریں گے۔

[اگست ۱۹۷۱ء]

نوری، محمد یٰسین (بیرسٹر)

محمد یٰسین نوری بیرسٹر

جناب محمد یٰسین صاحب نوری بیرسٹر بھی ہماری قومی اور ملی زندگی کے بڑے ممتاز ہیرو تھے۔ گجرات ان کا وطن تھا۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی اس لیے اس کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے بڑے فعال اور مخلص رکن تھے۔ ولایت جا کر بیرسٹری کی اور بمبئی میں رہائش اختیار کی۔ خلافت تحریک سے لے کر کانگریس کی جنگ آزادی تک ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مگر اپنی کسی خدمت کا صلہ طلب نہیں کیا۔ آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کی حالت زار نے ان کی تمام توجہات اور مساعی کو اس حالت کے سدھارنے پر مرکوز کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جس بے باکی اور جرأت سے کام کیا وہ اُن کے غایت خلوص اور بے غرض خدمت قوم کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی بل کے سلسلہ میں انھوں نے اولڈ بوائز کونسل کے ایک وفد کے قائد کی حیثیت سے ابھی حال میں ہی وزیراعظم سے جو ملاقات کی تھی تو اس میں علی گڑھ کا معاملہ اس خوبی سے پیش کیا کہ وزیراعظم قائل ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کی فلاح و بہبود اور کامرانی و کامیابی سے نوازے اور ان کی قبر ٹھنڈی رہے۔ آمین [اگست ۱۹۷۱ء]

بلیاوی، مولانا عبدالحفیظ

مولانا عبدالحفیظ بلیاوی

ابھی چند روز ہوئے (۲۶ رجولائی کو) مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی بھی ہم کو داغِ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم دارالعلوم دیوبند کے قدیم فارغ التحصیل تھے اور اب ادھر ایک عرصہ سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی زبان وادب اور دوسرے علوم وفنون دینیہ کے نامور استاد تھے۔ استعداد بڑی پختہ تھی اور مطالعہ وسیع تھا۔ عربی زبان وادب کا ذوق فطری تھا جس کی شاہد عدل ان کی مشہور متداول کتاب ''مصباح اللغات'' مطبوعہ مکتبہ برہان ہے اور جس پر ان کو وزارت تعلیم اور یوپی گورنمنٹ کی طرف سے انعامات بھی ملے تھے۔ طبعاً بڑے متواضع، خوددار اور خلیق و ملنسار تھے۔ ابھی گزشتہ مئی کی ۱۷ر تاریخ کو ان کی قیام گاہ پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ چند ماہ سے بیمار تھے لیکن اس وقت اس کا خیال بھی نہیں تھا کہ یوم موعود اتنا قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ ابرار وصلحاء کا مقام جلیل عطا فرمائے۔ آمین [اگست ۱۹۷۱ء]

محمود، ڈاکٹر سید

ڈاکٹر سید محمود

افسوس ہے ڈاکٹر سیّد محمود بھی رخصت ہوگئے۔ وفات کے وقت عمر ۸۲ برس کی تھی۔ مرحوم برلن کے پی۔ ایچ۔ ڈی اور انگلستان سے بارایٹ لاء اور گھر کے بھی بڑے خوشحال تھے۔ لیکن قومی وملّی خدمت کا جذبہ شروع ہی سے تھا اس لیے اولاً تحریکِ خلافت اور پھر تحریکِ آزادی دونوں میں ہراوّل دستہ کے فرد رہے، اس جرم کی پاداش میں کئی مرتبہ جیل گئے اور قید و بند کی سختیاں انگیز کیں پھر قومی حکومت بنی تو ریاست اور مرکز دونوں میں وزیر رہے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر سالہا سال رہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ اوّل درجہ کے نیشنلسٹ ہونے کے باوجود دل اور دماغ دونوں کھلا رکھتے تھے۔ چنانچہ تقسیم کے بعد مسلسل فسادات ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ختم نہیں ہوئی تو انہوں نے قومی سطح پر اس کا انسداد کرنے کی غرض سے مجلس مشاورت بنائی اور چند سال اس کے صدر کی حیثیت سے ملک کا دورہ کیا لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے چند رفیق اس پلیٹ فارم کو اپنے فرقہ پرورانہ مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں تو وہ اس سے الگ ہوگئے لیکن خانہ نشین پھر بھی نہیں ہوئے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لیتے رہے۔ مرحوم کا علمی اور ادبی ذوق بھی بہت شگفتہ اور شائستہ تھا۔ سیاسی مصروفیتوں میں تھوڑا بہت انگریزی اور اردو میں جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے نہایت باوضع، بامروت شریف الطبع اور خلیق بزرگ تھے۔ ان کی وفات سے ملک میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہیں ہو سکے گا۔ اللھم اغفرلہٗ وارحمہ۔ [اکتوبر ۱۹۷۱ء]

کاظمی، اسداللہ

اسداللہ کاظمی

گزشتہ مہینہ ایک اور حادثۂ وفات جناب اسداللہ صاحب کاظمی کا پاکستان میں پیش آیا جہاں وہ اپنے اعزا سے ملاقات کی غرض سے دو ماہ پیشتر ہی گئے تھے۔ مرحوم نہایت قابل اور بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ انگریزی نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ تعلیم کے بڑے ماہر تھے۔ اتر پردیش میں تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر رہے اس کے بعد یونیسکو کی طرف سے کم وبیش آٹھ برس تک حکومتِ عراق کے مشیر تعلیم کی حیثیت سے بغداد میں قیام پذیر رہے۔ اس سے سبکدوش ہوکر الہ

آباد میں مقیم ہوگئے۔اسی زمانہ میں سنٹرل وقف کونسل کی طرف سے مسلمان طلباء کے لیے پرائمری ایجوکیشن کا نصاب بنانے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو اگرچہ اس کی صدارت راقم الحروف کے سپرد تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ کاظمی صاحب مرحوم نے کمیٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے نہایت اہم اور مفید رول ادا کیا۔وہ برابر کمیٹی کی میٹنگس میں شریک اوراس کی کارروائیوں میں پوری دلچسپی اور سرگرمی سے حِصّہ لیتے رہے اور کمیٹی کی رپورٹ اورنصاب بہت کچھ انہیں کی رہنمائی کا نتیجہ ہے۔بغداد میں رہ کرقرآن مجید اوراسلامیات پرکتابوں کے مطالعہ کا بڑا شوق پیدا ہوگیا تھا۔اخلاقی اعتبار سے نہایت شریف ،بلندنظراور بیحد ہمدرد وملنسار بزرگ تھے۔جب کبھی ملاقات ہوتی تھی راقم الحروف سے ہمیشہ قرآن مجید کے کسی حکم یاکسی آیت پرگفتگو کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کوحسناتِ دینی و دنیوی سے نوازا تھا۔اب آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کوابرار وصلحا کا مقام عطافرمائے۔ آمین۔ [اکتوبر۱۹۷۱ء]

خان،مولانا رسول

مولانا رسول خان

لاہور کی ایک اطلاع سے یہ معلوم کرکے بہت افسوس اور دکھ ہوا کہ حضرت الاستاذ مولانا رسول خاں صاحب بھی انتقال کرگئے۔انتقال کے وقت عمر ایک سوچار یاپانچ کے لگ بھگ ہوگی۔ راقم الحروف کی طالبعلمی کے زمانہ میں اگرچہ دارالعلوم دیوبند کاہراستاداپنے فن میں ماہر اورکامل تھا لیکن چاراساتذہ ایسے تھے جواپنا جواب نہیں رکھتے تھے اورارباب علم کے حلقوں میں ان کی شہرت کا طوطی بولتا تھا۔حدیث میں حضرتنا الاستاذ مولانا محمدانور شاہ الکشمیر ی،ادب میں مولانا محمد اعزازعلی صاحبؒ ،منطق میں مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اورفلسفہ میں مولانا رسول خاں صاحب رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً۔چنانچہ راقم نے جس سال منطق کی آخری کتابیں حمداللہ اورقاضی مولانا محمدابراہیم صاحب سے پڑھی تھیں اسی برس فلسفہ کی اعلیٰ کتابیں صدرا اور شمس بازغہ مولانا رسول خاں صاحب سے پڑھیں، یہ دونوں استاد کتاب نہیں بلکہ فن پڑھاتے تھے۔طالب علم نے کیا اورکتنی عبارت پڑھیں ہے اس سے ان کوکوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔طالب علم عبارت پڑھتے پڑھتے رک گیا یاانھوں نے ہی رکوادیا تواب کتاب کودیکھے بغیر منہ اٹھا کرتقریر شروع کردی۔ اللہ اکبر! یہ تقریر کیاتھی،معلوم ہوتا تھا کہ علم وفن کے سمندر میں طوفان اٹھ آیا ہے اورموجیں ہیں کہ ایک دوسرے سے ٹکرارہی ہیں۔اس تقریر میں نفس مسئلہ کی وضاحت ہوتی تھی اوراس کے بعد اختلافات کامع دلائل بیان اور پھران پرتنقید وجرح اورمذہب حق کی ترجیح اوراس کے وجوہ۔ پھران دونوں حضرات کے درس کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ بھی تھی کہ تقریر بڑے اطمینان اورسکون سے کرتے تھے۔اس میں نہ عجلت پسندی ہوتی نہ گھبراہٹ اور نہ کہیں زورشور! البتہ فرق یہ تھا کہ مولانا محمدابراہیم صاحب بڑے شگفتہ مزاج،خوش تقریراور بزلہ سنج بھی تھے،اس لیے ڈبیاسے نکال کر پان کھاتے جاتے اورموقع موقع سے کچھ مزاحیہ فقرے کہہ کرخود بھی ہنستے اور ہم لوگوں کوبھی ہنساتے رہتے تھے۔اس کے برخلاف مولانا رسول خاں صاحبؒ شروع سے آخر تک سنجیدہ بنے اور گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے تقریر کرتے رہتے تھے۔قہقہہ لگانا تو جیسے انھیں آتا ہی نہ تھا۔کبھی کبھی ان کے لبوں پرتبسم کاارتعاش البتہ ضرور دیکھا گیا ہے۔کسی طالب علم سے خفگی ظاہر کرنی ہوتی تواسے ''حمار ناہق'' کہتے تھے۔ اس طریق درس کے باعث کتاب توکبھی ختم نہیں ہوتی تھی لیکن اس کاعظیم فائدہ یہ تھا کہ طالب علم میں فن کا پختہ ذوق پیدا ہوجاتا اوراس کے مسائل ومباحث پراس کی نگاہ مبصرانہ ہوجاتی تھی۔مولانا رسول خاںؒ صاحب ایک عرصہ تک دارالعلوم میں رہنے کے بعد اورینٹیل کالج لاہور میں تشریف لے گئے۔تقسیم کے بعد لاہور میں دارالعلوم دیوبند کے طرز کی ایک عالیشان درس گاہ ''جامعہ اشرفیہ'' کے نام سے قائم ہوئی تو مولانا اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

۶۹ء میں لاہور جانا ہواتو ایک دن اپنے عزیز ڈاکٹر محمد اسلم کے ساتھ عصر کی نماز کے بعد آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا،جامعہ کی عظیم الشان مسجد کے صدر دروازے کے باہر سبز گھاس پررومال بچھائے آرام کررہے اور دوطالب علم خدمت کررہے تھے۔ اس وقت عمر سوسال سے متجاوز تھی اور ضعف اور اضمحلال بھی نمایاں تھا لیکن اس کے باوجود درس کا سلسلہ (غالباً اب حدیث پڑھاتے تھے) اب بھی جاری تھا۔گفتگو خوب حاضر جوابی سے کرتے تھے۔ بصارت اگرچہ کمزور ہوگئی تھی لیکن لوگوں کو پہچان لیتے تھے۔اب میں چالیس پینتالیس برس کے بعد خدمت میں حاضر ہورہا تھا اوراس درمیان میں کبھی مراسلت اورخط وکتابت بھی نہیں ہوئی توخیال تھا کہ حضرت مجھ کو پہچانیں گے تو کیا؟ لیکن وہاں پہنچتے ہی جب میں نے سلام کے ساتھ مصافحہ کیا اورمیاں اسلم سلمہ نے میرانام جنس اورفصل کے ساتھ لیا تو حضرت اس طرح مسکرائے کہ گویا اپنے دیرینہ شاگرد کو پہچان لیا ہے اورصرف اسی قدر نہیں بلکہ وہ اپنے شاگرد کی مصروفیتوں اورسرگرمیوں سے بھی بے خبر نہیں۔چنانچہ خیر صلاّ کے بعد پوچھا:

مولوی صاحب ! آپ نے تو ہوائی جہاز کے سفر بہت کیے ہیں۔ یہ کہیے کہ آپ ہوائی جہاز میں نماز کس طرح پڑھتے ہیں؟ عرض کیا: میں ہوائی جہاز میں نماز ہی نہیں پڑھتا: مولانا نے تعجب سے فرمایا: اچھا! آپ نماز ہی نہیں پڑھتے ! آخر یہ کیوں؟ میں نے جواب دیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ریل کا معمولی سفر بھی کرتا ہوں تو اس میں جمع بین الصلوٰتین کرتا ہوں اور پھر ہوائی جہاز ہر ڈیڑھ دو گھنٹہ کے بعد کہیں نہ کہیں اترتا اور چالیس پینتالیس منٹ قیام کرتا ہے اس لیے جس کسی ائیرپورٹ پر وقت ہوا دو نمازیں ایک ساتھ پڑھ لیتا ہوں مجھے اندیشہ تھا کہ مولانا میرا یہ جواب سن کر برہم ہوجائیں گے لیکن مجھے تعجب کے ساتھ خوشی ہوئی جب مولانا نے فرمایا: اور ہاں! ہوائی جہاز میں نماز ہو بھی تو نہیں سکتی۔عبدالجبار صاحب ایڈوکیٹ جو اس وقت موجود تھے انھوں نے پوچھا : ''حضرت کیوں؟ فرمایا: نماز کے لیے ضروری ہے کہ علی وجہ الارض ہو:'' تو پھر پانی کے جہاز میں نماز کیوں پڑھتے ہیں''؟ انھوں نے پھر دریافت کیا: ارشاد ہوا: سمندر حکم میں زمین کے ہے'' میں نے عرض کیا: یہ بات تو دوسری ہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا۔لیکن جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے میری رائے میں نماز ہوائی جہاز میں ناجائز یا نادرست نہیں۔کیوں کہ وجوب و ادائے صلوٰۃ کے لیے انسان کا 'زمین' پر ہونا شرط نہیں ہے ۔قرآن مجید یا حدیث میں کہیں اس کا ذکر نہیں فقہانے اگر ''علی وجہ الارض '' کی قید لگائی ہے تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ اب انسان تنگنائے ارض کو اپنے لیے ناکافی پاکر دوسرے سیاروں کو اپنا مسکن بنانے کی جدوجہد کررہا ہے اور اس میں آج نہیں تو کل ضرور کامیاب ہوگا۔اقبال پہلے ہی کہہ گئے ہیں:

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

لیکن انسان خواہ کہیں بھی رہے، بہرحال اسے عبد ہوکر رہنا ہے۔اور اس لیے عبادت سے خلاصی نہیں'' ابھی میں بول ہی رہا تھا کہ مغرب کی اذان ہوگئی اور میں حضرت الاستاذ سے رخصت ہوکر مسجد میں چلا گیا۔

طبعًا نہایت خلیق ،متواضع اور بڑے عابد وزاہد بزرگ تھے۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی قبر ٹھنڈی رہے۔آمین۔

[نومبر ۱۹۷۱ء]

عبداللطیف، ڈاکٹر سید

ڈاکٹر سید عبداللطیف

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی بیاسی برس کی عمر میں رحلت گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔ موصوف کرنول کے ایک ممتاز خانوادہ شریعت وطریقت کے فردِ فرید تھے۔خود بڑے فاضل نامور مصنف اور انگریزی زبان کے ادیب اور اس کے نکتہ شناس تھے۔ ایک عرصہ تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں انگریزی زبان کے استاد اور پھر پروفیسر وصدر شعبہ رہے۔اسی زمانہ میں انھوں نے انگریزی میں غالبؔ پر ایک کتاب لکھی جس میں کلیم الدین احمد کی طرح غالبؔ کو مغربی فنِ تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی تھی اور اسی بنا پر اردو زبان وادب کے حلقوں میں اس کتاب نے بیزاری کے جذبات پیدا کردیے تھے۔راقم نے بھی سب سے پہلے موصوف کا نام اسی عنوان سے سنا تھا۔ اس کے بعد ان کا نام اس حیثیت سے سنا کہ انھوں نے تہذیبی منطقوں کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا ایک خاکہ مرتب کیا تھا۔اس خاکہ کی وجہ سے مرحوم کو بڑی شہرت حاصل ہوئی لیکن تقسیم کے بعد ان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور انھوں نے اپنی زندگی، یہاں تک کہ اپنا سرمایہ بھی اسلام کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔اس سلسلہ میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی معرکۃ الآرا تفسیر سورۂ فاتحہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور پھر خود بھی پندرہ بیس برس کی محنت کے بعد پورے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ایک مفصل اور مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ زبان اور اسلوب کے اعتبار سے یہ ترجمہ قرآن مجید کے تمام انگریزی تراجم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔علاوہ ازیں 'قرآن مجید کی تعلیمات' اور 'اسلامی کلچر' بھی بڑی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔

وفات سے چند برس پہلے سخت ضعفِ بصارت کے علاوہ چند درچند اسقام وعوارض کا مجموعہ ہوکر رہ گئے تھے لیکن کام کی دھن اور لگن ایسی تھی کہ اس عالم میں بھی اپنے خاص تلامذہ کی مدد سے اپنے تصنیفی وتالیفی کام کیے جاتے تھے۔ان کی تصنیف وتالیف کی اصل زبان انگریزی تھی، لیکن بعض رسالے اور مضامین اردو میں بھی لکھے ہیں۔طبعًا نہایت شریف خوش اخلاق اور مخلص انسان تھے۔ راقم الحروف پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے، حیدرآباد سے محبّ مکرم ڈاکٹر یوسف الدین صاحب جب کبھی علی گڑھ آتے تھے مرحوم کا سلام وپیغام ضرور لاتے تھے۔اس میں شبہ نہیں کہ قحط الرجال کے اس زمانہ میں موصوف کی وفات حسرت آیات مسلمانوں کے لیے ایک عظیم علمی اور ملی حادثہ ہے۔اللہ تعالیٰ مرحوم

کومغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔آمین۔ [دسمبر۱۹۷۱ء]

مہر، مولانا غلام رسول

مولانا غلام رسول مہر

چودھری غلام رسول مہر کا انتقال ۷۲ برس کی عمر میں گذشتہ مہینہ لاہور میں ہوا۔ہماری بزمِ علم وادب کے اہم رکن تھے۔ان کی شہرت کا آغاز ''اخبار نویس'' کی حیثیت سے ہوا۔ برسوں تک اخبار 'زمیندار' لاہور کی ادارت کرتے رہے۔ جب وہاں سے مولانا ظفر علی خاں کی پالیسی سے اختلاف کے باعث وہ اور عبدالمجید سالک الگ ہوئے تو دونوں نے مل کر بڑی آب وتاب اور طمطراق سے روزنامہ ''انقلاب'' نکالنا شروع کیا۔مہر صاحب افتتاحیہ لکھتے تھے جو بڑا پر مغز، مدلل اور سنجیدہ ہوتا تھا اور سالک ''افکار وحوادث'' لکھتے تھے، جو مزاحیہ ہوتے اور اردو زبان وادب کے چٹخاروں کے باعث بڑی دل چسپی اور شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ مہر صاحب کا قلم بڑا شگفتہ تھا، جو کچھ لکھتے تھے بڑے غور وفکر اور مطالعہ کے بعد لکھتے تھے۔وہ صرف اخبار نویس نہیں بلکہ صفِ اوّل کے ادیب مصنف اور محقق بھی تھے۔مرزا غالب اور حضرت سید احمد شہید ان کے تحقیقی مطالعہ کے خاص موضوعات تھے۔ان پر انھوں نے نہایت وقیع اور قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ان کی عقیدت ارادت کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔اس ارادت کے باعث ان کو قرآن مجید کے ساتھ بھی بڑا شغف اور اس کا خاص ذوق تھا۔افسوس ہے تقسیم کے بعد پاکستان میں ان کو وہ عروج حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔وہاں کی سوسائٹی میں ان کی شخصیت کچھ دب سی گئی تھی۔آخر عمر میں ان کی معاشی پریشانیاں بہت بڑھ گئی تھیں، جس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو ''نقوش کے مکاتیب نمبر میں چھپے ہیں۔اللہ تعالیٰ مغفرت اور دارِ آخرت کی راحتیں نصیب فرمائے۔ [دسمبر۱۹۷۱ء]

غلام السیدین، خواجہ

خواجہ غلام السیدین

افسوس ہے ہماری بزم علم وادب کی پرانی شمعیں ایک ایک کرکے اٹھتی جا رہی ہیں۔چنانچہ گزشتہ ماہِ دسمبر کی ۱۹؍کو خواجہ غلام السیّدین بھی ہم سے جُدا ہوگئے۔ مرحوم مولانا حالی کے نواسہ تھے اور حق یہ ہے کہ اس رشتہ کا جامہ مرحوم کے قامت موزوں پر ایسا راست آیا کہ خاندانوں میں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ وہ نوعمری میں علی گڑھ کے ٹریننگ کالج کے نامور پرنسپل ہوئے۔اس کے بعد رامپور، کشمیر اور بمبئی میں حکومت کے مشیر تعلیم کے عہدہ پر فائز رہے۔آزادی کے بعد مرکزی وزارت تعلیم میں سکریٹری ہوئے۔اور اس عہدہ سے پنشن پائی۔لیکن سچ یہ ہے کہ یہ سب عہدے ان کے علمی وادبی درجہ ومقام سے فروتر تھے۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ ادیب اور مقرر تھے۔ پچاسوں مقالات کے علاوہ انگریزی اور اردو میں متعدد وقیع کتابیں ان کی یادگار ہیں۔اگرچہ تعلیم اور اس کا فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا لیکن تاریخ اور مذہب سے بھی فطری لگاؤ تھا۔

بڑی بات یہ ہے کہ فکر ونظر کا اعتدال وتوازن بلا کا تھا۔وہ قدامت پرستوں میں ترقی پسند تھے اور ترقی پسندوں میں قدامت پرست۔تحریر وتقریر دونوں میں بڑا رچاؤ اور رکھ رکھاؤ تھا، اس بنا پر ہر طبقہ میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی، چنانچہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد امریکہ، کناڈا اور یورپ میں بار بار وزٹنگ پروفیسر ہوکر گئے۔آخر زمانہ میں اسلامیات کی طرف انہماک زیادہ ہوگیا تھا اور اس سلسلہ میں جب کبھی انہیں کوئی اشکال ہوتا راقم الحروف کو لکھتے تھے اور جواب سے خوش ہوتے تو اس کا اظہار ایک مستقل خط کے ذریعہ کرتے تھے۔نہایت مہذب، خوش طبع اور کریم النفس انسان تھے۔عمر ۶۷ کے لگ بھگ پائی۔اللہ تعالیٰ مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔اب تہذیب اور شائستگی کے ایسے نمونے کہاں ملیں گے؟ [جنوری۱۹۷۲ء]

کاندہلوی، مولانا احتشام الحسن

مولانا احتشام الحسن کاندہلوی

افسوس ہے ہمارے عزیز اور فاضل دوست مولانا احتشام الحسن کاندہلوی بھی گزشتہ نومبر میں شدید علالت کے بعد انتقال کرگئے۔مولانا کاندہلہ کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے لیکن ان کا مشغلہ تبلیغی کتابوں کی تصنیف وتالیف اور مطالعہ کے سوا کچھ نہ تھا۔شب وروز اسی میں بسر ہوتے تھے اور گفتگو کا موضوع بھی بس یہی ایک بات ہوتی تھی۔تبلیغی جماعت کے طریق کار سے ان کو اختلاف تھا۔وہ کہا کرتے تھے کہ تبلیغ تو نام ہی اسلام کو غیر مسلموں تک پہنچانے کا ہے۔مرض الوفات میں مبتلا ہونے سے ایک ماہ قبل علی گڑھ آئے اور ایک ہفتہ کے قریب قیام کیا۔ان دنوں میں ان سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی اور ہر ملاقات میں وہ اپنے اس محبوب موضوع پر تقریر کرتے رہے ہیں۔میں حسب عادت

خاموش سنتا رہا اور بولا کچھ نہیں۔مرض الوفات میں انھوں نے بڑی سخت تکلیف اٹھائی لیکن صبر ورضا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بڑے خلیق اور عابد وزاہد بزرگ تھے۔اللہ تعالیٰ ابرار وصلحا کا مقام عطا فرمائے آمین۔ [جنوری ۱۹۷۲ء]

حاوی، مولانا عبدالباری

مولانا عبدالباری حاوی

افسوس ہے گذشتہ ماہ ہمارے نہایت فاضل دوست مولانا عبدالباری صاحب حاوی نے بھی ہوائی جہاز کے ذریعہ حج کے ارادے سے جاتے ہوئے ظہران میں وفات پائی۔انا للہ وانا الیہ راجعون ۔مولانا وانمباڑی (شمالی ارکاٹ) کے باشندہ تھے اور وہیں حضرت مولانا گنگوہی حضرت شیخ الہند اور مولانا تھانوی کے ارشد تلامذہ سے علوم وفنون اسلامیہ ودینیہ کی تعلیم پائی۔یوں تو سب علوم وفنون میں کامل درک رکھتے تھے لیکن حدیث اور عربی ادب میں بڑا کمال حاصل تھا۔ پہلے مختلف مدارس اور ایک ہائی اسکول میں درس کی خدمات انجام دیں، اب ادھر دس برس سے مدراس کے مشہور جمالیہ عربک کالج میں صدر الاساتذہ کے عہدے پر فائز تھے۔عربی زبان اور اردو وفارسی میں شعر کہتے تھے۔ پہلے تخلص مجاہد تھا پھر حاوی کے تخلص سے مشہور ہوئے ۔بڑے خوش اخلاق اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ وضعداری، مروت اور شرافت ان کی فطرت تھی۔جیسا کہ سفرنامہ مدراس میں عرض کیا جاچکا ہے علالت اور ضعف کے باوجود راقم الحروف سے ملاقات کے لیے قیام گاہ پر تشریف لائے۔سات آٹھ مرتبہ حج وزیارت مدینہ سے مشرف ہوچکے تھے۔اس مرتبہ پھر جارہے تھے کہ اثنائے راہ میں پیغامِ اجل آپہنچا۔عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی اللہ تعالیٰ صدیقین وشہداء کا مقام عطا فرمائے۔آمین۔ [مارچ ۱۹۷۲ء]

اسمٰعیل، الحاج محمد

الحاج محمد اسمٰعیل

مسلم لیگ اور جمعیۃ العلمائے ہند دونوں ملک کی موقر اور باعظمت مسلم جماعتیں ہیں۔افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ دونوں جماعتوں کے صدر چند روز کے فصل سے راہی ملک بقا ہوگئے۔ان دونوں بزرگوں کی وفات ایک عظیم ملّی حادثہ ہے جس کی تلافی عرصہ تک ہوسکے گی۔الحاج محمد اسمٰعیل نہایت لائق وقابل اور بڑے معاملہ فہم اور سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ پارلیمنٹ میں جس کے ممبر وہ سالہائے سال سے تھے مالیاتی اور تجارتی مسائل و معاملات پر ان کی تقریر بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی۔تقسیم کے بعد مسلم لیگ سمٹ سمٹا کر مدراس اور کیرالا میں محدود ہوکر رہ گئی تھی۔مرحوم اس کے صدر منتخب ہوئے اور آخر تک رہے۔مرحوم نے اس جماعت کو اس خوبی سے چلایا کہ اس نے ملک کی سیاسی اور جمہوری جماعتوں سے اہم سیاسی معاملات میں برابر اشتراک و تعاون کیا اور حد یہ ہے کہ ایک مرتبہ وزیراعظم کی زبان سے اقرار کرالیا کہ مسلم لیگ فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے۔انگریزی میں ان کی تقریر بڑی پُرمغز، مدلل اور موثر ہوتی تھی۔یہ کمال ان کا ہی تھا کہ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کا جو رول اور نظریہ رہا ہے مرحوم تقسیم کے بعد میں اس کو بڑی جرأت وجسارت سے صحیح ثابت کرتے اور ہندوؤں کے بڑے بڑے مجمعوں میں اس کی مقبولیت پر مدلل تقریر کرتے اور اس کے باوجود ہر طبقہ اور ہر پارٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ان اوصاف وکمالات کے علاوہ بڑے متدین، متشرع، خوش اخلاق ومتواضع اور مخلص تھے۔اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔آمین [مئی ۱۹۷۲ء]

احمد، مولانا سید فخرالدین

مولانا سید فخرالدین احمد

اس حادثہ کے چند روز بعد ہی مولانا سید فخرالدین احمد صاحب کا حادثہ وفات پیش آیا۔حضرت شیخ الہندؒ کا فیضِ درس وتربیت ایک ابر کرم تھا جو عرب و عجم کے ہر خطے پر برسا اور ہر شخص نے بقدر حوصلہ واستعداد اس سے استفادہ کیا لیکن مولانا حضرت شیخ کے ان چند تلامذہ وتربیت یافتہ حضرات میں سے تھے جو علم وعمل، ورع وتقوی اور فکر ونظر کے اعتبار سے اپنے استاد وشیخ کے قالب میں ڈھل گئے تھے۔ چنانچہ ایک طرف ان کی حسین شخصیت درس حدیث کے مسند کی زینت تھی تو دوسری جانب زہد وورع اور عبادت وریاضت کے سجادہ کی رونق۔ وہ ایک طرف بلند پایہ اور وسیع النظر عالم محدث وفقیہ تھے تو اس کے ساتھ ہی جنگ آزادی اور میدان استخلاص وطن کے بہادر سپاہی اور مجاہد بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشغلہ درس وتدریس کے باوجود جمعیۃ العلماء سے اس کے ایک فعال ممبر کی حیثیت سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ عمر کا اکثر وبیشتر حصہ مدرسہ شاہی مراد آباد کی خدمت میں صرف ہوا۔شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی وفات حسرت آیات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث بھی مقرر ہوئے اور جمعیت علمائے ہند کے صدر بھی اور آخر اسی پر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ عمر کم وبیش پچاسی برس کی

پائی۔ادھر چندسال سے چند در چندعوارض واسقام کے باعث بہت کمزور اور چلنے پھرنے سے معذور سے ہوگئے تھے۔لیکن اس کے باوجود، اس کوان کی روحانی طاقت یاقوت ارادی کے علاوہ اور کیا کہیے کہ جب وہ درس بخاری کے لیے بیٹھتے تھے تو گھنٹوں ایک ہی نشست سے بیٹھے رہتے تھے۔ درس اور اسی سلسلہ میں طلبا کے سوالات کے جوابات پوری حاضر حواسی سے دیتے تھے اور تقریر کے وقت آواز میں بھی ضعیفی و پیری کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔طبعاً کم گو تھے،مگر جب ضرورت ہوتی تھی تو تقریر بہت واضح اور مدلل کرتے تھے۔خود بزرگ اور بزرگوں کی یادگار تھے۔ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پر ہونا قحط الرجال کے اس دور میں بہت مشکل ہے۔رحمۃ اللّٰہ رحمۃ واسعۃ۔

[مئی۱۹۷۲ء]

صدیقی، ڈاکٹر عبدالستار

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

افسوس ہے پچھلے ماہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کاالہٰ آباد میں انتقال ہوگیا۔مرحوم ہندوستان کے ان مغربی تعلیم یافتہ اکابر اساتذہ عربی وفارسی میں سے تھے جن کی نسل اب چراغ سحری ہے۔مرحوم علی گڑھ کے اس زمانے کے پڑھے ہوئے تھے جب کہ ابھی وہ صرف کالج تھا۔انہوں نے یہاں پروفیسر یوسف ہورووتس(JOSEF HOREVITZE)جو صدر شعبۂ عربی تھے ان کی شاگردی میں عربی میں ایم۔اے کیااور جب ان کو حکومت ہند کی جانب سے اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا تو موصوف کے ہی مشورے سے۱۹۱۲ء میں جرمنی چلے گئے۔اس زمانے میں جہاں تک عربی اور فارسی میں ریسرچ کا تعلق ہے فرانس کے ساتھ جرمنی کے نام کا بھی دنیا میں غلغلہ بلند تھا۔جرمنی میں جو مستشرقین علم و تحقیق کے جوئے شیر کے کوہکن مشہور تھے ان میں پروفیسر تھیوڈور نولڈیکی اور پروفیسر انولتمان(ENNO LITTMAN)(۱۸۷۵ء۔۱۹۵۸ء) سرخیل گروہ تھے۔ان دونوں کا اور خصوصاً موخرالذکر کا خاص فن سامی لسانیات تھا۔خوش قسمتی سے مرحوم کو جرمنی میں ان اساتذہ سے استفادہ کا پورا موقع ملا۔پروفیسر انولتمان ان کے استاد خصوصی تھے۔جن کی خدمت میں وہ مسلسل سات برس یعنی ۱۹۱۹ء تک رہے۔استاد نہایت شفیق اور علم و تحقیق کے بحر ناپیدا کنار کا کامیاب شناور اور شاگرد نہایت ذہین اور ہمہ طلب وجستجو! پھر کمی کس چیز کی تھی۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے فن لسانیات میں وہ کمال پیدا کیا کہ یورپ تک میں مشہور ہوگئے۔

جرمنی سے آنے کے بعد وہ علی گڑھ،حیدرآباد اور ڈھاکہ رہے لیکن آخر کار الہٰ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور صدر شعبۂ کی حیثیت سے ایسے جمے کہ یہیں سے ۱۹۴۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے اور یہیں مستقل طور پر رہ پڑے۔اپنے علم وفضل اور لسانیات میں خصوصی وسعت وقت نظر کے باعث جامعات اور ارباب علم کے حلقوں میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے جرمنی زبان میں ان کے مقالہ فضیلت کے علاوہ غالبًا کوئی مستقل تصنیف ان کی یادگار نہیں ہے۔تاہم جو مضامین(عربی کے علاوہ اردو وفارسی ادبیات پر بھی)ان کے قلم سے نکلے ہیں علم وتحقیق کا شاہکار ہیں۔

چار پانچ برس پہلے مرحوم سے آخری ملاقات جو علی گڑھ میں ہوئی تھی اس میں انھوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے اپنے تمام مطبوعہ مضامین فراہم کرلیے ہیں اور آج کل وہ ان پر نظر ثانی اور ان کی ترتیب وتدوین میں مصروف ہیں۔مرحوم علم وفضل کے ساتھ ہی اخلاق وعادات کے اعتبار سے نہایت شریف الطبع، باوضع اور خوش اخلاق وملنسار بزرگ تھے۔ان کی گفتگو معلومات سے پُر ہوتی تھی۔اصول وضوابط کے سخت پابند تھے۔ان میں کسی قسم کی مداہنت یارواداری کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔جس سے جو وضع ہوگئی اسے آخر تک نباہتے تھے۔راقم الحروف کے ایم۔اے(عربی) کے امتحان میں فلالوجی کے پرچہ کے وہی ممتحن تھے اور اس میں انہوں نے فرسٹ ڈویژن کے نمبر دیے تھے، جو وہ کسی خوش نصیب کو ہی شاذ ونادر دیتے تھے۔اس کے چند برسوں کے بعد جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو یاد دلایا کہ میں نے ان سے اتنے نمبر حاصل کیے ہیں تو انہوں نے فوراً پہچان لیا اور اس دن کے بعد سے ہمیشہ جب کبھی اور جہاں کہیں ملے بڑی محبت اور شفقت بزرگانہ سے ملے۔اب ایسے باوضع بزرگ کہاں ملیں گے!چند برس سے چند در چندعوارض واسقام کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے اور قوت حافظہ جس کے لیے وہ اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ ممتاز رہے بالکل جواب دے چکی تھی۔انتقال کے وقت عمر۹۰ سے کچھ زیادہ تھی۔اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔ [ستمبر۱۹۷۲ء]

محمد، ملّا جان

مُلّا جان محمد

افسوس ہے گذشتہ مہینہ ہمارے دومخلص قومی کارکن ملاجان محمد کلکتہ اور مولانا محمد عاقل الہ آباد انتقال کر گئے۔ملا صاحب کا اصل وطن پشاور تھا لیکن عرصہ دراز

سے کلکتہ میں آ بسے تھے اوراب سچ مچ وہی ان کا وطن تھا۔نہایت پُر جوش، جری اور بیباک انسان تھے۔گذشتہ نصف صدی میں کوئی قومی اور ملی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں انہوں نے بڑھ چڑھ کراورولولہ وعزم کے ساتھ حصہ نہ لیا ہو۔ان کی علمی زندگی کا آغاز تحریک خلافت سے ہوا اوراختتام مجلس مشاورت پر۔کلکتہ میں شاید ہی کوئی مسلم ادارہ (یہاں تک کہ محمڈن اسپورٹنگ کلب بھی) ایسا ہوجس میں ملاصاحب نے نمایاں حصہ نہ لیا ہو۔اسی وجہ سے وہ کلکتہ کے لوگوں میں بے حد مقبول تھے۔ بڑے بے غرض، بے لوث اورنہایت سادہ اورمخلص مسلمان تھے۔۱۹۵۰ء میں کلکتہ کے فساد میں لوگوں نے ان کو بچوں کی طرح چیختے اور روتے دیکھا ہے۔عمر ۸۵ سال کے قریب تھی۔ [نومبر۱۹۷۲]

عاقل، مولانا محمد

مولانا محمد عاقل

مولانا محمد عاقل الٰہ آباد دارالعلوم دیوبند کے باقاعدہ فارغ التحصیل تھے اوراستعداد بھی اچھی اور پختہ تھی۔ کچھ دنوں کسی مدرسہ میں درس کا کام بھی کیا تھا لیکن طبیعت کا اصل رجحان قومی اور ملی کاموں کی طرف تھا اس لیے جمعیۃ علماء سے وابستہ ہوگئے۔ان میں تنظیم کی بڑی اچھی صلاحیت تھی اورخاموش کام کرنے کے عادی تھے۔جمعیۃ کی موجودہ ہیئت وتنظیم سے اختلاف ہواتواس سے الگ ہوکر مجلس مشاورت کے سرگرم کارکن بن گئے اورادھربھی سرد بازاری دیکھی تومسلم مجلس میں چلے گئے اوراسی حالت میں چند ماہ بیمار رہ کرداعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں خادمان ملت کومغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے!

[نومبر۱۹۷۲ء]

حسین، پروفیسر سید احتشام

پروفیسر سید احتشام حسین

افسوس ہے پچھلے دنوں پروفیسر سید احتشام حسین کا اکسٹھ برس (۶۱) کی عمر میں اچانک حرکت قلب کے بند ہوجانے کے باعث الٰہ آباد میں انتقال ہوگیا۔ موصوف اردوزبان کے نامور استاذ، بلند پایہ ادیب، مصنف اورنقاد تھے۔اگرچہ انھوں نے لسانیات، تاریخ اورسماجیات پربھی لکھا ہے لیکن ان کی قلمی تگ ودو کا اصل میدان تنقید تھا۔اگرچہ وہ ترقی پسند نظریۂ ادب کے حامی اور اس کے علم بردار تھے لیکن طبیعت میں سنجیدگی تھی اورفکر میں اعتدال وتوازن،اس حیثیت سے انہوں نے اردوادب میں نئی تحریکوں کی رہنمائی کی اوران کو غلط راستہ پر پڑجانے سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ان کی تحریر شگفتہ اورارواں ہوتی تھی اوراس میں زبان کے چٹخارہ کے بجائے علمی وقار ہوتا تھا۔اردوزبان ادب میں محقق اورتنقید نگار نوجوانوں کی موجودہ نسل کے پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔اخلاق و عادات کے اعتبار سے بڑے شریف، ہمدرد ومتواضع اورسادہ طبیعت انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کومغفرت وبخشش کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔ [دسمبر۱۹۷۲ء]

تھنگل، سید عبدالرحمٰن

سید عبدالرحمٰن تھنگل

افسوس ہے گزشتہ مہینہ مسلمانوں کی بعض نمایاں شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں۔سید عبدالرحمٰن تھنگل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے۔سابق صدر مسلم لیگ محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے اس جماعت کا جووقار اورمرتبہ جنوبی ہند میں قائم کردیا تھا، سید عبدالرحمٰن تھنگل نے نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ بعض حیثیتوں سے اس میں اضافہ کیا۔ وہ نہایت سوجھ بوجھ اورفہم وتدبر کے سیاست دان تھے۔حکومت اوردوسری سیاسی پارٹیاں بھی ان کی لیاقت و قابلیت اور بلندکردار کی معترف تھیں۔ان کی دینداری کا ثبوت اس سے بڑھ کراورکیا ہوسکتا ہے کہ ان کی وفات حج سے فراغت کے بعد ہوئی اوران کا جسدِ خاکی سرزمین قدس کی امانت بن گیا، یہ وہ موت ہے جس پر زندگی کوبھی رشک آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مدارج ومراتب بلند فرمائے۔ [فروری۱۹۷۳ء]

نعمانی، مولانا عبداللطیف

مولانا عبداللطیف نعمانی

مولانا عبداللطیف نعمانی ایک مشہور عالم اورصاحب درس وتدریس بزرگ تھے۔ایک مدت سے مئو، ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ مفتاح العلوم میں شیخ الحدیث کے عہدہ پرفائز تھے۔اگرچہ سیاست کا میدان بھی ان کے تگ وتاز سے محروم نہیں رہا لیکن ان کا عمر بھر کا مشغلہ درس وتدریس تھا۔علوم دینیہ کے علاوہ منطق اورفلسفہ میں بھی ان کو بڑا کمال تھا۔سینکڑوں طلباء ان کے فیضِ تعلیم وتربیت سے مستفیض ہوئے۔ [فروری۱۹۷۳ء]

انصاری، عبدالقیوم

عبدالقیوم انصاری

عبدالقیوم صاحب انصاری بہار کے مشہور نیشنلسٹ اورقومی کارکن تھے۔

انھوں نے قید وبند کے مصائب بھی برداشت کیے اورتحریک پاکستان کے زمانہ میں اپنوں کے ہدف ملامت بھی بنے، لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔وہ بہار گورنمنٹ میں وزیر تھے لیکن ان کا طورطریق بالکل عوامی تھا۔ان کی زندگی ارباب حاجت کی مدد کے لیے وقف تھی۔چنانچہ ان کی وفات بھی خدمت کرتے ہی واقع ہوئی۔سیاسیات میں غایت درجہ انہماک کے باوجود نماز، روزہ کے پابنداور بڑے خلیق اورمتواضع تھے۔ [فروری۱۹۷۳ء]

فرقت، غلام احمد

غلام احمد فرقت

غلام احمد فرقت اردو زبان کے بڑے اچھے نثر نگار اورشاعر تھے۔انہوں نے طنز نگاری کاایک دلکش اسلوب پیدا کیا تھا۔جس میں قومی اورملی معاملات و مسائل پر بہت دلچسپ اورمعنی خیز تبصرہ کرجاتے تھے۔اس اعتبار سے اگران کو اردو نثر کا اکبرالہ آبادی کہاجائے تو بجا ہے۔ان کے نگارشات کے متعدد مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ان کی موت بڑی حسرت ناک ہوئی، ریل میں سفرکررہے تھے کہ دل کا دورہ پڑااوروہ وہیں ختم ہوگئے۔اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کومغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔ [فروری۱۹۷۳ء]

احمد، حاجی اقبال

حاجی اقبال احمد

افسوس ہے ۱۶،۱۷/اپریل کی درمیانی شب میں ہمارے علاقے اوردہلی کے مشہورومعروف صاحب خیرحاجی اقبال احمد صاحب ۷۲سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔مرحوم ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے قبل پھاٹک حبش خاں میں انڈے،مرغی کی تجارت کرتے تھے۔انقلاب کے بعد جامع مسجد کے علاقے میں آگئے اوریہی کاروبار اورمچھلی کا کاروبار وسیع پیمانے پر کرنے لگے۔ ہرشہر میں بڑے بڑے تاجر ہوتے ہیں، حاجی صاحب بھی ایک بڑے کاروباری تھے لیکن ان کی غیر معمولی خصوصیت یہ تھی کہ اوّل درجے کے صاحب خیر تھے،امورخیر کی جستجو اورتلاش میں رہتے تھے اوراجتماعی اورملی کاموں میں ذوق وشوق سے حصہ لیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ دوردور تک ان کی شہرت تھی۔رمضان المبارک میں مدارس عربیہ کے سینکڑوں سفیران کے یہاں آتے تھے اورمرحوم بڑے حوصلے سے ان مدرسوں اور دینی درسگاہوں کی خدمت کرتے تھے۔سفیروں کے ہجوم اورکثرت کی وجہ سے گزشتہ کئی سال سے یہ معمول بنالیا تھا کہ رمضان المبارک کی ۲۱ تاریخ سے زکاۃ کی تقسیم شروع کرتے تھے اورپھرآخر تک یہ سلسلہ قائم رہتا تھا۔مسجد مچھلی دالان میں چندہ لینے والوں کی لائنیں لگ جاتی تھیں اورحاجی صاحب صبر و برداشت بلکہ خندہ پیشانی سے ان سب کی مدد کرتے تھے، پتے لکھے ہوئے سینکڑوں منی آڈر فارم علیٰحدہ آتے تھے جوعید کے بعد روانہ کیے جاتے تھے۔ بیواؤں اورنادارشریف گھرانوں میں بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکیوں کی شادیوں میں امداد کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ویران اوراُجڑی ہوئی مسجدوں کی تعمیر اورآبادی میں والہانہ انداز سے حصہ لیتے تھے، رنگ روڈ پر شاہ بڑے کی حسین وجمیل اور وسیع مسجد ان کی حرارت ایمانی کی زبردست یادگار ہے۔ وزیراعظم کی سادھیوں کے درمیان اس خوبصورت مسجد کے سبک میناروں کی عجیب شان نظرآتی ہے، انقلاب سے پہلے یہ مسجد زیادہ آبادنہیں تھی اب اس میں وسیع پیمانے پرنماز تراویح ہوتی ہے اورعیدین کی نمازیں بھی، پانچوں وقت کی نمازوں کا بھی اہتمام ہے اور حاجی صاحب کی طرف سے باضابطہ امام مقرر ہے۔محلّہ کی مسجد کی توسیع وترقی کے علاوہ اس کی مستقل آمدنی کا انتظام بھی کرگئے۔

مرحوم کئی سال سے ضیق النفس کی تکلیف میں مبتلا تھے اور پیشاب کی نالی کے غدود بھی بڑھ گئے تھے، اسی کے ساتھ دیگرعوارض بھی جمع ہوگئے تھے۔ پریشانی کی حالت میں ہمدرد نرسنگ ہوم میں داخل کیے گئے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے ہمدردی وغمگساری سے علاج کیا۔ آپریشن اگرچہ نازک تھا بلکہ متعددعوارض اورغیرمعمولی ضعف کی وجہ سے انتہائی نازک ہوگیا لیکن کامیاب رہا اورمشکل مرحلے آسان ہوتے گئے یہاں تک کہ تقریباً صحت یاب ہوکرہسپتال سے آگئے۔ ہم سب مسرور تھے کہ ایک اعلیٰ درجے کے صاحب خیر اورنیک دل شخص کو دوبارہ زندگی مل گئی۔انتقال سے ایک روزقبل بلکہ کہنا چاہیے کہ چند گھنٹے پہلے نیچے دکان میں ہشاش بشاس بیٹھے ہوئے تھے اورہر دن سے بہتر تھے کہ شب میں ۳ بجے کے قریب دل کا دورہ پڑااور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انالله و انالیه راجعون۔

مرحوم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے اعمال خیر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اکلوتے صاحبزادے عزیز حاجی شیخ سلطان احمد صاحب کوتوفیق صبورضا سے نوازے اوراپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے، اموردینی میں بھی اوراموردنیاوی میں بھی۔

[مئی۱۹۷۳ء]

صالح، حاجی محمد

حاجی محمد صالح

دوسرا افسوسناک سانحہ ۶/مئی کی شام کو محترم حاجی محمد صالح صاحب کی وفات کا پیش آیا۔ صالح صاحب کئی سال سے معذور ہوگئے تھے اور صاحب فراش تھے، یوں بھی عمر طبعی کی سرحد پار کر چکے تھے لیکن چل رہے تھے اور ان کے صاحبزادے حاجی خواجہ محمد سلیم صاحب دل وجان سے ان کی خدمت کر رہے تھے۔ اس طویل مدت میں کبھی کبھی حالت نازک بھی ہوجاتی تھی مگر سنبھل جاتے تھے۔ ۶/مئی کی صبح کو آخری سانس لینے لگے اور شام کے ۵ بجے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ حاجی محمد صالح صاحب اپنی گوناگوں اور غیر معمولی خصوصیات کی وجہ سے دہلی والوں میں ممتاز بلکہ لاجواب تھے اور اپنی ذات سے صحیح معنی میں ایک انجمن تھے۔ اجتماعات اور مجالس کی رونق اور جان۔ سوسائٹی کے ہر طبقے میں مذہب وملت کے امتیاز کے بغیر مقبول تھے اور قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی فرم ''حاجی علی جان'' نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک کی روایتی فرم تھی، ایک زمانے میں اس کا کاروبار نہایت وسیع تھا، اور دہلی اور حجاز دونوں جگہ بڑے پیمانے پر لین دین ہوتا تھا۔ فرم حاجی علی جان کی امانت ودیانت کا عام شہرہ تھا اس فرم میں لاکھوں روپے کی امانتیں رہتی تھیں۔ حج کو جانے والے بے جھجک لاکھوں روپے اس فرم کو جمع کراتے تھے اور مکہ معظّمہ میں صرف رقعہ دکھا کر رقم لے لیتے تھے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ سے پاک ہے کہ فرم حاجی علی جان مسلمانوں کے لیے ریزرو بینک سے بھی زیادہ معتبر ومستند تھی۔ حاجی صاحب مرحوم اس تاریخی فرم کے مالک تھے، قومی اور ملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایک وقت میں بڑے بڑے اہم اجتماعات کوٹھی حاجی علی جان ہی میں ہوا کرتے تھے۔ حاجی صاحب کے والد محترم حاجی عبدالغفار صاحب جن کی ہم نے بارہا زیارت کی تھی، حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ندیم خاص تھے۔ امام صاحب جامع مسجد، نواب ابوالحسن خاں، نواب فیض محمد خاں وغیرہ اصحاب کی ایک خاص مجلس تھی اور دہلی کے اکثر مسلم مسائل اسی مجلس کے گرد گھومتے رہتے تھے، حاجی محمد صالح صاحب نے بھی اپنے بچپن اور جوانی میں ان اکابر کی مجلس میں شریک ہوکر کسب فیض کیا تھا۔

مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث سمجھے جاتے تھے لیکن ان کی پاک روح پر مذہبی گروہ بندیوں کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھیں۔ رواداری اور وسیع المشربی کا صاف وشفاف پیکر تھے اور حقیقی معنی میں قومی یک جہتی کی نشانی، راسخ العقیدہ قوم پرور تھے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ بربریت میں ماریں بھی کھائیں، جان کو خطرے میں بھی ڈالا لیکن اپنے طے شدہ مسلک پر چٹان کی طرح جمے رہے، عین اُس وقت بھی دکان جاتے تھے جب نئی سڑک سے گزرنا ہر کس وناکس کا کام نہیں تھا۔ جب تک چلنے پھرنے کے لائق رہے عید، بقرعید کے موقع پر ہم لوگوں کو ساتھ لے کر جواہر لعل جی، مولانا آزاد اور دوسرے حضرات کے یہاں بڑے اہتمام سے جاتے تھے اور اس طرح دیرینہ روایات تازہ ہوجاتی تھیں۔ جواہر لال جی سے تو زبردستی معانقہ کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد حفظ الرحمٰن مرحوم کے دور میں مغرب کے بعد سے رات کے ۱۰، ۱۱ بجے تک جمعیۃ علمائے ہند کے دفتر میں مجلس گرم رہا کرتی تھی اور اس میں ہر طرح کے مسائل زیر بحث آیا کرتے تھے، حاجی صاحب ہر مسئلے سے پوری دل چسپی لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اب ایسے باوضع بزرگ تلاش کرنے سے بھی نہیں ملیں گے۔ [مئی ۱۹۷۳ء]

رحمانی، مولانا عبدالصمد

مولانا عبدالصمد رحمانی

تین مہینہ کے سفر کے بعد جب ۳/ جون کو بحمداللہ بہمہ وجوہ خیریت و عافیت واپسی ہوئی تو جن احباب اور بزرگوں کے انتقال پرملال کی خبر سے سخت افسوس اور رنج ہوا ان میں مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی بھی تھے۔ مولانا ان اکابر علم وفضل اور اصحاب ورع وتقوی میں سے تھے جن کے دم سے اسلام کی روحانی اور دینی واخلاقی عظمت کی آبرو قائم ہے۔ ان کی استعداد بڑی پختہ تھی، مطالعہ وسیع، نظر دقیق اور فہم ثاقب رکھتے تھے۔ یوں تو سب ہی علوم دینیہ ومروجۂ مدارس عربیہ سے ان کو قلبی لگاؤ تھا لیکن فقہ اور حدیث سے ان کو زیادہ دلچسپی اور مناسبت تھی۔ جب گفتگو کرتے تھے تو ان کی باتوں سے رسوخ فی العلم کے ساتھ سنجیدگیٔ رائے، ذہانت اور توازن فکر کے جھلکے آتے تھے۔ عملاً بڑے قناعت پسند اور درویش صفت بزرگ تھے، ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی ملحوظ رکھتے تھے۔ صاحب درس اور صاحب تصنیف وتالیف بھی تھے۔ ملک کی تحریک آزادی کے ہراوّل دستے میں تھے لیکن آزادی کے بعد ملک میں جو حالات پیش آئے اور جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، انھوں نے بعض دوسرے مجاہدین وطن کی طرح ان کو اس درجہ دل شکستہ اور مایوس کردیا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ چند برس سے مجموعۂ امراض واسقام تھے اور بہت کمزور ہوگئے تھے،

آخر وقت موعود بھی آپہنچا۔اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش اور رفع درجات کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔آمین [جون۱۹۷۳ء]

بدایونی، پروفیسر ضیاء احمد

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی

افسوس ہے گزشتہ مہینہ ہماری پرانی بزم علم وادب کی ایک اور شمع بجھ گئی۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی، بدایوں کے ایک نامور خانوادۂ شعروادب کے فرزند ارجمند تھے۔قدیم دستور کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم ایک مدرسہ میں پائی پھر انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو ایم۔اے تک پہنچے، فارسی میں جس کا امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔۱۹۲۶ء میں بسلسلۂ ملازمت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور شعبۂ فارسی کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۵۹ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔

موصوف کی استعداد بڑی پختہ اور نظر بہت وسیع تھی۔عربی، فارسی اور اردو شعروادب پر تحقیقی اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے۔لغت ان کا خاص فن تھا چنانچہ ریٹائرمنٹ کے بعد چند برس علی گڑھ میں اور چند برس دہلی میں لغت پر جو کام اردو شعبوں کے ماتحت ہورہا ہے اس سے وابستہ رہے۔تصنیف وتالیف کا ذوق فطری تھا چنانچہ تاریخ وادب پر متعدد تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جن میں دیوان مومن مع ایک طویل مقدمہ کے اور شرح قصائد مومن خاصہ کی چیزیں ہیں۔ مذہبیات سے بڑی دلچسپی تھی، اس سلسلہ میں بھی ان کی دو تین کتابیں ہیں۔ اخلاق وعادات کے لحاظ سے بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، نہایت خوددار، ملنسار اور متواضع تھے۔طلباء پر بے حد شفقت کرتے اور ان کی خدمت کے لیے ہروقت مستعد رہتے تھے۔کم سخن تھے مگر جب بولتے تھے تو تقریر مربوط اور پُرمغز کرتے تھے۔عمر ۷۷ برس کے لگ بھگ تھی۔ادھر کچھ عرصہ سے علی گڑھ میں جس کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا تھا مقیم تھے۔وہیں ۸/ جولائی کو شب میں انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، اب اس وضع کے لوگ کہاں ملیں گے۔

[اگست۱۹۷۳ء]

فاروقی، مولانا عبدالسلام

مولانا عبدالسلام فاروقی

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی کا ۶۷، ۶۸ برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔مرحوم بلند پایہ عالم اور خوش بیان مقرر ہونے کے علاوہ بڑے صالح اور متقی بھی تھے۔فقہ ان کا خاص فن تھا اور استعداد بڑی پختہ تھی۔ اپنے معمولات کے بڑے پابند اور جو بھی ان کے افکار وخیالات تھے ان میں سخت جامد اور کٹر تھے۔تواضع، فروتنی، سادگی اور بے لوثی ان کے اوصاف خصوصی تھے، ان اوصاف وکمالات کے باعث لکھنؤ کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان کے جنازہ کے نہایت عظیم جلوس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ کے لوگوں کے علاوہ ان کی تعزیت کرنے والوں میں غیر مسلم حضرات کی بھی معتدبہ تعداد شامل تھی۔عمل اور اخلاق کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے۔میں جس سال (غالباً ۱۹۲۱ء) مدرسۂ امدادیہ مرادآباد میں داخل ہوا ہوں، اسی سال مرحوم بھی اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالغفور مرحوم کے ساتھ مدرسہ میں داخل ہوئے تھے اور مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کی نگرانی میں رہتے تھے۔دونوں بھائی نہایت کم آمیز، شرمیلے اور کم گو تھے اور طلباء سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ایک عرصہ دراز کے بعد علی گڑھ میں ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو یہ زمانہ یاد دلایا تو انھیں یاد آگیا۔ اس کے بعد ابھی ایک برس پہلے جب یہاں دلّی میں ملاقات ہوئی تو بڑی محبت اور تعلق خاطر کے ساتھ پیش آئے۔اب ایسے باوضع، پاک باطن اور پاک نظر لوگ کہاں ملیں گے؟ اللہ تعالیٰ ان کے درجات ومراتب بلند فرمائے۔آمین

[ستمبر۱۹۷۳ء]

خاں، پروفیسر عبدالمعید

پروفیسر عبدالمعید خاں

افسوس ہے گزشتہ ماہ کی ۲۵/ تاریخ کو پروفیسر عبدالمعید خاں کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرحوم برصغیر کے اساتذۂ عربی واسلامیات میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔انھوں نے پہلے قاہرہ میں کئی برس مقیم رہ کر وہاں سے ڈی۔لٹ کی ڈگری لی اور پھر کیمبرج سے پی۔ایچ ڈی کیا۔اس کے بعد جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئے تو ایسے کہ ساری زندگی یہیں بیت دی۔ابھی دو تین برس ہوئے وہ صدر شعبۂ عربی کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ۳۵ برس سے اسلامیات کے مشہور اور بلند پایہ سہ ماہی رسالہ ''اسلامک کلچر'' کے ایڈیٹر اور بارہ برس سے دائرۃ المعارف کے ناظم تھے۔ اس درمیان میں امریکہ اور یورپ کے جامعات میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ بیرونی ممالک کے بعض سفروں میں راقم الحروف اور وہ دونوں ہم سفر تھے۔اخلاق وعادات کے اعتبار

سے بہت سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی خرابیٔ صحت کا شکار تھے اور اسی سبب سے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق عمر بھر مجرد رہے، لیکن جو کچھ لکھا ہے بہت سخت لکھا ہے۔ عمر ۶۶ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

[اکتوبر ۱۹۷۳ء]

سواتی، مولانا فضل الرحمٰن

ایک مشہور گم نام کا انتقال

[مولانا فضل الرحمٰن سواتی]

عقل من پروانہ گشت و ہم ندید چوں تو شمع در ہزاراں انجمن

فارسی کا ایک مشہور مصرعہ ہے کہ جب قضا آتی ہے تو طبیب بے وقوف ہوجاتا ہے۔ یہ تو اچھی سچی حقیقت تھی جسے شاعر کا ادراک پا گیا مگر اسی سے ملتی جلتی ایک حقیقت اور ہے جو شاید شاعر کی نظروں سے اوجھل ہے وہ یہ کہ طبیب کی جب قضا آجاتی ہے تو سارا ہی عالم ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات پر پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے ان الفاظ سے مقالہ شروع کیا تھا ''کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا۔''

مجاہد جلیل حکیم مولانا فضل الرحمٰن صاحب سواتی کی وفات پر مقالہ بھی انھیں الفاظ کا اعادہ چاہتا ہے۔ موصوف بڑے ماہر اور فیض شناس حکیم تھے۔ صرف تشخیص سے وہ بات بتادیتے جو بعد میں ایکسرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ملک کے مشاہیر اطبا سے آپ کو شرفِ تلمذ یا دوستانہ تعلقات حاصل تھے۔

حکیم صاحب کہنے کو تو حکیم صاحب ہی کہلاتے تھے حالانکہ آپ صرف مریضوں کے لیے حکیم تھے۔ معقولات سے شغف رکھنے والوں کے لیے آپ بہت بڑے منطقی اور متکلم تھے۔ منطق وفلسفہ کی ایک ایک کتاب پانچ پانچ چھے چھے اساتذہ سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اس کے مطالب اور اختلافات ازبر کرچکے تھے اور حافظہ بھی ایسا کہ پتھر کی لکیر۔ بحث ومباحثہ میں بے تحاشہ کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے، عبارتیں فرفر پڑھتے جاتے، کبھی کوئی کتاب اُٹھا کے دیکھنے کی زحمت نہ فرماتے، چاہے بحث وتکرار تقریر میں ہو یا رسائل میں تحریری شکل میں۔ دارالسلام عمرآباد میں آپ معقولات ہی کے استاذ تھے۔

تاریخی کام کرنے والوں کے لیے آپ کی ذات ایک مآخذ ومرجع کی حیثیت رکھتی تھی، آپ کا دماغ تاریخی معلومات کا ایک خزانہ تھا۔ حضرت سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی ایک اہم کڑی آپ کی ذات سے ملتی تھی۔ 'سرگزشتِ مجاہدین' اور 'سیرت سید احمد شہید' کو مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے پچیس سال کے مطالعہ کے بعد تکمیل کو پہنچایا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے مہر صاحب کو دادِ تحقیق دی جارہی تھی۔ میری درخواست پر حکیم صاحب نے سیرت سید احمد شہید کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا۔ اور چھتیس ۳۶ صفحات پر مشتمل ایک تبصرہ میرے حوالے کرگئے جس میں مصنّف کی غلط معلومات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرکے ان کی تصحیح کی گئی تھی۔ میں نے بڑے تامل کے بعد اس کی ایک قسط مہر صاحب کو بھیج دی تو مہر صاحب تڑپ اٹھے اور ذیل کا مکتوب میرے نام ارسال فرمایا۔

''برادرِ مکرم گرامی نامہ وسط فروری میں مِل گیا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ حکیم صاحب محترم کی تحریر بہ تفصیل پڑھ کر جواب لکھوں اس میں تاخیر ہوتی گئی اور خود میری دوسری مشغولیتیں بھی حائل ہوئیں۔ قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں خدا جانے میں نے سرحدِ آزاد کے مختلف حصوں میں کہاں کہاں کوہ پیمائی کی کہاں کہاں کی خاک چھانی، جملہ، بونیر، سوات، ضلع پشاور ضلع مردان، ضلع ہزارہ کے بیشتر مقامات دو دو تین تین مرتبہ دیکھے، ایک ایک شخصیت کے حالات پوچھے۔ مگر حالات تو رہے ایک طرف بیشتر اصحاب ان شخصیتوں کے ناموں سے بھی آگاہ نہ تھے۔ حکیم صاحب محترم نے سرسری داستان سرائی میں اتنے حقائق بیان کردیے کہ جن کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ وہی مولانا روم والی بات ہوئی۔

ع یار در خانہ و من گردِ جہاں می گردم

مولوی عبدالحق آروی مصنّف دُرِ مقال کے متعلق سید عبدالجبار شاہ نے بارہا بتایا کہ وہ شافعیوں کی بستی میں مقیم ہوگئے تھے۔ جس کا نام غالباً نواگئی تھا، یا ناوہ گئی تھا۔ بونیر سے کوہ کراکٹر کو عبور کرکے سوات کی جانب اتر میں دامن کوہ سے ذرا بلندی پر یہ بستی بائیں ہاتھ ملتی ہے۔ میں نے خدا جانے کس ذوق وشوق سے اس بستی کو دیکھا تھا اب معلوم ہوا کہ مولوی صاحب الاڈنڈ میں فوت ہوگئے۔ تھانہ میں نے دیکھا ہے الاڈنڈ نہیں دیکھا۔

بالکل اسی قسم کا واقعہ امام ابن تیمیہ کے سلسلہ میں پیش آیا۔ میں دمشق گیا تو سینکڑوں اصحاب سے امام موصوف کی قبر کے متعلق پوچھا۔ مختلف قبرستانوں میں

پھرا۔ان کے نگہبانوں یا بعض قبروں کے مجاوروں سے پوچھا مگر کوئی کچھ بتا نہ سکا۔صوفیہ کے قبرستان کا پتہ بھی کہیں نہ ملا۔چونکہ میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس لیے میں بہت مایوس اور افسردہ لوٹا۔اب آپ کی بھیجی ہوئی کتاب سے یہ نکتہ حل ہوا۔

حکیم صاحب محترم نے مولوی صاحب کے بیشتر حالات تحریر فرما دیے۔ اور اپنے متعلق بھی بعض ایسی باتیں لکھ دیں جو کسی دوسرے سے معلوم نہیں ہوسکتی تھیں۔میری کتاب ''سرگذشتِ مجاہدین'' طبع ثانی کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق آروی کے وہ تمام حالات آجائیں گے جو حکیم صاحب محترم نے بیان کیے ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ خود حکیم صاحب کے متعلق بھی ایک باب بڑھا دوں۔ایسے بےنفس، ایثار پیشہ اور حقیقی مجاہد کہاں ملیں گے وہ دور ہی گذر چکا جس کی آغوش میں ایسی شخصیتیں پرورش پاتی تھیں۔حکیم صاحب محترم تو بہت اونچے ہیں۔انہیں پہچاننے والا کون ہوگا؟

تاہم ایسی تصویریں کسی نہ کسی مرقع میں محفوظ ہونی چاہئیں۔شاید کبھی سازگار وقت آئے۔اور ایسی نگاہیں پھر پیدا ہوجائیں جو حقیقت شناسی کی میزان سے بہرہ مند ہوں۔

آپ نے مجھ پر جو احسان فرمایا خدا شاہد ہے کہ اس کا کوئی بدلہ دعا کے سوا میں نہیں دے سکتا۔مگر اِسے اتمام پر پہنچایے، مسافر کو منزلِ مقصود پر پہنچایے عرضِ راہ میں نہ چھوڑیئے۔ اگر آمدورفت میرے بس میں ہوتی اور وسائل بہ قدرِ ضرورت ساتھ لے سکتا تو ایک دن کا بھی توقف نہ کرتا۔اور وہاں پہنچ جاتا۔اب بے دست و پا ہوں تحریر مکمل کرایے اور جلد بھجوایئے۔

حکیم صاحب محترم کی خدمت میں میرا سلامِ شوق پہنچایئے۔ مجھے ان کے ارشادات کا انتظار رہے گا۔سید احمد شہید کی اشاعت پر پانچواں سال گذر رہا ہے۔ آپ یقین فرمائیں گے اس پوری مدت میں ایک صاحبِ نظر بھی نہ ملا جو کتاب کے بنیادی مطالب و مقاصد پر مجھے مفید مشورے دے سکتا۔

حکیم صاحب محترم سے میں ایسے ہی مشوروں کا امیدوار ہوں، نیز پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ''جماعت مجاہدین'' اور ''سرگذشتِ مجاہدین'' ان کی دسترس میں ہیں؟ انہیں بھی ایک نظر ملاحظہ فرمالیں اس لیے کہ پوری تحریک کے متعلق میری کاوشوں کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکے گا۔اللہ تعالیٰ انہیں باصحت و عافیت رکھے۔ عرض کیجیے کہ اپنی دعاؤں میں اس روسیہ کو بھی شامل فرمالیں۔

والسلام۔مہر ۲۹ جنوری ۶۳ء

ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی حکیم صاحب نے نمایاں کردار ادا کیا۔ برسوں جیلوں میں رہے۔مصائب جھیلے، ترکِ وطن کرکے دو ایک بار افغانستان پہنچ گئے مگر دماغ میں آزادی وطن کے لیے جہاد کا جو لاوا سُلگ رہا تھا اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔پھر واپس آکے گرفتار ہوئے۔تین تین مرتبہ بنابنایا ہزاروں کا مطب اجڑا مگر اس راہ کا ہر نقصان فتح و نصرت کا پرچم بن کر تصور میں لہرا رہا تھا۔

ع   درد میں لطف ہے، ایذا میں مزا، غم میں خوشی

ہر میدان میں آپ کا کام انتہائی بےلوث اور بربنائے اخلاص ہی ہوا کرتا تھا۔آپ نے ہر خدمتِ ملک و قوم کچھ دینے ہی کے لیے کی۔لینا آپ کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔جنگِ آزادی کے دوران آپ کی ڈھارس بندھانے والی رفیقۂ حیات داغ مفارقت دے گئیں۔ جواں سال وجیہ لڑکے الطاف الرحمٰن نے سبھاش کی فوج میں سرگرم عمل رہ کر وطن کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ملک جب آزاد ہوا تو بڑے مجاہدوں کی فہرست میں آپ کا بھی نام تھا۔ایک معقول جائداد آپ کے نام الاٹ ہوئی تو اُسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔

جنگِ آزادی کے مشاغل میں مطب سے آپ کا تعلق بالکل ہی ٹوٹ چکا تھا۔میدانِ کارزار سرد پڑنے کے بعد مطب کی طرف لوٹے تو وہ کسی طرح جم نہیں رہا تھا۔معاشی حالت پتلی ہوتی جارہی تھی۔دوسری شادی کے بعد اولاد کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔احباب نے مشورہ دیا کہ پاکستان چلے جائیں جہاں ان کے خاندان کے بیشتر احباب خوشحال اور اربابِ اقتدار تھے۔خود آپ کے داماد پائندہ محمد خاں فوج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔آپ کو باصرار دعوت دے رہے تھے مگر سب کے جواب میں اس مومن مخلص نے یہی کہا کہ ہم زندگی بھر پاکستان بننے کی مخالفت کرتے رہے اب پاکستان کس منہ سے جائیں گے۔

مطب چلتا کیا تھا گھسیٹے لیے جارہے تھے۔اور اسی پر کچھ ایسے اصول اپنے اوپر عائد کیے ہوئے تھے کہ لگی بندھی آمدنی بھی کم سے کمتر ہونے لگی۔مسجد اور مدرسے کے کسی بھی ملازم سے چاہے اس کا علاج کیسا ہی اہم اور اس کی دوا کتنی ہی قیمتی ہو ایک پائی وصول نہیں کرتے تھے۔مدرسے کے ایک خوشحال استاذ نے بتایا کہ حکیم صاحب نے کئی ماہ کے لیے قیمتی دوائیں انھیں دیں۔وہ جیب سے نوٹ نکالنے لگے تو حکیم صاحب نے منع کردیا اور فرمایا کہ میں عہد کرچکا ہوں کہ مدرسہ اور مسجد کے ملازمین سے معاوضہ ہرگز وصول نہیں کرونگا۔ایک طرف سے اصرار دوسری طرف سے انکار، اس تکرار کا تماشہ دیکھنے بچے گھر سے نکل آئے تو

مولوی صاحب کوایک ترکیب سوجھی ،جھٹ سے نوٹ نکال کر بچوں کو دے دیے۔ اورکہا میں عیدی دے رہاہوں آپ مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔اور وہ عیدالفطر کا دوسرا یا تیسرا دن تھا۔مولوی صاحب کا جملہ ختم ہونے بھی نہ پایا کہ حکیم صاحب ان سے لپٹ پڑے اور گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔واللہ تم رحمت کے فرشتے ہو۔صبح سے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

حکیم صاحب کی کتابِ زندگی میں ایسے نادر روزگار ایک دونہیں سیکڑوں واقعات ہیں چونکہ قارئین میں اکثر کے لیے موصوف اجنبی ہیں۔اس لیے ان واقعات کی اہمیت ایک کہانی سے بڑھ کر کیا ہوسکتی ہے۔

حکیم صاحب کا سترہ سالہ سرخ وسپید سندر اورتوانا بچہ عتیق الرحمٰن دوپہر کا کھانا کھا کر اسکول گیا۔وہاں ایک حادثے میں اس کی موت ہوگئی ۔عصر کے قریب لاش گھر لائی گئی۔ بوڑھاپے کی اولاد کیسی عزیز ہوتی ہے مگراس صبر و استقامت کی چٹان کی زبان سے جوالفاظ ادا ہورہے تھے، وہ سامعین کودیوانہ کردینے کے لیے کافی تھے۔حکیم صاحب فرمارہے تھے۔''اچھا ہوامرگیا ذرا چوری کی عادت تھی اس میں۔''

مولانا آزادؒ سے حکیم صاحب کو بڑی گہری عقیدت تھی۔عقیدت تو بہتوں کو بہت ساروں سے ہوتی ہی ہے مگراس درجہ کی عقیدت حکیم صاحب ہی کے حصّہ میں آئی تھی۔مولانا سے متعلق جس قدر باتیں آپ کومعلوم تھیں شاید ہی اس باب میں آپ کا حریف مِل سکے۔تفسیرترجمان القرآن کے انتساب کاانکشاف فرما کرحکیم صاحب نے علمی دنیا کو چونکادیا۔مولانا آزاد کا نام عزّت سے کوئی لیتا تواسے حکیم صاحب اپنا عزیز ماننے لگتے۔چاہے دوسرے امورمیں کتناہی اختلاف ہو۔مولانا آزاد کی شان میں کسی نے ذرا بھی توہین کی تو حکیم صاحب کا اس سے بڑا دشمن کوئی نہیں ہوسکتا۔ ماہرالقادری نے''پردہ اٹھنے کے بعد'' لکھ دیا توحکیم صاحب کا غیظ وغضب دیکھنے کا قابل تھا۔کئی دِن گذرجانے کے بعد باربار یہی کہتے تھے کہ ایک ہی خواہش ہے کراچی جاؤں اور ماہرالقادری کا گلہ گھونٹ دوں۔حکیم صاحب مجاہد تھے جو کہتے وہی کرتے بھی تھے۔اتفاق ایسا ہوا کہ انہیں دِنوں ۱۹۶۰ء میں ماہر صاحب دارالسلام عمرآباد تشریف لائے۔حکیم صاحب کا مکان عمرآباد سے پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ دارالسلام کی ہر چھوٹی بڑی تقریب کے جیسے مہمان خصوصی حکیم صاحب ہی ہوا کرتے تھے۔اربابِ جامعہ نے عمداً حکیم صاحب کو ماہر صاحب کی تشریف آوری سے بے خبر رکھا۔ مبادا کوئی ناخوشگوار بات ہوجائے اورادارے کے نام پر دھبّہ لگ جائے۔

دارالسلام میں آپ چند سال استاذ رہے۔ان چنددنوں کےتعلق سے آپ کو پورے عمرآباد ہی سے کہنا چاہیے ۔جنون کی حدتک عشق ہوگیا تھا۔ہفتہ میں دو ایک بار عمرآباد کا چکرنہیں لگالیتے تو چین نہیں آتا تھا۔ضعف بڑھا،دماغی توازن بگڑا، بینائی جواب دینے لگی۔ ہرچیز ذہن سے نکل گئی،احباب کی شناخت ناممکن ہوگئی،مگرعمرآباد کی زیارت میں کوئی فرق نہیں آیا ۔بچے اس سے بازرکھنے کی کوشش کرتے توان سے لڑ پڑتے۔بس میں جگہ نہیں ہوتی تو کنڈکٹر سے الجھ پڑتے۔یہ سب جھمیلے اٹھاکر اتنی خلیجیں پاٹ کر عمرآباد تشریف لاتے رہے۔ دارالسلام کی ایک ایک درسگاہ سے رک رک کر گزرتے۔جی میں آیا کسی استاذ سے مصافحہ کرلیتے،کسی کے پاس بیٹھ کرچائے پی لیتے۔پھردوسری بس سے واپس ہوجاتے۔عمرآباد کے احباب گھرپر ملاقات کے لیے جاتے اپنا نام بتاتے۔حکیم صاحب ہیں کہ اجنبی بنے بیٹھے رہتے۔باتوں میں عمرآباد کا ذکرآجاتا تو چونک کر پوچھتے آپ عمرآباد سے تشریف لائے ہیں؟ جواب اثبات میں سُن کر جزاک اللہ جزاک اللہ فرمادیتے اورکبھی کھڑے ہوکر معانقہ بھی کرلیتے۔ اگلے وقتوں کے لوگ بھی کیا خوب انسان تھے۔چاہتے توٹوٹ کرچاہتے۔نفرت کرتے توڈٹ کر کرتے۔نفاق،تملق، ریااورنموونام کی کوئی چیزان کی زندگیوں میں بھٹک کربھی نہیں گذرتی تھی۔ان کا چہرہ دل کا آئینہ ہوتااورزبان دل کی ترجمان۔

لکیلا یعلم بعد علم شیا کی عملی تفسیر کرنے کے لیے بڑی طویل عمر مانگ کر لائے تھے۔شوال ۱۳۰۴ء کی ولادت تھی ۱۳۹۵ھ ۷/محرم جمعہ کی شب میں گیارہ بجے انتقال ہوا۔

زندگی تجربات سے بھرپوراور واقعات وحکایات سے لبریز تھی۔آئے خالی ہاتھ اور گئے بھی اسی طرح خالی ہاتھ ۔لاکھوں کمائے اور کمائی کی کوئی نشانی بھی نہیں چھوڑ سکے۔زندگی بھر دھوپ چھاؤں دیکھتے رہے مگردھوپ سے بچنے کے لیے ایک سائبان بھی اپنا نہیں بناسکے۔

کس کی راہ میں سب کچھ لٹادیا ہم نے
یہاں تو وہ بھی نہیں جو کفن کے کام آئے

سردی اور بارش کے موسم میں مسجد کی پہلی صف میں موذن کے داہنے ہاتھ کھڑی ہونے والی شخصیت وفات سے کچھ روزقبل جماعت میں شریک ہونے سے محروم ہوگئی تو کیا؟ اس کا دِل تو مسجد ہی میں اٹکا رہتا تھا،کسی بات کا ہوش نہیں رہتا،لیکن اذان ہوتی تو جواب دینا کبھی نہیں چوکتا تھا۔لیٹے ہی لیٹے نیت باندھ کرنماز شروع کردیتے۔قرأت میں جہرہی فرماتے تھے۔اکثرسورہ والفجر پڑھتے،

آہستہ آہستہ پڑھتے کوئی آیت چھوٹنے نہیں پاتی اور جب آخری آیت فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی پر پہنچتے تو آواز اتنی اونچی کردیتے کہ گلی سے آدمی بخوبی سن لے۔گلی کے لوگ جب ان کی قرأت سن کر ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے سکتے ہیں تو پھر ان کی قرأت سمیع وبصیر اور لطیف وخبیر کی بارگاہ میں کس مقام ومرتبہ کی مستحق ہوگی یہ ماوشما کے قیاس وگمان سے ماوراہے۔ع

مرگِ مجنوں پر عقل گم ہے میرؔ کیا! دیوانے نے موت پائی ہے

[حفیظ الرحمٰن العمری، فروری ۱۹۷۴ء]

طٰہٰ حسین، ڈاکٹر

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

افسوس ہے پچھلے دنوں عالمِ اسلام کی دو بلند پایہ اور نامور شخصیتیں ہم سے جُدا ہوگئیں، اور یہ دونوں مصری تھیں، ایک ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور دوسرے شیخ ابوزہرہ۔اول الذکر بچپن میں ہی نابینا ہوگئے تھے لیکن اس کے باوجود علم وفضل اور ادب وانشاء میں وہ کمال پیدا کیا کہ نہ صرف مصر کے بلکہ مشرق کی ایک نامور شخصیت بن گئے۔انھوں نے جامعۂ ازہر قاہرہ یونیورسٹی اور پھر فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی، اس بناء پر وہ کلاسکل اور جدید دونوں ادبیات کے مبصر اور صاحبِ فن نقاد تھے، ایک زمانہ میں پروفیسر مارگولیوتھ کی ہمنوائی میں انھوں نے اشعر الجاھلی کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس پر مصر میں ان کے خلاف اس قدر شدید ہنگامے ہوئے کہ لوگوں نے ان کا سوشل بائیکاٹ کردیا اور گورنمنٹ نے بھی کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔اس کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے قابلِ اعتراض حصّہ کو خارج کرکے اسی کتاب کو الادب الجاھلی کے نام سے شائع کیا، اس کے علاوہ اور متعدد کتب، مثلاً حدیث الاربعاء تین جلدوں میں، علی ھامش السیرۃ، الشیخان، الفتنۃ الکبری، مراۃ الاسلام، الایام، وغیرہ مرحوم کی یادگار ہیں۔لیکن ان کا اصل میدان ادبی تنقید تھا۔علاوہ ازیں وہ ایک خاص طرزِ تحریر کے بانی اور موجد تھے جس میں نسیم سحر کی لطافت، دریا کی روانی شعلہ کی لپک اور سیلِ رواں کی طاقت سب گھل مل گئے ہیں۔عرب کی نئی نسل کے ذہن اور فکر پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قلم کے بہت گہرے اثرات ہیں اور اس حیثیت سے وہ بے شبہ عہدِ جدید کے ادبی معماروں میں ایک ممتاز مرتبہ ومقام کے مالک ہیں۔

[مئی ۱۹۷۴ء]

ابوزہرہ، شیخ محمد

شیخ محمد ابوزہرہ

شیخ محمد ابوزہرہ عصرِ حاضر کے نہایت فاضل اور بلند پایہ عالم ومحقق اور مصنف تھے۔فقہ، اُس کے اصول اور تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔ چنانچہ ائمہ اربعہ، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل ان میں سے ہر ایک کے فقہ پر الگ الگ انھوں نے کتابیں لکھیں اور پھر امام اعظم کے تلامذہ قاضی ابویوسف، امام محمد اور امام زفر ان میں سے بھی ہر ایک کے فقہ پر الگ الگ ایک کتاب تصنیف کی۔علاوہ ازیں فقہ جعفری اور المذاہب الاسلامیہ پر بھی ان کی تصنیفات ہیں جو بڑی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہیں۔راقم الحروف کو پانچ چھ مرتبہ سفر قاہرہ اور وہاں کے قیام کا اتفاق ہوا ہے، اور افسوس ہے کہ اپنی خواہش اور تمنا کے باوجود ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم سے ملاقات کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ کیوں کہ ان دنوں میں یا وہ قاہرہ سے باہر تھے یا تھے وہیں مگر علیل تھے۔لیکن خوش قسمتی سے شیخ ابوزہرہ سے تقریباً ہر سفر میں ملاقات اور ان کی مجلس میں بیٹھنے اور مجمع البحوث الاسلامیہ کے جلسوں میں ان کی تقریریں اور سوال و جواب سننے کا موقع ملا ہے، اور جیسا کہ میں نے برہان میں لکھا بھی ہے میرے لیے یہ بات لائق افتخار ومسرت ہے کہ ایک مرتبہ مجمع کے جلسہ میں کسی موضوع پر میں نے عربی میں تقریر کی تو شیخ مرحوم نے جلسہ گاہ سے نکلتے ہوئے اس تقریر اور اُس کی زبان کی تعریف کی۔ اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کے ساتھ شیخ کو حافظہ نہایت قوی اور تقریر وخطابت کا عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا۔مجمع البحوث الاسلامیہ کی میٹنگ کے لیے اُن کا مقالہ ڈیڑھ سو دوسو صفحات سے کم کا نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کبھی مقالہ پڑھتے نہیں تھے بلکہ زبانی تقریر کرتے تھے۔یہ تقریر ڈیڑھ دو گھنٹہ سے کم کی نہیں ہوتی تھی، لیکن پیرانہ سالی کے باوجود اس درجہ مربوط اور مسلسل ہوتی تھی کہ مقالہ سے منطبق کرلیجیے، اور شروع سے آخر تک اس جوش اور قوت سے بولتے تھے کہ ہر برق وشرر کی چشمک باہم کا سماں بندھ جاتا تھا۔

مصر میں عظیم اکثریت شافعی المذہب حضرات کی ہے لیکن شیخ ابوزہرہ معاشی اور سیاسی مسائل میں عموماً حنفی مسلک کو ترجیح دیتے تھے اور اس کے اثبات کے لیے دلائل وبراہین کا انبار لگادیتے تھے۔یوں بھی نہایت خود دار مگر بے حد متواضع اور خلیق تھے۔اپنی جو رائے ہوتی تھی اِسے برملا ظاہر کرتے تھے اگرچہ وہ حکومت مصر کی پالیسی کے خلاف ہو۔رحمھما اللہ رحمۃ واسعۃ۔

[مئی ۱۹۷۴ء]

فریدی، ڈاکٹر عبدالجلیل

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی

افسوس ہے گذشتہ ماہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اکسٹھ برس کی عمر میں ہم سے جُدا ہوگئے۔ مرحوم ایک نہایت بلند مرتبہ اور ماہرِ فن ڈاکٹر کی حیثیت سے ریاست میں ہرجگہ معروف اور مشہور تھے، لیکن عملی سیاسیات کے میدان میں گامزن ہوئے ابھی انھیں دس بارہ برس ہی ہوئے تھے، اس کے باوجود وہ اس شان اور کروفر کے ساتھ اپنی ریاست کے آسمانِ سیاست پر نمودار ہوئے کہ پرانے چراغ جھلملا کے رہ گئے۔ ان کی سیاست اگر چہ اتر پردیش تک محدود رہی، لیکن ان کی غیر معمولی شخصیت کا وقار اور وزن پورے ملک کے مسلمانوں میں ہرجگہ محسوس کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرحوم جذبہ اور عمل دونوں کے انسان تھے، نہایت جری، بے باک اور صاف گو تھے۔ ان کی سیاست شتر گربگی یا منافقت کے عیب سے پاک وصاف تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاست کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنانے کے بجائے انھوں نے چند در چند مالی نقصانات برداشت کیے اور اپنی کمائی کے لاکھوں روپئے اپنے کاز پر بے دریغ خرچ کرڈالے۔ اخلاق وعادات کے اعتبار سے بھی وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ عقیدہ اور عمل میں پکے اور سچے مسلمان، ہمدرد ومتواضع، خوش اخلاق وخوش طبع تھے، اس بنا پر مخالفین بھی ان کا ادب واحترام کرتے تھے۔ عارضۂ صدر میں مبتلا تھے، روس اور یورپ میں اعلیٰ سے اعلیٰ علاج کرایا مگر مرض نہ گیا۔ ایک مرتبہ بڑی حسرت سے بولے: میں نے ڈاکٹر کی حیثیت میں تین لاکھ مریضوں کے ہاتھ دیکھے ہیں، لیکن آج خود اپنا ہاتھ دیکھتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے۔ آخر یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا اور وہ خدا کو پیارے ہوگئے۔ اللّٰھمَّ اغفرلہ وارحمہ۔ [جون ۱۹۷۴ء]

علال الفاسی، شیخ

شیخ علال الفاسی

افسوس ہے پچھلے دنوں مراکش کے مشہور مجاہد آزادی شیخ علال الفاسی کا بھی ۶۴ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم امیر شکیب ارسلان کے بعد عالمِ عرب کی دوسری اہم شخصیت تھے جن میں قدرت نے علم وفضل اور صلاح وتقویٰ کے ساتھ غیر معمولی سیاسی جدوجہد کا کمال بھی ودیعت کردیا تھا۔ فاس کے باشندہ ہونے کی حیثیت سے جب وہ جامعۃ القرویین سے تعلیم پاکر فارغ ہوئے اور انھوں نے اپنے ملک کو فرانسیسی استعمار کا صیدِ زبوں پایا تو انھوں نے حزب الاستقلال کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اپنی زندگی استخلاص وطن کے لیے وقف کردی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پورے ملک کا دورہ کرکے عوام میں بیداری پیدا کی اور پھر افریقہ مشرقِ وسطی اور یورپ اور امریکہ کا دورہ کرکے خارجی اثرات کے ذریعہ ملک کے لیے آزادی کی راہ ہموار کی۔ اس جرم کی پاداش میں وہ ایک عرصہ کے لیے جلا وطن بھی کیے گئے۔ لیکن اُن کی جدوجہد آزادی کی رفتار میں کوئی فرق نہ ہوا۔ آخر ۱۹۵۵ء میں ملک آزاد ہوا اور وہ اپنے وطن واپس آگئے۔ شیخ علال عالم اسلام کے اتحاد کے بھی زبردست مبلغ اور داعی تھے اور اسی مقصد کے لیے دنیا بھر کی اسلامی کانفرنسوں میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے رہتے تھے۔ ہمیں بھی مرحوم سے دومرتبہ ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ایک مرتبہ خاص اُن کے وطن رباط (مراکو) میں جب ۶۴ء میں راقم الحروف حکومت ہند کے وفد خیرسگالی کے ممبر کی حیثیت سے وہاں گیا تھا اور ان کی پارٹی حزب الاستقلال نے نہایت شان دار ڈنر دیا تھا اور دوسری مرتبہ ایران میں جب کہ وہ شیخ طوسی کے جشنِ ہزار سالہ میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ نہایت سنجیدہ ومتین کم سخن اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

[جون ۱۹۷۴ء]

امین الحسینی، سید (مفتی اعظم فلسطین)

مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی

افسوس ہے گزشتہ ماہ عالم اسلام کی ایک اور نہایت بلند پایہ شخصیت یعنی مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی ۷۷ برس کی عمر میں وفات پاگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ وہ ۱۸۹۷ء میں قدس کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم وطن مالوف میں ہی پائی اس کے بعد مصر چلے گئے اور وہاں جامعہ ازہر میں علوم دینیہ واسلامیہ میں تکمیل کے مدارج ومراتب طے کئے۔ جنگ عالمگیر اوّل (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کے دوران ترکی افواج سے وابستہ رہے۔ ۱۹۲۱ء میں فلسطین کے مفتی اور ۱۹۲۲ء میں وہاں کی مجلس اعلیٰ اسلامی کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں قدس میں جو موتمر عالم اسلامی ہوئی تھی اُس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں جب انگریزوں کی مداخلت بے جا کے باعث فلسطین میں شورش اور ہنگامے بپا ہوئے تو وہ لبنان آگئے اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک یہاں مقیم رہے پھر عراق چلے گئے اور سید رشید عالی الگیلانی نے انگریزوں کے خلاف جو بغاوت کی تھی اُس میں بڑی سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا۔ لیکن جب یہاں کے سیاسی حالات میں انقلاب رونما ہوا تو وہ بھاگ کر پہلے

ایران اور پھر وہاں سے جرمنی گئے اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء جب کہ دوسری عالمگیر جنگ میں جرمنی کو شکست فاش ہوئی اور اتحادیوں نے اُس پر قبضہ کرلیا، وہاں مقیم رہے جنگ کے خاتمہ پر فرانس میں قید ہوگئے۔ ۱۹۴۶ء میں رہا ہوکر مصر آ گئے۔ مرحوم کی پوری زندگی فلسطین کی آزادی وخودمختاری اور یہودیوں کو وہاں سے بے دخل کرنے کے لیے وقف تھی چنانچہ پہلی جنگ عظیم عالمگیر کے خاتمہ پر جب مجلس اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے مطابق ۱۹۲۲ء میں فلسطین پر برطانوی انتداب قائم ہوا تو اُس وقت اس کی مخالفت میں اور اس کے بعد ۱۹۴۷ء کے خاتمہ پر جب فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کا فیصلہ ہوا تو اب اُس کی مقاومت میں کوئی سیاسی اور جنگی تدبیر ایسی نہیں تھی جو انھوں نے اختیار نہ کی ہو۔ وہ ہر محاذ پر لڑے، ہر مورچہ پر انھوں نے داد شجاعت دی، ناکامی پر ناکامی ہوتی رہی، لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ان غیر معمولی مجاہدانہ سرگرمیوں کے علاوہ مرحوم علم وفضل، تقوی وطہارت اور عمل وکردار کے اعتبار سے بھی ایک بلند مرتبہ ومقام کے مالک تھے اور وہ اتحاد عالم اسلامی کے بھی بہت بڑے علم بردار تھے، اس بنا پر نہ صرف عرب بلکہ پورے عالم اسلام میں ان کو بڑی قدر ومنزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سخت افسوس ہے آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پُر نہیں ہوسکتا!

مفتی اعظم مرحوم سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات عجب ڈرامائی انداز میں ہوئی، غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء تھا کہ مفتی اعظم مرحوم اور مصر کے وزیر اوقاف محمد علی علویہ اپنے کسی ایک مشن کے سلسلہ میں ہندوستان آئے تھے اور ملک کا دورہ کررہے تھے، اس سلسلہ میں یہ دونوں آگرہ بھی آئے، میں ان دنوں اپنے وطن میں ہی مقیم تھا لیکن مجھ کو ان حضرات کے ورود ہند تک کی اطلاع نہیں تھی۔ اتفاق سے ایک دن شہر گیا اور عصر کی نماز ادا کرنے کے لیے جامع مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ دو عرب کھڑے ہیں اور چند مسلمان ان کے گرد جمع ہیں۔ مجھ کو عربوں سے ملنے اور عربی میں بات چیت کرنے کا شوق تو تھا ہی، میں بھی وہاں پہنچا اور گفتگو شروع کردی۔ جب ان سے تعارف ہوا تو چونکہ مفتی اعظم کے کام اور نام سے عربی جرائد ورسائل کے ذریعہ پہلے سے واقف تھا اس لیے اب ان کو اپنے سامنے اور اُن کے ساتھ مصر کے وزیر اوقاف کو بھی دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی لیکن ان دونوں کو بھی مجھ سے ملاقات کرکے کچھ کم خوشی نہیں ہوئی۔ مفتی اعظم نے فرمایا: کل جامع مسجد میں ہماری تقریریں ہیں لیکن اب تک کوئی ترجمان نہیں ملا تھا۔ اس لیے ہم سخت پریشان تھے اب خدا کا شکر ہے تم مل گئے تو اس کام کو تم ہی کرنا، ہم کو اطمینان ہوگیا۔ مجھے اس میں کیا عذر ہوسکتا تھا چنانچہ دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد آگرہ کے مشہور ایڈوکیٹ مسٹر اختر عادل مرحوم کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ میں والد صاحب قبلہ مرحوم کے ساتھ اس میں شریک تھا دونوں معزز مہمانوں نے (ایک نے مصری اور دوسرے نے شامی لب ولہجہ میں) عربی میں تقریر کی اور میں فی البدیہہ ان کا ترجمہ کرتا آگیا۔ آخر میں جناب صدر کی فرمائش پر اہل آگرہ کی طرف سے دس پندرہ منٹ میں نے عربی میں شکریہ کی تقریر کی۔ جلسہ ختم ہوا تو مفتی اعظم اور وزیر محمد علی دونوں نے بڑی تعریف کی اور فرمایا: جب سے ہم ہندوستان میں ہیں ہماری اچھی ترجمانی اور عربی میں تقریر کراچی میں مولوی نورالحق ندوی الازہری[1] نے کی تھی اور اُس کے بعد یہ دوسرا موقع ہے کہ ہماری خاطر خواہ ترجمانی اور عربی تقریر تم نے کی ہے۔

اس واقعہ کے عرصۂ دراز بعد مفتی اعظم سے میری آخری ملاقات ۱۹۶۷ء میں حجاز مقدس میں ہوئی تھی جب کہ میں وہاں کی گورنمنٹ آف انڈیا کے حج ڈیلی گیشن کے ممبر کی حیثیت سے گیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندو پاک جنگ ہو چکی تھی، مرحوم کو اس جنگ کا سخت ملال اور صدمہ تھا۔ جب مجھ سے گفتگو ہوئی تو وہ اس صدمہ کو چھپا نہیں سکے، اُن کے دل میں مسلمانان عالم کے موجودہ حالات، باہمی تشتت وتفرق، سیاسی عدم استحکام اور دینی واخلاقی انحطاط کا بڑا درد اور غم تھا۔ وہ ہر وقت انھیں کے افکار اور معاملات ومسائل میں غلطاں پیچاں رہتے تھے۔ رحمه الله رحمة واسعة۔ [اگست ۱۹۷۴ء]

---

[1] یہ میرے عزیز دوست ہیں، اصلاً پشاوری ہیں، ندوۃ العلما لکھنؤ سے فراغت کے بعد سیٹھ عبداللہ یوسف ہارون (کراچی) کے وظیفہ پر قاہرہ گئے، جامعہ الازہر میں تعلیم پائی، وہیں ایک مصری خاتون سے شادی کی، واپس آکر کراچی کے سندھ مدرسہ میں مدرس ہوگئے۔ پھر اسلامیہ کالج پشاور میں دینیات کے ڈین ہوئے، اس سے سبکدوش ہوکر جامعۂ عباسیہ بہاولپور کے وائس چانسلر ہوگئے۔ اب سنا ہے کہ اس سے بھی سبکدوش ہوگئے ہیں۔ ایک زمانہ میں برہان کے مستقل خریدار اور اُس کے بڑے قدردان تھے۔

برکتی، مولانا مفتی عمیم الاحسان مجددی

مولانا مفتی عمیم الاحسان صاحب مجددی برکتی

ڈھاکے کے ایک خط سے ابھی چند روز ہوئے یہ معلوم کرکے بے حد افسوس ہوا کہ مولانا مفتی سید عمیم الاحسان صاحب مجددی برکتی داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس خاکدان عالم سے رخصت ہوگئے۔ مولانا اپنے زمانے کے بلند پایہ اور

وسیع النظر محقق عالم تھے۔ فقہ وحدیث آپ کے خاص فن تھے جن میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ درس کے علاوہ افتا اور تصنیف وتالیف کا بھی مشغلہ تھا اور اسی سلسلے میں متعدد اہم کتابیں آپ کے قلم کی مرہون رقم ہیں۔ علاوہ ازیں نہایت متقی، متورع اور صاحب باطن بھی تھے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ کلکتہ میں بسر ہوا۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلے گئے اور وہاں کے مدرسۂ عالیہ میں پروفیسر حدیث وفقہ ہوگئے تھے۔ ڈھاکہ میں عید کی نماز مولانا نے ہی پڑھائی تھی۔ اس کے بعد طبیعت خراب ہوگئی جس کا سلسلہ دس روز تک چلتا رہا یہاں تک کہ ۲۷/ اکتوبر کو ساڑھے چار بجے صبح طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ ناظم ندوۃ المصنفین اور ایڈیٹر برہان سے بڑی محبت کرتے اور خلوص رکھتے تھے اس لیے ہم لوگوں کے لیے یہ ذاتی حادثہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور ان کے مدراج ومراتب بڑھائے۔ آمین ثم آمین [نومبر ۱۹۷۴ء]

ندوی، مولانا شاہ معین الدین / نورالدین

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی/نورالدین

حیدرآباد سے واپس پہنچتے ہی مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور جناب نورالدین صاحب بیرسٹر کے حادثۂ وفات کی خبر اچانک سُنی تو جی دھک سے ہوکر رہ گیا اور قلب ودماغ پر گویا بجلی گر پڑی۔ شاہ صاحب ندوۃ العلماء کے گل سرسبد، نہایت پختہ قلم مصنف، تاریخ اسلام کے وسیع النظر محقق، اردو زبان کے ادیب اور سوباتوں کی ایک بات یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے صحیح جانشین اور ان کے قائم مقام تھے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک انہوں نے دارالمصنفین کے علمی وقار اور مرتبہ کو قائم و برقرار رکھا اور ملک کے نہایت سخت طوفانی دور میں بھی اس باغیچۂ علم وادب کی جس طرح حفاظت اور دل وجان سے اس کی آبیاری کی وہ ان کی قبائے فضل کا تکمۂ زریں ہے۔ علم وفضل اور تحقیق وتصنیف کے علاوہ اخلاق وعادات اور کردار وعمل کے اعتبار سے بھی وہ سلف صالحین کا نمونہ تھے نہایت مخلص، بے لوث، عابد و زاہد، خندہ جبیں، شگفتہ طبع، ملنسار اور متواضع اور مرنجان ومرنج۔

موثر الذکر ہندوستان کے نامی گرامی بیرسٹر تھے سپریم کورٹ کے ممتاز قانون دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قومی اور ملی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ طبیعت قلندرانہ پائی تھی۔ ایک برس دلی کے میئر (MAYOR) اور اس حیثیت سے بہت کامیاب رہے تھے، دوسرے برس انہوں نے میئر ہونے سے انکار کر دیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی وائس چانسلر شپ کئی مرتبہ پیش کی گئی لیکن انہوں نے قبول نہیں کی، وہ اگر چاہتے تو مرکزی کابینہ میں شمولیت اور کسی ملک کی سفارت کا حصول اُن کے لیے معمولی بات تھی، لیکن کبھی ان چیزوں کی طرف انہوں نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بیرسٹر بہت اونچے درجے کے تھے، وہ بہت آسانی سے کروڑ پتی بن سکتے تھے، لیکن عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہے، اور یوں بھی بہت سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اکثر کہتے تھے، ''میں صرف اتنا کماتا ہوں، جس کی مجھے ضرورت ہوتی ہے، اس سے زیادہ کا غم میں نے کبھی نہیں پالا۔''

نہایت حق گو، جری اور بے باک تھے۔ صوم وصلوٰۃ اور تلاوت قرآن کے سختی سے پابند تھے، حج بھی کر آئے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں بزرگوں کی وفات ایک عظیم قومی وملّی حادثہ ہے، جس کی تلافی آسان نہیں ہے۔ لیکن شاہ صاحب اور نورالدین صاحب دونوں ہمارے ان نہایت عزیز اور مخلص دوستوں میں سے تھے جن کی معیت لطفِ حیات کا باعث ہوتی اور جدائی زندگی کو بے کیف و بے مزہ بنا دیتی ہے، اسی وجہ سے یہ دونوں دوست چلے گئے مگر ہمارا عالم جگر کے الفاظ میں اب تک یہ ہے:

اب بھی ہے تیرے تصور سے وہی راز و نیاز
اپنی بچھڑی ہوئی آغوشِ محبت کی قسم

اللھم ارحمھما واغفر لھما مغفرۃ عامۃ، شاملۃ، کاملۃ۔

[جنوری ۱۹۷۵ء]

فیصل، شاہ (شہید)

کل شیء ھالك الا وجھه

گزشتہ مہینہ شاہ فیصل کا حادثۂ شہادت موجودہ حالات میں عالم اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے جس کی شدت کو ایک مدت تک فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ مرحوم اس زمانہ میں عالم اسلام کی آبرو، عزت و وقار اور تمکنت تھے۔ قدرت نے انھیں سوز اور ساز دونوں نعمتوں سے نوازا تھا۔ کہنے کو خادم حرمین شریفین تھے لیکن درحقیقت وہ پاسبان ونگہبان حرم اسلام تھے۔ نور ایمان ویقین ان کا جوہر ذاتی، تعامل بالکتاب والسنۃ ان کا آئین حقیقی، فہم وفراست اور تدبر و دوراندیشی ان کی طبیعت کے گوہر آبدار تھے۔ مرحوم کی سربراہی کی مدت گیارہ برس سے زیادہ نہیں ہے، اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ عالم اسلام اندرونی وبیرونی اسباب وعوامل کے

باعث شدید کشمکش امید وبیم سے دوچار تھااوراس کے سر پر اضطراب وتشویش کی قیامتیں مچل رہی تھیں، لیکن شاہ فیصل کی قائدانہ بصیرت وبصارت نے وہ معجزہ نمائی کی کہ عالم ہی دوسرا ہوگیا۔امریکہ جواس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت وقوت ہے اورسیاست''فرنگ''__ جواس دور کا سب سے بڑاحربہ ہے، دونوں نے اس طرح سپرافگنی کی کہ روس اورامریکہ کے بجائے عالم کی نظریں شاہ کی جنبش مژگان وآبروپرمرتکز ہوگئیں اورامریکہ کے ٹائمزوغیرہ کوتسلیم کرنا پڑا کہ اس زمانہ کاسب سے بڑاسیاسی اورطاقتورانسان شاہ فیصل ہیں۔ یہ انھی کا حوصلہ تھا کہ عرب کی طاقت کالوہا دنیا سے منوالیا،انھوں نے عرب ممالک میں اتحاد پیدا کیا، انھیں خوداعتمادی سکھائی،عرب قومیت کی لعنت سے نجات دلا کرانھیں صراطِ مستقیم پر گامزن کیا۔ان کے دل میں اسلام اورمسلمانوں کادردکوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے اربوں اورکھربوں روپیہ سے ضرورت مند عرب اوردوسرے عرب اسلامی ممالک کی بے تحاشامدد کی، دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہیں ان پر اُن کی نگاہ رہتی اوراُن کےفوزوفلاح کی تدبیر کرتے رہتے تھے۔

مرحوم نہایت محنتی،فرض شناس اورحددرجہ بیدارمغز اورروشن خیال فرمان روا تھے۔اسلامی اوردینی علوم وفنون کے ساتھ علوم جدیدہ اورسائنس وٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کی اہمیت وضرورت کاانھیں پورایقین تھا۔دنیا کے معاشی اوراقتصادی مسائل پران کی نگاہ مبصرانہ تھی، اس سلسلہ میں عرب بنک کا قیام ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اسلاف کےعلمی کارناموں (جسے التراث الاسلامی کہتے ہیں) کے احیا سے انھیں بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ ۱۹۶۷ء میں ہندوستان کے حج ڈیلی گیشن کے ساتھ راقم الحروف نے ایک خصوصی ملاقات میں تفسیر سفیان ثوری مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی اور مسند حمیدی مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کا تذکرہ کیا توشاہ مرحوم بے حد مسرور ہوئے، اس سلسلہ میں دو چار سوالات کیےاورہمارے سفیر ہند جناب قدوائی صاحب سے شکایت کی کہ انھوں نے اب تک یہ دونوں کتابیں اُن کونہیں پہنچائی ہیں۔غرض کہ ان کے کس کس وصف اورخوبی کا ذکر کیا جائے اس کے لیےایک مستقل کتاب درکار ہے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے ان کی شخصیت ایک گلشن رنگ وبو اور مینارۂ عظمت وبزرگی تھی۔ بردالله مضجعه و نور مرقده۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد

ولكنه بنيان قوم تهدما

[مئی ۱۹۷۵ء]

عثمانی،مولانا عامر

مولانا عامر عثمانی

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا عامر عثمانی ایڈیٹر تجلی دیوبند کا بھی غریب الوطنی میں قلب کادورہ پڑنے سے اچانک انتقال ہوگیا،مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے برادرعم زاد تھے، دارالعلوم دیوبند سےفراغت پائی تھی، ذہانت وطباعی اورشعروادب کا ذوق اس خاندان کی خصوصیت ہے۔مرحوم کوبھی اس سے بہرۂ وافر ملا تھا۔چنانچہ اردو زبان کے نغز گوشاعر بھی تھے اورایک صاحب طرزادیب بھی،شگفتہ نگاری کے ساتھ قلم بے حد شوخ اور بے باک تھا۔تنقید میں لگی لپٹی کچھ اٹھا کےنہیں رکھتے تھےاوراس اعتبار سےاس شعر کامصداق تھے:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

لیکن تنقید بڑی محنت اورکثیر مطالعہ کے بعد کرتے تھے، مذہبیات میں طنز نگاری ان کی ایجاد تھی۔ اللہ تعالیٰ کمزوریوں سےعفوودرگزرفرما کرمغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔آمین [مئی ۱۹۷۵ء]

الہٰ آبادی،مولانا شاہد فاخری

مولانا شاہد فاخری الہٰ آبادی

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا شاہد فاخری الہٰ آبادی کاانتقال ہوگیا۔مرحوم دائرہ اجملیہ الہٰ آباد کے سجادہ نشین،خلافت تحریک کےعظیم قائداورشعلہ بیان مقرر مولانا فاخر الہٰ آبادی کے خلف الرشید اوران کی روایات وخصوصیات کے بدرجۂ اتم حامل تھے چنانچہ انھوں نے بھی ساری عمرآزادی سے پہلے اورآزادی کے بعد کی قومی وملی تحریکات میں گزاردی۔

والدؒ کی طرح شعلہ بیان اورنہایت پُرجوش خطیب تھے۔آخرتک کانگریس اورجمعیۃ علمائے ہند سے وابستہ رہے اوراس سلسلہ میں قیدوبند کےمحن سے بھی دوچار ہوئے۔ان کی زندگی سراپا ایثار وخلوص تھی۔حق بات کہنے میں نہایت جری اور بیباک تھے۔ان کا قومی اورملی حلقوں میں بڑااحترام اوروقار تھا۔آزادی کے بعدانھوں نے جس جرأت وجسارت سےمسلم کاز کی حمایت کی وہ ان کا طغرائے امتیاز تھا۔پنڈت جواہر لال نہرو اوران کے خاندان سے ان کے ذاتی اوربے تکلفانہ تعلقات تھے۔مگر پنڈت جی کے سامنے بھی وہ حق بات کہنے میں کبھی نہیں ہچکچائے جس کی وجہ سے پنڈت جی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔اللهم اغفرله

وارحمہ۔ [اکتوبر۱۹۷۵ء]

میاں،مولانا سید محمد

مولانا سید محمد میاں

افسوس ہے ہماری انجمن علم وعمل کی ایک اورشمع روشن بجھ گئی، یعنی مولانا سید محمد میاں نے مختصر علالت کے بعد۷۴ برس کی عمر میں۲۲/ اکتوبر کوعین مغرب کے وقت ارون ہسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہااور راہی ملک بقا ہوگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔مولانا گوناگوں علمی وعملی کمالات کے جوایک شخص میں شاذونادر ہی جمع ہوتے ہیں جامع تھے، ایک طرف وہ بلند پایہ عالم،فقیہ ومحدث تھے دوسری طرف جنگ حریت وآزادی کے نہایت بہادراور بے خوف سپاہی، ایک طرف مورخ ومحقق اورکثیر التصانیف مصنف اوردوسری جانب اعلیٰ دفتری تنظیمی صلاحیتوں کے مالک،ایک طرف عابد شب زندہ دار اوردوسری طرف نہایت متواضع اورخلیق وملنسار، بے لوث وبے غرض،نام ونمود سے دور،شہرت ووجاہت طلبی سے نفور،نرم دم گفتار اورگرم بوقت پیکار۔مرحوم دیوبند کے سادات رضوی سے تعلق رکھتے تھے اس لیے دیوبند میں پیدا ہوئے اوروہیں ازاوّل تا آخر تعلیم حاصل کی۔فراغت کے بعد بعض مقامات پر مدرس رہے مگر پھر جمعیت علماء سے وابستہ ہوئے تو اسی کے ہوکر رہ گئے۔ وہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے دست راست تھے، اس سلسلے میں کئی مرتبہ جیل بھی گئے، باتیں کم کرتے تھے اورکام زیادہ، نہایت سمجھ بوجھ اور ہوش وگوش کے انسان تھے اورنہایت چست اور مستعد۔حقیقت یہ ہے کے دفتری نظم ونسق کا بھرم ان کے دم سے قائم تھا۔اگرچہ ایک عرصہ سے درس وتدریس کا باقاعدہ سلسلہ نہیں رہا تھا لیکن مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف کا ذوق فطری تھا اس بناپر جمعیت علماء کی ہنگامہ خیز اور شبانہ روز مصروفیات کے باوجود وہ پابندی سے اس میں بھی لگے رہے، چنانچہ اسی زمانہ میں دوکتابیں 'علماء ہند کا شاندار ماضی' (تین جلدوں میں) اور' علماء حق' (۲ جلدوں میں) ان کے قلم سے نکلیں اورشائع ہوتے ہی ارباب علم وذوق کے حلقوں میں مقبول ومشتہر ہوگئیں،مشرق ومغرب میں ان سے استفادہ کیا گیا اور ان دونوں کتابوں کی حیثیت ''حوالہ کی کتاب'' (Reference Book) کی ہوگئی، چنانچہ اس وقت بھی جب کہ یہ سطریں لکھی جارہی ہیں راقم الحروف کی میز پر کنیڈا کے زمانۂ قیام کے اپنے شاگرد ڈاکٹر یوحنا فریڈمان پروفیسر عبرانی یونیورسٹی، یروشلم کا ایک خط رکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے مولانا مرحوم کی بعض کتابوں سے متعلق استفسار کیا ہے۔اس سے پہلے انھیں کی نگرانی میں مرتب کی ہوئی ایک کتاب ''عہد حاضر کے علمائے اسلام'' کے نام سے انگریزی میں یروشلم یونیورسٹی سے شائع ہوچکی ہے، جس پر راقم الحروف کا تبصرہ اسلامک کلچر،حیدرآباد میں نکل چکا ہے، اس کتاب میں بھی کئی جگہ مولانا مرحوم کی ان کتابوں کے حوالے موجود ہیں۔

تقسیم کے بعد ملک میں جوحالات پیدا ہوئے انھوں نے بہت سے شیران بیشۂ شجاعت وقوم پروری کودل شکستہ وبیزار کرکے عملی سیاسیات سے ترک تعلق پر مجبور کردیا۔مرحوم بھی انھیں میں سے تھے لیکن جب تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حیات رہے وہ جمعیت سے لگے چمٹے رہے اور اس دور میں انھوں نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ جمعیت کے منصوبۂ دینی تعلیم کے ماتحت مکاتب کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا نصاب مرتب کرکے اس کے مطابق بچوں اوربچیوں کے لیے کتابیں لکھ ڈالیں جوگھر گھر مقبول ہوئیں اورمشہور ہوگئیں۔۱۹۶۲ء میں مولانا حفظ الرحمٰن خدا کو پیارے ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد مولانا سید میاں جمعیت علماء کی نظامت اعلیٰ سے مستعفی ہوکر خانہ نشین ہوگئے اوراب انھوں نے اپنے تئیں درس و تدریس،تصنیف وتالیف،افتاء اوررکن مجلس شوریٰ کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لیے ہمہ تن وقف کردیا۔اس زمانہ میں مدرسۂ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے حدیث کا درس دیتے رہے اور سیرت اوردوسرے دینی و تاریخی موضوعات پر متعدد چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں جواُن کے قبائے علم و فضل کا تکمۂ زریں ہیں۔لکھنے پر مولانا کواس درجہ قدرت تھی کہ جب چاہتے بے تکلف لکھتے اور لکھتے ہی چلے جاتے تھے۔قلم انھیں اس درجہ عزیز تھا کہ وفات سے دودن پہلے بھی وہ ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کررہے تھے۔ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی ہمہ گیر مصروفیتوں، جسمانی اسقام وعوارض اورکبرسن کے باعث ضعف واضمحلال کے باوجود کیا مجال کہ ان کے معمولات،عبادت واوراد ووظائف میں کوئی فرق آجائے۔ وہ چلے گئے اورنئی نسل کے لیے اخلاص وعمل، جدوجہداوراعلیٰ اقدارحیات کے لیے ہمہ تن سعی وکوشش کی ایک مثال قائم کرگئے۔رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ [نومبر۱۹۷۵ء]

کاشمیری،آغا شورش

آغا شورش کاشمیری

مولانا محمد میاں کے ماتم میں ابھی اشک غم دیدۂ پُرنم میں خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ اچانک لاہور سے آغا شورش کاشمیری کے انتقال پرملال کی خبرملی

اور جی دھک سے ہوکر رہ گیا۔اردو صحافت و جرنلزم کی تاریخ میں دبستان ظفر علی خاں نے پنجاب میں ارباب قلم اور اصحاب شعر و ادب کی جو ایک نہایت عظیم الشان اور نامور نسل پیدا کی ہے، مرحوم اس کے گل سرسبد تھے۔نوعمری میں ہی قومی اور ملی تحریکات میں سرگرمی اور جوش کے ساتھ عملاً شریک ہوجانے کے باعث تعلیم کبھی ڈھنگ سے نہیں پائی اور نہ اس کی تکمیل کی لیکن تحریر و تقریر کا ملکہ خداداد تھا، مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے زعمائے مجلس احرار نے اس کو جلا دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان کے منفرد صحافی، ادیب، بلند پایہ زود گو شاعر اور شعلہ بیان خطیب و مقرر بن گئے۔ان کو نثر و نظم دونوں پر بلا کی قدرت تھی اور دونوں میں خطابت کا رنگ جھلکتا تھا، اس اعتبار سے ان کے عبقری ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ان اوصاف و کمالات کے ساتھ اگر ان میں مصلحت پسندی بھی ہوتی تو ان کے لیے کیا کچھ نہیں تھا لیکن انھوں نے اصحاب دار و رسن کی راہ اختیار کی اور اس جوش و جذبہ کے ساتھ کہ عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ قید و بند میں گزارنا پڑا۔ابھی چند ماہ پہلے اُن کا محبت نامہ جو اڈیٹر برہان کے نام آیا تھا اس میں بڑی حسرت سے لکھا تھا: ''اس قید و بند نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا اور مجھ میں کچھ نہیں رہا، تمنا ہے کہ زندگی میں ایک بار آپ کو اور دیکھ لوں۔'' کیا خبر تھی کہ مرحوم کا یہ آخری خط ہے، ورنہ اس کے جواب میں مکتوب الیہ خود لاہور پہنچنے کی کوشش کرتا۔یہ عجب شرط دوستی و وفاداری ہے اے دوست کہ ادھر یہ تمنا اور ادھر یہ بے رخی کہ

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن کے نام کے عاشق تھے، مجھ سے اکثر شکایت کرتے تھے کہ برہان نے ان دونوں کا حق ادا نہیں کیا۔اب ایسے پیکر اخلاص و وفا دوست کہاں ملیں گے! اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ [نومبر ۱۹۷۵ء]

ولی الدین، ڈاکٹر میر

ڈاکٹر میر ولی الدین

حیدرآباد کی ایک اطلاع سے یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوا کہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا انتقال ہوگیا۔مرحوم کی عمر ۸۰ کے لگ بھگ ہوگی۔ان کا مرتبہ انڈو پاک کے مصنفین میں بہت بلند تھا۔دراصل ان کا مضمون فلسفہ تھا جس کے پروفیسر اور صدر شعبہ وہ ایک عرصہ تک جامعہ عثمانیہ میں رہے اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔لیکن تصوف کے ساتھ ان کو بڑا گہرا لگاؤ تھا علمی اور نظری اعتبار سے نہایت وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ وہ عملاً بھی ایک بلند پایہ صوفی تھے۔ایک مرتبہ کلکتہ میں ایک ہفتہ تک وہ راقم الحروف کے مہمان رہے تو اس مدت میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں تھا جب کہ وہ تہجد کے لیے بیدار نہ ہوئے ہوں اور نماز کے بعد صلاۃ فجر تک اوراد و وظائف میں مشغول نہ رہے ہوں۔انھوں نے انگریزی اور اردو تصنیفات و تالیفات کا ایک عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے۔ان میں سے ہر تصنیف ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ندوۃ المصنفین اور اس کے ارکان کے ساتھ ان کو بڑا مخلصانہ اور مشفقانہ تعلق تھا چنانچہ اس ادارے میں ان کی متعدد کتابیں چھپی ہیں اور مقبول عام و خاص ہوئی ہیں۔ادھر کئی سال سے وہ بے حد کمزور اور ضعیف ہوکر خانہ نشین ہوگئے تھے مگر تصنیف و تالیف کا مشغلہ پھر بھی جاری تھا۔اللہ تعالیٰ ان کے مراتب و مدارج بڑھائے اور ان کو جنت الفردوس نصیب ہو۔ [دسمبر ۱۹۷۵ء]

سنبھلی، مولانا محمد اسمٰعیل

مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی

افسوس ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی بھی ہم سے رخصت ہوگئے۔مولانا دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور بڑے جوش اور جذبہ کے انسان تھے اسی وجہ سے وہ ہمیشہ جمعیۃ علماء کے ساتھ وابستہ رہے اور اس سلسلہ میں قید و محن کی تکالیف بھی برداشت کیں۔وہ نہایت پُر جوش خطیب و مقرر تھے، ان کی تقریر کی خصوصیت یہ تھی کہ شروع سے لے کر آخیر تک ایک سکینڈ کے وقفہ کے بغیر اور ایک ہی لب و لہجہ سے تقریر کرتے تھے۔تقسیم کے بعد دوسرے حضرات کی طرح انھوں نے بھی عملی سیاسیات سے ترک تعلق کرلیا تھا اور یوپی اور گجرات کے مختلف مدارس میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔نہایت مخلص، بے لوث اور متواضع بزرگ تھے۔اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت و رحمت کی نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔

[دسمبر ۱۹۷۵ء]

ندوی، مولانا عبدالباری

مولانا عبدالباری ندوی

افسوس ہے مولانا عبدالباری ندوی کا گزشتہ مہینہ ایک طویل علالت کے بعد ۸۲ برس کی عمر میں ان کے وطن لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔مولانا کے نہایت ذہین اور طباع ہونے کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کی اصل تعلیم قدیم

طریقہ کے مطابق عربی اور فارسی کی تھی اور انگریزی غالباً ہائی اسکول تک پڑھی تھی لیکن اپنے ذاتی مطالعہ اور شوق سے انھوں نے انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ اولاً فلسفۂ یورپ اور ثانیاً سائنس کا مطالعہ کرسکیں۔ فلسفہ سے انھیں خاص مناسبت تھی، چنانچہ اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ برکلے، برگساں اور ڈیوڈ ہیوم پر انھوں نے کتابیں لکھیں اور ان کی بعض کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور نہ صرف یہ بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے فلسفہ کے لیکچرر اور پھر اس کے ریڈر مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں سیرت النبیؐ مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی کی جلد سوئم کے قدیم ایڈیشن میں مرحوم نے معجزات پر جو ایک باب لکھا تھا وہ زبان و بیان اور استدلال واستنتاج کے اعتبار سے ایک نہایت اہم مقالہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

طبع سلیم اگر رہنما نہ تو فرط ذہانت اور فلسفہ کے ساتھ انہماک وتوغل بسا اوقات گمراہی کا سبب ہوجاتے ہیں، چنانچہ مرحوم کے ساتھ یہی ہوا، زندقہ والحاد کا شکار ہوگئے۔ ایک مدت کے بعد جب مولانا تھانوی سے بیعت ہوئے تو فلسفہ کا ردعمل اس شکل میں ہوا کہ مذہب کا رہبانی تصور غالب آ گیا، غرض کہ وہ زمانہ میں ع

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلاشُدی

کا مصداق رہے۔ عملاً بڑے صالح، نیک، متقی اور پرہیز گار، زاہد وعابد، شب زندہ دار اور اخلاقی اعتبار سے بڑے شگفتہ طبع، بذلہ سنج وملنسار تھے۔ مولانا شبلی کی تعلیم و تربیت نے اکابر علماء وفضلا اور نامور ارباب قلم کی جو عظیم نسل پیدا کی تھی، مولانا اس کی آخری یادگار تھے۔ ان کی آخری تصنیف جو بڑی معرکۃ الآرا ہے ''مذہب و سائنس'' ہے۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں اور خطاؤں کو معاف فرمادے اور انھیں مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے۔ آمین [فروری ۱۹۷۶ء]

عبدالعلیم، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالعلیم

افسوس ہے پچھلے دنوں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کا ۷۱ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا اور تدفین علی گڑھ کے یونیورسٹی قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم نے جامعہ سے بی۔اے (آنرز) کیا، پھر برلن سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ اور کلچر کے برسوں لکچرر رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ان کو یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی جگہ پر لے آئے۔ چند برس کے بعد پروفیسر ہوئے، پھر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم ہوا تو اس کے ڈائرکٹر یہی ہوئے، پروفیسر شپ سے سبکدوش ہونے والے تھے کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، یہ مدّت ختم ہونے کو تھی کہ اُردو ترقی بورڈ کے چیرمین ہوگئے۔ اس عہدہ پر؟ برس کی مدت پوری کرنے کے بعد گزشتہ ماہ جنوری میں ایک برس کے لیے مزید توسیع ہوئی تھی کہ ۱۷ر فروری کو پیغامِ اجل آپہنچا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مرحوم اول درجہ کے نیشنلسٹ اور فرزندانِ جامعہ وعلی گڑھ میں بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ اردو کے ترقی پسند ادیبوں میں اُن کو ایک نمایاں اور امتیازی مقام حاصل تھا۔ لکھتے بہت کم تھے، مگر جو کچھ لکھتے شگفتہ اور دل نشین لکھتے تھے۔ اخلاق وعادات کے اعتبار سے بڑے شریف، خلیق، ملنسار اور ہمدرد وغم گسار تھے، غریبوں اور ضرورتمندوں کی مدد بڑی فیاضی اور جرأت سے کرتے، یہاں تک کہ قاعدہ وقانون اور ضابطہ وآئین کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ نہایت باوضع اور رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ مرحوم جامعہ ملّیہ کی تاریخ کا ایک باب تھے، وہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک داستان اور ایک کہانی تھے۔ حیف کہ اب یہ کہانی ختم ہوگئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ [مارچ ۱۹۷۶ء]

صدیقی، ڈاکٹر محمد زبیر

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی

صدحیف، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی بھی گزشتہ ماہ ہم سے جدا ہوگئے ہیں۔ عمر پچاسی چھیاسی کے قریب ہوگی۔ ہماری گزشتہ نسل میں برصغیر انڈو پاک کی یونی ورسٹیوں میں عربی اور فارسی کے جو نامور اور بلند پایہ اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ اساتذہ پیدا ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب مرحوم اُن میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے اور اس بزم کی آخری شمع بھی تھے۔ مرحوم نے ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ رام پور میں پائی تھی، یہ مدرسہ اُس زمانے میں منطق اور فلسفہ کے لیے مشہور تھا اور مولانا محمد طیب مکی اور مولانا فضل حق ایسے نامور فاضل روزگار اس مدرسہ کے علی الترتیب پرنسپل اور صدرالمدرسین تھے، مرحوم نے دونوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا لیکن ابھی فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ایک مرتبہ مدرسہ کے بنگالی اور پٹھان طلبہ میں سخت فساد ہوگیا اور دو بنگالی طالب علم مارے گئے، ریاست نے فوراً مدرسہ بند کرنے اور طلبہ کو ہوسٹل چھوڑنے کا حکم دیا، ڈاکٹر صاحب نے خود بیان کیا تھا کہ اس حکم کے ماتحت وہ بھی رام پور چھوڑ کر مرادآباد آ گئے اور وہاں شاہی مسجد کے مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ لیکن جی نہ لگا اور چند مہینوں کے بعد اسے بھی چھوڑ کر وطن (بہار) آ گئے۔ اب انھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی فاضل کا امتحان پاس

کیا اور پھر انگریزی کے امتحانات دینے شروع کئے۔ عربی میں ایم۔اے کے بعد حکومت بہار کے وظیفہ پر کیمبرج گئے اور ڈاکٹر ہوئے۔ وطن واپس آ کر کچھ دنوں لکھنؤ میں عربی کے استاد رہے، پھر جس زمانہ میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور انھوں نے اپنے والد سر اسوتوش مکرجی کے نام پر یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ وثقافت کا ایک شعبہ کھولا تھا وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اس شعبہ کے سربراہ کی حیثیت سے لکھنؤ کلکتہ لے آئے۔ عربی اور فارسی کے مشترکہ شعبہ کے صدر اور پروفیسر بھی مقرر ہوئے اور آخر ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء میں اس عہدہ سے سبکدوش ہو کر کلکتہ میں مستقلاً اقامت گزیں ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب عربی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں کے بلند پایہ مصنف تھے۔ عربی میں ان کی کتاب ''السیر الحثیث فی تدوین الحدیث'' اور انگریزی میں ''حدیث لٹریچر'' اور ''عربی وفارسی میں طب'' بڑی محققانہ اور معرکہ آرا کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ''تاریخ ہرات'' اور ''فردوس الحکمۃ'' یہ دونوں کتابیں ایڈٹ بھی کی تھیں۔ ''اسلام میں عورت کا مرتبہ'' کے عنوان سے ایک طویل محققانہ مقالہ بھی لکھا تھا، اُن کا ارادہ مزید اضافہ کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا تھا لیکن غالباً یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ مستشرقین میں بھی اُن کا بڑا اعتبار اور وقار تھا۔ طبعاً بڑے خلیق، شگفتہ طبع اور متواضع تھے، دینداری انھوں نے ورثہ میں پائی تھی۔

راقم الحروف سے انھیں ایسا تعلق خاطر تھا کہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں ہفتہ میں ایک مرتبہ میں اُن کے یہاں جاتا تھا اور ایک مرتبہ وہ اکثر متعلقین کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے! ضرورت ہے کہ اُن پر ایک مستقل مقالہ شائع کیا جائے، موقع ہوا تو یہ فرض جو برہان پر قرض ہے برہان انجام دے گا۔

[اپریل ۱۹۷۶ء]

شاہجہاں پوری، مولانا مفتی مہدی حسن

مولانا مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری

آہ! کیوں کر کہئے کہ علم وفضل اور تحقیق وتدقیق کی ایک اور شمع روشن گزشتہ ماہ کی ۲۹ر تاریخ کو گل ہوگئی یعنی مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری نے اپنے وطن میں وفات پائی، مولانا کا سلسلۂ نسب بیس (۲۰) واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے، ساتویں پشت میں آپ کے جدِّ امجد سید ابو اسحٰق ابراہیم عہدِ شاہجہانی میں بغداد سے ہندوستان آئے اور اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے، حضرت مفتی صاحب ۱۳۰۰ ہجری میں شاہجہانپور کے محلّہ کاکا خیل میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کے مدرستہ امینیہ دہلی میں درسیات کی تکمیل کی پھر دیوبند جا کر حضرت شیخ الہندؒ سے صحیح بخاری اور ترمذی کا درس لیا۔ اگرچہ بیعت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے تھے لیکن خلافت واجازت حضرت کے خلیفۂ مجاز مولانا شیخ شفیع الدین مہاجر مکیؒ سے لی۔ کم وبیش تیس برس راندیر ضلع سورت میں مقیم رہ کر درس وافتا کی خدمات انجام دیں، پھر صدر مفتی کے عہدہ پر دیوبند چلے گئے۔ تقریباً اٹھارہ برس کے بعد مسلسل بیماری اور ضعیفی کے باعث وطن چلے گئے، یہاں آخر دم تک صاحبِ فراش ہونے کے باوجود افتا اور مطالعۂ کتب کا مشغلہ برابر جاری رہا۔ حدیث اور فقہ مولانا کے خاص فن تھے، چھوٹی بڑی متعدد کتابیں تصنیف کیں، لیکن علمی تحقیق وتدقیق، دقّتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا شاہکار یہ کتابیں ہیں، (۱) امام محمد کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ کی تحقیق وترتیب اور اُس پر تعلیقات وحواشی، پوری کتاب میں ہے لیکن حیدرآباد سے دو جلدیں شائع ہوئی ہیں، (۲) امام محمد کی کتاب الآثار کی شرح تین ضخیم جلدوں میں یہ بھی حیدرآباد سے شائع ہوئی ہیں، (۳) مؤطا امام محمد کی شرح، (۴) علامہ ابن حزم کی کتاب المحلی پر تنقید جو غالباً مکمل نہیں ہوئی۔ علمی اور تحقیقی کمالات کے ساتھ شعروادب کا ذوق بھی بڑا شگفتہ تھا، عربی اور اُردو دونوں میں قادرالکلام شاعر تھے۔ ورع و تقویٰ اور اخلاق وشمائل میں سلف صالحین کا نمونہ، نہایت شگفتہ طبع، خندہ جبیں، متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ اَعْلَی اللّٰہُ مَقَامَہٗ و برد مَضْجَعَہٗ۔

[مئی ۱۹۷۶ء]

صدیقی، محمد یوسف

محمد یوسف صدیقی

افسوس ہے اِنھیں دنوں ہمارے فاضل اور لائق دوست جناب یوسف صاحب صدیقی بھی ہم سے جدا ہو گئے، مرحوم انگریزی اخبار ریڈینس (اب ممنوع) کے اڈیٹر تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے، انگریزی اور اردو دونوں میں تحریر وتقریر کی قدرت تھی۔ بڑے ہوش وگوش اور سمجھ بوجھ کے انسان تھے۔ صبر واستقلال اور خلوص اُن کا شعار تھا، مجلسِ مشاورت کے جنرل سکریٹری تھے، جماعتِ اسلامی (اب ممنوع) کے ہائی کمانڈ میں شامل ہونے کے باعث متعدد بار قید وبند کی تکالیف سے دوچار ہوئے، لیکن پائے استقامت میں کبھی

جنبش نہیں ہوئی، جووقت پڑا اسے ہنسی خوشی انگیز کرلیا۔ ریڈینس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے عرب ملکوں اورخصوصاً سعودیہ عرب میں اُن کا بڑا وقار و اعتبار تھا چنانچہ وہاں کی متعدد کانفرنسوں میں مدعو کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ گھر کے بہت خوش حال اورصاحبِ املاک وجائداد تھے۔ عمر اسّی کے لگ بھگ ہوگی، اس کے باوجود گھر کا عیش وآرام چھوڑ کر جماعتی کاز کی خاطر دلّی میں غربت اور بے آرامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اپنے وطن ٹونک میں تھے کہ وہاں سے بیوی کے ڈاکٹری معائنہ کی غرض سے جے پور آئے، ابھی ڈاکٹری معائنہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ خود انہیں پیغامِ اجل آپہنچا۔ بڑی خوبیوں کے نہایت شریف اور باوضع انسان تھے۔ اللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارحمہ۔ [مئی ۱۹۷۶ء]

فارقلیط، مولانا محمد عثمان

مولانا محمد عثمان فارقلیط

سخت افسوس ہے کہ مولانا محمد عثمان فارقلیط بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ تقریباً اسّی برس کی عمر پائی۔ مرحوم گوناگوں خوبیوں اورکمالات کے بزرگ تھے، علوم دینیہ وعربیہ کی باقاعدہ تکمیل مختلف مدارس میں اوربعض اربابِ کمال کی صحبت میں رہ کرشخصی طور پر کی تھی۔ شروع میں طبیعت مناظرہ کی طرف مائل تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے عیسائیت اوراُس کے لٹریچر کا مطالعہ بڑی وقّتِ نظر اوروسعت سے کیا تھا۔ اسی شوق میں انھوں نے انگریزی پڑھی اوراُس میں بڑی اچھی استعداد پیدا کرلی، ساتھ ہی سنسکرت اورعبرانی زبان سے بھی واقفیت پیدا کی، لیکن ان کی تقدیر میں اُردو زبان کا عظیم صحافی ہونا لکھا تھا، اس لیے وہ جلد ہی جرنلزم کی طرف مائل ہوگئے۔ پہلے اِدھر اُدھر دہلی اور پنجاب میں مختلف اخبارات کی ادارت کرتے رہے، اس کے بعد اخبار الجمعیۃ سے وابستہ ہوئے تو ایک مختصر وقفہ کومستثنیٰ کرکے اُس کے ہوکررہ گئے اورساری زندگی اُس کے لیے وقف کردی۔

مرحوم کا سیاسی اورمذہبی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ طبعاً نہایت ذہین اورطباع تھے۔ قلم بے حد شگفتہ تھا، جوکچھ لکھتے تھے بہت صاف، واضح، مدلل، پرمغز اور ساتھ ہی پرجوش اور ولولہ انگیز ہوتا تھا اس لیے ان کے افتتاحیے بڑے شوق وذوق سے پڑھے جاتے اورعوام وخواص سے خراجِ تحسین وصول کرتے تھے۔ لیکن انگریزوں کے زمانہ کی بات دوسری تھی۔ ایک غیرملکی حکومت سے واسطہ تھا اور ہندوستان اُس سے جنگِ آزادی لڑرہا تھا۔ قلم نے تلوار کی جگہ لے لی تھی، اس لیے جتنا سخت لکھتے کارِثواب تھا اوراُس کی پاداش میں جیل جانا یا اخبار کی ضمانت کا ضبط ہوجانا استخلاصِ وطن کی شریعت کا حجِ آزادی جواپنے جلو میں تقسیم اوراُس کی تباہ کاریاں لے کرآئی، اُس کے بعدصورتِ حال بالکل مختلف ہوگئی، اب مولانا محمد عثمان فارقلیط کے خامۂ شعلہ بار وآتش فگن کواس دوگونہ رنج وعذاب سے دوچار ہونا پڑا کہ:

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ مسلک عاشقی پر گامزن اورمولانا فارقلیط تمنا کی بے تابی کے صیدِ زبون! نتیجہ یہ ہوا کہ کشمکش بڑھنے لگی، ہم نے خود بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ دفتر جمعیت علماء میں مغرب کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا دربار لگا ہوا ہے، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اوردوسرے حضرات جوروز کے حاضر باش تھے بیٹھے ہوئے ہیں، اِدھر اُدھر کی باتیں ہورہی ہیں، اسی اثناء میں مولانا فارقلیط کو بلایا گیا، وہ آگئے تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے حسب عادت اُن پر برسنا شروع کردیا: ''میں آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ قلم سنبھال کے لکھئے، اُس کو اسپ بے لگام نہ ہونے دیجیے، مگرآپ پرکوئی اثر نہیں ہوتا۔ الجمعیۃ اُٹھا کراُس کے مقالۂ افتتاحیہ کی بعض سطریں پڑھنی شروع کردیتے ہیں اورعصہ سے اُسے رکھ کر پھرفرماتے ہیں: بھلا اس قدرسخت اوراشتعال انگیز لکھنے سے فائدہ کیا؟ اگراس سے کچھ مقصد برآری ہوتی ہو؟ ایک بات بھی ہے، ورنہ کھسیانی بلّی بننے سے اپنا ہی منہ بگڑتا ہے، حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔'' مولانا کو تو تقریر کا ایک بہانہ ملنا چاہیے تھا وہ ہیں کہ کہے چلے جارہے اور فارقلیط صاحب گردن جھکائے خاموش بیٹھے زجروتوبیخ کے تلخ گھونٹ حلق سے نیچے اُتار رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مجلس برخاست ہوتی اور میں اور فارقلیط صاحب دفتر سے باہرآتے تو فارقلیط صاحب آبدیدہ ہوکر مجھ سے کہتے: ''مولانا! ہائے کیا بے بسی اور بے چارگی کا وقت آیا ہے کہ ہم روتے ہیں تو اس کی اجازت بھی نہیں ملتی''، اس کے بعد غالب کا یہ شعر پڑھتے:

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں، یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

قومی اورملکی مسائل ومعاملات کے علاوہ انھوں نے مسلمانوں کی اخلاقی، مذہبی، معاشی اور سماجی اصلاح کے لیے بھی ایک سے ایک بہتر، فکرانگیز اور بصیرت افروز سینکڑوں مقالات لکھے۔ اُن کی تنقید ہمیشہ تعمیری ہوتی اورجو بات کہتے وہ اُن کے سوزِ درون کا؟ ہوتی تھی۔ بحیثیت انسان کے وہ عجیب وغریب

اوصاف وکمالات کے بزرگ تھے نہایت سادہ، قانع، بے لوث و بے غرض، نہ کسی دعوت اور پارٹی سے غرض، نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ دنیوی عیش اور آرام سے واسطہ! اُن کی چاء اور بیڑی سلامت! پھر انھیں کسی چیز سے کوئی غرض نہیں۔

[جولائی ۱۹۷۶ء]

گزشتہ ماہ کے نظرات میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم کے متعلق دو واقعوں کا ذکر ہونے سے رہ گیا۔اس کی تلافی اب کی جاتی ہے۔مرحوم جس درجہ مخلص، بے نفس اور بے لوث و بے غرض تھے، اسے ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے سب جانتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں میرے ساتھ جو ایک واقعہ پیش آیا میرے دل پر مرحوم کے لیے جذبات شکرگزاری کے ساتھ اب تک اس کا گہرا اثر ہے۔ دوسوا دو برس پہلے کی بات ہے ایک دن مرحوم نے مجھے لکھا: ''میرے پاس انگریزی کی چند اہم علمی کتابیں اور پرانے انگریزی رسالے ہیں میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کی نذر کردوں کیونکہ میرے نزدیک آپ سے زیادہ کوئی اور شخص مستحق نہیں۔ میں خود اب ان کتابوں سے استفادہ نہیں کرسکتا''۔ میں نے کہا: بہت بہتر! میں شکریہ کے ساتھ قبول کروں گا۔دوسرے دن مولانا نے ایک صاحبزادے کے ہاتھ ایک بڑا بنڈل میرے پاس بھیج دیا۔میں نے شوق اشتیاق کے ہاتھوں سے اسے کھولا تو میری خوشی کی انتہا نہیں رہی، جب میں نے اس بنڈل میں دوسری چیزوں کے ساتھ تاریخ یہود پر انگلینڈ کی ایک بہت پرانی مطبوعہ اور بہت ضخیم کتاب بھی دیکھی۔میں اس کتاب کے نام سے واقف تھا مگر تلاش کے باوجود کہیں دستیاب نہ ہوئی تھی۔اس غیر معمولی عنایت وکرم کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے میں خود مولانا کے مکان پر گیا۔حسب معمول بڑی محبت اور ولولے وجوش سے ملے۔الجمعیۃ سے الگ ہونے کی داستان سنائی۔ برہان اور خاص طور پر اس کے نظرات کی تعریف کرتے رہے اور تجویز کیا کہ یہ سب نظرات کتابی شکل میں یکجا شایع ہونے ضروری ہیں۔مسلمانوں کی بے حسی اور غفلت شعاری کا ماتم کرتے رہے کہ میں نے خفتہ بخت قوم کو بیدار کرنے کے لیے کیا کچھ جتن نہیں کیے مگر اس پر ذرا اثر نہیں ہوا۔اس لیے وہ کہتے تھے کہ میں تو اس ملک میں ان کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہوں۔یہ کہہ کر آبدیدہ ہوگئے اور ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

میں نے ان کے گراں قدر تحفہ کا شکریہ ادا کیا۔اور کہا: ''تاریخ یہود پر جو کتاب آپ نے بھیجی ہے وہ اب نایاب ہے مگر ہے بہت اہم۔اس لیے اگر آپ اس کو کسی یونیورسٹی کے ہاتھ فروخت کردیں تو منہ مانگے دام مل سکتے ہیں۔مرحوم نے کہا: ''جی ہاں مجھے معلوم ہے لیکن فارقلیط صاحبِ قلم ہے، صاحب دوکان نہیں۔بات یہ ہے کہ میرے پاس کتابوں اور قدیم مجلّات کا بڑا ذخیرہ ہے، اب زندگی کا چراغ جھلملا رہا ہے۔یہ سب چیزیں میرے لیے بے کار ہیں۔انھیں کسی اور کی نظر کروں گا۔تاریخ یہود پر جو کتاب آپ کو بھیجی ہے اس کی علمی اہمیت اور قدر وقیمت کی وجہ سے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آپ جس ذوق کے آدمی ہیں اور جو علمی خدمات آپ کی ہیں اور کررہے ہیں، ان کے اعتراف کے طور پر یہ کتاب آپ کی نظر کروں گا۔آپ نے اسے قبول فرمالیا میں شکرگزار ہوں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ انہی دنوں میں حیات ونزول مسیح کے مسئلہ میں جب بعض اخبارات نے مولانا فارقلیط پر لے دی کی اور شور مچایا تو ازراہِ تعلق خاطر انھوں نے مجھے لکھا: میرے خلاف سخت ہنگامہ بپا ہے۔لکھنؤ کے ایک مولوی صاحب اپنے ایک رفیق کے ساتھ مجھ کو تبلیغ کرنے کے لیے آنا بھی چاہتے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا ہوں۔اس سے مجھ کو بڑی روشنی ملے گی۔میں نے مولانا کو حسب عادت مختصر خط لکھا: ''جس طرح قرآن مجید میں متشابہات ہیں اسی طرح علامہ جلال الدین سیوطی کے بقول میرے نزدیک بعض احادیث بھی متشابہات ہیں اور مسئلہ متعلقہ کے بارے میں جو احادیث صحیح ہیں وہ سب اسی قسم میں شامل ہیں۔اس بنا پر آیات متشابہات کے بارے میں میرا جو عمل ہے یعنی مثلاً صفات باری کے متعلق قرآن میں جو کچھ ہے اور جس طرح ہے میں اُس پر ایمان رکھتا ہوں لیکن ساتھ ہی کہتا ہوں کہ اُن کی حقیقت کیا ہے؟ مجھے نہیں معلوم، کائنات میں کتنی چیزیں ہیں جن کا وجود یقینی ہے لیکن سائنس کو ان کی حقیقت کے معلوم نہ کرسکنے کا اعتراف ہے، پس میرا یہی طریقہ عمل اُن احادیث کے متعلق ہے جو میری رائے میں متشابہات میں داخل ہیں۔ اس بنا پر اُن سے متعلق نہ میں بحث کرنا پسند کرتا ہوں اور نہ کسی سے الجھنا۔اور نہ ہم شرعاً اس پر بحث کرنے کے مکلّف ہیں، بلکہ امور قدر و جبر کی طرح یہ معاملات ومسائل وہ ہیں جن پر بحث کرنے کی ممانعت حدیث سے نکلتی ہے۔ یوں شرح عقائد نسفی میری محبوب کتاب ہے، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بیضاوی وغیرہ کے ساتھ اس کتاب کا درس سالہا سال سے دیتا رہا ہوں اور اس قسم کے مسائل ومباحث پر طلبا کے سامنے تقریریں کرتا رہا ہوں لیکن پبلک میں ان چیزوں کو معرض بحث میں لانا سخت ناپسند کرتا ہوں۔ایک صدی اور انتظار کیجئے سائنس خود قرآن کے بیان کردہ حقائق غیبیہ کو آپ کے سامنے بے نقاب وحجاب لاکر پیش کردے گی۔وما ذلك

علی اللہ بعزیز۔''

یہ خط بہت سرسری اور جلدی میں لکھا گیا تھا، مگر وقت کی بات! مرحوم پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا، اس کے جواب میں ایک پرزہ پر صرف یہ لکھ کر بھیجا: ''جزاک اللہ! دل کے دریچے کھل گئے۔'' میرا خیال ہے کہ مرحوم کا آخری بیان جس پر اُن کے خلاف سارا ہنگامہ فرو ہوا ہے میرے اس خط کے بعد ہی نکلا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ ایک اخبار کا ایڈیٹر اس حیثیت سے بڑا بدنصیب ہوتا ہے کہ ہزاروں صفحات اچھے سے اچھے لکھتا ہے لیکن حاصل وصول کچھ نہیں، سب کچھ ردی کے بھاؤ بک جاتا ہے اور کوئی چیز اس کی یادگار نہیں رہتی، اسے نہ تاریخ ادب میں جگہ ملتی ہے اور نہ مصنفین ومؤلفین اور ادیبوں کے زمرہ میں اُس کا شمار ہوتا ہے، ایک شعلۂ مستعجل کی طرح چمکتا ہے اور بجھ کر ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجاتا ہے، فارقلیط مرحوم کے ساتھ اگر ایسا ہوا تو قوم کی بڑی بدنصیبی ہوگی۔

[اگست ۱۹۷۶ء]

رحمت اللہ، مولانا محمد

مولانا محمد رحمت اللہ

اسی مہینہ ایک اور حادثہ یہ پیش آیا کہ ہمارے رفیق ادارہ مولوی محمد عبداللہ صاحب طارق کے والد ماجد مولانا محمد رحمت اللہ صاحب چند روز کی معمولی علالت کے بعد کم وبیش ساٹھ برس کی عمر میں نظام الدین اولیاء، نئی دہلی میں وفات پاگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور علوم دینیہ میں پختہ استعداد کے مالک تھے۔ درس وتدریس اور تحریر کا بھی کبھی کبھی مشغلہ رہا، لیکن اُن کا اصل میدان وعظ وخطابت تھا، اس میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ مدراس اور گجرات ومہاراشٹر کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اُن کا گرویدہ تھا۔ نہایت خوش گفتار، عابد و زاہد اور خلیق وملنسار تھے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو بخشش کی نعمتوں سے نوازے اور اُن کے مدارج بلند فرمائے۔ آمین۔

[جولائی ۱۹۷۶ء]

شفیع، مولانا مفتی محمد

مولانا مفتی محمد شفیع

ابھی پاکستان ریڈیو سے یہ خبر وحشت اثر معلوم کرکے سخت صدمہ اور رنج ہوا کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا قلب کی حرکت کے بند ہوجانے سے انتقال پُرملال ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کے جو حضرات اساتذہ راقم الحروف کے بھی اساتذہ تھے، حضرت مفتی صاحب اُن کی آخری یادگار تھے، اب وہ بھی نہیں رہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دیوبند میں دو خاندان علم وفضل اور دینی خدمات وفیوض کے اعتبار سے بہت نمایاں ہیں، ایک عثمانی اور دوسرا صدیقی۔ مفتی صاحب مرحوم اول الذکر خاندان کے گل سرسبد تھے۔ مولانا محمد یٰسین صاحب جو دارالعلوم دیوبند میں درجۂ فارسی کے صدر المدرسین اور نہایت باکمال استاذ تھے، وہ آپ کے والدِ ماجد تھے۔ ۱۳۱۳ھ میں پیدا ہوئے، از اول تا آخر پوری تعلیم دارالعلوم میں پائی، ۱۳۳۵ھ میں فراغت پائی۔ اس زمانہ میں دارالعلوم کا آفتاب جہاں تاب نقطۂ عروج پر تھا، اس بناء پر مفتی صاحب کو اکابر علماء ومشائخ دیوبند سے استفادہ کا بہترین موقع ملا۔ کہتے ہیں چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے، لیکن جہاں علم وعمل کے چند در چند شمع ہائے روشن مصروف انجمن آرائی ہوں تو اُن کی فیض رسانی کا عالم کیا ہوگا! ذہانت، ذوق، علم وجستجو اور محنت وکاوش کا ملکہ خداداد تھا اس لیے مفتی صاحب جب فارغ ہوئے تو دارالعلوم کے قابلِ فخر فرزند تھے۔ فراغت کے بعد حضرت مولانا مفتی ۔۔؟ الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کی نگرانی اور تربیت کے زیرِ سایہ دارالافتاء میں؟ کام کیا اور درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دی، یہاں تک کہ دونوں شعبوں میں؟ نام پیدا کیا، اور اب خود اکابرِ دیوبند میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ اگرچہ تمام علوم وفنون متداولہ میں پختہ اور ٹھوس استعداد کے مالک تھے، لیکن خاص فن فقہ تھا اور اس مناسبت سے تفقہ فی الدین اُن کا جوہرِ ذاتی تھا۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور کراچی میں مقیم ہوئے، یہاں اسلامی دستور مرتب کرنے کے لیے جو سرکاری کمیٹی بنی تھی برسوں تک اُس کے رکن رہے۔ اسی درمیان میں عربی کا ایک مدرسہ قائم کیا جس کے خود مہتمم تھے، پاکستان میں اُن کی حیثیت صدر مفتی کی تھی۔ تصنیف وتالیف کا ذوق فطری تھا، دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ ''امدادالفتاویٰ'' کے نام سے آٹھ جلدوں میں مرتب اور مدون کیے جو دیوبند سے شایع ہوکر مقبول عوام وخواص ہوچکے ہیں۔ ''معارف القرآن'' کے نام سے کئی جلدوں میں تفسیر لکھی، ختم نبوت، مسائلِ جدیدہ اور دولت کی تقسیم اور اوزانِ شرعیہ کے نام سے الگ الگ نہایت مفید اور بصیرت افروز؟ لکھے۔ البلاغ اُن کا اپنا ماہنامہ تھا اُس میں بھی وقتاً فوقتاً اُن کے قلم سے بہت اچھے دینی اور اصلاحی مقالات نکلتے رہتے تھے۔ کئی سال سے صحت خراب ہوگئی تھی، متعدد

بار دل کا دورہ پڑا، ہسپتال میں داخل رہے اوراچھے ہوگئے۔گذشتہ سفر پاکستان کے موقع پرکم وبیش تیس برس کے بعد اُن کی قیام گاہ پر ملاقات کاشرف حاصل ہوا۔ بے حد خوش ہوئے، دعائیں دیں اور کافی دیرتک باتیں کرتے رہے،لیکن اُن کے؟بشرہ سے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ اب اگردل کادورہ پھرہوا تو جاں برنہ ہوسکیں گے،چنانچہ؟ہوا،اللہ تعالیٰ اعلیٰ علّیین میں مقام نصیب فرمائے آمین ثم آمین۔ [اکتوبر۱۹۷۶ء]

ندوی،مولانا محمداویس نگرامی

مولانا محمداویس نگرامی ندوی

افسوس ہے مولانا محمد اویس صاحب نگرامی بھی ایک طویل علالت کے بعد ؟اگست کی سہ پہر کولکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس خاکدانِ عالم سے رخصت ہوگئے۔عمرتر سٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

نگرام لکھنؤ کاایک مردم خیز قصبہ ہے ،مولانا یہاں کے ایک نامورعلمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔تعلیم ندوہ میں پائی ،فراغت کے بعد دارالمصنفین اعظم گڈھ چلے گئے،کم وبیش سات برس یہاں مقیم رہ کر' سیرت النبیؐ جلد اول پر نظرثانی کی۔ حافظ ابن قیم نے اپنی تصنیفات میں جہاں کہیں کسی آیت سے متعلق تفسیری کلام کیا ہے اُن سب کوتفسیرابن قیم کے نام سے یکجا مرتب کیا،علاوہ ازیں معارف میں بھی متعدد مقالات لکھے ۔یوں توسب ہی علوم اسلامیہ میں پختہ استعداد رکھتے تھےلیکن قرآن مجید کاذوق سب پرغالب تھا۔ چنانچہ یہ سب مقالات بھی قرآن مجید سے متعلق ہیں، دارالمصنفین سے جب وہ ندوۃ العلما میں منتقل ہوئے تویہاں بھی اُن کاخصوصی مشغلہ درسِ قرآن ہی رہا،مدرسہ کے اندر اوراُس کے باہر بھی۔ندوہ میں آنے کے بعد درس کی ہمہ گیرمصروفیتوں کے باعث وہ تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرسکے،تاہم جوکچھ لکھ گئے ہیں اُس کی افادیت میں کلام نہیں ہوسکتا۔

طبعاً نہایت شگفتہ مزاج ،خوش خلق ،خوش پوشاک وخوش خوراک تھے، خندہ جبینی اُن کی فطرت تھی،عملاً نہایت صالح اوراوراد و وظائف تک کے پابند تھے۔ مولانا سیدحسین احمدصاحب مدنیؒ سے بیعت تھے اور اس سلسلہ میں اُن سے برابرمراسلت بھی رکھتے تھے۔اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔

[اکتوبر۱۹۷۶ء]

مرزا،ڈاکٹر وحید

ڈاکٹر وحیدمرزا

پچھلے دنوں ڈاکٹر وحید مرزا کا بھی انتقال ہوگیا،عمراسّی۸۰ کے لگ بھگ ہوگی۔مرحوم ایک عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی اورفارسی کے پروفیسراورصدر شعبہ رہے۔امیرخسرو پراُن کی کتاب جواُن کے پی۔ایچ ڈی کاتحقیقی مقالہ ہے اب تک اس موضوع پرشاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔لکھنؤ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور چلے گئے اوراردو انسائیکلو پیڈیا اسکیم سے وابستہ ہوگئے اور وہیں وفات پائی۔غفراللہ لہ [اکتوبر۱۹۷۶ء]

دریابادی،مولاناعبدالماجد

مولاناعبدالماجددریابادی

افسوس ہے بہت دنوں سے جس کاکھٹکا لگاہوا تھا آخر وہ دن بھی آگیا یعنی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے کم وبیش ۸۵ برس کی عمر میں ایک طویل علالت کے بعد۶/جنوری ۱۹۷۷ءکواپنے وطن دریاباد میں وفات پائی۔اناللہ واناالیہ راجعون۔

مولانا اپنی خصوصیات اورکمالات واوصاف کے باعث ایک خاص اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ برصغیر ہندوپاک کےعلمی اورادبی اوراسلامی حلقے اُن کواپنا بزرگ مانتے اوراس لیےان کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے۔مولانا کی اصل تعلیم انگریزی کی تھی، فلسفہ اورنفسیات اُن کے خاص مضمون تھے۔لکھنؤ سے بی۔اے کیا تھا اس کے بعد کچھ دنوں علی گڑھ میں بھی رہے،لیکن ایم۔اے نہ کرسکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بی۔اے کی قدرآج کل کے پی ایچ۔ڈی سے بھی زیادہ ہوتی تھی اوروہ درحقیقت ان سے زیادہ قابل اور لائق بھی ہوتا۔مولانا نے باقاعدہ کبھی اورکہیں ملازمت نہیں کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں دار الترجمہ حیدرآباد دکن سے منسلک رہے اورمنطق و فلسفہ کی بعض کتابوں کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا،مگر وہاں جی نہ لگااوروطن چلے آئے، یہاں آکر ایسے جمے کہ بڑے بڑے انقلابات آئے، زمین اورآسمان زیروزبر ہوگئے مگر مولانا اپنے قصباتی کنج عافیت سے نہ نکلے اورساری عمروہیں گزاردی۔

مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغازایک فلسفی اوراردوشعروادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا۔مطالعہ کے دھنی اوررسیا،نظر میں وسعت اورذہانت وفطانت خداداد، اس زمانہ کے باکمال اربابِ قلم کی معیت وصحبت، پھرسب سے بڑی

بات یہ کہ انشاوتحریر کا ایک منفرد اسلوب، ان سب چیزوں نے مل جل کر عنفوان شباب میں ہی اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب اور مصنف بنادیا۔ مولانا نے تذکرۂ و سوانح، شعر وادب، تاریخ وفلسفہ اور اجتماعی مسائل، ان سب پر بہت کچھ لکھا اور اچھے سے اچھا لکھا، لیکن آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جو بقائے دوام کا ضامن ہے وہ انگریزی اور اردو میں ترجمہ وتفسیر کلام مجید ہے۔ ابھی عمر کی درمیانی منزل میں ہی تھے کہ آپ کو اپنے پیرومرشد حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کے فیض صحبت واثر سے قرآن مجید کے ساتھ ایسا شغف وانہماک پیدا ہوا کہ زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کردی، اگرچہ وہ دوسرے کام بھی کرتے رہے لیکن ان کی حیثیت ضمنی تھی۔ ترجمہ وتفسیر کے سلسلہ میں مولانا نے مسلسل سالہا سال جو محنت شاقہ برداشت کی ہے اور جس ذوق شوق اور انہماک سے یہ عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اُس کا اندازہ کتاب دیکھنے سے ہی ہوسکتا ہے۔ اس ذیل میں مولانا نے عربی اور اردو زبان کی تفاسیر اور عربی وقرآنی لغات کا مطالعہ تو محنت اور وسعت سے کیا ہی تھا، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید میں اہل کتاب اور اُن کی کتابوں کا تذکرہ کثرت سے ہے پھر امم قدیمہ کے حالات وسوانح بھی جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں، اس بناپر مولانا نے کتب قدیمہ یعنی New Testament And Old Testament کے پرانے اور نئے ایڈیشن اور امم سابقہ کی تاریخ پر نہایت مستند اور محققانہ کتابوں کا وہ عظیم ذخیرہ بڑی محنت اور دل کی لگن کے ساتھ کہاں کہاں سے فراہم کیا، اس سلسلہ میں عبرانی زبان بھی سیکھی، پھر قرآن مجید سے متعلق جو کچھ یورپ میں لکھا گیا تھا اس کی کتابیں بھی برابر بہم پہنچاتے اور بڑے غوروخوض سے ان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں فلسفہ اور سائنس کے نئے نئے نظریات وافکار سے بھی واقف رہتے تھے ان سب چیزوں سے انھوں نے اپنی تفسیر میں کام لیا اور یہی چیز مولانا کی تفسیر کی وہ انفرادی خصوصیت بن گئی جس میں کوئی ان کا سہیم وشریک نہیں ہے۔ تفسیر ماجدی کے بعد جن حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر یا اس کی تفہیم کے سلسلہ میں ان موضوعات پر لکھا ہے اُس میں انھوں نے درحقیقت مولانا کی ہی خوشہ چینی کی ہے۔ مولانا کے خامۂ زرنگار سے جو مضمون نکل گیا سدا بہار ہوگیا، لیکن علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب وتاب وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھے گی اور آیندہ نسلیں شکرگزاری کے ساتھ انھیں یاد کریں گی۔

مولانا کا سانحۂ وفات علم وادب کی دنیا کا عظیم حادثہ ہے لیکن مولانا کو ندوۃ المصنفین اور خاص طور پر برہان کے ساتھ جو قلبی لگاؤ اور ندوۃ المصنفین کے ناظم اور برہان کے ایڈیٹر کے ساتھ جو غیر معمولی شفقت بزرگانہ کا تعلق تھا اُس کی وجہ سے یہ حادثہ خود اپنا ذاتی حادثہ بھی ہے جس کے اثرات بہت دنوں تک محو نہ ہوں گے۔ مولانا علم وعمل، حق گوئی وصاف بیانی، اخلاق وشمائل اور عادات وخصائل کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ اُن کی وفات ایک دور کا خاتمہ اور مسلمانوں کی تاریخ عصر حاضر کے ایک باب کی انتہا ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ [جنوری ۱۹۷۷ء]

صدیقی، پروفیسر رشید احمد

پروفیسر رشید احمد صدیقی

افسوس ہے ابھی مولانا عبدالماجد دریابادی کے اشک ماتم خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ اردو ادب وانشا کے میدان کا ایک اور شہسوار گرا یعنی پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے کم وبیش پچاسی برس کی عمر میں علی گڑھ میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ مرحوم کا اصل وطن جونپور تھا لیکن طالب علمی کے زمانہ میں علی گڑھ آئے تو بس یہیں کے ہوکر رہ گئے، یہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ اُس زمانہ میں اردو میں ایم۔اے نہیں ہوتا تھا اس لیے فارسی میں ایم۔اے کیا، پھر یہیں اردو کے لیکچرر ہوئے اور ایک عرصہ کے بعد ریڈر بنے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جن کو مرحوم ہمیشہ مرشد کہتے اور لکھتے تھے اُن کی وائس چانسلری کے زمانہ میں پروفیسر ہوگئے لیکن اس عہدہ پر فائز ہوئے ابھی دو ہی برس ہوئے تھے کہ ملازمت سے سبکدوش کردیے گئے۔ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق وہ ابھی توسیع کے مستحق تھے لیکن اس زمانہ میں یونیورسٹی میں جو سیاست چل رہی تھی وہ مانع ہوئی اور شیخ عبدالرشید (شعبۂ تاریخ) وغیرہ کے ساتھ یہ بھی ریٹائرڈ کردیے گئے۔ مرحوم نہایت خوددار اور حساس تھے اس لیے انھوں نے شکوہ شکایت کسی سے نہیں کیا لیکن انھیں اس کا احساس عمر بھر رہا چنانچہ وہ علی گڑھ میں ہی اپنے ذاتی طویل وعریض مکان میں ایسے گوشہ نشین ہوکر بیٹھ گئے کہ نہ کبھی اردو ڈپارٹمنٹ میں قدم رکھا اور نہ یونیورسٹی کی کسی تقریب، کسی پارٹی اور فنکشن میں کہیں نظر آئے۔

مرحوم نے اگرچہ کوئی مستقل کتاب کبھی نہیں لکھی اور نہ کوئی علمی اور تحقیقی کام کیا لیکن وہ اردو زبان کے عظیم نکتہ دان اور ادیب تھے، اس لیے مضامین کثرت سے لکھے جن کے دو مجموعے ''طنزیات ومضحکات'' اور ''مضامین رشید''

کے نام سے طبع ہوکر ارباب ذوق میں مقبول اور مشہور ہوئے۔ علاوہ ازیں بعض خطبات بھی چھپے ہیں۔ ان کا اردو، فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ وسیع تھا، ذہانت خداداد، طبیعت میں جولانی اور نکتہ آفرینی، قوت مشاہدہ تیز، ان سب چیزوں نے جمع ہوکر انھیں ایک بالغ نظر، دقیقہ رس اور اعلیٰ درجہ کا ادیب اور نقاد بنا دیا۔ اُن کی تحریر میں زبان و بیان کی صحت و شگفتگی کے ساتھ ایک خاص قسم کا بانکپن اور تیکھاپن پایا جاتا تھا۔ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ لطیف طنز و مزاح کی آمیزش ان کی نگارش کو شراب دوآتشہ بنا دیتی تھی۔ اس وصف خاص میں اگر کوئی ان کا ہمسر تھا تو وہ احمد شاہ بخاری پطرس تھے لیکن کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی، احمد شاہ بخاری پر ترجیح کے مستحق ہیں، یہی وجہ ہے کہ برصغیر ہندو پاک کے ادباء اور دانشور انھیں اپنا سالار کارواں مانتے اور تسلیم کرتے تھے۔

انھوں نے ایک زمانہ میں علی گڑھ سے ایک سہ ماہی مجلّہ ''سہیل'' کے نام سے نکالنا شروع کیا تو ظاہری اور معنوی حیثیت سے یہ ایسی آن بان اور شان کا مجلّہ تھا کہ بڑے بڑے نامور ادبی مجلّات و رسائل اس کی آب و تاب کے سامنے ماند پڑ گئے۔ اس زمانہ کے اکابر علم و ادب حافظ محمود خاں شیرانی، پروفیسر محمد اقبال (پنجاب یونیورسٹی) مولانا ابوبکر شیث اس کے مقالہ نگاروں میں تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا ڈرامہ ''زود پشیمان'' سب سے پہلے اسی میں شایع ہوا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ مشعلۂ مستعجل ثابت ہوا، چھ سات نمبر ہی نکل پائے تھے کہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد علی گڑھ میگزین کے دو خاص اور ضخیم علی گڑھ تحریک نمبر ان کی نگرانی اور رہنمائی میں شایع ہوئے تو وہ بھی مہدی افادی کے بقول ''خاصہ کی چیز تھے''۔ غرض کہ ان کا جو کام تھا اعلیٰ قسم اور بلند معیار کا تھا، وہ علی گڑھ اور اس کی روایات کے دلدادہ اور عاشق تھے، اور اس درجہ کہ علی گڑھ ہی ان کا منبع خیال، مرکز فکر و نظر اور سرچشمۂ احساسات و جذبات تھا۔ چنانچہ ان کے اکثر مقالات و مضامین میں جو واقعات یا تلمیحات یا کردار مذکور ہیں وہ سب علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ رشید احمد صاحب صدیقی پر ان کی حیات میں کافی مقالات لکھے گئے اور ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر بعض لوگوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی لی، لیکن ہمارے نزدیک اس سلسلہ کا سب سے بہتر مقالہ وہ ہے جو پروفیسر محمد اسلوب انصاری (شعبۂ انگریزی، علی گڑھ) نے رشید صاحب کے فکر و فن پر لکھا اور جو ''فکر و نظر'' علی گڑھ میں کئی قسطوں میں چھپا تھا۔ طبعاً شگفتہ مزاج، خوش خلق، غیور و خوددار، مرنج و مرنجان مگر کم آمیز اور خلوت پسند تھے۔ وہ درحقیقت ان لوگوں میں سے تھے جن کے دیکھنے کو آیندہ نسلیں ترسیں گی مگر ان جیسا کسی کو نہ پاسکیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے۔ آمین

[فروری ۱۹۷۷ء]

احمد، فخر الدین علی (صدر جمہوریہ)

آہ مرحوم صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد

ملیشیا میں مرحوم فخر الدین علی احمد صاحب کے بیمار ہونے کی اطلاع اخبارات میں پڑھی تو ان سے جو تعلق خاطر تھا اس کے باعث تشویش پیدا ہوئی اور خصوصاً اس لیے کہ وہ دل کے مریض تھے، لیکن ۱۱/فروری کی صبح کو انگریزی اخبارات میں مرحوم کے بخیریت ہندوستان واپس پہنچ جانے کی خبر کے ساتھ ان کا وہ فوٹو بھی دیکھا جس میں وہ ہشاش و بشاش اور مسکراتے ہوئے وزیراعظم اور کابینہ کے بعض وزراء کے ساتھ پالم پر ہوائی جہاز سے اتر کر کھڑے ہیں تو دل کو اطمینان ہوا اور اللہ کا شکر ادا کیا، یہ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کی بات ہے۔ اس کے بعد سوا نو بجے حسب معمول انسٹیٹیوٹ آیا، سب سے پہلے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر کرنل تاج الدین صاحب سے ملاقات ہوئی تو علیک سلیک کے بعد انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا: ''سخت افسوس ہے کہ صدر کا انتقال ہوگیا۔'' یہ سننا تھا کہ جیسے بجلی گر پڑی اور جی دھک سے ہوکر رہ گیا، میں اور وہ فوراً ٹیلی فون پر آئے اور آخر جس خبر پر یقین کرنے کے لیے دل ہرگز آمادہ نہیں تھا اُس پر یقین کرنا پڑا اور عالم یہ ہوا کہ:

تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

آخر مرحوم کا ماتم گھر گھر بپا ہوا، ان پر سینکڑوں مضامین لکھے گئے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے صدر کی حیثیت سے بڑی بڑی حکومتوں کے نمائندوں نے اُن کی وفات پر اظہار غم کیا اور ان کی تدفین میں شرکت کی، ہزاروں قرآن مجید پڑھ کر ان کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا، سرکاری طور پر جو رسوم ضروری تھیں وہ ادا کی گئیں۔ ان کی زندگی سراپا عمل اور جدوجہد تھی، وہ ایک عظیم انسان کی طرح زندہ رہے اور اپنے ملک کے عظیم ترین انسان کی حیثیت میں جو ایک شخص کے لیے عزت و وجاہت دینوی کا آخری نقطۂ عروج و ترقی ہے، دنیا سے عالم عقبیٰ کی طرف چل بسے۔ سدا رہے نام اللہ کا! انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم کے والد ماجد کرنل زیڈ۔ احمد آسام کے باشندہ تھے اور ان کی والدہ محترمہ نوابان لوہارو میں سے نواب زین العابدین عارف جن کا مرثیہ غالب نے

لکھا ہے اُن کے خاندان سے تھیں، کرنل صاحب اگرچہ آسام کے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت سرکاری ان کو دہلی اور اس کے اطراف واکناف میں رہتے ایک مدت ہوگئی تھی۔ حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کے خاص دوستوں اور ہم نشینوں میں تھے اور کہتے تھے کہ آسام کا دلی سے یہ پیوند حکیم صاحب کی خواہش اور ان کی کوششوں پر ہی لگا تھا۔ یہ خاندان دولت وتمول، عزت ووجاہت اور تعلیم کے ساتھ دین داری اور شرافت میں ممتاز تھا۔ ایک مرتبہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے سنایا کہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں جب وہ پہلی مرتبہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہوئے اور بجنور جیل میں رکھے گئے تو اس زمانہ میں یہاں کے جیلر کرنل زید احمد صاحب ہی تھے۔ کرنل صاحب کی بیگم صاحبہ نے قیدیوں کو نماز پڑھتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے دیکھا تو بولیں: ''ارے غضب خدا کا، تم نے کیسے اللہ والوں کو جیل میں لاکر بند کردیا ہے۔'' کرنل صاحب نے جواب دیا: میں تو ملازم سرکار ہوں جو حکم ہے وہ کروں گا، البتہ تم ان قیدیوں کی دیکھ بھال اور خاطر تواضع کرتی رہو، چنانچہ مولانا کہتے تھے جب تک کہ وہ جیل میں رہے ان کے اور ساتھیوں کے لیے طرح طرح کے عمدہ کھانوں کے خوان جیل میں آتے رہے۔ اس واقعہ کے بعد سے ہی مولانا کو اس خاندان سے بالکل برادرانہ اور عزیزانہ تعلق پیدا ہوگیا تھا جو آخر تک قائم رہا۔

جناب فخر الدین علی احمد صاحب جو غالباً بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، ۱۹۰۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم کلکتہ اور دہلی میں پائی، ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کچھ دنوں پنجاب اور اتر پردیش میں پریکٹس کی، پھر یورپ چلے گئے، وہاں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور بار۔ایٹ لاء ہوئے۔ اس زمانہ میں وہاں ان کے ساتھی مرحوم بیرسٹر نورالدین (دہلی) اور قاضی عبدالودود صاحب (پٹنہ) تھے۔ یورپ سے واپس آکر آسام میں پریکٹس شروع کی، چند برسوں میں ہی وہاں کے نہایت کامیاب اور ممتاز بیرسٹر ہوگئے۔ اللہ نے کیا کچھ نہیں دیا تھا، اگر وہ چاہتے تو زندگی بڑے عیش وآرام اور شہرت وناموری کے ساتھ گزار سکتے تھے مگر وہ سچے محبِّ وطن اور فطرتاً نیشنلسٹ تھے اس لیے جلد ہی خار زار سیاست میں گھس پڑے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز آسام سے ہوا۔ ۱۹۳۵ء ایکٹ کے ماتحت ملک میں جو انتخابات ہوئے، اگرچہ یہ زمانہ مسلم لیگ کی تحریک کے انتہائی شباب کا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے سرسعد اللہ جیسی کہن سال و تجربہ کار شخصیت کو شکست دی۔ آسام میں ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کی سیاست ان کے اشارۂ چشم وابرو پر رقص کرتی اور وہ یہاں کے مردِ آہن کہلاتے تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے کانگریسی اور نیشنلسٹ ہونے کے باوجود نہایت انصاف پسند، جری اور حق گو بھی تھے، چنانچہ تقسیم کے بعد ایک وہ وقت بھی آیا جبکہ آسام کے سرحدی علاقوں سے وہاں کے مسلمانوں کو پاکستانی کہہ کر نکالا جارہا تھا، مرحوم نے اس کی شدید مخالفت کی، اسمبلی میں گورنمنٹ کی اس پالیسی کے خلاف سخت تقریریں کیں، سینٹرل گورنمنٹ کو میمورنڈم بھیجا۔ اس سلسلہ میں خود وہاں کی کانگریس نے انھیں کیا کچھ بدنام نہیں کیا، ان کے نیشنلزم کو مطعون کیا گیا اور ملک سے ان کی وفاداری تک کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی لیکن انھوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا آخرکار اسے انجام تک پہنچا کے رہے اور گورنمنٹ کو اپنی یہ پالیسی ترک کرنی پڑی۔ مرکز میں آنے کے بعد اگرچہ ان کی شخصیت کا وہ طنطنہ اور دبدبہ باقی نہیں رہا جو آسام میں تھا لیکن وہ کانگریس کے ہائی کمانڈ میں تھے، اس بنا پر ان کی رائے اور مشورہ کی بڑی اہمیت تھی، وہ تقریر کم کرتے کام زیادہ کرتے تھے، جوشیلی باتیں کہنے سے اجتناب کرتے اور ٹھوس حقائق پر نظر رکھتے تھے۔ گزشتہ چند برسوں میں ملک میں سرکاری سطح پر اردو کو جو فروغ ہوا کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں آں مرحوم کی درپردہ مساعی اور کوششوں کا دخل نہیں ہے۔ دلّی میں ایوان غالب ان کی ایسی عظیم الشان یادگار ہے جو آیندہ نسلوں کے دل میں ان کی یاد اور ان کے لیے جذبات شکرگزاری کا چراغ ہمیشہ روشن رکھے گی۔ وہ قدیم دلّی کی تہذیب، شرافت اور اس کی حسین روایات کے پیکر اتم تھے اور انھیں ان روایات پر فخر تھا۔ چنانچہ پہلے غالب صدی تقریبات اور اس کے بعد امیر خسرو تقریبات ان کے اہتمام وانتظام میں بصرفِ زرِ کثیر جس شان سے منائی گئیں وہ کل کی سی بات ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا جناب فخر الدین علی احمد صاحب کا خاندان دین داری اور شرافت میں ممتاز ہے، آں مرحوم اور ان کے خاندان کے ساتھ میرے برادرانہ اور عزیزانہ تعلقات چالیس برس سے ہیں، ان کی بہنوں اور بھائیوں کی طرح میں بھی انھیں ہمیشہ آکا بھائی کہتا تھا۔ میرے کلکتہ کے زمانۂ قیام میں متعدد بار انھوں نے شلانگ سے دہلی آتے جاتے کبھی تن تنہا اور کبھی متعلقین کے ساتھ، کبھی فقط ایک شب کے لیے اور کبھی ایک دو دن کے لیے میرے ساتھ قیام کیا۔ ان کے علاوہ ان کی بہنیں اور بھائی کلکتہ آتے تو وہ بھی یہیں قیام کرتے تھے، اسی طرح مرحوم کے برادرِ خورد جناب حاجی احتشام الدین احمد صاحب عرف چھمن میاں جو آسام گورنمنٹ میں اعلیٰ افسر تھے ان کی دعوت اور اصرار پر متعدد بار میں شلانگ گیا تو ہفتوں دونوں بھائیوں کا مہمان رہا۔ اس بنا پر جناب

مرحوم اور ان کے خاندان کو میں نے جلوت میں بھی دیکھا ہے اور خلوت میں بھی، گھر کے اندر بھی دیکھا ہے اور گھر سے باہر بھی، میں اپنے علم وبصیرت کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسے اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ خاندان میں نے کم دیکھے ہیں جہاں یہ دونوں چیزیں بیک وقت اس طرح مجتمع ہوں۔ خود مرحوم کی دین داری کا عالم یہ تھا کہ صوم صلوٰۃ کے پابند تھے، قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور حلال وحرام کا خیال رکھتے تھے۔ صدر جمہوریہ ہونے کے بعد بھی جمعہ کی نماز کے لیے نئی دہلی کی جامع مسجد پابندی سے آتے اور رمضان میں ختم تراویح کی تقریب میں شریک ہوکر حافظ اور امام صاحبان کو خلعت وانعام اپنے ہاتھ سے دیتے تھے۔ قربانی بہت اہتمام اور پابندی سے کرتے تھے، رمضان میں افطار اور کھانے کی مکلّف دعوتیں جو وزارت کے زمانہ میں ہوتی تھیں وہ ہر سال راشٹر پتی بھون میں بھی ہوتی رہیں۔

شرافت کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ آدمی اپنے بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن کے ساتھ بھی زبان اور عمل کا کوئی غیر شریفانہ معاملہ نہ کرے، یہ وصف مرحوم میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ بہت نرم خو اور نرم گفتگو تھے، خندہ جبین اور خندہ رو تھے، میں نے اشتعال کی حالت میں بھی انھیں بلند آواز میں بولتے نہیں سنا۔ کبھی کوئی ناشائستہ اور نامہذب لفظ ان کی زبان سے آشنا نہیں ہوا۔ بیرسٹر نورالدین مرحوم بڑے پھکڑ قسم کے انسان تھے، بعض مرتبہ میں نے دیکھا ہے کہ قدیم دوستی اور بے تکلفی کے باعث وہ فخر الدین علی احمد صاحب کے سامنے پھکڑ پن کے ساتھ حکومت پر تنقید کررہے ہیں، مگر فخرالدین علی احمد صاحب ہیں کہ ہنس رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ اُن کا دل انسانی محبت وہمدردی کے جذبات سے معمور تھا، اُن کے ہاں امیر غریب کی کوئی تفریق نہیں تھی، وہ ہر ضرورت مند کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے، نہایت بامروت اور وضعدار انسان تھے، جس سے جو وضع تھی اسے برابر نباہتے تھے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کا کوئی عزیز قریب یا دوست وزارت کے عہدہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے میل ملاپ اور ملاقات کی لے کو بڑھا دیتے ہیں، لیکن میرا معاملہ اس کے برعکس ہے میں اس کے ہاں ازخود جانا ترک کردیتا ہوں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کسی سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ چنانچہ فخرالدین احمد صاحب کے ساتھ بھی میرا معاملہ یہی رہا۔ کبھی عید بقرعید پر چلا گیا تو خیر، ورنہ ان کی وزارت اور صدارت کے زمانہ میں ازخود کبھی نہیں گیا۔ لیکن اُن کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی مجھے فراموش نہیں کیا، سرکاری تقریبات کے علاوہ اپنی پرائیویٹ دعوتوں اور پارٹیوں میں بھی بلاتے تھے، گھر کی تقریبات کے موقع پر بھی یاد فرماتے تھے اور جب میں جاتا مصافحہ اور معانقہ کرتے اور گفتگو کرتے تھے۔ گزشتہ رمضان المبارک میں افطار پارٹی کے موقع پر کھانے سے فراغت کے بعد وہ ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے، لوگ باری باری ان کے پاس جاکر بیٹھتے اور کچھ دیر گفتگو کرکے اٹھ جاتے تھے، میں ہال میں ایک طرف کھڑا ہوا تھا انھوں نے دیکھا تو بڑی محبت سے آواز دے کر مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھالیا اور ہنس ہنس کر دیر تک باتیں کرتے اور میری ایک تقریر کی تعریف کرتے رہے، جو چند روز پہلے ہی راشٹر پتی بھون کی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔

غرض اُن کی کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے، اس میں شک نہیں کہ اُن کا سانحۂ وفات ایک عظیم قومی اور ملی حادثہ ہے جس کے اثرات عرصہ تک محسوس ہوتے رہیں گے، لیکن وہ اپنے کردار وعمل اور حسن اخلاق وفضائل کی ایسی زندۂ جاوید یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جن کو ہندوستان کا مورخ کبھی فراموش نہ کرسکے گا اور آیندہ نسلیں شکرگزاری اور عزت واحترام کے ساتھ انھیں یاد کریں گی۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح انھیں حسنات دنیوی سے نوازا، دعا ہے کہ حسنات عقبیٰ و آخرت سے بھی اُن کو سرفراز فرمائے اور ان کے مدارج ومراتب بلند ہوں۔ آمین۔

اب بھی ہے تیرے تصور سے وہی راز و نیاز
اپنی بچھڑی ہوئی آغوشِ محبت کی قسم

[مارچ ۱۹۷۷ء]

استدراک:

ذیل میں محترمہ حمیدہ سلطان کا وہ خط شائع کیا جاتا ہے جو انھوں نے ماہ گزشتہ کے برہان کے نظرات سے متعلق لکھا ہے، اڈیٹر سے واقعی یہ غلطی ہوئی کہ خاندانی امور کے متعلق اُس نے تحقیق کیوں نہ کرلی اور محض اپنی سنی سنائی باتوں پر اعتماد کیا۔ــــ ایڈیٹر

علی منزل، کوچہ پنڈت، دہلی ۶

۲۱/مارچ ۱۹۷۷ء

محترم بھائی سعید احمد صاحب! تسلیم

'برہان' کے نظرات پر نظر پڑی تو اس میں ہمارے خاندانی حالات نیز اور واقعات کے متعلق کافی غلطیاں نظر آئیں۔ ان کی تصحیح کرنا آپ کے لیے

ضروری ہے تعجب ہے کہ آپ نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں قائم کیا۔

۱۔اباجان کے نانادلّی کے تراہاہیرم خاں کے رہنے والے تھے اور یہاں سے سفیر ہوکر آسام کے راجہ کے یہاں گئے تھے۔اس لیے اباجان کو دلّی سے شغف تھااور شادی بھی انھوں نے اس تعلق کی وجہ سے دلّی میں کی تھی۔

۲۔والدہ مرحومہ کے دادانواب زین العابدین خاں عارفؔ خلف نواب غلام حسین خاں مسرورؔ تھے۔

۳۔اباجان پہلے مسلمان آئی۔ایم۔ایس اور لیفٹننٹ کرنل تھے۔بھلا اتنی بڑی پوزیشن کا آدمی معمولی جیلر کیسے ہوسکتا تھا۔وہ اس زمانے میں بجنور کے سپرنٹنڈنٹ جیل تھے اور سول سرجن تھے۔

۴۔ والدہ صاحبہ پردے کی پابند تھیں۔وہ بھلا قیدیوں کو دیکھنے کہاں جیل میں جاسکتی تھیں۔واقعہ یہ ہے کہ میں کبھی کبھی اباجان کے ساتھ گاڑی میں لدجاتی تھی اور ہمارے گھر کے داروغہ امین الدین میرے ساتھ ہوتے تھے وہ آن کر والدہ صاحبہ کو سیاسی قیدیوں کے متعلق خبریں پہنچاتے اور والدہ صاحبہ اس طرح شریف اور مذہبی لوگوں کا جیل میں سُن کر پریشان ہوجاتی تھیں اور اباجان سے اصرار کرتی تھیں کہ ان لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔مولانا حفظ الرحمٰن فرماتے تھے کہ آپ کی والدہ مرحومہ کی بدولت جیل میں رمضان آیا تو کورے گھڑوں کا ٹھنڈا پانی بھی ملا،افطار بھی ملتی تھی اور سحری پر دودھ بھی۔یہ سب چیزیں اباجان اپنے پاس سے روپے دے کر کراتے تھے۔

۵۔آ کا بھائی دو بہنوں سے چھوٹے تھے۔۱۶،دریا گنج ۱۹۰۵ء،۱۳رمئی کو پیدا ہوئے۔تعلیم کے لیے کبھی کلکتے نہیں گئے،البتہ گونڈے (یوپی) میں انھوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا کیونکہ اباجان اس زمانے میں وہاں سول سرجن تھے۔دلّی سے انھوں نے میٹرک کیا،چھ مہینے سینٹ سٹیفن کالج میں رہے اور اٹھارہ سال کی عمر میں کیمبرج چلے گئے۔وہاں انھوں نے بی۔اے کیا اور بار ایٹ لاء ہوئے۔

۶۔انھوں نے پنجاب میں صرف کورٹ فیس داخل کی تھی۔پریکٹس کبھی نہیں کی۔البتہ کلکتے میں تین سال پریکٹس کی۔۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک،پھر آسام میں پریکٹس کی اور وہیں سیاست میں کام کیا۔

راقمہ

حمیدہ سلطان

[اپریل ۱۹۷۷ء]

شریف الحسن،مولانا

مولانا شریف الحسن

اس مہینہ کی پانچ تاریخ کی شام کو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کے ٹیلی گرام سے اچانک یہ اطلاع ملی کہ دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا شریف الحسن صاحب کا شب گزشتہ یکا یک انتقال ہوگیا تو جی دھک سے ہوکر رہ گیا اور دل ودماغ پر ایک سلسلہ حزن والم کی کیفیت طاری ہوگئی۔مولانا کی عمر ستر کے لگ بھگ ہوگی، اس کے باوجود اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں نہایت چست اور مستعد تھے۔چند برسوں سے مختلف اسقام وعوارض میں مبتلا تھے آخر میں ان کو دل کا روگ بھی لگ گیا تھا اور غالباً یہی ان کی مرگ مفاجات کا سبب ہوا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا علم وعمل،تقوی وطہارت اور فضائل وشمائل ہر اعتبار سے اکابر دیوبند کی یادگار اور ان کا نمونہ تھے۔تمام علوم وفنون میں استعداد نہایت پختہ تھی مگر حدیث سے ان کو طبعی طور پر بڑا شغف اور لگاؤ تھا۔برسوں جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل میں صحیح بخاری کا درس بڑی شان اور آن بان سے دیتے رہے، جب دارالعلوم دیوبند کو ان کی ضرورت ہوئی تو اس کی طلب پر یہاں چلے آئے، یہاں انہوں نے ایک نہایت نازک موقع پر دارالعلوم کی ایسی شاندار خدمت انجام دی کہ دارالعلوم ایک عظیم فتنہ اور ابتلا سے بچ گیا۔سابق شیخ الحدیث مولانا فخر الدین صاحب کے انتقال کے بعد بخاری جلد اوّل کے درس کا کوئی معقول اور خاطر خواہ انتظام ارباب بست وکشاد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیونکہ اگرچہ دارالعلوم میں خدا کے فضل وکرم سے حدیث کے بڑے اچھے اچھے استاد اور مدرس ہیں لیکن بخاری جلد اوّل کا معاملہ دوسری کتب حدیث سے بالکل الگ اور مختلف ہے، یہ ایک کتاب یا ایک فن نہیں بلکہ دسیوں علوم وفنون کے دقیق مباحث کا مجموعہ ہے۔دارالعلوم دیوبند کا سب سے بڑا امتیاز ہی درس بخاری ہے۔اس بنا پر یہاں اس مسند پر وہی عالم بیٹھ سکتا ہے جس کو سالہا سال بخاری کے درس اور اس کے ساتھ اشتغال کا تجربہ رہ چکا ہو، بہرحال جب طلبا میں بے چینی بڑھی تو مجلس شوری نے کافی بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد محدث یگانہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی پُر زور تائید وحمایت سے بخاری جلد اوّل کے درس کی خدمت مولانا مرحوم کے سپرد کردی اور حق یہ ہے کہ مولانا نے اس اہم خدمت کو اس تندہی جانفشانی اور اعلیٰ قابلیت سے انجام دیا کہ اس کا حق ادا ہوگیا اور طلبا مکمل طور پر مطمئن ہوگئے۔شوری نے یہ دیکھ کر مولانا کو باقاعدہ دارالعلوم کا شیخ الحدیث

مقرر کردیا۔ یہ ہے مولانا کی وہ اہم خدمت جس نے دارالعلوم کو بروقت ایک عظیم ابتلا سے بچا لیا۔ شوریٰ کے ایک ممبر کی حیثیت سے میں مولانا کی اس خدمت کا بڑا معترف اور قدردان تھا۔ مولانا اسے محسوس کرتے اور جب کبھی دیوبند جاتا تو ملاقات کے لیے ضرور تشریف لاتے تھے۔

نہایت خندہ جبیں، شگفتہ طبیعت اور سادہ و بے تکلفی بزرگ تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ [جون ۱۹۷۷ء]

مجیبی، مولانا شاہ عزالدین

فرنگی محلی، مولانا مفتی عتیق احمد

مولانا شاہ عزالدین مجیبی/مولانا مفتی عتیق احمد فرنگی محلی

اس واقعہ سے چند روز پہلے یعنی مئی میں ہندوستان کے دو اور بلند پایہ علماء کا بھی انتقال ہوگیا، ایک مولانا شاہ عزالدین صاحب مجیبی اور دوسرے مولانا مفتی عتیق احمد فرنگی محلی۔ اوّل الذکر نے ندوۃ میں تعلیم پائی تھی، استعداد پختہ تھی، فقہ اور حدیث میں بڑا اچھا درک رکھتے تھے۔ گزشتہ سال ہی انہیں صدر جمہوریہ کی طرف سے عربی اسکالر کی حیثیت سے ایوارڈ ملا تھا۔ قومی معاملات ومسائل میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ قیام خانقاہ مجیبہ پھلواری شریف میں رہتا اور وہیں درس وافتا کا کام کرتے رہتے۔ برہان کے بڑے قدردان تھے اور اسی وجہ سے ایڈیٹر برہان سے محبت کرتے تھے۔

ثانی الذکر فرنگی محل کے کاروان بہار کی آخری نشانی تھے۔ بلند پایہ عالم اور بڑے فاضل بزرگ تھے۔ فرنگی محلی کے مفتی تھے اور اسی کے مدرسہ میں جواب برائے نام رہ گیا ہے، درس واہتمام کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ گوشہ نشین اور قناعت پیشہ بزرگ تھے۔ [جون ۱۹۷۷ء]

سلیم، مولانا محمد

مولانا محمد سلیم

سخت افسوس ہے کہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے ناظم اعلیٰ اور مہتمم مولانا محمد سلیم صاحب ایک ماہ کی معمولی علالت کے بعد ۱۸/ جولائی کو بروز شنبہ نماز فجر کے وقت نصف گھنٹہ پہلے رہ گزائے عالم جاودانی ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کا آبائی وطن کیرانہ ضلع مظفرنگر تھا۔ آپ کے والد ماجد محمد سعید صاحب المتوفی ۱۳۵۷ھ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی المتوفی ۱۳۰۸ھ صاحب ''اظہار الحق'' کے بھتیجے محمد صدیق صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شرکت کے بعد مکہ مکرمہ ہجرت کرگئے تو آپ نے مولانا محمد سعید کو جن کی عمر صرف بارہ برس کی تھی، اپنے پاس مکہ مکرمہ بلالیا اور ان کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام کیا اور وہ بھی مستقلاً یہیں رہ پڑے، چنانچہ مولانا محمد سلیم صاحب کی پیدائش بھی مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ نے کلکتہ کی ایک مخیّر خاتون صولت النساء بیگم کی امداد واعانت سے مکہ کے محلّہ خندریسہ میں زمین کا ایک پلاٹ خرید کر ایک عمارت بنوائی اور ۱۲۹۰ھ میں انہی خاتون کے نام پر مدرسہ صولتیہ کے نام سے اس عمارت میں ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔ مولانا محمد سلیم صاحب نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ فراغت کے بعد پندرہ بیس سال اسی مدرسہ میں درس دیا، ۱۳۴۶ھ میں اس کے نائب ناظم اور ۱۳۵۷ھ میں ناظم مقرر ہوئے جس پر وہ اخیر تک رہے۔

مولانا نے نصف صدی سے زیادہ کا یہ مدرسہ کے اہتمام وانتظام کا زمانہ جس عالی ہمتی، صبر واستقلال فہم وتدبر اور لیاقت وقابلیت سے گزارا ہے، وہ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا اور دوسروں کے لیے ایک بڑا سبق آموز کارنامہ ہے۔ چنانچہ اسی اثنا میں جب ملک کے سیاسی حالات بدلے تو آپ کو چند در چند دشواریوں اور مختلف قسم کی آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا، لیکن آپ نے بڑی پامردی اور ہمت واستقلال سے ان کا مقابلہ کیا۔ انہی دنوں میں آپ عارضی طور پر حجاز مقدس کی سکونت ترک کرکے ہندوستان چلے آئے اور تقسیم سے قبل قرول باغ، دہلی میں کھجور روڈ پر دفتر برہان سے متصل ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر اس میں رہنا شروع کردیا۔ یہاں آپ نے مدرسہ صولتیہ کا دفتر قائم کیا اور ایک ماہنامہ رسالہ ''الحرم'' کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالہ کے ذریعہ آپ مدرسہ صولتیہ کی اہمیت وضرورت اور اُس کی خدمات وضروریات سے مسلمانوں کو واقف کرتے رہتے اور غیر منقسم ہندوستان کے اہل خیر سے چندہ وصول کرکے مدرسہ صولتیہ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرتے رہتے تھے۔ تقسیم کے بعد دفتر برہان وہاں سے منتقل ہوا تو مولانا بھی بدقت بسیار اپنا دفتر سمیٹ کر پاکستان چلے گئے۔ اس درمیان میں حجاز کے حالات بھی اعتدال پر آگئے تھے، اسی لیے مولانا پاکستان میں مختصر قیام کے بعد پھر مکہ مکرمہ واپس آگئے اور ہمہ تن مدرسہ صولتیہ کی خدمت اور اس کو ترقی دینے کی کوششوں میں لگ گئے۔ حالات کا اقتضا تھا کہ مدرسہ صولتیہ کا نصاب بھی بدلا جائے اور اس میں کچھ اور شعبوں کا اضافہ کیا جائے۔ مولانا نے یہ کام نہایت حزم واحتیاط اور دوراندیشی سے انجام دیا چنانچہ مدرسہ

کے لیے ایک ایسا نصاب مرتب کیا جسے اسلامی اورعرب ممالک کے علماء اور ماہرین تعلیم نے پسند کیا۔آج ایک سوبرس سے زیادہ یہ مدرسہ عالم اسلام کی اہم تعلیمی خدمات انجام دے رہاہے اوراس کے فارغ التحصیل طلبہ عرب وعجم میں ہرجگہ پھیلے ہوئے ہیں، پھرصرف یہ ایک مدرسہ نہیں بلکہ مولانا مرحوم کے حسن اخلاق اورجذبۂ خدمت خلق کے باعث ہندوستان اور پاکستان کے حاجیوں کے لیے ایک بڑا مرکز بھی تھا۔حاجی اپنی اپنی ضرورتوں کے لیے یہاں آتے اورمولانا بڑی خندہ پیشانی سے اُن ضرورتوں کے رفع اوراُن کی تکمیل کاانتظام کرتے تھے۔

مولانا مرحوم جید عالم وفاضل ہونے کے ساتھ عربی، فارسی اور اردوشعر و ادب کا بھی بڑاالطیف اورشگفتہ ذوق رکھتے تھے، ہزاروں اشعاربرنوک زبان تھے۔نہایت بذلہ سنج، شگفتہ طبع، خندہ جبین اورزندہ دل انسان تھے۔مزاج میں لطافت اورنفاست بلا کی تھی، حددرجہ خوش لباس تھے، غالبًا ایک جوڑا روزبدلتے تھے،عطروپھلیل کے رسیا تھے۔نہایت متواضع اورمہمان نواز تھے،کھانا بہت عمدہ کھاتے اوردوسروں کوپُرتکلف دعوتیں کھلاکرمسرت محسوس کرتے تھے۔قرول باغ کے زمانۂ قیام میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اورراقم الحروف سے مولانا کو خصوصی قلبی تعلق تھا۔اکثرشام کونمازعصر کے بعد مولانا کے ہاں ہماری نشست ہوتی تھی اوراس میں مولانا اپنی طلاقت لسانی اور بذلہ سنجی سے ہنستے ہنساتے ہی رہتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ علماء اورمشائخ کے طبقہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ العالی کے سوا مولانا مرحوم جیسا شگفتہ طبع اورخندہ جبین و متواضع آج تک میں نے کوئی اورنہیں دیکھا۔جن بزرگوں کا خدا کے ساتھ خاص معاملہ ہوتاہے وہ خدا کی مخلوق پرایسے ہی مہربان اورشفیق ہوتے ہیں اورآخراس صفت خاص کا اصل منبع اورسرچشمہ تو حضوراکرم رحمۃ للعالمین ﷺ ہی کی ذاتِ اقدس واکرم ہے۔

راقم الحروف کو۱۹۶۷ء میں عمر میں دوسری مرتبہ حج وزیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل ہوئی تو مولانا محمد سلیم صاحب سے تقسیم کے بعد پہلی ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا۔اتنے عرصہ کے بعد بھی مولانا اسی دیرینہ محبت وشفقت سے پیش آئے جس کی لذت وحلاوت آج تک فراموش نہیں ہوسکی ہے،لیکن سخت افسوس ہے کہ چونکہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حج ڈیلی گیشن میں تھااس لیے نہ مدینہ طیبہ میں اتنا طویل قیام کرسکا جتنا کہ میں چاہتا تھا اورنہ مکہ مکرمہ میں مولانا کے ساتھ حسب خواہش زیادہ وقت گزارسکا۔اس بناپر میں نے عہد کرلیا کہ اب آئندہ کبھی یہاں سرکاری ڈیلی گیشن میں نہیں آؤں گا اورخدا توفیق دے گا تو بال بچوں کے ساتھ خود یہاں حاضر ہوں گا اورکم ازکم تین چارمہینے قیام کروں گا لیکن یہ توفیق آج تک حاصل نہ ہوسکی۔ولعل یحدث بعدذالك امراً۔

مولانا مرحوم کے صاحبزادہ عزیزم مولوی محمد شمیم صاحب نے۲۶/ جولائی کو مولانا کے حادثۂ وفات کی اطلاع کے لیے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کوخط لکھاہے،اُس میں خاکسار راقم الحروف کے متعلق یہ جملہ ہے۔حضرت مولانا سعید اکبرآبادی کے متعلق مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اگرصرف تین مہینے کے لیے مکہ معظّمہ میرے پاس آجائیں تو میری ایک بہت بڑی تمنا اُن کے تعاون سے پوری ہوجائے گی،اس کی تفصیل آئندہ کبھی لکھوں گا۔اس جملہ کو پڑھ کرمفتی صاحب بھونچکے رہ گئے اورمجھ پر بھی سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔نجانے وہ تمنا کیا تھی،اگر مجھے اُس کاعلم ہوجاتا تو مکہ مکرمہ دورہی کتنا ہے میں حاضر ہوکرمولانا کی تمنا کواپنے لیے سرمایۂ سعادت وشرف سمجھتا۔اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

مولانا کا حادثۂ وفات عالم اسلام کا حادثہ ہے۔

اللھم اغفرله وارحمه رحمةً واسعةً شامله و کامله۔

[اگست۱۹۷۷ء]

بسمل سعیدی

بسمل سعیدی

افسوس ہے پچھلے دنوں جناب بسمل سعیدی کاچند ماہ کی مسلسل علالت کے بعد دہلی میں انتقال ہوگیا۔مرحوم ٹونک (راجستھان) کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے،اس خاندان کی قرابت حضرت سید احمد شہید سے بھی تھی۔اس خاندان میں تعلیم قدیم وتعلیم جدید دونوں کے نامور افرادواشخاص پیداہوئے۔ مرحوم بلند پایہ شاعر اورصاحب فن استادسخن تھے، غزل اورنظم دونوں پریکساں قدرت تھی، اُن کے فیض صحبت سے سینکڑوں نوجوان بڑے شاعر ہوگئے۔ایک عرصہ سے دہلی میں مقیم تھے۔خاندانی اعتبار سے صاحب املاک وجائیداد تھے لیکن ایک ایسی افتاد پڑی کہ سب کچھ جاتارہا۔طبعًا نہایت غیور وخوددار تھے۔ زندگی کے آخری سال عسرت اورتنگدستی میں گزرے یہاں تک کہ جسم وجان کا رشتہ بھی اسی عالم میں منقطع ہوگیا۔اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔آمین

[ستمبر۱۹۷۷ء]

بنوری، مولانا محمد یوسف

یعقوب، قاری محمد

مولانا محمد یوسف بنوری/ قاری محمد یعقوب

سیمینار میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ملی اور واپسی میں جناب قاری محمد یعقوب صاحب (کراچی) کے حادثۂ انتقال کا علم ہوا تو سخت صدمہ اور ملال ہوا۔ رحمهما الله رحمة واسعةً۔ اکتوبر اور نومبر میں بعض ضروری علمی کاموں میں، میں اس درجہ مصروف رہا کہ برہان کی طرف بالکل توجہ نہیں کرسکا۔ یہ نظرات لکھنے کے لیے بھی بڑی مشکل سے وقت نکال سکا ہوں۔ آئندہ انشاء اللہ ''وفیات'' کے زیرعنوان مرحوم بزرگوں کا تذکرہ ہوگا۔ [نومبر ۱۹۷۷ء]

حسین، مولانا سید اختر

مولانا سید اختر حسین

افسوس ہے دارالعلوم دیوبند کے ایک دیرینہ استاذ مولانا سید اختر حسین صاحب کا ۸۱ برس کی عمر میں گذشتہ ماہ ذی الحج کی پہلی تاریخ کو نماز فجر کے بعد انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادہ تھے، صورۃً وسیرۃً الولد سّر لابیہ کے مصداق تھے۔ نہایت خاموش، بے حد متورع اور متقی اور اوراد وظائف کے پابند تھے۔ حضرت میاں صاحب کی طرح اُن پر عالم جذب طاری رہتا تھا۔ کم وبیش ۵۵ برس دارالعلوم کی درسی خدمات انجام دیں۔ سالہا سال سے طبقہ علیا کے مدرس اور ناظم تعلیمات بھی تھے، اُن کا وجود مدرسہ کے لیے خیر وبرکت کا موجب تھا۔ اُن کا اصل نام سید محمد عباس تھا لیکن اپنے عرف سید اختر حسین سے اس درجہ معروف ہوئے کہ کسی کو اُن کا اصل نام کا پتہ بھی نہ تھا۔ ۲۳/ رجب ۱۳۱۶ھ کو بروز پنجشنبہ بعد عصر پیدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو صدیقین وشہدا کے مقام جلیل وعظیم سے نوازے۔ آمین [دسمبر ۱۹۷۷ء]

صدیقی، اعجاز

اعجاز صدیقی

افسوس ہے ہمارے عزیز دوست اور بچپن کے ساتھی جناب اعجاز صدیقی کا پچھلے دنوں بمبئی میں اچانک انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مولانا سیماب اکبرآبادی کے فرزند ارجمند اور اُن کے خاص تربیت یافتہ تھے۔ اردو کے بلند پایہ اور قادرالکلام شاعر تو تھے ہی، بڑی بات یہ ہے کہ فن کے اصول وفروع اور اُس کے رموز ونکات اور زبان کے قواعد اور اُس کے مصطلحات پر اُن کی نگاہ وسیع اور دقیق تھی، اس بناء پر وہ نقاد بھی بہت اچھے تھے۔ نثر بھی شگفتہ لکھتے تھے۔ تقسیم کے بعد آگرہ کے حالات ناقابل برداشت ہوئے اور وہاں رہنا دشوار ہوگیا تو بمبئی منتقل ہوگئے۔ یہاں اُن کو سخت پریشانیوں اور دشواریوں سے سابقہ پیش آیا لیکن انھوں نے بڑی ہمت اور جواں مردی سے ان سب کا مقابلہ کیا۔ ''شاعر'' کو نہ صرف یہ کہ جاری رکھا، اُس کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششوں میں لگے رہے اور آخر کار بمبئی ایسے غدار شہر میں اپنا ایک خاص مرتبہ ومقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اُن کو اردو سے عشق تھا، تقسیم کے نتیجہ میں اُس پر جو بپتا پڑی تھی، مرحوم عمر بھر اُس کا ماتم کرتے اور اُس کی اصلاح کی جدوجہد کرتے رہے۔ طبعاً بڑے خوش خلق، غیور وخوددار، باوضع اور نہایت محنتی اور جفاکش انسان تھے۔ اُن کی وفات سے اردو اپنی فوج کے ایک بہت بڑے مجاہد سے محروم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

[مارچ ۱۹۷۸ء]

نیر، شفیع الدین

شفیع الدین نیر

افسوس ہے انھی دنوں میں شفیع الدین نیر صاحب کا بھی ۷۳ برس کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم اردو زبان کے بچوں کے نامور شاعر اور ادیب تھے، اس حیثیت سے انھوں نے نثر اور نظم میں پچاسوں کتابیں لکھیں جو گھر گھر مقبول ہوئیں۔ انھوں نے اپنی زندگی گورنمنٹ کے ماڈل اسکول میں اردو کے ٹیچر کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جن کو خود بچوں کے ادب سے دلچسپی تھی، اُن کو جب مرحوم کی صلاحیتوں کا علم ہوا تو انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ لے آئے اور انھوں نے پوری زندگی یہیں بڑی وضع داری، شرافت اور مروت سے گزار دی۔ تقسیم کے بعد اردو پر زوال آیا تو مرحوم کی شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی بھی متاثر ہوئی جس کا اُن کو طبعاً ملال تھا اور وہ اُس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ بہرحال اُن کی کتابیں بچوں کے ادب کی دنیا میں اُن کے بقائے دوام کی ضامن ہیں۔ اخلاق وعادات کے اعتبار سے بڑے سنجیدہ ومتین لیکن دیندار اور خوش مزاج تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ [مارچ ۱۹۷۸ء]

ماہرالقادری

ماہرالقادری

افسوس ہے گذشتہ مئی کی ۱۰ تاریخ کو اردو زبان کے نامور شاعر، ادیب اور نقاد جناب ماہرالقادری صاحب کا ۷۲ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ جدہ میں کوئی بڑا مشاعرہ تھا، اُس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ بہت رات گئے مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا، داد وتحسین سے محفل گونج اٹھی۔ اُس سے فارغ ہوکر ابھی قیام گاہ پر آئے ہی تھے کہ اچانک سینہ میں درد اٹھا اور طبی امداد کے پہنچتے پہنچتے روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تدفین مکہ مکرمہ کے مشہور قبرستان جنت المعلی میں ہوئی۔

مرحوم کا اصل نام منظور حسین تھا، بلند شہر میں پیدا ہوئے تھے، تقسیم سے پہلے ہی اردو کے نامور شعراء میں شمار ہونے لگے تھے لیکن اس زمانہ میں وہ صرف حسن وشباب کے شاعر تھے، نظم سے زیادہ اُن کی غزلیں پُرکیف ووجد آفرین ہوتی تھیں، نظم میں اُن کا نعتیہ کلام اور سلام بڑے معرکے کا تھا جس سے اُن کی شہرت گھر گھر پہنچی۔ تقسیم کے بعد کراچی چلے گئے۔ طبیعت کے شروع سے نیک اور دین دار تھے، پاکستان میں جماعت اسلامی کے زیر اثر آجانے سے اُن کی زندگی میں انقلاب عظیم آگیا۔ اُن کا ماہنامہ 'فاران' جماعت کا آرگن ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ ادبی مجلّہ بھی تھا، اس میں مرحوم کے قلم سے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین زبان وبیان کے اصول وقواعد اور ان کے رموز ونکات کے نقطۂ نظر سے پڑھنے کے لائق ہوتے تھے۔ اُن کی نثر ونظم کے متعدد مجموعے شائع ہوکر مقبول عوام وخواص ہوچکے ہیں۔ برہان اور اس کے ادارے سے انھیں قلبی تعلق اور لگاؤ تھا۔ گذشتہ سفرنامۂ پاکستان میں انھوں نے اپنا تذکرہ پڑھا تو فوراً ایک محبت بھرا خط لکھا جس میں سفرنامہ کے حسن انشا اور طرز بیاں کی دل کھول کر داد دی اور ساتھ ہی ایک تازہ نعت بھی بھیجی جو اُسی زمانہ میں برہان میں شائع ہوگئی تھی۔

جنت المعلی کی سرزمین کا کیا کہنا! ظاھر ھا حسنة و باطنھا حسنه، سبحان اللہ! نور ہی نور ہے۔ اُس کی خاک پاک کا پیوند ہوجانا ایک مسلمان کی خوش قسمتی کی معراج ہے۔ اللھم اغفرله وارحمه۔ [جون ۱۹۷۸ء]

بریلوی، حکیم صدیق احمد امروہوی

حکیم صدیق احمد امروہوی ثم بریلوی

مئی کے اسی ہفتہ میں ایک اور حادثہ یہ پیش آیا کہ ہمارے نہایت عزیز اور مخلص دوست اور اپنے فن کے ماہر حکیم صدیق احمد صاحب امروہوی ثم بریلوی نے وفات پائی۔ عمر غالباً پچھتر چھہتر برس ہوگی۔ اصل وطن امروہہ ضلع مرادآباد تھا، مگر ایک عرصۂ دراز سے بریلی میں مقیم تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم مختار احمد صاحب ایک نہایت حاذق طبیب ہونے کے علاوہ پختہ استعداد کے عالم باعمل، متقی اور عابد وزاہد بزرگ تھے۔ حکیم صدیق احمد کی بھی علوم وفنون میں استعداد بڑی پختہ تھی، شروع میں منطق اور فلسفہ کا بڑا غلبہ رہا۔ نہایت ذہین اور طباع تھے۔ اس لیے کوئی موضوع بحث ہو تقریر مدلل اور منطقیانہ کرتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بیعت ہونے کے علاوہ اعمال و وظائف کا ورد کثرت سے کرنے لگے تھے۔ فن طب میں نظری اور عملی مہارت و حذاقت انھیں ورثہ میں ملی تھی، طبیعت بے حد رسا تھی۔ تشخیص اور تجویز دونوں میں ان کی شہرت دور دور تک تھی۔ سینکڑوں بڑے معرکے کے علاج کئے لیکن وہ جتنے بڑے طبیب تھے، اسی قدر مزاج سخت لاابالی اور روپیہ پیسہ کے لالچ سے کوسوں دور تھے۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد اپنی جیب سے کرتے تھے اور علما کی خدمت کرکے خوش ہوتے تھے، غرض کہ بڑی خوبیوں اور کمالات کے انسان تھے۔ اُن کے پاس مخطوطات کا ایک خاصہ ذخیرہ تھا جس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور بعض دوسرے بزرگوں کے مکاتیب اور ان کی تحریریں شامل ہیں۔ لیکن راقم الحروف کے سخت اصرار کے باوجود انھوں نے ان چیزوں کو نہ خود چھاپا اور نہ کسی اور کو انھیں نقل کرنے کی اجازت دی۔ پھر معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہوا۔

اخلاق وعادات کے اعتبار سے نہایت خلیق، خوش طبع وخوش مزاج اور متواضع ومہمان نواز تھے۔ رحمه الله رحمةً واسعةً۔ [جون ۱۹۷۸ء]

ناغڑ، میجر محمد یٰسین خان (خان بہادر)

خان بہادر میجر محمد یسٰین خان صاحب ناغڑ

میجر محمد یسٰین خاں صاحب مرحوم ندوۃ المصنفین کے قدیم ترین معاون تو تھے ہی ادارے کی خدمات کو بھی نہایت قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ادارے سے مرحوم کی وابستگی ندوۃ المصنفین کے مخلص ترین محسن مرتضٰی صاحب مرحوم کے واسطے سے ہوئی تھی دونوں میں قابل رشک مخلصانہ تعلقات تھے، سید صاحب ہی کے ذریعہ مرحوم کے کارکنان ادارہ سے روابط بڑھے اور پھر یہ روابط بڑھتے ہی چلے گئے، تھوڑی دیر کے لیے بھی دہلی تشریف لاتے تو ندوۃ المصنفین کے دفتر میں ضرور آتے۔ ممبری کی فیس

ادا کرنے میں بھی بے مثال تھے۔ ان کا شمار ادارے کے اُن چند گنے چنے معاونوں میں ہوتا تھا جو وقت سے پہلے کسی یاددہانی کے بغیر شوق وذوق سے سالانہ فیس دیتے ہیں۔ ایک پوتے کی المناک شہادت کی خبر تو اس مضمون میں ہے، کم وبیش دو سال قبل ان کا دوسرا جوان پوتا دنیا سے رخصت ہوا تو بڑا ہی دردناک خط آیا تھا، میں نے تعزیت نامے میں اپنے عزیز ترین ہونہار پوتے کی حسرت ناک وفات کا ذکر کیا تو ان کو بڑی تسلی ہوئی تھی اور اُس تاثر کا اظہار انھوں نے ایک طویل مکتوب میں کیا تھا۔ پچھلے دنوں حباب آفرید صاحب کا مکتوب آیا جس میں زیرِ نظر مضمون کا تذکرہ کیا تھا، یہ میجر صاحب مرحوم کو ندوۃ المصنفین اور ہم لوگوں سے جو غیر معمولی تعلق تھا اس کے پیشِ نظر میں نے حباب صاحب کو مضمون بھیجنے کے لیے لکھ دیا، مضمون ہر اعتبار سے سبق آموز ہے اور اسی لیے برہان میں شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (ع)

جیئے پہاڑی سے یوسف بھائی کے الم نامہ نے غمزدہ دل کو ہمیشہ کے لیے سوگوار کر دیا کہ ''آپ کو یہ دردناک خبر پڑھ کر بے حد افسوس ورنج ہوگا کہ والد بزرگوار میجر محمد یسٰین خاں کچھ دنوں کی علالت کے بعد اس عالم فانی سے مورخہ ۱۴/ اگست ۱۹۷۸ء/۹ رمضان بروز پیر رات کے ۸:۴۳ پر ہم سب کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو کوچ کر گئے۔ مرحوم نے آپ کو خط لکھنے کی غرض سے لفافے پر پتا لکھ کر رکھا تھا لیکن علالت کی وجہ سے نہ لکھ سکے۔''

صورتِ ازبے صورتی آمد بُروں
بعد شد انا الیہ راجعون

چہل سالہ مراسم وتعلقات، وہ شفقتیں، عنایتیں وہ مہربانیاں اور نوازش نامے کیا کیا یاد آتا رہے گا! میرے بڑے لڑکے سلیم فریدی کی پچھلے برس جواں مرگی پر دلاسے اور تسلیوں کو کیسے فراموش کر سکوں گا۔ ۱۹۳۷ء کے دوران سفر یورپ کی لگاتار خط کتابت کو کیونکر بھلا سکوں گا۔

گلہ فلک سے ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

وہ چھریرا بدن، گندمی رنگ، کشادہ سینہ، روشن جبیں، گھنے ابرو، منور بڑی بڑی آنکھیں، گھٹا ہوا بدن، خط مستقیم قامت مردانہ۔ آہ اب یہ چہرہ بھی دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گیا۔

خان بہادر کا ذکر ہمارے گھر کے نصاب میں شریک تھا۔ بہ یک نظر کوئی کیسے سمجھ سکتا تھا کہ یہی وہ ہند کی عظیم شخصیت ہے جس پر ریگ زار راجپوتانہ کو ناز اور قبیلۂ ناغڑی کو فخر ہے، جس کے سینے میں سرسید کا دل اور دل میں حالی کا درد موجود ہے، جس کی روح سرمد واقبال کے نغموں سے سرشار ہے، جس کے اخلاق سعدی کی حکیمانہ نصیحتوں سے مزین ہیں اور جس کا اعلیٰ دماغ حافظ کے آب رکن آباد سے سیراب ہے۔

عہد طفلی کا وہ زمانہ نظروں میں پھر رہا ہے جبکہ خان بہادر سے والد مرحوم (حکیم سبط احمد فریدی) کے ابتدائی تعلقات پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ عدیم المثال بے غرض دوستی میں تبدیل ہوگئے اور خان چچا کی دیرآشنائی نے اپنے منتخب احباب کے رشتہ میں فریدیت کو بالآخر پرولیا۔ میری بڑی بھتیجی سعید فاطمہ کو وہ توتلی پوتی سے مخاطب فرماتے اور یہ اپنے لڑکپن میں میجر دادا پکارا کرتی تھی۔

چودہ برسوں تک شہزادہ برار کے محل بلاوسٹہ تین روزانہ ملاقاتیں، حکیمانہ باتیں، ظریفانہ حکایتیں اور سپاہیانہ جرأتوں کی طویل داستان جو ورق در ورق یاد ہے ایسی نہیں ہے جسے چند سطروں میں بیان کیا جا سکے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

حادثات زمانہ نے ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انتہائی صبر آزما منزلوں سے انہیں ہمکنار کیا۔ دلّی کے مکان میں نایاب کتب خانہ تھا، قادرخاں کی نگرانی پوتا زیرِ تعلیم تھا اطلاع آئی کہ یسٰین پکارنے والی ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دلّی سے جئے پہاڑی پہنچے اور تربت مادر پر فاتحہ پڑھ کر دل کو سکون پہنچایا۔ دلّی سے لوٹنا چاہتے تھے کہ کتابوں کو گھر لے جائیں، لاری کے لیے باہر نکلے واپس آ کر کیا دیکھتے ہیں کہ نہ کتابیں اور نہ جیتی جاگتی جانیں۔ آگ اور دولاشیں پہلی قادرخاں کی اور دوسری پوتے کی۔ قادرخاں نے آخری سانس تک سردار زادے کو بچایا، انجام کار دونوں ختم ہوگئے۔ قضاوقدر کے اس لرزا دینے والے فیصلے نے تسلیم و رضا کے پیکر خان بہادر کے ضبط واستقلال کو ذرہ برابر جنبش نہ دی اور ہر چہ از دوست میرسد نیکوست کہتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

عظیم مصائب میں ثابت قدم رہنا، قول کا سچا اور وعدے کا پکا ہونا، راستی و امتیازی کی خاطر خندہ پیشانی کے ساتھ صعوبتوں کو برداشت کرنا، حق وصداقت کی راہ میں مالی نقصانات سہہ لینا، غور کیجیے عملی حیثیت سے کس قدر دشوار ہے! اس میں کسی مبالغہ کی گنجائش نہیں کہ خان بہادر کی شخصیت میں تمام اوصاف حمیدہ اور فضائل برگزیدہ قدرت نے کچھ اس توازن سے جمع کئے تھے جنھیں دیکھ کر پہلی ہجری کے مسلمان کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جایا کرتی تھی۔ ان کے عزائم پہاڑ سے زیادہ استوار، اُن کے ارادے چٹانوں سے بڑھ کر مضبوط اور ان کے خیالات سمندر کی گہرائیوں سے فزوں تر تھے۔

آن کی خاطر جان کی پرواہ نہ کرنے والے، زبان کی پاسداری کے لیے خطرات مول لینے والے اور وعدہ خلاف حاکموں کے مناصب سے آن واحد میں معافی چاہ لینے والے خان بہادر نے رندانہ محفلوں میں شب بیداری کی اور اپنا دامن بچائے رکھا، بدمستوں سے جو بات کی ہوشیاری سے کی، بے خودوں کو جب سبق دیا خودی کا دیا، گمرہوں کو راہ دکھلائی تو سچی اور سیدھی، مختصر یہ کہ ماحول میں ڈھل کر زمانہ ساز کہلانے کے بدلے ہمیشہ اور ہر جگہ ماحول کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور زمانہ باتو نہ ساز تو باز زمانہ ستیز کے مردانہ اصولوں پر ناقابل شکست عزائم کے ساتھ آخری دم تک قائم رہے۔

خان بہادر کی سپاہیانہ زندگی پہلی جنگ عظیم کے میدان سے شروع ہوئی۔ شہسواری، نیزہ بازی اور چوگان بازی نے بین الاقوامی شہرت کا مالک بنایا۔ درباری سلیقہ مندیوں نے کبھی مرزبان دستیاسے وابستہ رکھا، کبھی ایوان جئے پور سے، کبھی کشمیر کی وادیوں میں راجہ کو ہندو مسلم اتحاد کے اٹل مشورے دیئے اور کبھی نواب بھوپال کے ہاں بے لوث کارنامے انجام دیئے۔

بالآخر ہز ہائینس پرنس آف برار کی نظر انتخاب مرحوم پر پڑی اور نواب خسرو جنگ کی معرفت حیدرآباد بلوائے گئے۔ یہاں مرحوم ہز ہائینس کے اے ڈی سی رہے۔ ہز ہائینس کے کنٹرولر رہے، پرنس باڈی گارڈ کی کمانڈنگ افسری کی اور رجمنٹ کو ریگولر آرمی کا ہم پلہ بنادیا۔ شکار کے موقع پر شیر کے مقابل آکر ٹیپو اور شیر افگن کی جرأت پارینہ کو زندہ کر دکھایا، اسی مرحلہ کے بعد بایاں پاؤں بالکل سیدھا ہوگیا تھا، اس کے باوجود معمولات زندگی شہہ سواری و چوگان بازی اسی پھرتی سے انجام دیتے رہے۔ مجھے مرحوم کے لیٹر پیڈ کا یہ شعر کبھی نہ بھولے گا:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
بادوستان تلطف بادشمنان مدارا

خدا ان کی آخری آرام گاہ کو اپنے نور کے پھولوں سے ہمیشہ معمور رکھے۔

[حباب آفرید (حبیب احمد فریدی)، اکتوبر ۱۹۷۸ء]

نانا، مولانا محمد اسمٰعیل

مولانا محمد اسمٰعیل نانا

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ رمضان میں جانسبرگ (جنوبی افریقہ) کے ایک جید عالم اور نہایت مخیّر بزرگ مولانا محمد اسمٰعیل کا انتقال ہوگیا مرحوم اصل باشندہ ڈابھیل یا سملک ضلع سورت گجرات کے تھے۔ ہم لوگ جب ڈابھیل پہنچے ہیں اس وقت مدرسہ میں متوسطان پڑھتے تھے۔ مفتی صاحب اور راقم الحروف دونوں کے اسباق میں پابندی سے شریک ہوتے اور صبح وشام کمرہ میں حاضر رہتے تھے۔ اس زمانہ میں گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی چل رہی تھی۔ حکومت نے اس میں شریک ہونے والوں کی جائیدادیں ضبط کر کے ان کو فروخت کرنا شروع کیا تھا۔ اس پر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنا مشہور اور معرکتہ الآرا فتوی دیا کہ ان جائیدادوں پر حکومت کا قبضہ ناجائز اور حرام ہے اس لیے کسی مسلمان کے لیے ایسی جائیداد کا خریدنا جائز نہیں ہے۔ اس فتوی سے ایوان حکومت میں زلزلہ آگیا اور فتوی ضبط کرلیا گیا۔ اس موقع پر مرحوم مولوی محمد اسمٰعیل نانا نے بڑی جرأت مندی اور دلیری کا ثبوت دیا، اس فتوے کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا، ہزاروں کی تعداد میں طبع کیا اور پھر راتوں رات خفیہ طور پر دورہ کر کے اسے ایک ایک مسلمان کے گھر پہنچایا۔ مرحوم نے جو کچھ پڑھا تھا شوق، محنت اور دلچسپی سے پڑھا تھا، مطالعہ کے خوگر تھے۔ اس لیے علمی استعداد پختہ تھی۔ طبیعت کے شروع ہی سے نیک اور دین دار تھے۔ فراغت کے بعد جنوبی افریقہ چلے گئے اور کاروبار شروع کیا تو لکھ پتی بن گئے۔ نہایت مخیّر اور سیر چشم تھے، عربی مدارس کی امداد بہت دل کھول کر کرتے تھے۔ کتنے ہی مولوی صاحبان اور حاجت مندوں کے مستقل ماہانہ وظائف انھوں نے مقرر کر رکھے تھے۔ بصرف زرِ کثیر متعدد دینی کتابوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرایا اور بڑے اہتمام سے چھاپ کر انھیں شائع کیا۔ دیوبند اور اس کے علماء کے نام کے عاشق تھے۔ کئی سال سے فالج کے شدید مرض میں مبتلا تھے اور صاحب فراش ہوگئے تھے لیکن اس عالم میں بھی خدمت علم دین کے بڑے بڑے منصوبے بناتے اور ان پر عمل کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ بیمار فالج کے تھے لیکن انتقال دورۂ قلب سے اچانک ہوا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ [اکتوبر ۱۹۷۸ء]

حسین، ڈاکٹر سید عابد

ڈاکٹر سید عابد حسین

افسوس ہے پچھلے دنوں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا کم وبیش پچاسی برس کی عمر میں جامعہ نگر نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اُن چند اولین معماروں میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود باہم عہد کیا تھا وہ گورنمنٹ کی یا کسی اور ادارہ

کی بڑی سے بڑی تنخواہ کی نوکری قبول نہیں کریں گے اورایک قلیل مشاہرہ پر جامعہ میہ اسلامیہ کی خدمت کریں گے، چنانچہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب جرمنی سے فلسفہ میں پی۔ایچ ڈی کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے تو ایک بہت قلیل مشاہرہ پراپنے آپ کو جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ اس زمانہ میں وہ فلسفہ کادرس دیتے اورانتظامی امور میں ڈاکٹر ذاکرحسین مرحوم کے دست راست بنے رہے۔ مرحوم اگرچہ فلسفہ کے ڈاکٹر تھے لیکن اردو فارسی شعر و ادب، سیاسیات، تعلیمات واخلاقیات، ان سب کا مطالعہ نہایت وسیع اورتصنیف تالیف اور ترجمہ کاذوق اعلیٰ اور پاکیزہ تھا، چنانچہ انھوں نے ہرموضوع پرلکھا اور بہت خوب لکھا، اس حیثیت سے وہ برصغیر کے بلند پایہ مصنف ومترجم تھے اُن کا اسلوب تحریر بڑا شگفتہ اورموثر تھا۔ ادھر گذشتہ چند برس سے انھوں نے اسلام اور عصر جدید سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کررکھا تھا جس کے وہ خودسیکرٹری تھے اوراس ادارہ کی طرف سے انگریزی اوراردو میں جو دوسہ ماہی رسالے شائع ہوتے تھے اُن کے ایڈیٹر تھے۔ اسلام اورعصر جدید (اردو) میں انھوں نے جو اداریے لکھے سنجیدہ طبقہ میں بہت مقبول ہوئے اوراُن کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہوگیا۔ اخلاق وعادات کے اعتبار سے بڑے پایہ کے بزرگ اورجامعہ کی زندگی کانمونہ تھے۔ اُن کی فکر متوازن تھی، سادہ زندگی بسر کرتے تھے، طبیعت مرنجان ومرنج تھی۔ شعر بھی کہتے تھے مگرکم، وہ پرانی نسل کے اربابِ قلم کی آبرو اورنئی نسل کے لیے مینارۂ روشنی تھے۔ دوتین برس سے صحت بہت گرگئی تھی، آئے دن بیمار رہنے لگے تھے، آخر وقت موعود آپہنچا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ [جنوری۱۹۷۹ء]

خان، ڈاکٹر یوسف حسین

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

افسوس ہے گذشہ مہینہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں بھی راہی ملک بقا ہوگئے۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب مرحوم کے برادرخورد تھے اوران کی طرح بڑی خوبیوں اورکمالات کے بزرگ تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویٹ ہونے کے بعد فرانس گئے اورپیرس یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا اصل مضمون تاریخ اورسیاست تھا اوراسی کے وہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر تھے، لیکن ان کاانگریزی، فرنچ اورفارسی و اردو کے ادب وشعر کا مطالعہ نہایت وسیع اورتنقیدی ذوق اعلیٰ اور پختہ تھا چنانچہ ان کی کتابیں 'اردو غزل'، 'روحِ اقبال و حافظ'، اردو لٹریچر میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فرانسیسی ادب اورغالب پر بھی ان کی کتابیں ہیں۔ دوکتابیں ہندوستان کے اسلامی عہد پر انگریزی میں ہیں۔ اب آخر میں غالبؔ کے کلام کو انگریزی میں ترجمہ کررہے تھے۔ کرنل بشیر حسین زیدی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے مرحوم کو پرووائس چانسلر کے عہدہ پرعلی گڑھ بلایا، لیکن ۱۹۶۵ء میں نواب علی یاور جنگ سے نہ بنی تو مستعفی ہوکر دہلی چلے آئے اورنظام الدین اولیا میں ایک فلیٹ کرایہ پرلے کر رہنے لگے۔ چند سال شملہ انسٹیٹیوٹ میں بھی فیلو رہے۔ عقائد کے معاملہ میں کٹر مسلمان تھے، طبعاً نہایت شریف، خوش اخلاق اور سنجیدہ وملنسار بزرگ تھے اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

[مارچ۱۹۷۹ء]

رضوی، سید محبوب

سید محبوب رضوی

بڑے افسوس اوردکھ کی بات ہے کہ ہمارے عزیز دوست جناب سید محبوب رضوی صاحب اچانک ۲۵/ مارچ کو راہی ملک بقا ہوگئے۔ مرحوم نے اچھے خاصے ظہر کی نماز چھتے کی مسجد میں ادا کی، فراغت کے بعد سینے میں کچھ درد محسوس ہوا تو فوراً ایک رکشا کرکے گھر روانہ ہوئے لیکن ابھی گھر پہنچے بھی نہ تھے کہ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہمہ تن دارالعلوم کی خدمت کے لیے وقف ہوگئے۔ انھوں نے مختلف دفتری خدمات بڑی دیانت داری، محنت اور قابلیت سے انجام دیں۔ اُن کو مطالعہ تحقیق اورتصنیف وتالیف کا اعلیٰ ذوق قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا، وہ دیوبند کے مایۂ ناز ادیب محقق مؤرخ اور مصنف تھے۔ اُن کا آخری شاندار کارنامہ 'تاریخ دارالعلوم دیوبند' کی دوجلدیں ہیں۔ عادات وفضائل کے اعتبار سے نہایت دین دار، عابد وزاہد، معاملہ فہم، خوش اخلاق اور دیانت دار تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُن کی وفات دارالعلوم کا ایک عظیم نقصان ہے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ [اپریل۱۹۷۹ء]

الگیلانی، سید فضل اللہ

سید فضل اللہ الگیلانی

افسوس ہے ہماری بزم علم وفضل کی ایک اورشمع روشن بجھ گئی، یعنی ۲۳/مئی کو مولانا سید فضل اللہ الگیلانی نے ۷۸ برس کی عمر میں علی گڑھ میں وفات پائی اور

یونیورسٹی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔انا للہ و انا الیہ راجعون ۔حضرت مولانا محمد علی مونگیری جن کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے مولانا کے دادا تھے۔ والد یعنی مولوی احمد علی کا انتقال جوانی میں ہوگیا جب کہ مولانا صرف سات برس کے تھے، اس لیے دادا نے آپ کو تربیت میں لے لیا اور مونگیر میں رہ کر آپ نے علوم دینیہ واسلامیہ کی تکمیل کی۔بعض کتابوں کا درس مفتی عبداللطیف سے بھی لیا جو بعد میں آپ کے خسر بھی ہوگئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ دینیات میں لیکچرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں، ۱۹۵۷ء میں ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔اس کے بعد آپ نے کاروبار شروع کردیا اور ملازمت کبھی نہیں کی۔

مولانا علم وفضل کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے استعداد نہایت پختہ، مطالعہ بے حد وسیع اور نظر دقیق تھی۔ان کو سب علوم سے یکساں مناسبت تھی، مطالعہ اور درس کے دھنی تھے، لکھتے کم تھے مگر جب کبھی لکھا بہت خوب لکھا، چنانچہ امام بخاری کی کتاب ''ادب المفرد'' کی جو شرح دوجلدوں میں مرحوم نے لکھی اور مدینہ سے شائع ہوئی ہے۔تحقیق اور دقت نظر کا شاہکار ہے۔اس کے علاوہ چند چھوٹے بڑے رسالے جو بعض جزئی مسائل پر لکھے گئے ان میں بھی تحقیق کی یہی شان ہے۔عملاً نہایت عابد وزاہد اور صاحب اوراد وظائف، جماعت سے نماز ادا کرنے کا اہتمام سخت معذوری کی حالت میں بھی کرتے تھے۔اخلاق وعادات کے اعتبار سے بڑے متواضع، خوش مزاج، باوضع اور قلندر منش انسان تھے۔ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں انہیں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ برسوں سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے ممبر تھے اُس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور کاروائی میں توجہ سے حصہ لیتے تھے۔ پندرہ سولہ برس سے حیدرآباد کی سکونت ترک کرکے مستقلاً علی گڑھ میں مقیم ہوگئے تھے جہاں ان کی دوصاحبزادیاں یونیورسٹی زنانہ کالج کے شعبۂ دینیات میں علی الترتیب ریڈر اور لیکچرر ہیں اور اپنے خاندانی روایات کو بوجوہ احسن قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ذالك فضل الله یوتیه من یشاء ۔یہاں ان کی زندگی مکمل گوشہ نشینی کی تھی۔مطالعہ اور درس ان کا محبوب مشغلہ تھا۔اس کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔برہان کے بڑے قدردان تھے، شروع سے اس کے خریدار تھے اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ پابندی سے کرتے تھے۔ان کی وفات علم وادب، زہد و ورع اور حسن عمل اور اخلاق کی دنیا کا عظیم حادثہ ہے۔رحمه الله رحمة واسعة۔ [جون ۱۹۷۹ء]

الحسنی، مولانا محمد

مولانا محمد الحسنی

ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

من لم یمت عبطةً یمت هرما للموت کاساً فالمرء ذائقاً

''جو لوگ جوانی میں نہیں مرتے وہ بوڑھے ہوکر مریں گے۔بہرحال موت کی شراب ہر شخص کے لیے چشیدنی ہے۔''

افسوس ہے گذشتہ مہینہ ہمارے علوم دینیہ وعربیہ کے دو مرکزوں میں چند روز کے فرق سے شعر میں مذکور دونوں قسم کی حسرتناک موتیں واقع ہوئیں، پہلا واقعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولوی محمد الحسنی کی اچانک وفات کا پیش آیا۔ مرحوم صحیح معنی میں متنبّی کے اس شعر کے مصداق تھے:

وشیخ فی الشباب ولیس شیخاً یسمی کل من بلغ المشیبا

وہ کہنے کو مولانا سید ابوالحسن علی میاں کے بھتیجے تھے مگر درحقیقت وہ مولانا کے لیے فرزند حقیقی سے بڑھ کر تھے۔مولانا نے اپنے فیض تعلیم وتربیت اور توجہ خصوصی سے اس جوہر قابل کو ایسا چمکایا کہ مرحوم عربی ادب وانشا میں مولانا کے ثنی بن گئے۔عرصہ سے ''البعث الاسلامی'' کے رئیس التحریر تھے، اس حیثیت سے انھوں نے جو مقالات اور اداریے لکھے انہوں نے ہندو بیرونِ ہند کے اسلامی حلقوں میں دھوم مچادی۔ان کی کتاب ''الاسلام الممتحن'' جو عالم اسلام اور خصوصاً عرب ممالک کے معاملات ومسائل سے متعلق اُن کے بیس برس کے اداریوں اور مقالات کا منتخب مجموعہ ہے، وہ عرب میں اس درجہ مقبول ہوئی کہ چند برسوں میں اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ وہ اردو زبان کے بھی ادیب تھے۔مصنف اور مترجم کی حیثیت سے اس زبان میں بھی ان کی متعدد یادگاریں ہیں۔عمل وکردار اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے وہ اپنے خانوادۂ والا تبار کی روایات کا مکمل نمونہ تھے۔یعنی نہایت دیندار، صالح، متواضع، فقیر منش، طبیعت کے نہایت غیور وخوددار، خاموش اور باہمہ وبے ہمہ، دنیا اور اس کے زرافرف عیش وعشرت سے قطعاً بے نیاز وروگرداں، عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔

؎ خوش درخشید وبے شعلۂ مستعجل بود۔

رحمه الله رحمة واسعة

[جولائی ۱۹۷۹ء]

اسعداللہ، مولانا

مولانا اسعداللہ

اس حادثہ کے چند روز بعد ہی مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور کے ناظم مولانا اسعداللہ صاحب کے انتقال پُر ملال کا واقعہ پیش آیا۔ میرا دیوبند میں طالب علمی کا زمانہ تھا کہ مولانا کی شہرت کے چہرہ کا سبزہ آغاز تھا۔طلبا میں جہاں ان کے علمی اورتدریسی کمالات کا چرچا تھا وہ خاص طور پر اس کا بھی تذکرہ کرتے کہ آزاد منش اس درجہ کے ہیں کہ کوٹ پتلون پہنتے ہیں اوراسی لباس میں درس دیتے ہیں۔ مجھ کوبھی ان کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، اتفاق سے انہی دنوں ایک دن وہ دیوبند آئے تواس شان سے کہ ہاتھ میں بندوق تھی، شکاری لباس یعنی کوٹ اور برجس زیب تن اورکارتوسوں کی ایک پیٹی حمائل۔ مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی) سے ہم سنی اورصاحبزادگی کے باعث خاص تعلق رکھتے تھے، ان سے بےتکلف ہوکر بات چیت کی اور چلے گئے۔اس کے بعد، مدرسۂ مظاہرالعلوم سہارنپور کا سالانہ جلسہ بہت شاندار ہوتا تھا، دیوبنداورسہارنپور کے اکابراس میں جمع ہوتے اوران کے مواعظ ہوتے تھے، اس لیے میں اکثر ان جلسوں میں شریک ہوتا۔اس موقع پراوریوں بھی جب کبھی سہارنپور جانا ہوتا مولانا سے ضرور ملتا۔ان سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی، وہ عجیب وغریب جامع صفات انسان تھے، نہایت ذہین و طباع، اعلیٰ درجہ کے نغمہ گو شاعر، پرجوش خطیب، بلند پایہ مناظر، شروع میں منطق، فلسفہ اورعربی شعروادب ان کے خاص مضامین تھے، لیکن حضرت مولانا تھانوی سے بیعت کے بعد ان کی حالت یکسر منقلب ہوگئی تھی۔اب تفسیر وحدیث کے ساتھ اشتغال بڑھ گیا تھا اور اوراد و وظائف کے پابند ہوگئے تھے۔شوخی اورطراری کی جگہ سنجیدگی اورمتانت نے لے لی تھی، پہلے شکار کے بڑے شوقین تھے اب ایک پیرجنیدنظیر کی نظیر کیمیا اثر کے خوداسیر ہوگئے تھے۔ سہارنپور میں مولانا اسعداللہ اوردیوبند میں مولانا بدرعالم ان دونوں کے حالات کم وبیش یکساں تھے۔تصنیف وتالیف سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس لیے غالباً کوئی وقیع اور قابلِ ذکرعلمی یادگار نہیں چھوڑی۔

چند برس ہوئے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوا تو مدرسہ سہارنپور مظاہر العلوم کے ایک کمرہ میں مولانا سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا۔ مولانا اس وقت نہایت کمزور ہوگئے تھے، نقل وحرکت میں بھی دشواری ہوتی تھی، تاہم بڑے تپاک سے ملے اورشفقت سے پیش آئے، اور مدینہ طیبہ کی کھجوروں سے تواضع کی۔ جب رخصت ہونے لگا تو ایک اعلیٰ قسم کے عطر کی شیشی تحفہ میں عطا فرمائی۔عمر غالباً اسّی کے لگ بھگ ہوگی۔اب ایسے بزرگ کہاں ملیں گے جنھیں دیکھ کرسلف صالحین کی یادتازہ ہوجاتی ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ و واسعۃ۔

[جولائی ۱۹۷۹ء]

قدوائی، مولانا عبدالسلام

مولانا عبدالسلام قدوائی

افسوس ہے ہمارے فاضل اوردیرینہ دوست مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی بھی کم وبیش ستر برس کی عمر میں ۲۴/ اگست کواپنے گاؤں تہیلنڈی ضلع رائے بریلی (اترپردیش) میں راہی ملک بقاہوگئے۔خاتمہ اچانک ہوا، ۲۴/ اگست کو آخری روزہ تھا، مرحوم سحری کے وقت پہلے خود اُٹھے، پھر گھر کے لوگوں کو اٹھایا لیکن ابھی سحری کھائی نہیں تھی کہ بیت الخلا جاتے ہوئے گر پڑے، تھوڑی دیر کے بعد حالت غیر ہوگئی اور بے ہوش ہوگئے، نفس کی آمدوشد میں فرق آگیا، اورآخر چندگھنٹوں کے بعد جان جانِ آفریں کوسپرد کردی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلما کے آخری درجہ میں زیرتعلیم تھے کہ ندوہ میں ایک مشہور اورعظیم الشان اسٹرائیک ہوئی، اس سلسلہ میں احمد جعفری اوردوسرے بہت سے طلباء کے ساتھ مرحوم بھی خارج کردیئے گئے۔ اب وہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہوگئے لیکن کئی برس یہاں مقیم رہنے کے باوجود تکمیل یہاں بھی نہ کرسکے۔بہرحال تھے ذہین اورجو کچھ پڑھا تھا محنت اورشوق سے پڑھا تھا اس لیے استعداد پختہ تھی، اس بناپر چندبرس ندوہ میں مدرس رہے۔لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔بمبئی میں اخبار خلافت کے عملۂ ادارت سے بھی وابستہ رہے۔آخرکار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ناظم شعبۂ دینیات ہوگئے، یہاں سے سبکدوش ہوکرندوۃ العلماء میں معتمد تعلیمات ہوئے، پھر شاہ معین الدین احمد صاحب کاانتقال ہوا توان کی جگہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے ہاں ماہنامۂ 'معارف' کے شریک ادارت ہوگئے۔مولانا مرحوم نے اگرچہ کم لکھا ہے لیکن جوکچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے۔سادگی کے ساتھ طرفگی اور سنجیدگی ومتانت کے ساتھ شگفتگی اُن کے قلم کی خصوصیت تھی۔طبیعت رسااورنکتہ آفریں پائی تھی، کم گواورکم سخن، مرنج ومرنجان اور بڑے بااخلاق ومتواضع تھے۔اللھم اغفرلہ وارحمہ

[ستمبر ۱۹۷۹ء]

جلیس، مولانا محمد اسحاق

مولانا محمد اسحٰق جلیس

یہ محسوس کرکے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ تین مہینے کے اندر اندر دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنے تین نامور اور لائق وفائق کارکنوں سے محروم ہوگیا۔ جون میں مولانا محمد الحسنی ایڈیٹر البعث الاسلامی کی جواں مرگی کا حادثہ پیش آیا تھا۔ جولائی میں مولانا محمد اسحٰق جلیس ایڈیٹر 'تعمیر حیات'، اچانک ۴۴ برس کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم گوناگوں علمی وعملی خصوصیات کے مالک تھے، ندوہ کے فارغ التحصیل، انگریزی میں گریجویٹ اور بی لب، ہندی، پشتو اور مرہٹی زبانوں کے عالم اور تحریر وتقریر دونوں میں فرد تھے۔ ان خصوصیات کے باعث ''پیامِ انسانیت'' تحریک میں مولانا سید ابوالحسن علی میاں کے دستِ راست تھے اور اس کے بعد اگست میں یہ تیسرا حادثہ پیش آ گیا۔ برہان ان حوادثِ پیہم میں مولانا علی میاں اور تمام ارباب ندوۃ العلماء کے ساتھ دلی ہمدردی اور شرکت غم والم کا اظہار کرتا ہے۔ [ستمبر ۱۹۷۹ء]

مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ

آہ! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

موت وحیات قانون فطرت ہے، جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک دم جانا ضرور ہے، لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ اس جہان آب وگل سے رخصت ہوکر عالم آخرت کی طرف پرواز کرتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب و دماغ کی دنیا میں ایک زلزلہ سا آ گیا ہے اور خرمن ہوش وحواس پر بجلی گر پڑتی ہے، اس زلزلہ اور صاعقہ فگنی کا احساس مقید اور محدود نہیں ہوتا بلکہ عالمگیر ہوتا ہے اور اس کی شدت اور کرب مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں یکساں محسوس ہوتا ہے، یہی وہ شخصیتیں ہوتی ہیں جن کی وفات پر نطق ربانی کے لفظوں میں زمین وآسمان روتے ہیں اور ان کی موت عربی کے اس شعر کا مصداق ہوتی ہے:

وما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات ایسی ہی ایک شخصیت کی وفات ہے۔

اب سے ساٹھ اکسٹھ برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ جس سبزہ آغاز نوجوان نے اپنے والد ماجد کی ناگہانی وفات کے باعث معاشی ضرورت سے مجبور ہوکر اور اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر تاج (جبل پور) اور مسلم والجمعیت (دہلی) کی ایڈیٹری کو قبول کیا تھا، وہ ایک روز عالم اسلام کے افق پر آفتاب بن کر چمکنے اور ملت بیضا کی ایک نامور وعظیم تر شخصیت بننے والا ہے لیکن موخر الذکر اخبار کی ایڈیٹری (از ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء) کے زمانہ میں ہی بعض مضامین اور خصوصاً ''الجہاد فی الاسلام'' جو اس نوجوان ایڈیٹر کے قلم سے نکلے وہ زبان و بیان اور حقائق و مطالب کے اعتبار سے اس درجہ موثر اور جاذب توجہ تھے کہ غیر منقسم ہندوستان کے ارباب فکر ونظر کی زبان بیساختہ نواسنج تحسین وآفریں ہوگئی اور دوراندیش نگاہوں نے تاڑ لیا کہ جرنلزم کے آسمان پر جو آج ہلال نو بن کر نمودار ہوا ہے وہ کل علم وتحقیق کے افق پر ماہ کامل کی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا مرحوم باقاعدہ تعلیم کی تکمیل نہیں کرسکے تھے، لیکن تعلیم جو کچھ بھی حاصل کی تھی وہ عربی اور انگریزی میں مطالعہ کے لیے کافی تھی، پھر خود طبعاً تھے بڑے ذہین اور طباع اور مطالعہ کے دھنی اور رسیا، علاوہ ازیں الجمعیت کی ادارت کے زمانہ میں ان کو مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا عبدالسلام نیازی، مولانا محمد اشفاق کاندھلوی اور دوسرے علماء واساتذہ دہلی کے ساتھ معیت وصحبت اور اُن سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان سب چیزوں نے مل کر ان کے علم کو پختہ، استعداد بحث وتحقیق کو استوار اور نظر کو وسیع کردیا۔ طبیعت غوروفکر کی خوگر تھی۔ عنفوان شباب کا زمانہ صحافت میں بسر ہوا تھا۔ اس بنا پر تحریر وانشا کا اعلیٰ سلیقہ پیدا ہوچکا تھا اور اب وہ اس قابل تھے کہ قدرت نے انہیں جس اہم کام کے لیے پیدا کیا تھا اس کا آغاز کریں، اور یہ کام تھا احیائے واقامت دین کا۔

چنانچہ الجمعیۃ کی ادارت سے سبکدوش ہوکر حیدرآباد منتقل ہوگئے وہاں سے ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' جاری کیا جو عمر بھر ان کے افکار وخیالات کا ترجمان بنا رہا۔ اسی رسالہ میں اسلامی نظام کو جسے شروع میں انھوں نے حکومت الٰہیہ کا نام دیا تھا نصب العین بنا کر اسلام کی حقیقت، عقائد و اعمال، احکام و مسائل، معاملات حاضرہ اور اسلام پر یورپ کے اعتراضات پر پیہم ومسلسل اس عزم وجزم اور زور وقوت سے لکھنا شروع کیا کہ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی اور مولانا کے عقیدت مندوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہونے لگا۔ تقسیم سے چند برس قبل آپ نے پٹھان کوٹ (پنجاب) میں جماعت کی بنیاد رکھی۔ حصول آزادی کے بعد مع اپنی جماعت کے لاہور منتقل ہوگئے۔ ابھی حال میں لندن سے ایک ضخیم انگریزی کتاب ''نذر سید ابوالاعلیٰ مودودی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مولانا کی چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد ایک سو چالیس اور خطبات وتقریروں کی تعداد ایک ہزار ہے۔ مولانا نے

جو کچھ لکھا صرف اردو میں لکھا۔لیکن اس کا ترجمہ عربی اورانگریزی میں خصوصاً اور دوسری ملکی و غیر ملکی زبانوں میں عموماً برابر بڑی باقاعدہ کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا کی شہرت اوران کے افکار وخیالات کی گونج عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں پہنچی اور جماعت اسلامی کی شاخیں جگہ جگہ قائم ہوئیں جو اعلیٰ تنظیم اور ضبط ونظم کے ساتھ مولانا مودودی کے مشن کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ومنہمک ہیں۔

اختلاف کب اورکس سے نہیں ہوا،لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا سید ابوالاعلی مودودی ایک بلند پایہ مفکر ومبصر اسلام،ایک مصنف ومحقق اور ایک بانی جماعت اسلامی کی حیثیت سے عہد حاضر میں عالم اسلام کی عظیم ونامور شخصیت تھے۔انھوں نے اپنے قلم سے ایک اہم فکری اورذہنی انقلاب برپا اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مغربی علوم وفنون اورتہذیب وتمدن سے جو مرعوبیت تھی اسے دور کرکے ان میں انفرادیت کا احساس،خوداعتمادی اوراعلاء کلمۃ اللہ کا جذبۂ و جوش پیدا کیا ہے، اخلاق وعادات اورذاتی خصائل وشمائل کے اعتبار سے بھی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔

ایک زمانہ تھا کہ تقسیم اور جماعت اسلامی کی تاسیس سے بہت پہلے دلّی میں اُن سے ملاقات اور بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔اس کے بعد حجاز اور پاکستان میں بھی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ان ملاقاتوں میں مولانا ہمیشہ جس محبت اور شرافتِ اخلاق سے پیش آئے اس کی خوشگوار یادیں آج بھی حافظہ کے خزانہ میں محفوظ اورمشام جان کو معطر کررہی ہیں۔اللہ تعالیٰ فردوس بریں میں ان کو مقام جلیل عطا فرمائے۔آمین ثم آمین [اکتوبر ۱۹۷۹ء]

خان،مولانا ظفر احمد

ایک حادثۂ المناک [مولانا ظفر احمد خاں]

۱۳/دسمبر ۱۹۷۹ء جمعرات کی شب میں ایک بجے مولانا محمد ظفر احمد خاں صاحب رحلت فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۹۳۸ء میں یہ ادارہ قائم ہوا۔مولانا مرحوم ۱۹۳۹ء میں ندوۃ المصنفین میں بحیثیت کارکن ومنیجر تشریف لائے۔موصوف کا رسالہ برہان اورادارہ ندوۃ المصنفین سے دیرینہ تعلق تھا۔مرحوم کا حضرت مفتی صاحب سے تعلق چالیس ۴۰ سال رہا۔اوراسی دوران جب سے دفتر کی ذمہ داریاں میرے سپرد کی گئی تھیں وہ ۱۹۶۸ء تھا، زیادہ تر اسی وقت سے میرا مرحوم سے قُرب رہا۔موصوف پُرخلوص نیک دل انسان تھے اور وفاداری ان کے مزاج میں بے پناہ پائی جاتی تھی۔موصوف اپنی خود ایک مثال تھے۔ادارہ ندوۃ المصنفین کے وفادار اورایک اعلیٰ معیار کے کارکنوں میں ان کا شمار تھا۔مولوی صاحب میرے لیے سہارا اور ڈھارس تھے کیونکہ مجھ کو اُن سے حوصلہ افزائی اور تقویت حاصل تھی۔ مولوی صاحب کی جدائی میرے واسطے ایک بھیانک انقلاب ہے۔مجھ کو یہ دلی صدمہ پہنچا ہے دعافرمائیں کہ مزید ذمہ داریاں سنبھالنے کی اللہ تعالیٰ مجھ کو بہترین صلاحیتوں سے نوازدیں۔آمین ثم آمین۔

مولوی صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے چھ گھنٹے قبل تک رسالہ برہان کا کام انجام دیتے رہے۔[منیجر ندوۃ المصنفین دہلی، جنوری ۱۹۸۰ء]

عباسی، قاضی محمد عدیل

قاضی محمد عدیل صاحب عباسی

سخت افسوس ہے کہ ۲۰/ مارچ کو قاضی محمد عدیل صاحب عباسی اپنے وطن بستی میں راہی ملک بقاء ہوگئے۔عمر ۷۵ کے لگ بھگ ہوگی۔مرحوم علی گڑھ کے نامور تعلیم یافتہ تھے۔برسوں یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہے۔اردو اورانگریزی دونوں ہی زبانوں میں تحریر وتقریر کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔پیشہ کے اعتبار سے ایڈوکیٹ تھے اوراس میں بڑے نیک نام اورمشہور تھے۔قومی اورملّی کاموں سے بڑا عشق تھا،جس تحریک میں شامل ہوتے تھے بڑے جذبہ اورخلوص سے کام کرتے تھے۔ خلافت تحریک میں شریک ہوئے تو اس میں پیش پیش رہے، پھر کانگریس میں آئے تو اس میں بھی بڑے سرگرم اور پُرجوش کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ صاف گوئی اورراست گفتاری ان کا شعار تھا۔مصلحت اندیشی کا ان کے صحیفۂ اخلاق میں کہیں وجود نہ تھا، پبلک پلیٹ فارم ہو یا اسمبلی ہال جس کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے تھے۔قیدوبند کی تکلیفیں بھی اٹھائیں مگران کے عزم وحوصلہ میں کمی نہ آئی۔عقیدہ اورعمل اورجذبہ کے اعتبار سے بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ وقت کی نزاکت اوراس کے تقاضوں کو خوب سمجھتے اوران کے مطابق عالی حوصلگی اورعزم سے کام کرتے تھے چنانچہ آزادی کے بعد ملک میں سیکولر نظام تعلیم اور خصوصاً اترپردیش کے محکمہ تعلیم کی سوچی سمجھی پالیسی کے باعث ان کو مسلمان بچوں اور بچیوں کے ارتداد ذہنی کا خطرہ پیدا ہوا تو وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ تن اس میں مصروف ہوگئے اوراس کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔اس سلسلہ میں انہوں نے اترپردیش دینی کونسل قائم کی۔ جب یہ کونسل قائم ہوئی ہے جس میں راقم بھی شریک تھا،حالات اس درجہ نامساعد تھے کہ سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ اس منصوبہ میں کس طرح کامیابی ہوگی اور یہ اسکیم کیسے پروان چڑھے گی، لیکن قاضی صاحب مرحوم نے اپنے مخلص اور پُر جوش رفقائے کار کی امداد واعانت کے ساتھ اس محنت اور ولولہ وعزم کے ساتھ کام کیا کہ چند برسوں میں ہی گاؤں گاؤں اور شہروں اور قصبات میں ہزاروں دینی مکتب قائم ہوگئے جن میں لاکھوں بچے اور بچیاں پرائمری کلاس تک تعلیم پا رہے ہیں۔

دینی تعلیمی کونسل کا کام صرف مکاتب قائم کرنا نہ تھا بلکہ محکمہ تعلیم کی تجویز کردہ درسی کتابوں پر کڑی نگرانی رکھنا اور ساتھ ہی مکاتب دینیہ کے اساتذہ کے لیے ٹریننگ کا انتظام کرنا اور گورنمنٹ سے دینی مکاتب کو مستند منوانا بھی تھا۔ کونسل نے یہ تینوں کام بڑی مستعدی اور بیدار مغزی سے انجام دیئے، وہ گورنمنٹ کی نصاب کمیٹی کے کاموں پر کڑی نگرانی رکھتی ہے، جہاں اسے کوئی ایسی کتاب نظر آئی جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہو، کونسل نے اس کی طرف فوراً توجہ کی اور اسے نکلوا کر چھوڑا۔ غرض کہ اس میں شبہ نہیں دینی تعلیمی کونسل کا قیام مرحوم کا نہایت عظیم الشان دینی کارنامہ ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اجر جزیل ہے۔ وہ اخیر تک کونسل کے سیکرٹری رہے۔ ان کی وفات ایک ملّی حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

[اپریل ۱۹۸۰ء]

تھانوی، مولانا احتشام الحق

مولانا احتشام الحق تھانوی

افسوس ہے کہ پاکستان کے نامور عالم اور شیریں بیاں خطیب ومقرر مولانا احتشام الحق تھانوی اجلاس صد سالہ کے تین دن بعد دیوبند پہنچے اور وہاں سے مدراس گئے۔ جہاں وہ اس سے پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے وہاں سے بمبئی کا ارادہ تھا کہ وانمباڑی میں اچانک دل کا دورہ پڑا اور جاں بحق ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ کراچی پہنچایا گیا اور وہیں تدفین ہوئی مرحوم کا اصل وطن تھانہ بھون تھا۔ ایک دور کے رشتہ سے حضرت مولانا تھانوی کے بھانجے بھی تھے۔ والد اٹاوہ میں ملازم تھے مرحوم کی پیدائش ۱۹۱۵ء میں وہیں ہوئی، تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پائی۔ یہاں سے فراغت کے بعد اپنے برادر بزرگ مولوی عزیز الحق صاحب جو گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی محکمہ میں افسر اعلیٰ تھے اور نئی دہلی میں خواجہ میر درد روڈ پر رہتے تھے ان کے پاس چلے آئے اور اسی علاقہ کی ایک مسجد میں خطیب مقرر ہوگئے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دیتے اور جمعہ کے دن وعظ کہتے تھے۔ آدمی تھے خوش الحان اور شریں بیان، اس لیے مقبولیت بڑھنے لگی۔ ملازمت کے ساتھ انہوں نے مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری کی مولوی فاضل کلاس میں داخلہ لے لیا۔ میں اس کلاس کا سینئر استاذ تھا اس بنا پر مرحوم میرے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے، کلاس میں پابندی سے آتے اور درس ہمہ تن متوجہ ہوکر سنتے اور کبھی کبھی سوال بھی کرتے تھے۔ مولوی عزیز الحق صاحب سے تعلق پہلے سے تھا ہی، اب مرحوم سے بھی قریبی تعلق پیدا ہوگیا۔ ان کی مسجد میں سیرت مقدسہ کا یا کوئی اور جلسہ ہوتا تو تقریر کے لیے مجھے بالالتزام بلاتے تھے۔

تقسیم کے وقت اپنے خاندان کے ساتھ ترک وطن کرکے کراچی میں جا بسے۔ یہاں بہت کچھ چمکے اور بڑا نام پیدا کیا۔ ریڈیو پر ایک عرصہ تک روزانہ قرآن مجید کا درس دیتے رہے، قرآن مجید اور مثنوی مولانا روم بڑی خوش الحانی سے پڑھتے اور اس لیے عوام وخواص میں بڑے مقبول تھے۔ بیرونی ممالک جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں بھی بلائے جاتے تھے اور لوگ ان کے وعظ میں بڑے شوق اور دلچسپی سے شریک ہوتے تھے۔ تصنیف وتالیف سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے کوئی علمی یادگار نہ چھوڑی۔ بعض وجوہ سے پاکستان کے لوگوں اور خصوصاً دیوبندی مسلک کے علماء میں مرحوم کی شخصیت ہمیشہ مختلف فیہ رہی۔ بہر حال شگفتہ طبع اور خوش مزاج عالم تھے تقریر کی طرح گفتگو بھی بڑی دلچسپ اور پُر لطف ہوتی تھی۔ مجھ سے جو ربط خاص اور تعلق خاطر شروع میں تھا وہ اخیر تک قائم رہا۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ میں کراچی گیا تو مولانا بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور ایک نہایت شاندار اور پُر تکلف استقبالیہ دیا، جس کا انتظام ایک انگریزی ہوٹل نے کیا، اور کم وبیش ڈھائی سو افراد جن میں علماء، تاجر، صنعت کار، سیاسی لیڈر، سرکاری افسر اور وکلاء وڈاکٹر غرض کہ ہر طبقہ اور ہر گروہ کے حضرات شامل تھے، اس استقبالیہ میں موجود تھے اس موقع پر مولانا نے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا: کراچی والے جانتے ہیں کہ یہاں بڑے سے بڑے لوگ آتے ہیں مگر میں نے کسی کو استقبالیہ نہیں دیا، آج یہ پہلا استقبالیہ ایک ایسے شخص کو دے رہا ہوں جس کے سامنے میں نے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور جو چنیں وچناں بھی ہے۔ مولانا نے جس محبت اور خلوص سے یہ الفاظ فرمائے تھے کام ودہن اس کی حلاوت سے آج تک آشنا ہیں۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

[مئی ۱۹۸۰ء]

اختری بیگم

اختری بیگم

[اہلیہ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی]

میری اہلیہ! اختری بیگم کے انتقال پرملال پر جو دو ماہ کی شدید علالت کے بعد ۳۰ / شعبان المعظم مطابق ۱۴/ جولائی کو عصر اور مغرب کے درمیان ہوا۔ جن دوستوں، عزیزوں نے برصغیر ہندو پاک اور بیرونی ممالک سے تعزیت کے خطوط وٹیلگرام بھیجے ہیں اور ہندوستان و پاکستان کے جن اخبارات نے تعزیتی نوٹ کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا ہے اور جن اداروں نے اپنے یہاں اجتماعی ایصال ثواب کا اہتمام کیا ہے ان سب کی محبت و ہمدردی کا تہہ دل سے نہایت شکرگذار ہوں اور دعا کرتا ہوں جزاهم الله عنی جزاء خیرا۔

ساتھ ہی معذرت اس کی کرنی ہے کہ اس حادثہ نے ذہن وقلم کو جیسے مفلوج کر دیا ہے، چنانچہ برہان کے زیرنظر شمارہ کے لیے جب نظرات بھی نہیں جاسکے تو اپنے ناتمام مضامین کے فائل سے ایک مضمون نکال کر بھرت پورا کر دیا ہے، اس لیے قارئین کلکتہ کے سفرنامہ اور تبصروں کے لیے معذور تصور فرمائیں۔

[سعید اکبرآبادی، ۷/ اگست ۱۹۸۰ء]

العمری، مولانا سید فخر الحسن الحسنی

مولانا سید فخر الحسن الحسنی العمری

بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ گذشتہ مہینے ہمارے نہایت فاضل دوست اور دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر المدرسین مولانا سید فخر الحسن صاحب الحسنی العمری کم وبیش دوبرس کی شدید اور مسلسل علالت کے بعد راہی ملک بقا ہوگئے اور ایوان علم وفضل میں اپنی جگہ خالی چھوڑ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم عمری ضلع مرادآباد کے سادات حسنی میں سے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی پھر دیوبند چلے آئے، یہاں سات آٹھ برس رہ کر نصاب میں جو علوم و فنون شامل ہیں از اوّل تا آخر تمام علوم وفنون کی تمام کتابوں کا درس لیا۔ ان میں دونوں باتیں تھیں، محنتی بھی اور ذہین وطباع بھی، اس لیے استعداد کے اعتبار سے طلباء میں ممتاز اور اساتذہ کے مقرب ومحبوب تھے۔ دارالعلوم کی روایات کے مطابق ہم جماعت طلباء کی ایک بڑی تعداد کو تکرار کراتے تھے۔ دورۂ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں دارالعلوم کے ساتھ حضرت کے تعلق کے پہلے برس ہی کیا۔ یہاں سے فارغ ہوکر مدرسۂ عالیہ مسجد فتح پوری دہلی میں مدرس ہوکر چلے گئے۔ راقم الحروف کا مدرسۂ عالیہ سے جب تعلق ہوا ہے (۱۹۳۱ء) تو یہ چند برس پہلے سے وہاں مدرس تھے، مدرسہ میں وہ حدیث وتفسیر، منطق وفلسفہ اور ادب کی متوسط اور اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ پختہ اور ٹھوس استعداد کے ساتھ تقریر اور افہام وتفہیم کا ملکہ خداداد تھا، خندہ جبینی اور شگفتہ مزاجی طبیعت اور فطرت تھی، طلباء کے ساتھ حسن واخلاق سے پیش آتے اور ان کی ہر قسم کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں میں ہی ان کی شہرت کا طوطی مدارس عربیہ کے بام و در پر بولنے لگا اور عوام وخواص ان کا نام عزت سے لینے لگے۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ کو جو معاملہ پیش آیا ہے وہ مرحوم کو بھی پیش آیا۔ یعنی جب کسی مدرسہ میں شہرت ونیک نامی کے ساتھ درس دیتے کئی برس گزر گئے تو مرکز نے اپنی طرف کھینچ بلایا، چنانچہ دس بارہ برس کے بعد یہ بھی فتح پوری سے دیوبند منتقل ہوگئے۔ یہاں جوہر قابل نے وہ چمک دمک دکھائی کہ جلد ہی طبقۂ علیا کے ممتاز اساتذہ میں شمار ہونے لگے، ناظم تعلیمات بھی رہے اور آخر میں صدر المدرسین ہوگئے جو ایک استاذ کے لیے انتہائی نقطۂ عروج ہے، اس حیثیت سے مجلس شوریٰ کے ایک رکن بھی تھے۔ چند برس ہوئے مرحوم کے فرزند رشید مولوی بہاء الحسن مدرس دارالعلوم دیوبند کا جوتومند جوان تھے، اچانک قلب کی حرکت کے بند ہوجانے کے سبب سفر کے عالم میں انتقال ہوگیا تھا اور میت دیوبند لائی گئی تھی۔ مولوی صاحب پر اس حادثہ کا اثر اس قدر شدید ہوا کہ ہوش و حواس کھو بیٹھے، طاقت نے جواب دے دیا، اعضائے رئیسہ نے اپنا کام چھوڑ دیا اور آخر کم وبیش تین برس تک قفس جبر وقدر میں پھڑ پھڑانے کے بعد روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

دیوبند منتقل ہونے کے بعد تصوف کی طرف میلان زیادہ ہوگیا تھا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے اور غالباً خلیفۂ مجاز بھی ہوئے۔ تصنیف وتالیف سے دلچسپی نہ تھی، وعظ وارشاد کا مشغلہ رکھتے تھے۔ ان کے سرچشمۂ علم وفضل سے ہزاروں طلباء فیض یاب ہوئے جو برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی وفات ایک عظیم ملی حادثہ ہے عمر ۷۷ کے لگ بھگ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو ٹھنڈی رکھے اور رحمت وبخشش کی نعمت بے کراں سے نوازے۔ آمین!

[اکتوبر ۱۹۸۰ء]

مظہری، علامہ جمیل

علامہ جمیل مظہری

علامہ جمیل مظہری اردو کے بلند پایہ شاعر، ادیب اور نقاد تھے، انہوں نے مشرقی ومغربی فلسفہ، ادبیات ومذہبیات اور انسانی فکر ونظر کی تاریخ اور طلسم کدۂ کائنات وحیات کا مطالعہ اس عمیق و دقت نظر سے کیا تھا کہ ان پر عالم حیرت طاری ہوگیا اور اس میں تشکیک کا رنگ پیدا ہوگیا تھا۔ اس تشکیک نے رمزیت، تفلسف اور اظہار کی ندرت وبرجستگی کے ساتھ آمیز ہوکر ان کے کلام کو گہری انفرادیت سے ہم آہنگ کردیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ ایک فنکار کی حیثیت سے برصغیر کے شعراء میں وہ ایک ممتاز مرتبۂ ومقام کے مالک تھے لیکن ان کی طبیعت ہنرفروشی جوہنرنمائی کی ایک شاخ ہے اس سے ہمیشہ سخت متنفر رہے۔ مزاج میں کمال استغناء وبے نیازی کے ساتھ گوشہ گیری وکم آمیزی کی خُو تھی اس لیے ان کو شہرت وعظمت کے دربار میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ افسوس ہے ۲۳/ جولائی کو ان کا بھی انتقال اپنے وطن مظفرآباد میں ہوگیا۔ مرحوم اور ان کے برادرخورد سید امیر رضا کاظمی میرے ان احباب خاص میں تھے جن کی صحبت ومعیت کی وجہ سے کلکتہ میرے لیے باغ وبہار تھا، اس لیے علامہ جمیل مظہری کا انتقال دنیائے شعروادب کا ہی ایک سانحہ نہیں، ذاتی طور پر بھی ایک المناک حادثہ ہے۔

اردو کا ایک نوزائیدہ ادبی مجلّہ ''مظہری نمبر'' شائع کررہا ہے، اس میں مرحوم پر میرا مفصل مقالہ بھی ہوگا اس لیے یہاں صرف اس نوٹ پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ مرحوم حضرت ابوالکلام آزاد کے خاص صحبت یافتہ تھے، ان کو موصوف سے اور موصوف کو ان سے ربط وانس خاص تھا۔ ایک مدت تک ادھر ادھر تلاش معاش میں سرگرداں رہنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں پہلے اردو کے لیکچرر ہوئے اور پھر ریڈر اور اسی پوسٹ پر سبکدوش ہوگئے۔ نظم اور نثر میں متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، درویش صفت وقلندر منش، نہایت بے تکلف اور بے تصنع، باہمہ اور بے ہمہ انسان تھے، کسی کی دلآزاری کا غالباً انہیں کبھی تصور بھی نہ آیا ہوگا۔ میں نے اس درجہ قریبی تعلق کے باوجود ان کی زبان سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی، درحقیقت یہ وصف خاص ہزار نیکیوں کی ایک نیکی ہے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

[اکتوبر ۱۹۸۰ء]

جان، شیخ محمد (خان بہادر)

خان بہادر شیخ محمد جان

افسوس ہے گزشتہ مہینے خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کا کم وبیش ۸۵ برس کی عمر میں کلکتہ میں انتقال ہوگیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم قومی اعتبار سے ہندوستان کے ان پنجابی مسلمانوں میں سے تھے جو تجارت اور کاروبار میں ترقی کے لیے ممتاز ونمایاں ہیں۔ مرحوم اپنی جماعت میں بھی ممتاز اور نہایت محترم ومعزز سمجھے جاتے تھے۔ طبعاً نہایت مخیّر اور غربا وفقراء کی انفرادی طور پر امداد کرنے کے علاوہ قومی، مذہبی اور ملکی معاملات میں بڑی فیاضی اور کشادہ دلی سے خرچ کرتے تھے۔ ان کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ ان کا قائم کیا ہوا خان بہادر شیخ محمد جان ہائر سکینڈری اسکول کلکتہ کی ایک قدیم اور نیک نام مسلمان بچوں کی تعلیم گاہ ہے۔ علاوہ ازیں وہ کلکتہ اور بیرون کلکتہ کے بیسوں بلند پایۂ اور ممتاز تعلیمی اداروں کے رکن تھے۔ دیوبند کے علماء سے ان کو بڑی عقیدت اور ارادت تھی۔ عقیدے اور عمل اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان تھے، پنجگانہ نماز باجماعت کی پابندی کے علاوہ تہجد گذار بھی تھے اور اوراد وظائف کا شغل بھی رکھتے تھے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے بیعت تھے۔ سیاسی اعتبار سے کٹر نیشنلسٹ تھے، کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے ہم خیال اور فرقہ وارانہ سیاست کے ہمیشہ مخالف رہے اور اگرچہ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کی تحریک کے سخت بحران وجوش کے باعث دوسرے مسلم نیشنلسٹ اکابر طرح خان بہادر صاحب کو شدید اذیتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، تاہم انھوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور ان کے خیال اور روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ارکان ندوۃ المصنفین کے ساتھ ذاتی تعلق کے علاوہ شروع سے ادارہ کے محسن رہے، تقسیم کے وقت جب ادارہ لٹ لٹا کر تباہ وبرباد ہوگیا، ارکان ادارہ بے خانماں اور بے سروسامان ہوگئے تھے اور ادارہ کے دوبارہ قائم اور جاری رہنے کی بہ ظاہر کوئی امید باقی نہیں رہی تھی تو اس وقت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو جنھوں نے ان سخت مایوس کن حالات میں بھی ادارہ کو ازسرنو قائم کرنے کا عزم بالجزم کرلیا تھا سب سے بڑی تقویت خان بہادر صاحب مرحوم کی حوصلہ افزائی اور فیاضانہ امداد سے ہی ہوئی۔ وہ ندوۃ المصنفین کے کاموں کے بڑے قدردان تھے، برہان اور ادارہ کی مطبوعات کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے تھے۔ اخلاق وعادات کے اعتبار سے بڑے خوش طبع، مرنج ومرنجان، ہمدرد اور متواضع تھے۔ اب ایسے وضعدار کہاں ملیں گے۔ ان کا حادثہ

وفات خود ندوۃ المصنفین کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، ادارہ اس حادثہ فاجعہ میں مرحوم کے پسماندگان کا دل سے شریکِ غم ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں ابرار وصلحا کا مقام جلیل عنایت فرمائے اور ان کی قبر ٹھنڈی رکھے۔

[جنوری ۱۹۸۱ء]

علوی، ڈاکٹر مصطفےٰ حسن

ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی

افسوس ہے اسی مہینہ ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی کا حادثہ وفات بھی پیش آ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۶ برس کے لگ بھگ تھی، ان کا اصل وطن کاکوری تھا۔ اردو زبان کے مشہور نعت گو جناب محسن کاکوروی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے حضرت شیخ کے درس بخاری کے آخری سال میں دورۂ حدیث کی تکمیل تھی اور اس کے بعد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ نے دیوبند کی جامع مسجد میں ان کو دستار فضیلت عطا فرمائی تھی، اس حیثیت سے وہ غالباً حضرت شیخ الہند کی بزم تلامذہ کے آخری چراغ تھے، اب تو دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے کثرت سے نظر آتے ہیں، لیکن غالباً مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے دارالعلوم دیوبند سے باقاعدہ فارغ ہونے کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد وہ ایک عرصہ تک لکھنؤ کے شعبۂ علوم مشرقیہ سے منسلک رہے۔ آخر میں چند برس شعبۂ عربی میں بھی کام کیا، عربی بولنے اور لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق موروثی تھا، لکھنؤ کی زبان اور اس کے رنگ میں غزلیں لکھتے اور ترنم سے پڑھ کر ارباب ذوق سے داد لیتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔ ان کی آخری کتاب ''قائد بدر واحد'' تھی جس پر بہار اردو اکیڈیمی نے انعام دیا تھا۔ علاوہ ازیں عرصہ ہوا ان کو صدر جمہوریہ کی طرف سے عربی کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ دارالعلوم دیوبند سے بڑی محبت تھی، اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر عرصۂ دراز سے تھے اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے مگر ادھر چند برس سے بتقاضائے عمر ضعف و نقاہت کے باعث شوریٰ کے جلسوں میں شرکت کا معمول نہیں رہا تھا۔ عجب اتفاق ہے مارچ ۱۹۸۰ء میں جو اجلاس صد سالہ ہوا اس میں دیوبند آئے اور پھر اس کے بعد ۱۱، ۱۲/ اکتوبر کو مجلس شوریٰ کا جو جلسہ ہوا تو وہ اس میں بھی شریک ہوئے۔ ایسے موقع پر حضرت شیخ الہند کے آخری تلمیذ سمجھ کر طلباء ان کے پاس کثرت سے آتے اور اُن کی زبانی اکابر دیوبند کے واقعات سنتے تھے۔ طلبا حسب معمول اس مرتبہ بھی ان کے کمرہ میں جمع ہوئے تو ان سے بولے: بچو! آفتاب عمر لب بام ہے، پتہ نہیں اب آئندہ کبھی میں دیوبند آ بھی سکوں گا یا نہیں، اس لیے تم مجھ سے درس حدیث لے لو تاکہ میں تم کو اپنی سند دے دوں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا دو چار حدیثیں بخاری کی پڑھیں اور طلباء کو اسناد کی اجازت دے دی۔ طبعاً بڑے خلیق، شگفتہ مزاج، وضعدار و بامروت انسان تھے۔ لکھنؤ کے شرفاء کے اوصاف و کمالات کے حامل تھے، خاتمہ بھی عجیب و غریب طریقہ پر ہوا، ۲۶/ نومبر ۱۹۸۰ء کو عصر کی نماز ادا کرتے کرتے سجدہ میں گئے تو پھر سر اٹھانا نصیب نہ ہوا، جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ دوسرے دن نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اور تدفین وطن کاکوری کے خاندانی قبرستان میں ہوئی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ [جنوری ۱۹۸۱ء]

قریشی، پروفیسر اشتیاق حسین

پروفیسر اشتیاق حسین قریشی

اخبارات سے یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی گزشتہ ماہ جنوری کے تیسرے ہفتہ میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم برصغیر ہندو پاک کے نامور مورخ اور ماہر تعلیم تھے، ان کا اصل وطن مارہرہ (اتر پردیش میں ضلع ایٹہ کا ایک مردم خیز قصبہ) تھا، وہیں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ انٹرنس کا امتحان مولوی بشیر الدین مرحوم کے قائم کیے ہوئے اٹاوہ کے ہائی اسکول سے پاس کیا۔ مولوی صاحب سرسید مرحوم کے صحبت یافتہ تھے اس لیے ایک زمانہ میں اسی اسکول کی مسلمان لڑکوں کی بہترین تعلیم گاہ کی حیثیت سے بڑی شہرت تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے برادر خورد ڈاکٹر یوسف حسین خان اسی اسکول کے فیض یافتہ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کے ساتھی تھے، اس کے بعد ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ تحریک خلافت شروع ہوئی۔ یہ شروع سے ہی تھے بڑے جذبیلے اور جوشیلے، انھوں نے تحریک میں اس جوش و خروش سے حصہ لیا تھا کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چند برسوں کے بعد جب کمال اتاترک کے الغائے خلافت کے باعث مسلمانوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تو مرحوم نے پھر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور بی۔اے کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفینس کالج، دہلی میں داخل ہو کر دہلی یونیورسٹی سے تاریخ اور فارسی دونوں میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا اور پھر اسی کالج میں تاریخ کے لیکچرر ہو گئے۔ سات

آٹھ برس کے بعد کالج کے معمول اور دستور کے مطابق کیمبرج یونیورسٹی گئے اور ڈاکٹر ہوکر واپس ہوئے ۔ ڈاکٹریٹ کے لیے انھوں نے جو مقالہ لکھا تھا وہ ''دلّی سلطنت کا نظم ونسق'' کے نام سے اسی زمانہ میں ہی شائع ہوکر ارباب علم وتحقیق میں مقبول ہو چکا تھا۔ کیمبرج سے آنے کے بعد چند برس کالج میں رہے اور پھر دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر قائم ہوئی تو یہ یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر تاریخ مقرر ہوکر وہاں چلے گئے اور ساتھ ہی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین منتخب ہوئے۔ کالج اور یونیورسٹی میں ان کا بڑا وقار اور مرتبہ تھا، اساتذہ اور طلباء سب ان کا لحاظ اور احترام کرتے تھے۔

مرحوم نہایت پختہ عقیدہ، نماز روزہ کے پابند اور بڑے جوشیلے اور جذباتی مسلمان تھے۔ سیاسی خیالات کے اعتبار سے کٹر مسلم لیگی اور تحریک پاکستان کے سرگرم حامی تھے چنانچہ وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو اسمبلی کا جو پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تھا ڈاکٹر صاحب اس میں شریک تھے۔ چند روز کے بعد جب ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کی توقع کے برخلاف دہلی میں واپس آ گئے اور یونیورسٹی میں باقاعدہ کام کرنے لگے تو سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کالج اور یونیورسٹی میں تو میرے رفیق کار تھے ہی یوں بھی ذاتی طور پر میرے نہایت بے تکلف اور عزیز دوست تھے، ایک دن میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا واقعی آپ نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟ بولے جی ہاں! میں کراچی سے آیا تو ہوں اسی عزم اور ارادہ کے ساتھ۔ میں نے کہا: پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ ہوں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور رہیں ہندوستان میں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: میں کراچی اسی ارادہ سے گیا تھا کہ اب ہندوستان میں نہ رہوں گا، لیکن قائداعظم نے مجھ سے فرمایا: اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے مجھ کو امید ہے کہ دونوں ملک مل جل کر رہیں گے اس لیے تم جیسے مسلمان جو اعلیٰ عہدہ پر ہیں میں چاہتا ہوں کہ وہ ہندوستان میں ہی رہیں۔ چنانچہ قائداعظم کے اس ارشاد پر میں واپس آ گیا ہوں، حالات اگر ٹھیک رہے تو میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے استعفیٰ بھیج دوں گا۔ لیکن اس گفتگو کے چند روز بعد ہی دلّی میں قتل وغارت گری کا بازار ایسا گرم ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں بھی ایسا گرم کیا ہوا ہوگا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتہ میں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی اور دلّی یونیورسٹی کے مسلمان رجسٹرار کے مکان پر یونیورسٹی کے کیمپس میں شدید حملہ ہوا اور دونوں کو اپنی جانیں بچا کر ترک وطن کرنا پڑا۔

ذاتی واقفیت کی بنا پر مجھ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان چند مخلص مسلمانوں میں سے تھے جنھوں نے نیک نیتی اور ایمان داری سے یہ سمجھا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم ہوگا وہاں کے مرد، عورت، جوان اور بوڑھے عقیدہ اور عمل اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے بہتر مسلمان ہوں گے اور دونوں ملک امن وسلامتی سے رہیں گے۔ لیکن وہاں ان معصوم توقعات کے بالکل برعکس جو حالات رونما ہوئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو سخت مایوس کردیا اور وہ اس صورت حال پر اپنے غم وغصہ اور درد وکرب کا اظہار تقریروں، تحریروں اور نجی گفتگوؤں میں برملا اور علی الاعلان کرتے تھے۔ تاہم قائداعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خاں ان کے بڑے قدردان تھے، اس بنا پر وہ آبادکاری کے وزیر مقرر کئے گئے تھے بڑے شریف اور دوست۔ اس زمانہ میں میں کلکتہ میں تھا، وہاں سے میں نے کراچی اور لاہور کے بعض دوستوں اور عزیزوں کی سفارش میں ڈاکٹر صاحب کو خطوط لکھے تو ان کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے فراخدلی سے ان کی مدد کی۔ نواب زادہ کی شہادت کے بعد جب پاکستان میں الٹ پلٹ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب بددل ہوکر امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ہو کر چلے گئے، یہاں انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں پر لیکچر دیئے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ مرحوم کے بلند پایۂ مورخ اور محقق ہونے میں شبہ نہیں ہوسکتا، لیکن مجھ کو ہمیشہ ان سے یہ شکایت رہی کہ ان کی غیر معمولی جذباتیت کہیں کہیں مؤرخانہ معروضیت پر غالب آجاتی ہے، یہ رنگ ان کی اس کتاب میں بھی ہے اور ایک دوسری کتاب ''علماء''[۱] میں بھی۔ آپ کہیں گے ہندو مؤرخین بھی تو غیر متعصب نہیں ہیں، میں عرض کروں گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: لایضرکم من ضل اذااھتدتیم۔ ''یعنی بلا سے کوئی گمراہ ہوتا ہے تو ہونے دو، تم اے مسلمانوں! بہرحال سیدھے راستے پر رہو۔''

اس بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی لاکھ دھاندلی کرے ایک مورخ کو بہر صورت تاریخ کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔

امریکہ اور دوسرے ملکوں کے دورہ کے بعد کراچی واپس آئے تو یہاں مختلف اوقات میں مختلف عہدوں پر رہے۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ وزیر تعلیم بھی رہے۔ آخر میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور بھٹو گورنمنٹ کے عہد میں اس سے سبکدوش ہوکر خانہ نشین ہوگئے، لیکن سیاسیات سے ان کی دلچسپی برابر قائم رہی جس کی وجہ سے وہ بھٹو گورنمنٹ کے معتوب بنے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی وائس چانسلری کے زمانہ میں ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ میں پاکستان گیا اور

کراچی بھی پہنچا تو ایک دن صبح کے وقت ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی غرض سے کراچی یونیورسٹی بھی گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے دفتر میں موجود تھے میں نے اطلاع کرائی نام سنتے ہی فوراً باہر نکل آئے، ۲۳ برس کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی، فرط محبت میں بغلگیر ہوگئے اور دفتر کے اندر آ کر سخن گذشتہ گفتن وگلہ را دراز کردن کا دور شروع کردیا۔ ابھی ہم کافی پی رہے اور باتیں کررہے تھے کہ اچانک ایک نہایت شائستہ و بائستہ خاتون کمرہ میں داخل ہوئیں اور ڈاکٹر صاحب سے بولیں: وقت ہوگیا! آپ کا انتظار ہورہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً گھڑی دیکھی اور کھڑے ہوگئے، مجھ سے بولے آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے ڈپارٹمنٹ کے ماتحت ایک شعبہ اسلامک سوشیالوجی کا قائم ہوا ہے، یہ خاتون ڈپارٹمنٹ کی صدر ہیں اور ڈاکٹر صاحب اس وقت اسلامک سوشیالوجی کے سیکشن کا افتتاح کرنے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مجھے ساتھ لئے ہوئے ڈپارنمنٹ کے ایک وسیع اور کشادہ کمرہ میں داخل ہوئے جو اساتذہ، طلباء اور طالبات اور اخبارات کے نامہ نگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ڈائس پر اپنی کرسی پر بیٹھے اور ایک قریب کی کرسی پر مجھے بٹھادیا۔ قرآن مجید کی تلاوت کے بعد فوراً ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوگئے اور میرے تعارف میں ایک مختصر تقریر کی جس میں بڑی محبت سے 'برہان' اور میری کتابوں خصوصاً 'صدیق اکبرؓ' کا تذکرہ کرنے کے ساتھ مجھ سے اپنے دیرینہ تعلق کا بھی ذکر کیا، یہاں تک تو خیر غنیمت تھا، غضب یہ ہوا کہ اب ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے تقریر کی بھی فرمائش کردی۔ میں یہ سنتے ہی سٹ پٹا کے رہ گیا، تاہم اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک منٹ کے لئے سرنگوں ہوکر خدا سے دعا کی: ''بارالہا! تو نے میرے دوستوں کے دلوں میں یہ حسن ظن پیدا کیا ہے کہ میں ہر موضوع پر ہر وقت فی البدیہہ تقریر کرسکتا ہوں تو اس وقت میری مدد بھی فرما۔'' اس کے بعد کھڑا ہوا اور بولنا شروع کردیا۔ پون گھنٹہ بولا ہوں گا تقریر میں، میں نے پہلے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ ان کے عہد میں یہ ڈپارٹمنٹ قائم ہورہا ہے اور پھر میں نے یہ بتایا کہ اسلامک سوشیالوجی کیا ہے؟ اسلام کس طرح انسان اور معاشرہ کو مختلف طبقات پر تقسیم کرتا ہے، ہر طبقہ کے الگ الگ حقوق وفرائض کو متعین کرتا ہے، ان سب کی بنیاد اور اساس ایک ہے اس کے ذریعہ اسلام کس طرح کثرت میں وحدت اور سماج میں ہم آہنگی اور توازن واعتدال پیدا کرتا ہے۔ آخر میں، میں نے یہ بھی کہا کہ اب جب کہ انسانی معاشرہ بدل رہا ہے ضروری ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ اسلامی سماجیات کے جدید مسائل ومعاملات کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ میری تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی اور ڈپارٹمنٹ کا افتتاح کیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک دن لیاقت آباد میں اپنی کوٹھی پر کھانے پر مدعو کیا اور یہ میری اور ان کی آخری ملاقات تھی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر کیا تھی؟ میرا اندازہ ۷۴، ۷۵ برس کا تھا۔ لیکن علی گڑھ کے ایک ممتاز خاندان کے ایک پیر کہن سال جو میرے قریب رہتے ہیں، ابھی چند روز ہوئے ان سے معلوم ہوا کہ ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر صاحب مارہرہ کے ایک اسکول میں اسکول ماسٹر تھے اور وہ خود ان کی کلاس میں تھے، مزید برآں انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے پاس اب تک ڈاکٹر صاحب کے قلم کی ایک تحریر موجود ہے جس پر ان کے دستخط ہیں اور ۱۹۱۴ء کی تاریخ پڑی ہے۔ یہ صحیح ہے تو اُن کی عمر میرے اندازہ سے کہیں زیادہ ہوجاتی ہے واللہ اعلم۔ بہرحال بڑی خوبیوں کے اور بڑی آن بان کے مسلمان تھے، اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں دینی حمیت وغیرت اور ایمانی حرارت وجسارت کے ایسے لوگ کم ہی ہوں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

[۱] کتاب کا پورا نام ہے ''علماء میدان سیاست میں'' [مرتب]

[فروری ۱۹۸۱ء]

عرشی، مولانا امتیاز علی خاں

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

سخت افسوس ہے گذشتہ ماہ فروری کی ۲۵/ تاریخ کو مولانا امتیاز علی خاں عرشی بھی ۷۷ برس کی عمر میں اپنے وطن رامپور میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی شہرت کا آغاز اوّل اوّل غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے ہوا، انھوں نے غالب کے دیوان اور خطوط پر جو تحقیقی مقالات لکھے، انھوں نے اردو زبان وادب کے حلقہ میں دھوم مچادی۔ وہ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں اور ان کے ادب کے نامور مبصر ومحقق تھے۔

وہ رامپور میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ رامپور پٹھانوں کی مشہور بستی ہے جو افغانستان کے مختلف قبیلوں سے منسوب ہیں۔ مرحوم کا خاندانی تعلق حاجی خیل قبیلہ سے تھا جو یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ ہے، ابتدائی تعلیم مطلع العلوم نامی ایک مقامی مدرسہ میں پائی۔ اسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی سے عالم کا امتحان پاس کیا۔ پھر اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لے کر اولاً مولوی فاضل کا اور اس کے بعد منشی فاضل کا امتحان پرئیویٹ طور پر دیا اور دونوں امتحانوں میں درجہ اوّل میں

کامیاب ہوئے۔ رامپور واپس آکر مدرسۂ عالیہ کی اونچی کلاس میں داخل ہوئے اور اس سے سند فراغ لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چند دنوں ندوۃ العلماء کے سفیر رہے، اس سے بیزار ہوکر مستعفی ہوئے تو تجارت کرنے لگے، ناتجربہ کاری کے باعث اس میں گھاٹا ہوا تو دامن جھاڑ کر اس سے بھی الگ ہوگئے۔ آخر ۱۹۳۲ء میں رامپور کے مشہور زمانہ کتب خانہ جو تقسیم کے بعد سے رضا اسٹیٹ لائبریری کہلاتا ہے اس سے بحیثیت ناظم کے وابستہ ہوئے۔

کتب خانہ کے ساتھ ان کی یہ وابستگی زندگی کے آخری سانس یعنی کم و بیش نصف صدی تک باقی رہی۔ اس مدت میں انھوں نے کتب خانہ کی کیسی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ملازمت سے سبکدوشی کے عام قانون سے مستثنیٰ کرکے گورنمنٹ نے آرڈر دے دیا ہے کہ وہ تاحین حیات اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرشی صاحب کو کتب خانہ کے ساتھ محبت نہیں عشق تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں کتب خانہ کی خدمت کے لیے وقف کررکھی تھیں جس کی وجہ سے آج کتب خانہ مشرق ومغرب کے اربابِ علم وتحقیق کے لیے کعبۂ آمال و امانی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہندوستان کے لیے سرمایۂ افتخار بنا ہوا ہے۔ دوسری طرف کتب خانہ نے عرشی صاحب کو ایسا چمکایا اور جگمگایا کہ ان کا شمار عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ محققین ومبصرین میں ہونے لگا۔ ۱۹۶۵ء میں مرحوم کے اعزاز میں ایک ضخیم کتاب 'نذر عرشی' کے نام سے شائع ہوئی تھی، جس کا اجراء صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کیا تھا۔ اس کتاب میں مرحوم کے خلف الرشید اکبر علی خان صاحب نے نگارشات عرشی کی جو طویل فہرست نقل کی ہے اگرچہ وہ جامع نہیں ہے تاہم اس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا مرحوم نے عربی، فارسی اور اردو کے کیسے اور کتنے نادر مخطوطات کو ایڈٹ کیا اور کتنے اہم موضوعات پر پُرمغز مقالات لکھ کر داد تحقیق دی۔ اس فہرست سے سبھی کو یہ معلوم ہوگا کہ مولانا کی نگارشات کا ایک بڑا اور نہایت اہم حصہ وہ ہے جو اب تک زیورطباعت سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا نے تحقیق وتنقید کا جو بلند معیار قائم کیا ہے وہ اس میدان کے نوجوان رہ نوردوں کے لیے ایک مینارۂ روشنی کا حکم رکھتا ہے۔

مرحوم جس مرتبہ اور پایہ کے عالم وفاضل اور محقق تھے۔ بحیثیت ایک انسان کے بھی اعلیٰ مکارمِ اخلاق وفضائل کے حامل تھے۔ نہایت خندہ جبین، شگفتہ رو، متواضع اور منکسر المزاج، ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور محبت، ان کی فطرت بے لوث و بے غرض، طمع اور ریا سے نفور، اخلاص ووفا کے پیکر! ہمہ شرافت اور مجسمہ وضعداری ومروت، قیامِ کلکتہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ راقم الحروف سخت بیمار ہو گیا۔ جب کچھ صحت ہوئی تو ڈاکٹروں نے کسی پہاڑ پر جانے کا مشورہ دیا۔ میں نے ایک ماہ کی رخصت لی اور نینی تال چلا آیا اور ایک ہوٹل میں مقیم ہوگیا۔ دلّی سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور بھائی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی عیادت کے لیے نینی تال آئے۔ مولانا عرشی ماسکو (روس) گئے ہوئے تھے جس دن اس طویل سفر سے رامپور واپس آگئے اور انھیں میری علالت کا حال معلوم ہوا، اسی روز شام کو روانہ ہوکر نینی تال پہنچ گئے اور تین چار دن ہوٹل میں میرے ساتھ مقیم رہے۔ مولانا کے اس کرم بے غایت کی لذت آج تک دل کی امانت ہے، ایک میں نہیں سب دوستوں کے ساتھ ان کا معاملہ یہی تھا۔

دس بارہ برس سے دل کے بیمار تھے، دومرتبہ شدید دورہ ہو چکا تھا اس لیے رفتار وگفتار اور روزمرہ کے معمولات میں بڑے محتاط ہوگئے تھے، سفر بالکل ترک کردیا تھا لیکن اس عالم میں بھی کتب خانہ کا کام پابندی سے کرتے رہے۔ چنانچہ کتب خانہ کے مخطوطات کی تشریحی فہرست جواب تک متعدد جلدوں میں شائع ہوچکی ہے اس کا ایک بڑا حصہ اسی زمانہ میں مرتب ہوا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ مولانا عرشی کا حادثۂ وفات علم وادب کی دنیا کا ایک عظیم حادثہ ہے جس کی تلافی ایک عرصہ تک نہ ہوسکے گی۔ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے صفِ اوّل کے مسلمان تھے۔ نماز روزہ کے پابند اور شعائر اسلام کا بڑا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وبرد مضجعہ۔ [مارچ ۱۹۸۱ء]

گابا، ایل۔ کے

ایل۔ کے۔ گابا

افسوس ہے کہ ایک دن کے فرق سے یعنی ۲۴ اور ۲۵/ اکتوبر کو بمبئی میں دو ممتاز شخصیتوں مسٹر ایل۔ کے۔ گابا اور پروفیسر اصغر علی فیضی کا انتقال بیاسی برس کی عمر میں ہوگیا۔ اوّل الذکر اصلاً پنجابی ہندو اور لاہور کے نامی گرامی بیرسٹر تھے تقسیم کے بعد ہندوستان آکر بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی ادھر ایک مدت سے گمنام تھے، لیکن ایک زمانہ تھا جب انھوں نے اسلام قبول کیا اور ایک مسلمان خاتون سے شادی کی اور پھر اس کے بعد اسلام کی حمایت میں نہایت پُرزور مضامین لکھے اور جگہ جگہ تقریریں کیں۔ اُس زمانہ میں اُن کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ انگریزی کے بڑے اچھے انشاپرداز تھے۔ اسی زمانہ میں رسوائے زمانہ کتاب

مادر ہند (Mother India) کا انھوں نے دندان شکن جواب لکھا جس کا بڑا چرچا ہوا، آنحضرت ﷺ پر ان کی کتاب (Prophet of The Desert) بھی بہت مشہور ہوئی۔ [نومبر ۱۹۸۱ء]

فیضی، پروفیسر اصغر علی

پروفیسر اصغر علی فیضی

پروفیسر فیضی آکسفورڈ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ان کا اصل مضمون قانون تھا، مشرقی علوم وفنون میں بھی ان کو دسترس تھی۔ اسلامی قانون پر ان کی کتابیں حوالہ کی کتاب (Book of Reference) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عرصہ تک لاء کالج بمبئی کے پرنسپل رہے، انڈیا کے مصر اور شام میں بھی سفیر رہے اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کینیڈا، یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں لکچر دیے۔ برہان کے خریدار شروع سے تھے اور اس کی بڑی قدر کرتے تھے، برہان کا کوئی مقالہ یا نظرات ان کو زیادہ پسند آتا تھا تو اس کی داد تحریراً دیتے تھے۔ عرصہ سے ان کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ بعض خانگی معاملات اور مسلسل ضعف وعلالت کے باعث سخت پریشان تھے۔ اب اچانک اخبارات میں ان کے انتقال کی خبر نظر سے گزری تو دیرینہ تعلق کے باعث سخت صدمہ اور افسوس ہوا۔ اللھم اغفرلھما وارحمھما۔ [نومبر ۱۹۸۱ء]

خان، سر حافظ احمد سعید (نواب آف چھتاری)

نواب آف چھتاری سر حافظ احمد سعید خان

افسوس ہے ۶/ جنوری کی شام کو نواب آف چھتاری سر حافظ احمد سعید خان صاحب نے ۹۴ برس کی عمر میں علی گڑھ میں وفات پائی اور دوسرے دن اپنے آبائی وطن چھتاری میں مدفون ہوئے۔ نواب صاحب تقسیم سے پہلے وائسرائے کی اکزیکٹو کونسل کے ممبر اور یوپی کے گورنر رہ چکے تھے اس لیے ان کا جنازہ ان کی کوٹھی راحت منزل سے یونیورسٹی تک اور یونیورسٹی سے چھتاری تک پورے سرکاری اعزاز واکرام کے ساتھ لے جایا گیا۔ جلوس میں ہر فرقہ و ملت کے ہزاروں سوگواروں کے علاوہ متعدد وزرا اور اتر پردیش کے اعلیٰ افسران حکومت بھی شامل تھے۔ نماز جنازہ جس میں ہزاروں مسلمان شریک ہوئے، علی گڑھ اور چھتاری دونوں جگہ ہوئی۔ جن لوگوں نے سرسید (متوفی ۱۸۹۸ء) کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی باتیں سنی ہیں، نواب صاحب غالباً اس بزم کی آخری شمع تھے، سدا رہے نام اللہ کا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گذشتہ ایک صدی کے اندر برصغیر کے مسلمانوں میں مختلف حیثیتوں سے بڑی بڑی نامور اور قدآور شخصیتیں گزری ہیں جن کے طنطنۂ شہرت وکمال سے اس ملک کے بام و در عرصہ تک گونجتے رہے ہیں اور اب وہ تاریخ کی گود میں آسودۂ سکون ہیں لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ دین اور دنیا کے اعلیٰ صفات وکمالات اور امیری میں درویشی کی جامعیت کے اعتبار سے نواب صاحب کی شخصیت منفرد اور اپنی مثال آپ تھی، چنانچہ ایک طرف دنیوی عزت و وجاہت کے نقطۂ نظر سے انگریزوں کے عہد میں جو عہدہ ومنصب ایک ہندوستانی کی معراج ہوسکتا ہے وہ انہی کو حاصل تھا، وہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر بنے، اتر پردیش کے پہلے مسلمان گورنر مقرر ہوئے، نظام حیدرآباد کے وزیر اعظم یا مدارالمہام برسوں رہے، نظام ٹرسٹ کے رکن منتخب ہوئے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے پرو چانسلر اور پھر چانسلر سالہا سال رہے۔ گورنمنٹ اور پبلک ہر جگہ بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ برطانیہ کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس لندن میں شریک ہوئے، آزادی کے بعد خانہ نشین ہوگئے تھے اور سیاست سے عملاً کوئی تعلق باقی نہ رکھا تھا، پھر بھی دو مرتبہ راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔

اور دوسری طرف دینداری کا یہ عالم تھا کہ نماز، روزہ اور اوراد و وظائف کی سخت پابندی کے علاوہ قرآن مجید سے ان کو عشق تھا۔ آٹھ برس کی عمر میں حافظ ہوگئے تھے اور ہر سال (خواہ کہیں بھی ہوں یہاں تک کہ گورنری کے زمانہ میں گورنمنٹ ہاؤس میں بھی) تراویح میں قرآن مجید بڑی پابندی اور اہتمام سے سناتے تھے۔ چند سال ہوئے ایک مرتبہ انھوں نے خود راقم الحروف سے فرمایا تھا: الحمدللہ! میں نے ۸۱ محرابیں پڑھی ہیں۔ اس کے بعد مرحوم نے دو مرتبہ اور تراویح میں قرآن سنایا ہے، اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے یوں بھی تلاوت کرتے رہتے تھے۔

اخلاق وعادات کے اعتبار سے بالکل صوفی منش اور درویش صفت انسان تھے، ایک رئیس اعظم اور بلند مرتبہ صاحب منصب وعہدہ ہونے کے باوصف نہایت حلیم وبردبار، خندہ جبین وملنسار، نہایت متواضع اور خوش گفتار تھے، امیر ہو یا غریب ہر ایک سے کامل التفات اور توجہ سے گفتگو کرتے تھے، دکھ درد میں ہر ایک کے غمگسار اور شریک رہتے تھے، ارباب حاجت وضرورت کی مدد کرکے انھیں خوشی ہوتی تھی۔ علما اور مشائخ کی صحبت کے جویا رہتے تھے۔ یونیورسٹی سے ان کو محبت نہیں عشق تھا، اس کے ہر فنکشن میں شریک ہوکر اکثر اردو میں اور کبھی کبھی انگریزی

میں دلچسپ اورموثر تقریر کرتے تھے۔ طلبا کے وظائف کے لیے ایک خطیر رقم مقرر تھی جسے ہرسال خرچ کرتے تھے۔ شادی بیاہ،دعوت وضیافت میں کوئی بلائے اسے رد کرنا ان کے حسن اخلاق سے بعید تھا۔

صحت ہمیشہ بہت اچھی رہی،جسم گھٹا ہوا مضبوط اور پھرتیلا تھا، شاید کسی زمانہ میں پہلوانی بھی کی ہو، بہرحال شہسواری ان کا خاندانی اورموروثی ہنر تھا۔ شکار کے اتنے شوقین تھے کہ مرض الوفات میں مبتلا ہونے سے چند ماہ پیشتر تک شکارمیں برابر جاتے رہے۔ اسپورٹس مین ایسے تھے کہ بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کے چیرٔ مین اخیر تک رہے۔

حیات مستعار کے طویل سفر میں بیمار بار ہا پڑے اورکبھی کبھی علالت بہت شدید اورتشویش انگیز ہوبھی گئی مگر علاج معالجہ ہوا صحت یاب ہوگئے، لیکن ابھی چند ماہ پہلے ایسے صاحب فراش ہوگئے کہ پھر نہ اٹھ سکے، کمزوری بڑھتی رہی، غذا اور دوا موقوف ہوگئی، اکثر بیہوشی اوراستغراق کاعالم طاری رہتا تھا۔اس جہان ناپائیدار سے رشتہ منقطع ہورہا تھا اورحیات جادوانی کے چمن لذت وسرور کی عطر بیز ہواؤں کا دریچہ کھل گیا تھا اس لیے اس عالم سکروبے خودی میں زبان برابر ذکرالٰہی کے ورد میں مصروف تھی۔ باربار ہاتھ اٹھاتے اور بڑھاتے تھے گویا کچھ محبوب صورتیں انھیں نظر آرہی ہیں اوروہ ان کی دست بوسی وہم آغوشی کے لیے بے قرار ہیں، چنانچہ غایت درجہ ناطاقتی کی حالت میں ڈاکٹر انجکشن دینے کاارادہ کرتا تو فرماتے: ڈاکٹر! ''اب طاقت کاانجکشن دے کر مجھ کومیرے حبیب کے پاس جانے سے مت روکو'' اہل خانہ پرگریہ طاری ہوگیا تو بڑے صاحبزادے کاہاتھ میں ہاتھ لے کر بولے:''میاں ہم اس دنیا میں مہمان بن کرآئے تھے، ورنہ ہمارااصلی گھر تو دوسری جگہ ہے اورمہمانی ایک دن، دودن حد سے حد تین دن کی اورہم تو پھربھی بہت رہ لیے،بس اب جانے دو۔''

آخر اسی عالم اضطراب وشوق میں عصر اورمغرب کے درمیان کاجھٹ پٹا وقت تھا کہ حیات ناسوتی کا پردہ اٹھا۔ یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك کی صدائے دلنواز حریم قدس سے فردوس گوش ہوئی اورایک روحِ بے قرار وبے تاب وصل حبیب کے دامن میں پناہ لے کرقرار پاگئی۔

رحمه الله رحمة واسعة۔

[فروری۱۹۸۲ء]

<u>ثانی،مولانا محمد</u>

مولانا محمد ثانی

[بھانجہ مولانا سید ابوالحسن علی الندوی]

ہمارے حبیب لبیب اورقرآن کے عبدمنیب مولانا سید ابوالحسن علی الندوی کوگزشتہ دوتین برس میں جوحوادث پیش آئے ایک ضعیف قلب انسانی کی قوت برداشت کاامتحان لینے کے لیے کچھ کم نہ تھے کہ اب گزشتہ فروری میں حقیقی بھانجے مولانا محمد ثانی کی بمرض سگ گزیدگی ۵۶ برس کی عمر میں دردناک موت کا حادثہ فاجعہ پیش آگیا۔انالله وانا الیه راجعون۔

سچ کہا کسی نے جن کے رتبے ہیں سوا اُن کوسوامشکل ہے، لیکن چونکہ مولانا کا گھرانہ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کامصداق ہےاس بناپراس طرح کا حادثہ تنہا مولانا کانہیں بلکہ علم وادب اور دین وشریعت کے عالم کا حادثہ ہوتا ہے، چنانچہ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، مرحوم ندوۃ العلماء اورمظاہرالعلوم سہارنپور دونوں درس گاہوں کےتعلیم یافتہ تھے۔ حدیث کادرس شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی سے لیا تھا اوران کے خلیفۂ مجاز بھی تھے۔تصنیف وتالیف کا ذوق فطری تھا، سوانح نگاری کا خاص سلیقہ رکھتے تھے، چنانچہ مولانا سہارنپوری اور مولانا محمد یوسف کی ضخیم سوانح عمریاں لکھیں اورمقبول خاص وعام ہوئیں۔ مترجم بھی بہت اچھے اورشاعرشیوابیان بھی تھے۔''رضوان'' کے نام سے خواتین کاایک ماہنامہ بھی ایڈٹ کرتے تھے۔عملاً واخلاقاً نہایت زاہد و عابد، بے غرض وبے لوث، خاموش مگر متواضع وخندہ جبین تھے۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اورمولانا علی میاں اوردوسرے اہل خانہ کوصبرجمیل کی توفیق عطا ہو۔آمین

[اپریل۱۹۸۲ء]

<u>دانش،احسان</u>

احسان دانش

قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک اخبار میں اچانک اپنے عزیز اوردیرینہ دوست احسان دانش کے انتقال کی خبرنظر سے گزری توصدمہ ہوا۔ مرحوم ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے، لاہور پہنچ کرمزدوری کی،اسی سے مزدوروں کے شاعر بنے۔ بڑی شہرت اورمقبولیت پائی،تقسیم کے بعد مرجھا سے گئے تاہم اطمینان اورفارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ طبعاً مرنج ومرنجان،متواضع و منکسر المزاج اورعقیدہ وعمل کے اعتبار سے پکے مسلمان تھے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

[اپریل۱۹۸۲ء]

محمد زکریا،مولانا

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ

حوادث اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

واحسرتا! آخر۲۴/مئی کوحضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا بھی ہم سے جداہوکرقرب وجوار خداوندی کے اپنے اس مسکن حقیقی میں پہنچ گئے جہاں جانے کے لیے جیسا کہ آپ کا ہر ندیم وہم نشین محسوس کرسکتا تھا، برسوں سے آپ کی روح پرفتوح مضطرب وبےقرارتھی اور عالم اسلام کو ہرشب چراغ ملّت بیضا سے یکسرمحروم ہوگیا۔اناللہ واناالیہ راجعون۔

گذشتہ سال حضرت شیخ نے رمضان المبارک کا پورامہینہ جنوبی افریقہ کے ایک مقام اسٹرنگر میں گزارا تھا،حسن اتفاق سے اپنے ایک عزیز دوست مسٹر موسیٰ پارک کی نجی دعوت پر راقم الحروف بھی رمضان کے آخری ہفتہ میں ڈربن پہنچا، ڈربن سے اسٹرنگر کا فاصلہ ڈیڑھ سوکلومیٹر ہے جوجنوبی افریقہ کی زندگی میں درحقیقت کوئی فاصلہ ہی نہیں، اس لیے جب تک حضرت کا قیام اسٹرنگر میں رہا تو وہاں اوراس کے بعد جب آپ ڈربن اوراس کے اطراف واکناف میں ایک ایک دودودن کے لیے قیام فرماہوئے توان مقامات پروقتاً وقتاً خدمت سامی میں برابر حاضر ہوتارہا، اس اثنا میں میں نے حضرت کی صحت اورنقل وحرکت سے مجبوری ومعذوری کا جوحال دیکھا اورساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ حضرت کا پروگرام جنوبی افریقہ،مزمبیق اور نیروبی کامکمل دورہ کرنے اوراس کے بعدانگلینڈ جانے کا ہےاورپھر یہ مشاہدہ بھی کیا کہ جہاں کہیں پہنچتے ہیں ہرطبقہ اور ہرگروہ کے ہزاروں بوڑھے اورجوان پروانوں کی طرح آپ پرگرتے ہیں توان سب چیزوں کے پیش نظر معاً خیال ہوا کہ یہ جوکچھ ہورہاہے کسی غیبی حکم اوراشارہ پرہورہاہے اور ساتھ ہی اندیشہ اس بات کا ہوا کہ غالباً اب وہ وقت قریب ہے جب کہ یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ صدائے غیب حضرت کے سامعہ نواز ہوگی، بعد میں یہ خیال اوراندیشہ دونوں صحیح ثابت ہوئے، کل جو اندیشہ تھا، ابھی پورا ایک برس بھی نہ ہواتھا کہ آج ایک حقیقت بن کرسامنے آیااور لاکھوں مسلمانوں کوتڑپا گیا، رہا خیال!تواب اس کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ ایک دن باتوں باتوں میں میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: ''عجیب شان ہے جب تک میرے جسم میں طاقت اور اعضا میں توانائی رہی تو میری دنیا سہارنپور سے دلّی تک محدود رہی،لیکن اب جب کہ میں ضعیف وناتواں ہوگیاہوں اورنقل وحرکت کے قابل بھی نہیں رہا تو مجھے ملکوں ملکوں لیے پھررہے ہیں۔''

اس زمانے میں گمراہی کے سب سے بڑے سرچشمے دوہی ہیں ایک افراطِ زر اور دولت وثروت کی بہتات اوردوسری تہذیبِ فرنگ، یہی دوچیزیں ہیں جنھوں نے اسلامی اقدارِ حیات کونہایت مضمحل اور کمزور کردیاہے اورمسلمان اقوام وممالک بھی بحیثیت مجموعی شعوری یالاشعوری طورپراس سیلاب بلا میں بہتے جارہے ہیں، پہلے فتنہ کا منبع سعودی عربیہ اورمشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک اور دوسری قسم کے فتنہ کا سرچشمہ انگلستان ہے، پھران فتنوں سے مسلمانوں کومحفوظ رکھنے کا اصولی اور بنیادی ذریعہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ اوراس کے رسول کا حقیقی عشق اور یوم حساب کا خوف پیدا کیاجائے تاکہ وہ حبّ دنیا،حب جاہ اور نفس پروری کے شکنجوں سے آزاد ہوکر ایمان کامل اورعمل صالح کی دولت سے مالامال ہوسکیں۔اسلام کے مبلغ کا پہلااور بنیادی کام یہی ہے، اسلامی کیریکٹر کی یہی وہ خشت اوّل ہےجس پراسلامی تعلیمات کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے، چنانچہ مکہ کی تیرہ برس کی زندگی میں خودآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی پر اپنی توجہ مبذول رکھی ہے اورقرآن مجید کی مکی سورتوں میں یہی ایک مضمون باربار مختلف اسالیبِ بیان میں کمال بلاغت وفصاحت اورانتہائی جوش و زورِخطابت کےساتھ کہا گیاہے۔

حضرت شیخ الحدیث کا ترک وطن کرکے مدینہ طیبہ میں قیام پذیر ہونا اور تھوڑے وقفہ سے انگلینڈ کا دومرتبہ سفرکرنا اورساتھ ہی جنوبی افریقہ اوردوسرے ملکوں کواپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کرنا! ہمارے نزدیک یہ سب کچھ محض ایک اتفاقی واقعہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت قدرت کے نظام ربوبیت اور اس کے دستورارشاد وہدایت کاایک جز تھا۔ چنانچہ سب کومعلوم ہے کہ ان اسفاراورمدینہ طیبہ میں مستقل قیام سے لےکرملت اسلامیہ کوکس درجہ اہم دینی فوائد پہنچے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے جوعظیم الشان کارنامے ہیں وہ بھی حضرت شیخ الحدیث کی توجہ اورفیض باطنی کے مرہون منت ہیں۔اس سے انکارنہیں کیاجاسکتا کہ عالم اسلام سے قطع نظر! اگرآج امریکہ،یورپ ،افریقہ اورجاپان میں اسلام کاغلغلہ بلند ہو رہاہے اورلاکھوں انسانوں کے دل ایمان محکم اورعمل صالح وپیہم کے نور سے

روشن ہورہے ہیں تو دوسری طرف فعال اورمتحرک جماعتوں کے ساتھ اس میں حضرت شیخ الحدیث کے فیوض روحانی وباطنی کا بھی بڑااورگراں قدر حصّہ ہے۔ آپ کی دعوت کیاتھی؟اس کا خلاصہ آپ کے مرتبہ ''تبلیغی نصاب'' میں آگیا ہے جس کولاکھوں مسلمان روزانہ پڑھتے پڑھاتے یاسنتے ہیں۔

تبلیغی اوراصلاحی فیوض وبرکات کے علاوہ آپ کے علمی کارنامے بھی بہت شاندار ہیں، اگرچہ مدارس عربیہ کے تمام علوم وفنون متداولہ میں استعداد اعلیٰ اور پختہ تھی، لیکن علم حدیث سے عشق تھا، ایک مدت تک حدیث کادرس اس طرح دیا کہ شہرت دوردور پہنچی۔ درس کے علاوہ بذل المجهود فی شرح ابی داؤد کی تالیف میں اپنے پیرومرشد اوراستاذ حضرت خلیل احمد صاحب سہارنپوری کے شریک اورمعاون رہے، پھرخود موطا امام مالک اورصحیح بخاری کی شرح متعدد ضخیم مجلدات میں لکھی، اگرچہ جرح وتعدیل کے باب میں آپ زیادہ سخت نہیں ہیں، لیکن ان شروح کی خصوصیت روایات اوران کے استیعاب واستقصا ہے، جس کی وجہ سے حدیث کاایک طالب علم دوسری کتابوں کی ورق گرانی سے بے نیاز ہوجاتاہے، پھرعربی زبان اس درجہ شستہ اورشگفتہ ہے کہ پڑھتے جایئے اور جھومتے جایئے۔ اردو میں بھی چند کتابیں جومفید اورقابل مطالعہ ہیں ان میں آپ بیتی، جوتین جلدوں میں ہے سب سے اہم کتاب ہے، اس کے مطالعہ سے جہاں بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں، تہذیب نفس وتجلیۂ اخلاق کا سامان بھی ہوتاہے۔

حضرت مرحوم سے پہلی ملاقات دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے زمانہ میں ہوئی۔ایک مرتبہ میں اورمفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سہارنپور گئے تو حضرت سے ملاقات کے غرض سے اُن کے مکان پربھی حاضر ہوئے، مفتی صاحب اورشیخ الحدیث میں دوستی اوربے تکلفی تھی، صبح کاوقت تھا، شیخ الحدیث بڑے تپاک سے ملے، تھوڑی دیر کے بعد چائے آگئی۔ مگر یہ صرف چائے تھی، وہ حضرت نے ہمارے سامنے رکھ دی ہم نے چائے بنا کرابھی دوگھونٹ لیے ہوں گے ایک شخص ایک خوان لیے ہوئے آیا، حضرت بہت خوش ہوئے اوروہ خوان جس میں انڈے، توس اورمکھن وغیرہ تھے ہمارے سامنے رکھ کربولے یہ لیجیے آپ کی قسمت سے پوراناشتہ آگیا، پھرفرمایا جوچیز جس کی قسمت میں لکھی ہے وہ اس کو ضرور ملے گی خواہ عنوان کچھ بھی ہومثلاً اگرکسی کی قسمت میں موٹر کی سواری لکھی ہے تووہ موٹر میں ضرور بیٹھے گا چاہے ڈرائیور کی حیثیت سے ہی ہو۔ یہ زمانہ حضرت کے عہدشباب کاتھا، دوہرابدن، درازقامت، نہایت سرخ وسفید، توندنکلی ہوئی، عینک سربینی پر، دوپلیاٹوپی سرپر، ایک لانبا کرتہ اورتہمد بدن پر، آنکھوں اورچہرہ بشری سے ذہانت برستی ہوئی، گفتگو میں بڑی روانی اور، مزاح اورخندہ بھی ساتھ ساتھ، بس یہ تھے اس وقت شیخ الحدیث۔ درس دیتے تھے مگرتنخواہ کبھی نہ لی، ایک ان کے والد کا کتب خانہ تھااسی پرگذربسرتھی۔

اس کے بعد دہلی، علی گڑھ اورسہارنپور میں بارہا خدمت سامی میں حاضری کا شرف حاصل ہوااورو امابنعمة ربك فحدث کی تعمیل میں عرض کرتاہوں کہ ہرمرتبہ جب میں حاضر ہواحضرت نے میرے ساتھ خصوصی شفقت ومحبت کاوہ معاملہ کیاجو میں نے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔معمول یہ تھا کہ حضرت مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں اورمیں وہیں پہنچ گیا تواگرفرش پرگاؤتکیہ سے لگے تشریف فرما ہیں تو فوراً مجھ کواپنے قریب بلایا اورپھرمیرا ہاتھ پکڑکراپنے پاس اوراگرمسہری پر ہوئے تو مسہری پربیٹھالیا۔جنوبی افریقہ میں بھی حضرت نے یہی معاملہ کیا مجھے شرم آتی اورکبھی عرض کرتا کہ حضرت بڑے بڑے علماء، مفتی اورمشائخ آپ کی مسہری کے اردگرد نیچےفرش پربیٹھے ہوئے ہیں، مجھے برالگتاہے، اجازت دیجیے کہ نیچے ہی بیٹھ جاؤں مگرحضرت میراہاتھ پکڑکراصرارفرماتے کہ نہیں آپ کا مقام یہی ہے آپ یہیں میرے پاس بیٹھیے، پھرگفتگونہایت شفقت اوربے تکلفی سے فرماتے جس کوسب سنتے تھے، اسی درمیان میں کوئی بات رازفرمانی ہوتی تومجھ کو اورقریب بلاکرچپکے چپکے کان میں فرماتے، ادھریہ گفتگو ہوتی اورساتھ ہی انواع و اقسام کی لذیذچیزیں فرمائش کرکے طلب کرتے اورباصرار مجھے کھلاتے رہتے اللہ اکبر! اک فاسق وفاجراورایسی کراماتیں۔

کئی برس کی بات ہے حضرت بستی نظام الدین اولیاءنئی دہلی میں قیام پذیر تھے۔عصر کے بعد کاوقت تھا، میں حاضرہوا۔آپ اس وقت فرش پرگاؤتکیہ کے سہارے تشریف فرما تھےاورایک بڑا مجمع سامنے تھا۔میں مجمع کے قریب پہنچا اورحضرت کی نگاہ مجھ پرپڑی تو فوراً اپنے خدام کوآپ نے اشارہ کیااوران خدام نے بڑی پھرتی سے آپ کواٹھاکر پیچھے والے کمرہ میں ایک مسہری پرگاؤتکیہ سے لگاکربیٹھادیا۔اب حضرت نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھالیا، یہاں تنہائی تھی، موقع پاکر میں نے عرض کیا:''حضرت! میراجی آپ سے بیعت کرنے کو چاہتاہےلیکن بیعت کامقصد حاصل کرنے کے لیے جوفراغت اوریکسوئی درکار ہے وہ مجھے حاصل نہیں ہے اورکوئی بھی کام محض رسماً کبھی بھی نہیں کرتا'' فوراً ارشاد ہوا: ''میں آپ کوخوب جانتا ہوں آپ کو بیعت ہونے کی ضرورت ہرگزنہیں ہے، البتہ اپنے شب وروز کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف آدھ گھنٹہ مجھ کو دے

دیجیے۔'' میں نے اقرار کرلیا اور حضرت نے چند معمولات بتادیئے میں نے انھیں گرہ میں باندھ لیا، پھر کیا ہوا؟ وہ کسی سے کہنے کی بات نہیں ہے۔

ایک مرتبہ آنکھ بنوانے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لائے، عصر کے بعد میں حاضر ہوا، حضرت فرش پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور لوگوں کا ہجوم تھا، مجھ کو حسب معمول اپنے قریب قالین پر بیٹھالیا اب گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر نے آنکھ کا معائنہ کیا؟ فرمایا: جی ہاں! معائنہ کیا اور کہتا ہے کہ آنکھ آپریشن کے لیے بالکل تیار ہے پرسوں آپریشن ہوجائے گا۔'' اس کے بعد فرمایا: ''مگر ایک اشکال پیدا ہوگیا ہے۔'' عرض کیا: ''وہ کیا ہے؟'' ارشاد ہوا: ''مولانا محمد منظور نعمانی کا خط آیا ہے اور اس پر علی میاں کی تصدیق بھی ہے کہ یہ ستمبر کا مہینہ آپریشن کے لیے ناموزوں ہے، آپ نومبر یا دسمبر میں کرائیں۔'' یہ کہہ کر آپ نے خط منگوایا اور پڑھوا کر سنایا'' اس وقت حاضرین سب خاموش تھے۔ آخر میں نے ہی جرأت کی اور عرض کیا: حضرت! یہ بتایئے کہ آپ مریض ڈاکٹر شکلا (ماہر امراض چشم) کے ہیں یا مولانا نعمانی اور علی میاں کے؟ ارشاد ہوا: ڈاکٹر شکلا کا۔ میں نے گذارش کی: تو پھر آپ جس کے مریض ہیں بات اسی کی ماننی چاہیے، میرے یہ کہنے پر حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا: سبحان اللہ! کیا حکیمانہ بات کہی ہے کہ آپ جس کے مریض ہیں اسی کی بات ماننی چاہیے۔ حضرت پر میرے اس قول کا اتنا اثر ہوا کہ دوسرے دن نماز عصر کے بعد لوگوں کو خطاب کیا تو اس میں پھر میرا یہ قول دہرایا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق دو تین دن کے بعد آنکھ کا آپریشن ہوا اور خدا کے فضل وکرم سے بہمہ وجوہ کامیاب رہا۔

باخبر اصحاب کو معلوم ہے حضرت نے ایک رسالہ'' فتنۂ مودودیت'' کے نام سے تحریر فرمایا تھا، آپ نے ایک نسخہ میرے پاس بھی بھجوایا اور برہان میں تبصرہ کی خواہش فرمائی۔ حضرت کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی جس کی تعمیل ضروری تھی، لیکن دوسری طرف ارشاد نبوی: المستشار موتمن کا تقاضا تھا کہ جو بات میں حق سمجھتا تھا اس کا برملا اظہار کروں، چنانچہ میں نے تبصرہ لکھا اور حضرت کی رائے سے اختلاف کا اظہار کیا، حضرت نے میرا موقف تسلیم کیا یا نہیں؟ اس کا علم تو نہ ہوسکا، البتہ مدینہ طیبہ سے آپ نے ایک مکتوب گرامی میں میری جرأت اظہار رائے کی داد دی اور دعائیں لکھیں۔ اس کے بعد بارہا خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر کیا مجال کہ حضرت کی غیر معمولی شفقت میں، میں نے کوئی ادنیٰ سا تغیر بھی محسوس کیا ہو۔ اس سے بہت پہلے جماعت اسلامی ہی کے بارے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بھی مجھ کو اختلاف ہوا تھا اور آپ کا بھی معاملہ یہی رہا بلکہ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا کے ایک مرید نے میرے خلاف ایک سخت مضمون لکھا مولانا کو اس کا علم ہوا تو مضمون نگار پر سخت خفا ہوئے اور مضمون تلف کرا دیا۔ عبرت کا مقام ہے، ایک یہ بزرگان دین تھے جو اپنے نیازمندوں کے اختلاف رائے کو کس عالی حوصلگی اور فراخدلی سے انگیز کرتے تھے اور ایک آج کل کے حضرات ہیں کہ آپ نے ذرا ان سے اختلاف کیا اور آپ ان کے دشمن قرار دے دیے گئے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دور میں حضرت شیخ الحدیث کی ذات گرامی آیة من آیات اللہ اور ایک حجت ربانی تھی۔ جتنا باطنی وروحانی فیض اس زمانہ میں آپ سے پہنچا کسی سے نہیں پہنچا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی طرح عجیب دلآویز ودلکش شخصیت تھے۔ دکھ اور درد کے مارے لوگ آتے اور آپ کو دیکھتے ہی سارے غم بھول جاتے اور تسلی وتشفی پاتے تھے، آپ پر نظر پڑتے ہی خدا یاد آتا اور عشق ومحبت نبوی کی لہریں دل میں دوڑنے لگتی تھیں۔

اہل دنیا کے لیے ایک مومن کامل اور عارف باللہ کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ شاہی میں فقیری کرتا ہے اور فقیری میں شاہی، حضرت کی زندگی اس کی بہترین مثال تھی، آپ کا وجود سرتاسر خیر وبرکت اور بے شبہ ایک موہبت الٰہی تھا۔ اب دنیا اس سے محروم ہوگئی، یہ عالم اسلام کا بڑا المیہ ہے۔ تدفین جنت البقیع میں ہوئی، جہاں اکابر صحابہ آسودۂ خاک ہیں۔

الارواح جنود مجندہ کے ارشاد گرامی کے مطابق عالم ارواح میں تو ہم جنس روحوں میں ربط واتصال ہوتا ہی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ عالم آب وگل میں اگر جسمانی اتصال نہیں ہوسکتا تو بعد وفات کم از کم مٹی سے مٹی مل جاتی ہے اور اسی لیے کسی شاعر نے کہا ہے۔ ع پہنچی وہیں پہ خاک کہ جس کا خمیر تھی

رحمہ اللہ رحمة واسعة۔ [جون ۱۹۸۲ء]

راشدی، پیر سید حسام الدین

پیر سید حسام الدین راشدی

افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ اپریل میں ہمارے دو عزیز ومحترم دوست اور برصغیر کے نامور محقق اور عالم پیر حسام الدین راشدی اور مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اوّل الذکر کا انتقال لندن میں ہوا جہاں وہ کینسر کا آپریشن اور ساتھ ہی دل کی بیماری کا علاج کرانے کی غرض

سے مقیم تھے اور تدفین سندھ کے ان کے اپنے آبائی وطن کے قبرستان میں ہوئی اور موخرالذکر کا انتقال کراچی میں ہوا اور یہیں تدفین بھی ہوئی۔

پیر صاحب لاڑکانہ کے بہمن نامی ایک قصبہ میں ۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء کو سندھ کے نامی گرامی خاندان راشدیہ میں پیدا ہوئے، علمی ذوق موروثی تھا، دولت وثروت میں بھی یہ خاندان ممتاز تھا۔ ذہانت اور طباعی کا جوہر خداداد رکھتے تھے اس لیے از خود تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور فارسی اردو اور سندھی زبان وادب کے نامور ادیب، محقق اور مصنف بنے، عربی اور انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ذاتی کتب خانہ جو اباً عن جدٍ اِ تک پہنچتا تھا مطبوعات کی کثرت کے ساتھ نوادر مخطوطات پر مشتمل پہلے سے تھا ہی، مرحوم نے اپنی ذاتی کاوش اور تلاش وجستجو سے اس پر جو نہایت وقیع اضافہ کیا اس کی وجہ سے آج تک یہ کتاب خانہ کراچی کے کتب خانوں میں ایک خاص مرتبہ ومقام رکھتا ہے۔ پیر صاحب عمر بھر مجرد رہے، ان کا شب و روز کا مشغلہ مطالعہ، تحقیق وتصنیف اور احباب سے ملاقات کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر انشاء اللہ برہان میں عنقریب ایک مقالہ شائع ہوگا ان سطور سے مقصد صرف رسم تعزیت ادا کرنا ہے۔

کراچی اربابِ علم وادب اور اصحاب دانش وہنر کی کثرت کے باعث آج کل برصغیر کا قرطبہ وبغداد بنا ہوا ہے لیکن ایک پیر سید حسام الدین راشدی اور دوسرے مشفق خواجہ، اس مجمع علم وفضل میں دونوں کا مرتبہ ووقار ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی ایک بزرگ خاندان کا ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ اور ان کے خاندان سے راقم الحروف کا تعلق بہت دیرینہ اور عزیزانہ ہے۔ گزشتہ سال مارچ ۱۹۸۱ء کی ۱۶/ تاریخ کو جب میں اسلام آباد اور لاہور سے فارغ ہوکر کراچی پہنچا اور خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو ۲۱/ مارچ کو انھوں نے ایک نہایت مکلّف اور عظیم الشان ڈنر دیا۔ جس میں کراچی کے مشاہیر علم وادب کا بڑا اچھا مجمع تھا اور انڈیا کے مندوبین میں سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بھی شریک تھے۔ پیر سید حسام الدین راشدی سے اس اجتماع میں ملاقات ہوئی تو غیر معمولی التفات وتوجہ اور بڑی بے تکلفی اور محبت سے ملے، مجھ کو یاد نہیں تھا کہ اس سے پہلے ملاقات کب اور کہاں ہوئی ہے، لیکن انھوں نے یاد دلایا کہ میری اور ان کی پہلی ملاقات ۱۹۶۹ء میں کراچی میں لیفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کی کوٹھی پر ایک ڈنر میں ہوئی تھی اس کے علاوہ اور بہت باتیں ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مختصر صحبت میں پیر صاحب نے اپنے حسن واخلاق کا گرویدہ بنا لیا، چنانچہ ۲۰/ ستمبر کو جنوبی افریقہ سے واپسی میں پھر دوبارہ کراچی پہنچا تو ایک دن فون پر گفتگو کے بعد مکان پر حاضر ہوا، بڑے تپاک سے ملے، پھر ایک دن ڈنر پر مدعو کیا۔ میں نے ہر چند معذرت کی مگر کسی طرح راضی نہ ہوئے، آخر ۲۸/ ستمبر کو شب سوا آٹھ بجے ان کے ہاں نہایت متنوع اور مکلّف ڈنر ہوا۔ جس میں کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ، علمی اور ادبی اداروں کے ذمہ دار حضرات اور نامور ارباب قلم مدعو تھے، خواتین میں چند ایرانی خواتین بھی تھیں۔ یہ شاندار ضیافت اور اس کا اس درجہ اہتمام! یہ سب کچھ تو رہا ایک طرف! سب سے زیادہ میں جس چیز سے متاثر ہوا وہ یہ تھی کہ پیر حسام الدین راشدی دل اور کینسر، ان دونوں جان لیوا بیماریوں کے پرانے بیمار تھے، دل کا شدید دورہ دو مرتبہ پڑ چکا تھا اور کینسر کا حال یہ تھا کہ اس کے پانچ آپریشن کراچی میں اور چھٹا آپریشن ماسکو میں ہو چکے تھے اور اب ساتواں آپریشن لندن میں ہونے والا تھا، اس کی تیاری ہو رہی تھی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص اس قسم کا بیمار ہو اس کا کیا حال ہونا چاہیے لیکن یقین کیجیے پیر صاحب تین ساڑھے تین گھنٹے مسلسل ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے گفتگو اپنے خاص انداز میں کرتے رہے، کھانے میں شریک ہوئے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے رہے، اس وقت انھیں دیکھ کر ایک ناواقف آدمی اس کا وہم بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ بیمار بھی ہیں، لیکن میں تو اس سے واقف تھا ہی، اس لیے تقریب کے ختم پر جب میں ان سے رخصت ہوا تو بڑی محبت اور گرم جوشی سے بغلگیر ہوکر بولے: ''بس غالباً یہ ہماری آخری ملاقات ہے''، میرا دل بھر آیا اور آبدیدہ ہوگیا، تاہم ان کو تسلی دی اور بیساختہ ان کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ پیر سید حسام الدین چلے گئے، لیکن اپنے غیر معمولی اخلاق، شرافت اور محبت وہمدردی کے جو گہرے نقوش دلوں پر چھوڑ گئے ہیں وہ ہمیشہ ان کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔ [جولائی ۱۹۸۲ء]

ضروری تصحیح: برہان بابت ماہ جون [جولائی] کے نظرات میں پیر سید حسام الدین راشدی مرحوم پر جو تعزیتی شذرہ شائع ہوا تھا اسے پڑھ کر لاہور سے عزیزم میاں محمد اسلم سلمہ لکھتے ہیں:

''آپ سے تعزیت کے مضمون میں چند سہو ہوگئے ہیں:

۱۔ پیر سید حسام الدین راشدی مرحوم کا انتقال لندن نہیں کراچی میں ہوا۔

۲۔ مرحوم کی تدفین ٹھٹھہ میں کوہ مکلی پر مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کے احاطۂ مزار میں ہوئی۔

۳۔ مرحوم شادی شدہ تھے، اگرچہ لاولد تھے، ان کی اہلیہ اب تک بقید حیات

ہیں۔‘‘

ازراہِ کرم ناظرین تصحیح فرمالیں ___ ایڈیٹر [ستمبر۱۹۸۲ء]

پھلواروی، مولانا محمد جعفر شاہ

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مولانا محمد جعفر شاہ، پھلواروی شریف (بہار) کے ایک نامی گرامی خانوادۂ علم وتصوف کے چشم وچراغ تھے، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی، فراغت کے بعد ادھر اُدھر رہے۔ آخر پاکستان گورنمنٹ کی سرپرستی میں لاہور میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ قائم ہوا تو مولانا اس سے ایسے وابستہ ہوئے کہ عمر وہیں گزار دی۔ اس دور میں انھوں نے ’’المعارف‘‘ میں مقالات لکھے اور متعدد اہم اور فکرانگیز کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کی کتاب ’’اسلام اور موسیقی‘‘ اور مسائل اجتہادیہ پر بعض حلقوں میں کافی شورش ہوئی لیکن مرحوم کے موقف میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ان کی علمی استعداد پختہ تھی، مطالعہ وسیع تھا، طبیعت غور وفکر کی عادی تھی اور ان کا جوہر ذہانت وطباعی خداداد اور فطری تھا۔ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۶ء میں ان سے لاہور میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں، جب کبھی ملے تو بڑے تپاک اور محبت سے ملے، ایک مرتبہ گھر پر مدعو بھی کیا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ مرحوم اپنی تحریروں کے آئینہ میں جس قدر آزاد خیال نظر آتے ہیں، عقیدہ وعمل اور اخلاق وشمائل کے اعتبار سے اسی درجہ کے پکے اور سچے مسلمان اور عالم باعمل تھے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ لاہور سے کراچی میں سکونت پذیر اور گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ اللھم اغفرلھما وارحمھما [جولائی ۱۹۸۲ء]

عبداللہ، شیخ محمد

شیخ محمد عبداللہ

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ ستمبر کی ۸/ تاریخ کو شیخ محمد عبداللہ، وزیر اعلیٰ ریاست جموں وکشمیر کا انتقال ۷۷ برس کی عمر میں ہوگیا۔ ان کی وفات سے ریاست کی نہایت پیچیدہ سیاسیات میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ شیخ صاحب کی شخصیت کتنی قدآور اور کس درجہ بھاری بھرکم تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں جب کہ وہ ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے ان کو سینٹرل گورنمنٹ نے اس عہدہ سے برخاست ہی نہیں کیا، بلکہ فوج اور پولیس کی عظیم جمعیت کے زیر سایہ انہیں گرفتار بھی کرلیا۔ اس کے بعد مجموعی طور پر کم وبیش اٹھارہ سال شیخ صاحب نے نظر بندی اور اسارت میں بسر کیے۔ اس سلسلہ میں ان پر سازش کا مقدمہ بھی چلایا گیا اور قسم قسم کے الزامات لگائے گئے جو بے بنیاد ثابت ہوئے، لیکن شیخ کی نظر بندی قائم رہی۔ شیخ کھلے دماغ اور صاف ذہن کے آدمی تھے، وہ کٹر کشمیری تھے، جو کچھ سوچتے، خالص کشمیر اور اہل کشمیر کے مفاد میں سوچتے اور پھر جو فیصلہ کرلیتے اس پر مضبوطی سے قائم رہتے، کسی قسم کا خوف یا کوئی لالچ اس فیصلہ سے ان کو منحرف نہیں کرسکتا تھا۔ انھوں نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ بھی کسی دباؤ میں نہیں کیا تھا لیکن ساتھ ہی ان کا نظریہ یہ تھا کہ دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں کشمیر کے لیے دستوری طور پر چند خصوصی رعایتوں کا حاصل ہونا ضروری ہے نیز یہ کہ کشمیر کا مسئلہ برصغیر کی دو حکومتوں کے درمیان جو بس کی گانٹھ بنا ہوا ہے اس صورت حال کو دوستانہ طریقہ پر ختم ہونا چاہیے کیونکہ جب تک یہ صورت حال قائم رہے گی ریاست جموں وکشمیر کو امن واطمینان کے ساتھ ترقی کرنے، پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملے گا اور کشمیریوں میں بُعد وافتراق کی دیوار سدِّ سکندری بن کر ایسی حائل رہے گی کہ رشتہ داریاں ختم ہوجائیں گی۔

شیخ کی معزولی اور اسارت کے بعد ریاست میں حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں، سینٹرل گورنمنٹ نے ریاست کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا مگر کشمیر میں استحکام نہ پیدا ہونا تھا اور نہ ہوا، آخر کار اندرا گاندھی گورنمنٹ نے سابقہ حکومتوں کے بالمقابل حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور شیخ کو ۱۹۷۳ء میں پھر ریاست کا وزیر اعظم بنادیا گیا۔ اب شیخ صاحب دوبارہ وزیر اعظم ہوئے تو اپنی اسی پرانی آن بان اور انفرادی شان کے ساتھ ہوئے، نیشنل کانفرنس جس کے وہ خود بانی تھے ان کی سب سے بڑی قوت بازو تھی، اس کی مدد سے انھوں نے جنتا گورنمنٹ کے زمانہ میں جنتا پارٹی کو اور اس کے بعد کانگریس (آئی) کو شکست فاش دی۔ شیخ صاحب کو جو بات کشمیر اور اہل کشمیر کے لیے مفید نظر آتی تھی اس کے کرڈالنے میں انہیں کوئی باک نہیں ہوتا تھا اور اگر مرکز کو اس سے اختلاف ہوتا تو شیخ صاحب اس کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی زندگی کا آخری کارنامہ کشمیریوں کی دوبارہ آبادکاری بھی ہے جو انھوں نے ریاستی اسمبلی میں منظور کرایا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مرکز میں شیخ صاحب کا وقار اور ان کا ادب اور لحاظ اس درجہ کا تھا کہ شیخ صاحب پر جب دل کا آخری اور جان لیوا دورہ پڑا تو وزیر اعظم خود فوراً اُن کی عیادت کو سری نگر پہنچیں اور چند روز کے بعد انتقال ہوگیا تو صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور سیاسی پارٹیوں کے رہنما بھی سب جنازہ کے جلوس میں شریک ہوئے۔ مرحوم کو عوام میں

کس درجہ مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل تھی؟اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انگریزی اخبارات کی رپورٹ کے مطابق پانچ ملین یعنی پچاس لاکھ انسانوں پر یہ جلوس مشتمل تھا۔جس کی وجہ سے رہائش گاہ سے قبرستان تک ۱۲کلومیٹر کا راستہ ۱۰ گھنٹوں میں طے ہوا۔اور اس جلوس میں کتنے ہی لوگ تھے جو زاروقطار رو رہے تھے اور کتنے ہی وہ تھے جو بے ہوش ہوگئے تھے۔اب فرمایئے کسی شخصیت کے قدآور اور بھاری بھرکم ہونے کا ثبوت اور اس سے زیادہ کیا ہوگا۔

ڈوگرہ راج میں اہل کشمیر جس قعرِ مذلت وپستی اور جحیم غلامی وبندگی میں پڑے ہوئے تھے۔علامہ اقبال کے یہ دوشعر اس کے آئینہ دار ہیں:

کشمیری کہ بابندگی خوگرفتہ بتے می تراشد زسنگ مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او نصیب تنش جامۂ تار تارے

شیخ صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے کمال اخلاص اور قوت وعزم کے ساتھ اس کے خلاف آواز اٹھائی،اس جرم کی پاداش میں کم وبیش دس برس وہ قید وبند کی زندگی گزار چکے تھے، پھر اٹھارہ برس وہ آزادی کے بعد کشمیر کے لیے حکومتِ ہند کی اسارت میں رہے۔گو اپنی پوری زندگی کا بہترین اور کارآمد زمانہ انھوں نے قید وبند میں گزار دیا۔علاوہ ازیں شیخ صاحب نماز و روزہ اوراد وظائف کے بھی بڑے پابند تھے۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد پابندی سے تقریر کرتے تھے، یہ تقریر اصلاً مذہبی ہوتی تھی مگر ضمناً سیاسی مسائل بھی زیر گفتگو آجاتے تھے۔ تقریر میں قرآن مجید کی آیات خوش الحانی سے پڑھتے اور سیرت طیبہ کے واقعات بڑے جوش وخروش سے بیان کرتے تھے اس بنا پر کشمیر میں ان کی حیثیت صرف ایک سیاسی لیڈر کی نہیں بلکہ ایک مذہبی رہنما ہی نہیں، پیر ومرشد کی بھی تھی۔ان دونوں حیثیتوں کے بیک وقت اجتماع نے ہی ان کو کشمیر میں اس درجہ ہردلعزیز اور محبوب بنا دیا تھا۔اگرچہ وہ تمام تر کشمیر کے لیے وقف تھے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور مذہبی مسائل سے برابر دلچسپی لیتے رہے اور اُن کے اجتماعات میں شریک ہوکر تقریر کرتے تھے، مجلس مشاورت کے تو باقاعدہ اور اہم رکن تھے۔شیخ صاحب نے کشمیر میں سیکولرزم کی جو کامیاب مثال قائم کی تھی وہ مرکز کے لیے حددرجہ عبرت آموز اور سبق آموز ہونی چاہیے جس کی حکومت میں آزادی کے ۳۳ برس بعد آج بھی فرقہ وارانہ فسادات اسی انداز کے ہوتے ہیں جیسے پہلے ہوتے تھے، ان کو روکنے کے لیے گورنمنٹ نے کیا کیا،اسکیمیں بنائیں،مگر ہنوز روزاوّل کا معاملہ ہے۔

ہر بڑے انسان میں کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں ورنہ وہ بشر ہی کیوں کہلائے۔شیخ صاحب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے، تاہم اپنی خوبیوں، اوصاف وکمالات اور ذاتی اخلاق وشمائل کے اعتبار سے وہ پرانی نسل کے جواب چراغ سحری ہے، ایک بہترین نمونہ تھے، آئندہ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ [اکتوبر۱۹۸۲ء]

فاروقی،مولانا محمد کفیل

مولانا محمد کفیل فاروقی

دنیا میں کتنے ہی ارباب علم وفضل اور اصحاب مجد وکمال ہیں جو اپنے وقت کے جید عالم ہوتے ہیں اور بڑے لگن اور خلوص کے ساتھ شب و روز درس و تدریس، مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے ہیں لیکن شہرت ونام ونمود کی دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے باعث ان کے کمالات کا علم صرف ان چند لوگوں کو ہوتا ہے جو اُن کے حلقۂ احباب یا حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ کس پایہ کے عالم وفاضل تھے ان کا مطالعہ کتنا وسیع تھا اور علمی وفنی مباحث ومسائل میں ان کی دقت نظر کا کیا عالم تھا۔

اسی قسم کے ''چھپے ہوئے رستم'' لوگوں میں سے راقم الحروف کے نہایت عزیز دوست اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے زمانے کے رفیق کار مولانا محمد کفیل فاروقی تھے جو کم وبیش ۷۷ برس کی عمر میں ایک طویل علالت کے بعد اپنے وطن حبیب والہ بجنور (یوپی) میں گذشتہ اگست کی ۱۸/ تاریخ کو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم اپنے وطن کے ایک خوشحال اور زمیندار گھرانہ کے چشم وچراغ تھے۔ان کے والد منشی محمد عبداللہ وکالت کا پیشہ کرتے تھے اور اس میں کامیاب تھے۔مگر تھے نہایت متشرع اور دیندار۔ایک دن اچانک خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑی بہت جاگیر وجائیداد کے ذریعہ روزی کا انتظام تو کر ہی رکھا ہے تو پھر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ دکھانے کی شعبدہ بازی کی کیا ضرورت۔ وکالت کا پیشہ ترک کر دیا اور اپنا وقت مطالعہ اور عبادت وخلق خدا کی خدمت میں بسر کرنے لگے۔نہایت متواضع اور مہمان نواز تھے۔

مولانا محمد کفیل فاروقی ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم عربی فارسی کی گھر میں ایک اتالیق کے ذریعہ اور پھر نگینہ کے ایک عربی مدرسہ میں پائی۔اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے۔ الہٰ آباد یونیورسٹی سے عالم فاضل اور کامل کے امتحانات بھی پاس کیے۔تعلیم سے فراغت کے بعد لاہور کے کسی اخبار میں ایڈیٹر ہوگئے۔ڈیڑھ دو برس بعد وطن واپس

آ کر مختلف مدرسوں میں درس وتدریس کا کام کرتے رہے۔اس سلسلہ میں ایک برس دارالعلوم دیوبند میں بھی درس کی خدمت انجام دی۔

۱۹۴۴ء میں درس قرآن کی خدمت پر کلکتہ کی مشہور مسجد کولوٹولہ اسٹریٹ سے وابستہ ہوئے، پھر ۱۹۴۹ء میں تقسیم کے بعد مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا اجرا ہوا تو مرحوم یہاں فقہ اور حدیث کے استاد مقرر ہوئے۔میرے اور ان کے تعلقات کا آغاز یہیں سے ہوا، جولائی ۱۹۶۹ء میں یہاں سے سبکدوش ہوکر وطن چلے آئے۔اُن کا خاندانی کتب خانہ بڑا شاندار اور مطبوعات ومخطوطات پر مشتمل تھا، شب و روز مطالعہ میں مصروف رہنے لگے۔مرحوم خوش تقریر، واعظ شریں بیاں، حد درجہ بذلہ سنج اور خوب گفتار تو تھے ہی ان کی علمی استعداد بھی بڑی پختہ تھی ان کو تفسیر، حدیث، فقہ، شعروادب اور تصوف سب سے یکساں مناسبت تھی۔

عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا۔ایک ضخیم کتاب ''بنگال کے اردو شاعروں کے تذکرہ میں'' انھوں نے بڑی محنت اور تحقیق وتلاش سے مرتب کی تھی جس پر کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر عطاء کریم برق نے مقدمہ اور میں نے پیش لفظ لکھا تھا۔عربی میں ان کی ایک کتاب ''المدلل فی اصول الفقه'' ہے۔فارسی میں ان کی ایک مثنوی ''نغمۂ فردوس'' ہے جو ساڑھے تین سو اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں تصوف کے نہایت قیمتی مضامین اور دقیق مسائل بیان کیے گئے ہیں۔آخر عمر میں ان کو تصوف سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اس سلسلہ میں شیخ اکبر کی فتوحات اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات سب کو ہضم کر گئے تھے۔تصوف پر حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیفات پر بھی اُن کی بڑی اچھی نظر تھی، علی گڑھ اکثر آتے اور میرے پاس گھنٹوں بیٹھتے مگر جب وہ تصوف کے اسرار وغوامض پر بولنا شروع کر دیتے تو جھوم جھوم کر مسلسل تقریر کرتے اور درمیان میں اشعار بھی پڑھتے جاتے تھے۔برہان کے شروع سے خریدار اور اس کے بڑے قدرداں تھے، ایک ایک پرچہ محفوظ کر کے رکھتے تھے۔چنانچہ وفات کے بعد ان کے کتب خانے سے شروع سے اب تک کی برہان کی مکمل جلدیں ملی ہیں۔اور اب میں نے ان کے کتب خانہ کی فہرست دیکھی تو اس میں نوادر مخطوطات کا خاصا ذخیرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ان کی تصنیفات جن کا ذکر ہوا اب تک غیر مطبوعہ ہیں اگر کوئی ادارہ انہیں شائع کرنا چاہے تو مجھے لکھے۔غرض کہ بڑی خوبیوں اور کمالات کے انسان تھے۔مہمان نوازی اور کشادہ دستی انھیں ورثہ میں ملی تھی۔اچھا کھاتے اور اچھا کھلاتے تھے۔

اس میں باپ دادا کی جائداد پر اضافہ تو کیا کرتے تو جو کچھ بھی تھی اسے بیچ باچ کر برابر کر دیا۔پس ماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔دونوں بیٹے مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ایک حبیب والہ میں مطب اور دوسرے علی گڑھ میں کاروبار کر رہے ہیں بیٹیاں دونوں شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھر خوش! رحمه الله رحمة واسعة۔ [س، نومبر ۱۹۸۲ء]

نعمانی، مولانا عبدالحمید

مولانا عبدالحمید نعمانی

افسوس ہے گزشتہ ماہ جنوری کی ۲۰/ تاریخ کو ملک کے بلند پایہ عالم، مشہور صحافی عربی اور اردو دونوں کے ادیب اور خطیب مولانا عبدالحمید نعمانی نے اپنے وطن مالیگاؤں (مہاراشٹر) میں ایک طویل علالت کے بعد وفات پائی۔اناللہ وانا الیه راجعون۔

مولانا ۱۸۸۸ء میں مالیگاؤں کے ایک خوشحال گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے قدیم مدرسہ بیت العلوم میں پائی، اعلیٰ تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں حاصل کی۔فراغت کے بعد بمبئی پہنچے اور روزنامہ 'خلافت' و 'اجمل' وغیرہ اخبارات سے بحیثیت مترجم کے وابستہ ہوگئے۔

عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کا ذوق فطری تھا۔چنانچہ اخبارات کے لیے ترجمہ کرنے کے علاوہ متعدد اہم کتابوں کے بھی ترجمے کئے۔مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب ''عثمان وعلی''، ملک خانم الباحثة البادیہ کے اصلاحی مقالات کا ترجمہ اردو میں کیا اور اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے ''ترجمان القرآن'' کا مقدمہ اور ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب ''ہندوستان میں عربی لٹریچر'' کا ترجمہ عربی زبان میں کر کے شائع کیا۔اس کے علاوہ اردو زبان کے بیسیوں بلند پایہ مقالات کے عربی ترجمہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سہ ماہی مجلّہ ''ثقافة الهند'' میں شائع ہوئے۔انھوں نے عربی زبان سکھانے کے لیے چند ابتدائی کتابیں بھی لکھی تھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

مولانا کو قومی اور ملّی کاموں سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور ذہن تعمیری اور عمل کا جذبہ ولولہ فطری خداداد تھا اس لیے انھوں نے متعدد صنعتی، تعلیمی اور مذہبی ادارے قائم کیے جن سے مسلمان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔لیکن درحقیقت ان کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ مالیگاؤں بلکہ پورے مہاراشٹر کا سب سے نمایاں اور مشہور مدرسہ 'معہد ملت' ہے۔اس مدرسہ کا نصابِ تعلیم اصولاً وہی ہے جو عام طور پر دوسرے مدارس کا ہوتا ہے۔لیکن یہاں علوم عصریہ کا درس بھی ہوتا ہے پھر عربی زبان وادب کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ صرف کی جاتی ہے بڑی بات یہ ہے

کہ تعلیم کے ساتھ طلبا کی تربیت کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے، تمام اساتذہ اور طلبا ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح باہم دگر شیر وشکر بن کر رہتے ہیں، اساتذہ اپنے اپنے فن میں وسعت نظر اور پختہ استعداد رکھنے کے ساتھ نہایت مخلص اور خوش اخلاق وخوب شمائل ہیں اور طلبا محنتی، سعادت مند اور علم کے شوقین ہیں، یہ سب کچھ نتیجہ ہے مولانا مرحوم کے فیضان علم وعمل کا جنھوں نے اپنی زندگی مدرسہ کی ہمہ جہتی خدمات اور اس کو ترقی دینے کی جدوجہد کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کی وفات 'معہد ملت' کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے لیکن مولانا اس کو جن مضبوط بنیادوں پر قائم کر گئے ہیں ان کی وجہ سے امید قوی ہے کہ مدرسہ مولانا کے بعد بھی ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃً واسعۃً۔ [فروری ۱۹۸۳ء]

نورالنبی، ڈاکٹر محمد

ڈاکٹر محمد نورالنبی

سخت افسوس ہے کہ ہمارے نہایت فاضل دوست اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نامور استاد فلسفہ ڈاکٹر محمد نورالنبی ۷/ جنوری ۱۹۸۳ء کو انتقال کر گئے۔ مرحوم دسمبر ۱۹۸۲ء میں ایک سمینار کی شرکت کی غرض سے امریکہ گئے تھے جو وہاں نیوایرا (NEW ERA) سوسائٹی کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ (اس سمینار میں شرکت کی دعوت راقم کو بھی ملی تھی اور اس کو منظور کر بھی لیا تھا لیکن وقت کے وقت ارادہ فسخ کرنا پڑا) وہاں ان کے پیر میں ایک زخم ہوا، مرحوم ذیابیطس کے پرانے بیمار تھے، ڈاکٹروں نے اس زخم کو خطرناک بتایا یہ علی گڑھ سے واپس آ کر یونیورسٹی کے میڈیکل میں داخل ہوئے۔

مرض میں بظاہر افاقہ ہو رہا تھا مرحوم بھی پُر امید تھے۔ نماز، روزہ کے سخت پابند تھے۔ ۶/ جنوری کو عشاء کی نماز ادا کر کے لیٹے، کچھ دیر تک ہنسی خوشی حاضر الوقت تیمارداروں سے بات چیت کی پھر نیند آ گئی۔ مگر یہ نیند خواب مرگ ثابت ہوئی۔ صبح کو ان کی بیٹی نماز فجر کے لیے اٹھانے گئی تو وہاں کچھ نہ ملا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ولادت: مرحوم کے والد ماجد کا نام، جو بڑے دیندار اور گھر کے خوشحال تھے حاجی شیخ محمد حنیف تھا۔ ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء کو ضلع بھاگلپور (بہار) کے ایک گاؤں کہلنائی میں پیدا ہوئے۔ دینیات اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پٹنہ یونیورسٹی سے پاس کیے۔ بی۔اے بہار یونیورسٹی سے کیا۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آ گئے، یہاں سے امتیاز کے ساتھ فلسفہ میں ایم اے اور ایل ایل۔ بی ایک ساتھ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں فلسفہ میں پی ایچ۔ ڈی کلاس میں داخلہ لے کر پروفیسر عمرالدین مرحوم کے زیر نگرانی ریسرچ کا کام کیا، اس کی تکمیل کے بعد شعبہ میں لیکچرر ہو گئے۔ انتقال کے وقت ریڈر تھے اور جلد ہی پروفیسر ہونا متوقع تھا۔

مرحوم کا خاص موضوع فکر وتحقیق فلسفۂ اسلام تھا، چنانچہ پی ایچ۔ ڈی کے لیے ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع بھی ''تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں اسلام کا ارتقاء'' تھا۔ یہ مقالہ بعد میں یونیورسٹی کی طرف سے چھپ گیا تھا اور اسی زمانہ میں برہان میں اس پر تبصرہ ہوا تھا۔ اس کے بعد غالباً ان کی کوئی اور کتاب تو نہیں چھپی لیکن انگریزی میں زیادہ اور اردو میں کم، انہوں نے مقالات کثرت سے لکھے جو ملک اور بیرون ملک کے بلند پایہ علمی مجلّات ورسائل میں شائع ہوئے اور ارباب علم ودانش سے خراج تحسین حاصل کیا۔ برہان جس کے وہ بے حد قدر دان تھے اس میں بھی ان کے چند مقالات شائع ہو چکے تھے۔ وہ ہند اور بیرون ہند کے سمیناروں میں بھی کثرت سے شریک ہوئے اور وقیع مقالات پڑھے۔

۱۹۷۵ء میں چند مہینوں کے لیے امریکہ کی یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ہو کر بھی گئے اور اسلامی فلسفہ وتصوف پر لیکچر دیئے۔ شیخ محی الدین ابن عربی، امام غزالی اور علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ فلسفہ میں نظریۂ وجودیت کے بڑے مبصر اور نقاد تھے۔ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے کٹر مسلمان تھے۔ متعدد سیمناروں میں دیکھا ہے کہ کسی نے اسلام کے خلاف کوئی بات کہہ دی اور مقالہ ختم ہونے کے بعد اس کی تردید کے لیے مرحوم فوراً کھڑے ہو گئے ہیں۔ اخلاق وعادات کے اعتبار سے بڑے شگفتہ طبع اور خندہ جبیں تھے۔ راقم الحروف کے بڑے مخلص دوست تھے۔ پس ماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا عراق میں انجینئر ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے اور پسماندگان کا حامی وناصر ہو۔ آمین [مارچ ۱۹۸۳ء]

ڈاکٹر نورالنبی مرحوم

ڈاکٹر نورالنبی صاحب ۷/ جنوری ۱۹۸۳ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے، مرحوم ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء کو بہار میں پیدا ہوئے، انھوں نے ۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرس، فلسفہ میں کیا، اور ۱۹۵۴ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا، ۱۹۵۸ء میں موصوف نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہی سے ڈاکٹر عمرالدین مرحوم کی نگرانی میں Ph.D کی ڈگری

حاصل کی ۔اس کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۵۷ء میں لکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر صاحب یہاں ہی ریڈر ہوگئے۔

ڈاکٹر صاحب نے Visiting Professor کی حیثیت سے اولڈ ڈومیشن Old Domition نارفاک (Narfalk) شکاگو ڈیاب (Deab) اور مسلم کمیونٹی سینٹر شکاگو (امریکہ) میں لیکچر دیے۔ مرحوم نے فلسفہ اور مذہب سے متعلق کم وبیش ۲۲ کانفرنسوں میں شمولیت فرمائی جو ہندوستان اور بیرونی ممالک مختلف جگہوں پر منعقد ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے چالیس سے زیادہ مقالات مختلف فلسفیانہ مذہبی ،دینیاتی اور صوفیانہ موضوعات پر ہندوستان اور دنیا کے مشہور علمی رسالوں میں چھپے ۔آپ کی تین باقاعدہ کتابیں ہیں ان کی کتاب _____ علمی حلقوں میں خاصی مقبول ہوئی۔ مرحوم حال ہی میں امریکہ میں کئی کانفرنسوں میں شمولیت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے، وہاں ہی ان کے بائیں پاؤں میں زخم ہوگیا، اور ذیابیطس کے مرض میں پہلے ہی سے مبتلا ہونے کی وجہ سے اس زخم نے خطرناک صورت اختیار کرلی اور آخرکار یہی ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا آخری زخم ثابت ہوا۔

نورالنبی صاحب کا منصوبہ تھا کہ وہ مسلم فلسفہ اور اسلامی تصوف کے اصلی ماخذ تک رسائی کے ذریعہ سے مسلمانوں کے عظیم علمی کاموں اور کارناموں کی از سرنو تفتیش کا گراں بار کام انجام دیں۔ اس سلسلے میں آپ نے مختلف موضوعات جیسے ارسطو اور ابن رشد، شاہ ولی اللہ دہلوی ،مجدّد الف ثانیؒ ،شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی، گیسو دراز ، بابا فرید صاحبؒ ،محمد جائسی وغیرہ جیسی اہم اور عہد ساز شخصیتوں اور ان کے فلسفوں اور تعلیمات کو اپنی صحیح اور اصل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے کام کا آغاز بھی کرایا تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم کے پیش نظر غزالی کی ''تہافۃ الفلاسفہ'' کے تنقیدی جائزے اور ابن عربی کے فلسفہ ''وحدۃ الوجود'' پر کام کے بھی منصوبے تھے کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ لوگوں نے ابن عربی کو غلط انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ کہتے تھے کہ اگر ان کے فلسفہ کے اصل ماخذ سے مدد لے کر جائزہ لیا جائے تو ان کے متعلق شکوک وشبہات دور ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ابن رشد کی کتاب ''فصل المقال'' کا اردو میں ترجمہ کرایا، اس پروجیکٹ کے لیے U.G.C نے گرانٹ بھی منظور کرلی تھی۔ مگر نہ معلوم قدرت کو کیا منظور تھا کہ ڈاکٹر نورالنبی صاحب صرف ۵۲ سال کی عمر میں ان تمام اہم منصوبوں کو ادھورا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت سے محاسن حسنہ کا مجسّمہ تھے، سب سے بڑی خوبی جو ان میں تھی وہ یہ تھی کہ ان کو اپنے مذہب ،اپنی تہذیب اور اپنے شاندار علمی ورثے کی عظمت کا احساس اور اس کے احیاء کا جذبہ تھا۔ وہ مغرب کے فلسفہ اور علوم جدید میں اس کی ترقی سے مرعوب نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ فلسفہ پڑھنے اور پڑھانے کے باوجود انھوں نے کبھی بھی مذہب اور تصوف کے موضوع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ ہر موقع پر فلسفہ کی مدد سے مذہب کو جاندار انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ مغرب کے اندھے مقلد نہ تھے، بلکہ اس کے برعکس ان کو اپنے مذہب اپنی تہذیب اور اپنے اسلاف کے کارناموں کے ساتھ ایک والہانہ لگاؤ تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حکمت اور فلسفہ کے ان سرچشموں کا کھوج لگانا شروع کیا تھا جو ہمارے مسلمان حکماء اور فلاسفہ نے بڑی کاوش اور محنت سے فراہم کیے ہیں۔ نورالنبی صاحب مرحوم اِن لوگوں کی طرح نہیں تھے جو احساس کمتری میں مبتلا ہوکر اپنے ماضی اور مذہب سے کنارہ کش ہوکر مغرب سے بلند ہونے والی ہر آواز پر فریفتہ ہوتے اور بقول سارتر (Sarter) ان مرعوب دانشوروں کی طرح نہ تھے جو اپنے لوگوں کو پیرس، لندن اور امسٹرڈم (Ams Terdum) سے بلند ہونے والی آواز PARA, PARATHE, V (MUOD, THERWD) پر THE NIN اور THERWD کی صدائے بازگشت دیتے، اس کے برعکس ان کو یقین تھا کہ مسلمان فلسفیوں، حکماء اطباء اور صوفیاء کے کارنامے بذات خود اتنے وقیع اور قابل قدر ہیں کہ یہ ہم کو مغرب کے تمام ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فلسفوں سے نہ صرف بے نیاز کرسکتے ہیں بلکہ ہماری ہمہ جہت ترقی اور کامیابی کے محرک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر مرحوم کا یہ بھی اذعان تھا کہ موجودہ علوم وفنون اور فلسفہ میں مغرب نے جو ترقی کی ہے اس کی بنیاد سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی رکھی تھی اور مغرب نے اسی بنیاد پر اپنے علمی کارناموں کو مرتب کیا۔ مگر اپنے اولین معلمین مسلمانوں کے بجائے ساری علمی ترقی کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہا، یہی وجہ تھی کہ نورالنبی صاحب چاہتے تھے کہ مسلم فلسفہ اور دوسرے علوم کو اپنے بنیادی ماخذ (Original sources) سے حاصل کرکے تحقیق وتفتیش کے بعد دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ مسلمان مرعوبیت اور احساس کمتری سے نکل کر اپنے تہذیبی اور مذہبی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں بلکہ اس کو اور ترقی بھی دے سکیں۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر ٹوٹنے والی مصیبتوں اور مظالم کی خبریں سن کر بے چین ہوجاتے تھے، اور وہ باقاعدہ دنیا کے حالات اور خصوصاً مسلمانوں کے حالات سے مکمل آگہی رکھتے تھے، اور جب کبھی

ان کو موقع ملتا کہ وہ ان حالات پر تبصرہ کریں تو ان کے دلسوزی اور ہمدردی میں ڈوبے ہوئے الفاظ سامعین کے دلوں کو چھو جاتے تھے،اوران میں خود بخود کچھ کرنے جذبہ بیدار ہوجاتا تھا۔اس کے علاوہ مرحوم غریبوں ،مسکینوں اور فورتھ گریڈ ملازمین طبقہ کے ساتھ بہت ہمدردی رکھتے تھے،اورانکے دکھ درد میں برابر کے شریک حال رہا کرتے تھے نہ صرف خود ان کی مدد کرتے بلکہ اپنے سے وابستہ گوناگوں قسم کے لوگوں اور شاگردوں کو بھی ان کی مدد کرنے پر ابھارتے تھے۔ اپنے شاگردوں کی مدد کرنا، ان کی پڑھائی اوردوسرے کاموں کے متعلق ان کو مشورے دینا اور رہنمائی کرنا، اوران کے ساتھ ان کی اخلاقی ودینی لحاظ سے تربیت کرنا اوران کی صلاحیتوں کونشوونما دینا ڈاکٹر صاحب کی بہت ساری خوبیوں میں سے چندنمایاں خوبیاں تھیں ۔مرحوم اس شعر کے حرف بہ حرف مصداق تھے:

؎ درغم دیگر بسوز ودیگراں راہم بسوز

محنت اورعمل مرحوم کی زندگی کے دومستقل اصول تھے۔وہ نہ صرف اس پر خود کاربند رہتے تھے بلکہ اپنے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگوں کو بھی انہی زیورات سے آراستہ کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

اسلام کے ساتھ نور النبی صاحب کووالہانہ عقیدت تھی،چنانچہ اسلام پر مختلف حلقوں اورمغرب زدہ اور مارکسسٹ ''مسلمانوں'' کی طرف سے ہونے والے حملوں کا مرحوم مسکت جواب دیتے تھے۔اپنے شاگردوں کو ہروقت ڈاکٹر صاحب اسلام کے ساتھ چمٹے رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے،اوراسلامی علوم کے حوالے سے کام کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے محبت اورعشق تھا،عشق رسول نے آپ کواتنا گرویدہ بنادیا تھا کہ جب بھی کسی کی طرف سے رسول اللہ یاصحابہ رُسول ﷺ کے بارے میں کسی معمولی قسم کا اعتراض یاان کی شان میں سوئے ادبی کاادنیٰ سا مظاہرہ دیکھتے تو بے چین ہو جاتے تھے اور گرجتی ہوئی آواز میں معترض پر برستے تھے چنانچہ اپنے مرض الموت میں ڈاکٹرصاحب مرحوم راقم اورحیات عامر کوبار بار زیارۃ قبرالنبیؐ سے متعلق احادیث تلاش کرنے کے لیے کہتے اور جب ہم نے ان کو''من زارقبری وجبت له شفاعتی'' والی حدیث سنائی تب جاکے ان کواطمینان ہوا۔

آخر میں ڈاکٹر نورالنبی مرحوم کے متعلق صرف اتناہی کہاجاسکتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی ایک یادگار تھے،ان کے علمی اورعملی منصوبے اتنے عظیم اوراہم تھے کہ جیسے وہ اسلامی فلسفہ اورتصوف کی ازسرنوتدوین وتجدید کرنا چاہتے ہوں۔ اگرچہ مرحوم اب ہم میں موجودنہیں ہیں۔مگراس کے باوجود۵۲سال کی مصروف ترین زندگی گزارکرانھوں نے کام کرنے والوں کے لیےنمونہ اورمثال چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کواپنی رحمتوں سے نوازدے اوران کے ادھورے چھوڑے ہوئے مفیدعلمی کاموں کوآگے بڑھانے کا جذبہ ہمارے دلوں میں پیدا کرے ؎

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ تیری نگہبانی کرے

[حمیدنسیم رفیع آبادی،اگست ۱۹۸۶ء]

رفیع،مولانا محمد

مولانا محمد رفیع

افسوس ہے پچھلے دنوں ہمارے نہایت فاضل دوست لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کالاہور میں، اورمولانا محمد رفیع صاحب کا انتقال دیوبند میں ہوگیا۔ اوّل الذکر پرتوایک مضمون برہان کی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔مولانا محمد رفیع صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے نواسے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور پختہ استعداد کے عالم تھے،ان کے والد ماجدمولانا محمد شفیع صاحب جوعلم وعمل، تقوی وطہارت اورفقر ودرویشی میں سلف صالحین کے نمونہ تھے۔عرصۂ دراز تک مدرسہ عبدالرب دہلی کے صدر مدرس رہے،مولانا محمد رفیع بھی عمر بھراس مدرسہ میں استادرہے۔والد ماجد کی وفات کے بعد مدرسہ کے ناظم بھی ہوگئے تھے۔عملاً نہایت صالح،عابد وپرہیزگار،خوش پوشاک اورخوش اخلاق تھے،عمر۸۷برس کی ہوئی۔اللھم اغفرله وارحمه۔ [اپریل۱۹۸۳ء]

عبدالرشید،خواجہ (لیفٹننٹ کرنل)

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

عزیزم میاں اسلم سلمہ(پروفیسر محمد اسلم) کا۱۴/مارچ کالکھا ہوا خط ۱۹/ مارچ کو لاہور سے علی گڑھ میں موصول ہوا تواس میں لکھا تھا کہ کل یعنی۱۳/مارچ کوخواجہ عبدالرشید کا انتقال ہوگیا۔ پڑھتے ہی جی دھک سے ہوکر رہ گیا اور گزشتہ چالیس برس کے عہد اخوت ومحبت کاایک ایک واقعہ یادآکر دل کواشک خون رُلا گیا۔اخبارات نے ان کی عمرستر برس لکھی ہے۔مرحوم خوب تندرست اورتوانا تھے لیکن چندبرس سے ان کی بینائی خودبخود کم ہونی شروع ہوئی۔ وہ خود بھی بڑے پایہ کے ڈاکٹر تھے اورنامی گرامی ماہرین چشم سے مشورہ بھی کیا مگرکوئی فائدہ نہیں

ہوا۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں جب ان سے لاہور میں آخری ملاقات ہوئی اس وقت ان کی نگاہ برائے نام رہ گئی تھی، چند ماہ کے بعد ہی نابینا ہوگئے۔ آدمی تھے بے حدحساس، نفسیاتی طور پراس حادثہ کاان کے دل ودماغ اورصحت پرغیرمعمولی اثر ہوا۔ آخراس صدمہ اوررنج میں ان پرفشارقلب کاحملہ ہوا۔ اسپتال میں داخل کیے گئے، وقت موعود آچکا تھا، چاردن کے بعد انتقال سے چار گھنٹے پہلے کلمہ طیبہ کاورد زبان پرتھا پھرزبان بند ہوگئی اوراسی عالم میں جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔

ایک عربی شاعرنے اس قسم کے مواقع کے لیے کیاخوب کہاہے

الی اللہ اشکوالاالی الناس انّنِیْ

اری الارض تبقی والا خلاء تذھب

لوگوں سے نہیں، میں اللہ سے ہی اس بات کی فریاد کرتا ہوں کہ

(یہ کیاغضب ہے) زمین تو اپنی جگہ قائم ہے لیکن دوست ہیں کہ

ایک ایک کرکے سدھاررہے ہیں۔

مرحوم لاہور کے ایک نامی گرامی خاندان کے چشم وچراغ تھے ان کے برادر بزرگ خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم ایک اعلیٰ درجہ کے سرکاری افسر ہونے کے علاوہ انگریزی زبان کے بلند پایہ صاحب قلم اوراسلامیات کے بڑے فاضل تھے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد برسوں تک انگریزی میں ایک ہفتہ وار یا پندرہ روزہ (اب ٹھیک یادنہیں) رسالہ ''الاسلام'' کے نام سے کراچی میں اپنی ادارت میں شائع کرتے رہے۔ برصغیر کے اردو زبان کے نامورمحقق ادیب اورمصنف جناب مشفق خواجہ (کراچی) انہیں کے فرزندارجمند ہیں۔

خواجہ عبدالرشید صاحب کی تعلیم تمام تر لاہور سے گورنمنٹ کالج میں ہوئی، سائنس میں گریجویشن کے بعد ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، دینی اورعلمی ذوق موروثی تھا۔ نمازروزہ کی پابندی کے ساتھ قرآن مجید سے عشق تھا۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا احمدعلی صاحبؒ نے خاص انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے لیے درس قرآن کاایک نظم قائم کررکھا تھا جو بے حدمفید ثابت ہوااور پاکستان میں اس درس کے اثرات آج بھی نمایاں طور پرنظرآتے ہیں۔ خواجہ صاحب اس حلقۂ درس میں پابندی اور بڑی لگن سے شریک ہوتے تھے۔ مولانا احمدعلی صاحب، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے تلمیذ وتربیت یافتہ خاص اور داماد تھے، اس لیے مولانا کا درسِ قرآن درحقیقت مولانا سندھی کے قرآنی افکار ونظریات کاترجمان ہوتا تھا۔ اس تقریب سے خواجہ صاحب مولانا عبیداللہ سندھی سے بھی آشنا متعارف اور عقیدت مند ہوگئے اورپھر جب مولانا پنجاب میں قیام پذیر ہوئے تو خواجہ صاحب نے بلاواسطہ مولانا سے صرف ہم نشینی کافیض نہیں اٹھایا بلکہ باقاعدہ تلمذ اختیار کرکے مولانا سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے چند رسائل کادرس لیا۔

مولانا احمدعلی صاحب اورمولانا عبیداللہ سندھی کے تلمذ اوران کی صحبت و معیت نے خواجہ صاحب کے ذوق دینی وفکراسلامی کونہایت پختہ، منجھا ہوا اوروسیع کردیا۔ اب وہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تھے تومحض برائے ثواب نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ان کوقرآن میں حقائق ومعارف کاایک جہان نو ہی نظرآتا تھا۔ اس بنا پر ان کاقرآن سے شغف بڑھ گیااوروہ روزانہ تلاوت بڑے شوق اورانہماک سے کرنے لگے۔

اگرچہ تعلیمی اعتبار سے ان کاخاص مضمون سائنس تھا لیکن علمی اوراسلامی ذوق وشوق کے باعث انھوں نے تاریخ، فلسفہ، تصوف، فارسی شعروادب، سیاسیات اورنفسیات کامطالعہ بھی بڑی دلچسپی اورتوجہ سے کیا تھا۔ علامہ اقبال سے ان کوعشق تھا اوروہ کلام اقبال کے حافظ تھے۔ مقالہ نگاری اورتصنیف وتالیف کا بھی شگفتہ ذوق رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے انگریزی اوراردو میں بڑی کثرت سے مضامین لکھے، ان کے متعدد وقیع مقالات برہان میں بھی شائع ہوکرارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے ہیں، مضامین کے علاوہ متعدد کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں جن میں معارف النفس (اردو) فارسی شعراء پنجاب کا تذکرہ، فارسی زبان میں اورانگریزی زبان میں ایک کتاب جو ان کے مختلف مقالات کا مجموعہ ہے۔ مرحوم کو نادروجدید کتابوں اورنوادر اشیاء کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ملازمت کے سلسلہ میں وہ مختلف ملکوں میں رہے تھے۔ علاوہ ازیں دنیا کی سیاحت بھی خوب کی تھی۔ اس لیے انھوں نے لاکھوں روپے کے صرف سے ایک عظیم الشان کتب خانہ اورایک نہایت وقیع عجائب خانہ (میوزیم) فراہم کیا تھا۔ میوزیم اپنی زندگی میں ہی پاکستان گورنمنٹ کو دے گئے تھے اوروہ پاکستان کے نیشنل میوزیم میں ان کے نام سے محفوظ ہے، کتاب خانہ میں مطبوعہ کتابوں کے عظیم ذخیرہ کے علاوہ بعض نادرمخطوطات بھی تھے۔ قرآن مجید کے بیسوں عجیب وغریب نسخے جو انھوں نے غیرملکی سفروں اورسیروسیاحت میں بصرف زرکثیر ادھراُدھر سے حاصل کیے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا مرحوم اپنے پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے اوروہ پرائیویٹ پریکٹس ہی کرتے تھے، لیکن عالمگیر جنگ دوم میں انھوں نے فوجی ملازمت کرلی، اورلفٹنٹ کرنل کے عہدہ تک پہنچے۔ جنگ کے زمانہ میں مختلف

محاذوں پر رہے، اس سے ان کو جو تجربات ہوئے وہ اکثر ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ ان کے فوج میں جانے کا واقعہ بھی سننے کے قابل ہے جسے انھوں نے راقم الحروف سے خود بیان کیا تھا۔ انھوں نے کہا: کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے جنگ میں برطانوی حکومت کی مدد نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے ہندو اور مسلمان جنگ میں بھرتی کو ناپسند کرتے تھے اور میں انہی لوگوں میں سے تھا۔ لیکن ایک دن مولانا عبیداللہ سندھی نے مجھ کو بلا کر حکم دیا کہ میں فوجی ملازمت اختیار کرلوں۔ میں نے عرض کیا: ''ایسا کرنا تو قومی مفاد کے خلاف ہوگا۔'' مولانا نے حسب عادت بگڑ کر تند و تیز لہجہ میں فرمایا: بکنے دو کانگریس اور لیگ کو! دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کا بننا لازمی اور ناگریز ہے۔ پس اگر مسلمان فوج میں بھرتی سے الگ رہے تو کل جب پاکستان بنے گا تو ہمارے پاس فوج کہاں ہوگی؟ اس کے بعد فرمایا: اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی ہو کر فوجی ٹریننگ لینا چاہیے تاکہ جنگ میں مرکھپ جانے سے جو نوجوان بچ رہیں گے وہ ہماری آزاد حکومت کے کام آئیں گے۔'' خواجہ صاحب سے یہ بات سن کر یاد آیا کہ یہی بات مولانا عبیداللہ سندھی نے متعدد بار ہم لوگوں سے دلّی میں فرمائی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ انھیں اس پر اصرار بھی تھا۔

بہرحال اپنے شیخ و مرشد کے حکم کی تعمیل میں فوجی کمیشن میں شرکت خواجہ صاحب نے منظور کرلی اور جنگ کے دوران میں وہ مختلف محاذوں پر سرگرم عمل رہے۔ جنگ کے اختتام پر وہ میرٹھ چھاؤنی میں آگئے، یہاں ڈیڑھ دو برس رہے ہوں گے کہ برما میں ایک اسپتال کے منتظم اعلیٰ (Chief Administrator) بنا کر بھیج دیے گئے۔ ملک کی آزادی اور تقسیم کے وقت یہ برما میں ہی تھے لیکن یہ برما کے جس مقام پر تھے وہ کمیونسٹوں کا گڑھ تھا۔ ان لوگوں نے لوٹ مار اور قتل و قتال کی وہ گرم بازاری کی کہ یہاں رہنا مشکل ہوگیا، ہزاروں خاندان اجڑ گئے اور لوگ وطن سے بے وطن ہوگئے خواجہ صاحب اور ان کی اہلیہ بھی یہاں سے جان بچا کر فرار ہوئے اور بہ ہزار دقت و دشواری پاکستان پہنچے۔

یہاں ابتداء میں وہ لاہور کے میو اسپتال کے انچارج رہے، پھر راولپنڈی بھیج دیئے گئے۔ چند برسوں کے بعد قائداعظم جناح اسپتال کے چیف ایڈمنسٹریٹر ہو کر کراچی آگئے اور آخر تک یہیں رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن لاہور واپس آگئے اور لاہور چھاؤنی کے علاقہ میں ایک نہایت شاندار اور خوبصورت کوٹھی تعمیر کر کے یہاں مستقلاً سکونت پذیر ہوگئے۔

مرحوم کے بھائی خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم سے تو میرا تعلق دیرینہ اور اس زمانے سے تھا جبکہ میں اورینٹل کالج لاہور میں پڑھتا تھا، لیکن خواجہ عبدالرشید صاحب سے تعلق کا آغاز برہان کے ذریعہ ہوا، وہ شروع سے برہان کے خریدار ہی نہیں ندوۃ المصنفین کے محسنوں میں بھی شامل اور رسالہ اور کتابوں دونوں کے بڑے قدرداں اور مداح تھے۔ اس تقریب سے خواجہ صاحب کا ہم خدام ادارہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور خاکسار راقم سے عمیق تعلق خاطر پیدا ہوگیا اور ان سے باقاعدہ خط و کتابت شروع ہوگئی جس میں علمی اور اسلامی مسائل و مباحث پر گفتگو ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں برہان میں میرا مضمون ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد'' سات قسطوں میں شائع ہوا تو اس وقت سے خواجہ صاحب کو اس ہیچ مداں کے ساتھ غیر معمولی انس اور تعلق خاطر پیدا ہوگیا، لیکن یہ سب کچھ غائبانہ تھا۔ ان سے پہلی ملاقات (غالباً ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء) میں اس وقت ہوئی جب وہ مغربی لباس میں ملبوس اچانک اپنی بیگم کے ساتھ دفتر برہان میں آدھمکے۔ دفتر میں ہم سب سے ملاقات کی، پھر میاں بیوی دونوں میرے گھر پر آگئے دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور گھر میں ماحضر جو کچھ بھی تھا اسے ہنسی خوشی تناول کر کے واپس ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خواجہ صاحب میرٹھ چھاؤنی میں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے، میرٹھ اور دلّی میں فصل ہی کتنا ہے؟ اس پہلی ملاقات کے بعد پندرھویں بیسویں دن خواجہ صاحب اپنی کار میں دلّی آتے جاتے ملتے رہے۔ ان دنوں میں ایک واقعہ بھی پیش آیا کہ بھائی مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی ایک بچی سخت بیمار ہوئی۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے علاج کی غرض سے میرٹھ میں ایک مکان کا انتظام کیا اور بچی کو مع اس کی والدہ کے وہاں رکھ دیا، ان کے ساتھ میں بھی کم و بیش ایک ہفتہ میرٹھ میں مقیم رہا، اس طرح خواجہ صاحب اور ان کی بیگم جنھیں میں بھابھی کہتا تھا روزانہ ملاقات اور صحبت چند ساعت کی صورت پیدا ہوگئی اور ان مجلسوں میں خواجہ صاحب کے بعض ایسے کمالات کا بھی علم ہوا جو پہلے معلوم نہیں تھے، مثلاً یہ کہ وہ موسیقی کے بھی بڑے ماہر فن اور فاضل تھے، موقع غنیمت جان کر میں نے اس میں ان سے دو تین سبق لیے اور ان کے نوٹ لکھے۔

چند مہینوں کے بعد خواجہ صاحب برما چلے گئے، لیکن اب خواجہ صاحب سے جو قلبی اور روحانی تعلق پیدا ہوگیا تھا اور خواجہ صاحب میں طبعاً علمی و اسلامی مسائل و مباحث میں غور و فکر کی جو خو تھی اس کی وجہ سے اوسطاً مہینہ میں دو مرتبہ طویل خطوط برابر لکھتے رہے اور ادھر پابندی سے میں بھی انھیں لکھتا رہا۔ بدقسمتی سے تقسیم اور دوسرے حوادث کے باعث ان کے سب خطوط تو میرے پاس محفوظ

نہیں رہے لیکن میرا ایک ایک خط انھوں نے محفوظ رکھا۔ چنانچہ دو تین برس ہوئے انھوں نے انگریزی میں اپنے نام مشاہیر کے خطوط کی جو فہرست شائع کی ہے اس میں غالباً سب سے زیادہ تعداد میرے ہی مکاتیب کی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا تقسیم کے وقت خواجہ صاحب برما میں مقیم تھے، تقسیم کے نتیجہ میں دلّی کے مسلمانوں پر جو قیامت گزری اس کی خبریں ریڈیو اور اخبارات سے معلوم ہونے پر خواجہ صاحب اور ان کی بیگم میری طرف سے کس درجہ فکرمند اور پریشان تھے اور اس سلسلہ میں ایک کیسا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا تھا؟ اسے خود خواجہ صاحب کی زبان سے سنئے جس کو انھوں نے بڑی تفصیل سے تقسیم کے بعد اپنے پہلے خط میں لکھا تھا افسوس ہے یہ خط محفوظ نہیں ہے اس لیے اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھتا ہوں خواجہ صاحب نے لکھا تھا:

''ہم دونوں روزانہ صبح اور شام بی۔بی۔سی سے خبریں سنتے تھے اور دلّی کی خبریں سن سن کر ہوش وحواس اڑے جاتے تھے، آخر ۷/ستمبر کی خبروں میں جب یہ سنا کہ آج قرول باغ مسلمانوں سے خالی ہوگیا تو آپ کی اور مفتی صاحب کی طرف سے سخت تشویش لاحق ہوئی، کوئی اور ذریعہ تو تھا نہیں، میں نے رفیع احمد قدوائی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو الگ الگ دو ارجنٹ ٹیلی گرام بھیجے اور ان سے آپ لوگوں کی خیریت طلب کی۔ مگر ان کا جواب نہیں آیا تو پھر میں نے دوسرے ذرائع اختیار کیے، مگر جب کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی تو ہم دونوں دل مسوس کر رہ گئے۔''

اس کے بعد (غالباً ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۷ء) میں ایک دن بقرعید کا تھا اور وقت مغرب کے بعد کا، ہم دونوں میاں بیوی اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں پاس ہی ریڈیو رکھا ہوا ہے اور اس میں دلّی کا پروگرام سنا جا رہا ہے، اچانک ریڈیو سے اعلان ہوتا ہے اب آپ دلّی سے عید قرباں پر سعید احمد اکبرآبادی کی تقریر سنئے، یہ سننا تھا کہ خوشی کی ایک لہر اٹھی اور رگ وپے میں دوڑ گئی لیکن ساتھ ہی خیال ہوا کہ یہ تقریر کہیں پہلا کوئی ریکارڈ تو نہیں ہے؟ اب ہم دونوں اندرونی طور پر امید وبیم کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے، ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا اور اسی حالت میں آپ کی (یعنی میری) تقریر سن رہے تھے، یہاں تک کہ آپ نے صفحہ الٹا اور اس کی آواز ریڈیو پر سنی تو اب اس یقین سے کہ یہ تقریر ریکارڈ نہیں بلکہ خود آپ بول رہے ہیں خوشی سے یک لخت صوفہ پر اچھل پڑے، دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور سجدۂ شکر بجالائے۔ اب میں نے فوراً آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر سے تار کے ذریعے آپ کا پتہ دریافت کیا، ڈائریکٹر نے میرا ٹیلی گرام آپ کو پہنچا دیا اور آپ نے مجھے خط لکھا جس سے آپ سب کی خیریت معلوم کر کے اطمینان ہوا۔''

خواجہ صاحب وضع قطع اور رہن سہن کے اعتبار سے ہو بہو ایک مغربی انسان تھے لیکن اس وضع قطع اور طرز معاشرت کے ایسے حضرات میں نے بہت کم دیکھے ہیں جو خواجہ صاحب کی طرح نماز، روزہ، تلاوت اور اوراد وظائف کے پابند ہوں اور رمضان کے ماہ مقدس میں شب بیداری کر کے روحانی انبساط ونشاط خاطر محسوس کرتے ہوں، ان کا دل اسلام اور مسلمانوں کے درد سے بھرا ہوا تھا۔ پاکستان بڑے دم خم اور چاؤ چو چلے سے بنا، لیکن بنتے ہی اپنے مقصد زندگی اور نصب العین حیات کو یک قلم فراموش کر بیٹھا۔ دنیا طلبی، زر پرستی اور جاہ پسندی کا اس پر ایسا غلبہ ہوا کہ بقول مومن۔

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومنؔ خدا کو بھول گئے اضطراب میں

اور ایک پاکستان کیا؟ پورا عالم اسلام اور اس کے دین دار سب طبقات اس حمام زر پرستی میں ننگے ہیں، خواجہ صاحب کو اس کا سخت ملال اور رنج تھا۔ میں نے ۷۶ء کے اپنے سفرنامۂ پاکستان میں لکھا ہے کہ ایک دن خواجہ صاحب علی الصبح میرے ہوٹل تشریف لے آئے اور عالم اسلام کے حال اور مستقبل پر گفتگو شروع کر دی، گفتگو کرتے کرتے انھوں نے قرآن مجید کی وہ آیت پڑھی جس میں ہے کہ قیامت کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کی شکایت کرتے ہوئے فرمائیں گے: ''اے میرے رب ان لوگوں نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔'' خواجہ صاحب نے یہ آیت ابھی پوری بھی نہیں کی تھی کہ ان پر گریہ طاری ہوگیا اور آنسوؤں کا سیلاب ان کے دیدۂ تر سے پھٹ پڑا۔

خواجہ صاحب میں جذباتیت شدید قسم کی تھی، اس بنا پر بعض اوقات ان کے افکار وخیالات نقطۂ اعتدال وتوازن سے منحرف ہوجاتے تھے، لیکن مجھ پر ان کو اعتماد تھا اس لیے میں خطوط میں اس کی اصلاح کرتا رہتا تھا۔ مرحوم اس بات کے خود معترف بھی تھے، چنانچہ ایک خط میں انھوں نے لکھا: شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھا لیکن بعد میں یہ تاثر کم ہوگیا، البتہ مولانا عبیداللہ سندھی، ڈاکٹر اقبال اور آپ کے افکار وخیالات کا نقش میرے دل ودماغ پر بہت گہرا ہے۔''

خواجہ صاحب پاکستان کی ایک اہم اور نمایاں علمی وادبی شخصیت تھے اور اس لیے ان کی وفات ایک عظیم قومی حادثہ بھی ہے لیکن کیا کیجئے بقول غالب۔

صبر کرتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

میاں اسلم کا خط ملتے ہی میں نے بھابی صاحبہ کو (جو اخلاق وعادات اور حسن ذوق میں سچ مچ اپنے مرحوم شوہر کا پرتو ہیں) تعزیت نامہ لکھا تھا: بھابی! میں اپنی رفیقۂ حیات کی آغوش محبت سے پہلے ہی محروم ہوگیا تھا، جس کا زخم مندمل ہونے کے بجائے ہر دم اور ہر آن تازہ ہے، صد حیف کہ اب آپ کے سر سے بھی آپ کے شریک زندگی کا سایۂ رحمت والفت اُٹھ گیا۔

آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً [مئی ۸۳/۱۹۸۴ء]

محمد طیب، مولانا قاری

موت العالِم موت العالَم

وادریغا! دودمان قاسمی کا لعل شب چراغ گم ہوگیا۔ چمن زار دارالعلوم دیوبند کا گل سرسبد مرگ کی بادِ صرصر سے نذر خزاں ہوگیا، بزم علم وعرفان کی شمع فروزاں بجھ گئی، حسن بیان وخطابت کے ایوان میں زلزلہ آگیا، مسند وعظ ومصطبۂ ارشاد وہدایت بے رونق ہوگئے، یعنی ۱۷/ جولائی کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کم وبیش ۸۸ برس کی عمر میں عالم آب وگل کو خیرآباد کہہ کر عالم آخرت کی طرف منتقل ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شب میں عشاء کی نماز کے بعد ہزاروں ماتم گساروں کے مجمع میں نماز جنازہ دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں ادا کی گئی اور پھر تدفین جدامجد نوراللہ مرقدہ کے پہلو میں ہوئی، اس طرح گویا:

پہنچی وہیں پہ خاک کہ جس کا خمیر تھی

کل من علیہا فان o ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

حضرت مرحوم جب پیدا ہوئے، یہ دارالعلوم دیوبند کے اوج شباب کا زمانہ تھا۔ اساتذہ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھے جن کے علم وفضل اور مہارت فن کا آوازہ ممالک غیر میں بھی دور دور تک پہنچا ہوا تھا۔ پھر اس دور کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ اصحاب درس وتدریس خود بھی روحانی اور باطنی کمالات کے حامل اور جامع ہوتے تھے، اوران کے علاوہ تھانہ بھون، سہارنپور اور دیوبند میں مستقل طور پر طریقت ومعرفت کی درس گاہیں قائم تھیں اور دارالعلوم جس کا نام تھا وہ درحقیقت انہی دونوں قسم کے علوم وفنون کی تعلیم وتربیت گاہ تھا، غرض کہ ایک طرف یہ سرچشمہ ہائے فیض تھے جو پوری آب وتاب کے ساتھ رواں دواں تھے اور دوسری جانب حضرت مرحوم خانوادۂ قاسمی کے چشم و چراغ ہونے کے باعث ہر ایک کے نور نظر اور لخت جگر تھے اور خود بھی ذاتی طور پر نہایت ذہین اور طباع، روشن ضمیر ونکتہ رس تھے اور طلب علم کا جوہر فطری رکھتے تھے، پھر کسر کس بات کی تھی، جوان ہوئے تو حافظ قرآن اور قاری خوش الحان ہونے کے ساتھ ایک پختہ استعداد کے بالغ النظر عالم ہوگئے۔

اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم اگرچہ حضرت مرحوم کے والد ماجد حافظ محمد احمد صاحب مرحوم تھے لیکن اہتمام کا سارا کام نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کرتے تھے جو عربی زبان کے ادیب اور بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ حد درجہ ذہین، معاملہ فہم اور اعلیٰ درجہ کے مدبر اور منتظم تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بلا کے مردم شناس اور مردم آفریں تھے، وہ مدرسہ کے ہونہار طلبا پر کڑی نظر رکھتے تھے، چنانچہ اس قسم کے طلبا میں سے جب کوئی فارغ التحصیل ہوتا تو اس کو روک لیتے اور اس کے ذوق اور استعداد کے مطابق مدرسہ کی کوئی خدمت اس کے سپرد کردیتے تھے۔ اسی قسم کے فارغ التحصیل طلبا کے لیے انھوں نے مدرسہ میں معین المدرسین کا ایک شعبہ قائم کر رکھا تھا۔ حق یہ ہے کہ اپنے اس جوہر مردم شناسی و مردم آفرینی کے زیرسایہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے نامور اساتذہ علم و فن، مقرر اور خطیب، مناظر اور واعظ، مفتی، مصنف، صحافی، شاعر اور ادیب اس کثرت سے پیدا کیے کہ انھوں نے ملک میں پھیل کر ہر شعبۂ زندگی میں اپنا اثر و نفوذ قائم کیا۔

ظاہر ہے، مولانا کی نگاہ دوررس سے معدن قاسمی کا یہ گوہر تاباں کیونکر مخفی رہ سکتا تھا، آپ نے موصوف کو اپنی تربیت خاص کی آغوش میں لے کر اس طرح تربیت کی کہ موصوف کی فطرت وطبیعت کا ایک ایک جوہر قابل نشوونما پانے اور پروان چڑھنے لگا، چنانچہ آپ درس تو دیتے ہی تھے حسن بیان وخطابت کی خلقی استعداد وصلاحیت کے باعث جلسوں میں تقریر کی غرض سے ادھر اُدھر بھی بھیجے جانے لگے، لیکن سوال یہ تھا کہ گلبن دارالعلوم کے اس نہال نو کا آئندہ کیریئر (Career) کیا ہو؟ موصوف میں اہتمام وانتظام کی صلاحیت بہت اچھی تھی، علاوہ ازیں ان اوصاف وکمالات سے بھی متصف تھے جو مدرسہ کی ترقی وتوسیع میں ممد ومعاون ہوسکتی تھیں، ان امور کے پیش نظر مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے فیصلہ کیا کہ انھیں آئندہ مدرسے کا مہتمم ہونا ہے، چنانچہ آپ نے ان کو اپنا معین و مددگار یعنی نائب مہتمم مقرر کرلیا۔

یہ ذکر اس زمانہ کا ہے جب کہ راقم الحروف دارالعلوم دیوبند کا طالب علم تھا۔اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا انتقال ہوگیا تو مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم بنادیے گئے۔ اگرچہ آپ کی شہرت اور ملک میں مقبولیت کا آغاز نیابت اہتمام کے زمانہ میں ہی ہوگیا تھا لیکن مہتمم ہونے کے بعد وقت آیا کہ آپ کے اوصاف وکمالات پورے طور پر ابھریں اور جلا پائیں، یہ کمالات تین قسم کے تھے، علمی، عملی اور اخلاقی، اوّل الذکر کمال تو یہ تھا کہ علوم وفنون میں پختہ استعداد کے ساتھ ایک طرف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تصنیفات و تالیفات پر گہری نظر رکھتے تھے اور دوسری جانب حضرت تھانویؒ سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان دونوں نابغۂ روزگار بزرگوں کے علوم و فنون پر حاوی ہو اس کو شریعت وطریقت کا رمز شناس ونکتہ دان بننے کے لیے اور کیا درکار ہے، پھر اس پر حسن تقریر وخطابت کا ملکۂ خداداد سونے پر سہاگہ! گھنٹوں بولتے تھے، زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ، کہیں کہیں ظرافت اور مزاح کے چھینٹے، آواز اول تا آخر یکساں، نہ زیر و بم نہ اتار چڑھاؤ مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق، اس لیے تقریر عوام خواص دونوں کے کام کی، بات سے بات اور نکتہ در نکتہ، پھر معلومات کی کثرت اور طبیعت کی روانی کا یہ عالم کہ کیا مجال، ایک تقریر کا مضمون دوسری تقریر میں مکرر آجائے، میرے نزدیک یہ سب کچھ فیضان حضرت نانوتویؒ اور حضرت تھانویؒ کا تھا۔

عملی کمال یہ تھا کہ کارکردگی کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔جس کام کو کرتے تھے پوری توجہ اور یکسوئی سے کرتے تھے۔ہم نے بارہا دیکھا ہے ایک مجمع میں بیٹھے ہیں لوگ بات چیت کرنے میں مصروف ہیں اور آپ ایک گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے اور کاتبوں کی طرح بیٹھے کوئی مضمون مسلسل لکھے جارہے ہیں، خالی بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے، ہر وقت کام سے کام تھا، اخلاقی اعتبار سے وہ اس شعر کا مصداق تھے:

ھنیون لینون ایسارُذوو کرم

سواس مکرمۃ ابناء ایسارً

خندہ جبین وشگفتہ، نرم دم گفتگو اور نرم خو، حلیم وبردبار، متواضع ومنکسر المزاج، پھر ظاہری حسن ووجاہت بھی ایسی کہ ہزاروں میں ایک نظر آتے تھے۔ حسن قرأت کا یہ عالم کہ وجد آفریں وکیف آور، غرض کہ یہ کمالات سہ گانہ تھے جنھوں نے مولانا کی شخصیت کو برصغیر کے علما میں بہت نمایاں اور ممتاز کردیا تھا اور آپ سچ مچ سرخیل طائفہ بن گئے تھے۔ اللہ کے فضل وکرم سے عمر کافی طویل پائی، اس لیے جس طرح آپ کے اہتمام کی مدت دارالعلوم کے تمام سابق مہتموں کی مدت اہتمام سے زیادہ ہے، اسی طرح مدرسہ میں جو توسیع آپ کے عہد میں ہوئی کسی کے عہد میں نہیں۔آپ کی فیض رسانی کا دائرہ برصغیر تک محدود نہیں رہا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دور دراز خطوں کے علاوہ امریکہ اور یورپ پر محیط ہوگیا، اس لیے آپ کا حادثۂ وفات عالم اسلام کا وہ عظیم دوسرا المیہ ہے جو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی وفات کے بعد پیش آیا ہے۔ آپ کے سانحۂ ارتحال سے دارالعلوم دیوبند کا ایک دور اور ایک عہد ختم ہوگیا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور حضرت قاری صاحب دونوں ہم جماعت اور ہم درس ہونے کے علاوہ وہ بھی صاحبزادہ اور یہ بھی صاحبزادہ، اس لیے ہم جماعت وہم مقام بھی تھے، اس لیے دونوں میں بڑی دوستی اور بڑی بے تکلفی تھی۔لیکن میں ایک جونیئر طالب علم تھا، اس لیے حضرت مرحوم سے کوئی سابقہ نہ تھا۔ البتہ ان کے برادر خورد مولوی محمد طاہر مرحوم بڑے ہنسوڑ، خوش مزاج و یار باش انسان تھے ان سے بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی، میں ان کے گھر جاتا اور وہ میرے کمرہ میں آتے اور ہم دونوں گھنٹوں گلچھپ کرتے رہتے تھے، البتہ ۱۹۶۲ء میں مجلس شوری کا ممبر منتخب ہوا تو اب حضرت مرحوم سے بھی ذاتی تعلقات پیدا ہوگئے جو محض رسمی اور واجبی نہ تھے بلکہ حقیقی اور قلبی وروحانی تھے، اب ان سے صرف ادب واحترام کا تعلق نہ تھا بلکہ محبت اور تعلق خاطر بھی تھا، محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی بلکہ متعدی ہوتی ہے چنانچہ ادھر بھی ایسا ہی تھا۔اس کا پائیدار ثبوت یہ ہے کہ حضرت کا ذوق شعروادب بھی بڑا پاکیزہ تھا اور خود بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ایک قصیدہ کے ایسے چند اشعار خود اپنے قلم سے لکھ کر مجھ کو عنایت فرمائے جن میں ازراہ شفقت بزرگانہ اس ہیچ میرز کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جن کو پڑھ کر میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، میں نے یہ تحریر تبرک سمجھ کر حفاظت سے رکھ لی۔ ایک مرتبہ خیال ہوا کہ تحدیث نعمت کے طور پر ان اشعار کو برہان میں چھاپ دوں، لیکن خودستائی کے ڈر سے جہاں میں برہان کی ڈاک کے اس قسم کے روزانہ دو تین خطوط نہیں چھاپتا۔ان اشعار کو بھی صرف اپنے تک محدود رکھا۔آج یہ شفقت ومحبت اور التفات خاص و مراعات یاد آتے ہیں تو دل بے چین ہوجاتا اور تڑپ اٹھتا ہے اور یہ حادثہ ملی و قومی ہی نہیں بلکہ ذاتی اور شخصی بھی ہوجاتا ہے، مگر بہرحال بقول غالبؔ:

صبر کرتے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

رحمه الله رحمة واسعةً

[اگست۱۹۸۳ء]

قادری، ڈاکٹر محمد ایوب

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

پاکستان و بھارت کے علمی اور دینی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی کہ ۲۵/نومبر۱۹۸۳ء کو پاکستان کے ایک نامور ادیب، مصنف اور مؤرخ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی میں ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۵۶ برس کے لگ بھگ تھی۔

قادری صاحب روہیلکھنڈ کے مشہور تاریخی قصبے آنولہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بدایوں اور بریلی میں ہوئی۔ تقسیم ملک کے بعد موصوف کراچی چلے گئے۔ کراچی جا کر انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور بالآخر اردو کالج کراچی میں شعبۂ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے اور محنت، لگن اور خلوص کی بدولت آخر میں شعبۂ اردو کے صدر بن گئے۔

قادری صاحب کو روہیلکھنڈ کی تاریخ، رجال اور اماکن پر بڑی دسترس تھی۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو ان کی تحقیق کا محور تھے۔ انھوں نے مخدوم جہانیاںؒ کا ایک تذکرہ لکھا اور مآثر الامراء کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مرحوم نے مجلّہ اردو کالج کراچی کے کئی شاندار نمبر نکالے۔ پاکستان اور بھارت کے علمی و ادبی رسائل میں ان کے مضامین اکثر چھپتے رہتے تھے۔

۲۵/نومبر کی شام کو موصوف اپنے گھر واقع شمالی ناظم آباد سے چلے۔ ابھی انھوں نے بمشکل سو سوا سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک ویگن ان کے سر سے ٹکرا گئی اور موصوف موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کے ایک حقیقی بھائی ابومعاویہ نعمت اللہ قادری بھی ۲/فروری ۱۹۸۱ء کو لیاقت آباد کراچی میں ٹریفک کے ایک ایسے ہی حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ ابومعاویہ کو دیکھ کر قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ انھوں نے اس مادی دور میں اپنے تمام بچوں کو دینی مدارس میں تعلیم دلوائی۔

یہ دونوں بھائی بڑی خوبیوں کے مالک اور اعلیٰ انسانی اوصاف سے متصف تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

[مارچ۱۹۸۴ء]

جامعی، پروفیسر محمد سرور

پروفیسر محمد سرور جامعی

۲۰/ستمبر۱۹۸۳ء کو مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سوانح نگار اور اُن کے فکر کے شارح پروفیسر محمد سرور جامعی ابوظہبی میں جہاں وہ اپنے بیٹے سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ ۷۹ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کی میت تدفین کے لیے لاہور گئی۔ نماز جنازہ ڈاکٹر اسرار احمد نے پڑھائی اور انھیں لاہور کی ایک نئی بستی ٹاؤن شپ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سرور صاحب نے ''مولانا عبیداللہ سندھیؒ حالات، تعلیمات اور سیاسی افکار'' اور ''افادات و ملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ'' کے عنوانات سے دو بلند پایہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

مرحوم بڑے بلند پایہ صحافی تھے۔ وہ مختلف اوقات میں روزنامہ وفاق، المعارف اور ماہنامہ زکوٰۃ کے مدیر رہے ہیں۔ ان کی زبان میں قدرے لکنت تھی اس لیے تقریر کی بجائے تحریر پر زیادہ توجہ دیتے رہے۔

مرحوم تقسیم ملک سے قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں استاد تھے۔ وہاں انھیں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ سالہا سال تک کام کرنے کا موقع ملا۔ مرحوم ان کے بڑے مداح اور ان کے سیاسی نظریات سے بڑے متاثر تھے۔

''افادات و ملفوظات مولانا سندھی'' کے بارے میں علمی حلقوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اس میں مولانا سندھی کے نظریات کم اور سرور صاحب کے زیادہ ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ سرور صاحب بڑے محنتی اور مخلص انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہوئے ان کی مغفرت فرمائے۔

[مارچ۱۹۸۴ء]

ایم اسلم، میاں

ایم اسلم

برعظیم پاک و ہند کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس میاں ایم اسلم مورخہ ۲۳/ نومبر ۱۹۸۳ء کو ۹۸ سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں ان کے دیرینہ ساتھی اور ان کی تصانیف کے ناشر خواجہ بدرالاسلام فروغی نے مرحوم کے والد میاں نظام الدین کے ایک رجسٹر کے حوالے سے ان کی تاریخ ولادت ۶/ اگست ۱۸۸۵ء بتائی ہے۔

میاں ایم اسلم لاہور کے ایک رئیس گھرانے کے فرد تھے۔ان کے والد میاں نظام الدین لاہور کی کشمیری برداری کے سربراہ اوروسیع جائداد کے مالک تھے۔میاں ایم اسلم نے زراعتی کالج لائل پور(حال زرعی یونیورسٹی فیصل آباد) میں تعلیم حاصل کی اورمحکمہ انہار میں ضلع دار کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔یہ ملازمت انھیں راس نہ آئی اس لیے استعفیٰ دے کر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔میاں صاحب اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے اس لیے گھر میں روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔

انھوں نے اپنی زندگی میں ڈھائی صد کے لگ بھگ ناول اور سیکڑوں افسانے لکھے۔مرحوم اپنے احباب سے کہا کرتے تھے کہ انھوں نے ایک لاکھ سے زائد صفحات لکھے ہیں۔

برعظیم پاک وہند کے تمام اہل علم کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ جس کے ساتھ ایک بارتعلق پیدا ہوگیا اسے مرحوم نے تازیست نبھایا۔ایک افسانہ نگار اور ناول نویس ہونے کے باوجود ان کی زندگی بڑی پاکیزہ تھی۔ہفتہ وار چھٹی کے دن ان کے احباب علی الصبح ان کے ہاں پہنچ جاتے اور اکھٹے بیٹھ کر ناشتہ کرتے۔احباب کی یہ محفل دوپہر تک جاری رہتی۔راقم الحروف بھی اس محفل کا ایک باقاعدہ رکن تھا۔

میاں ایم اسلم لاہور کی ایک پرانی تہذیب اورروایات کے صحیح نمائندے تھے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں اسلامی تہذیب کے خدوخال نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔عبدالماجد دریابادی فرماتے تھے کہ ایم اسلم نے ناول کو عبادت بنادیا ہے۔

میاں صاحب نے دوشادیاں کیں لیکن اولاد سے محروم رہے۔ان کی دونوں بیویاں ان کی زندگی ہی میں فوت ہوگئی تھیں۔گذشتہ ایک سال سے ان پر ضعف غالب آ گیا تھا اورقوت حافظہ بھی جواب دے گئی تھی یہاں تک کہ پرانے احباب کوبھی پہچان نہیں سکتے تھے۔وفات سے کوئی سال سواسال پہلے ان کے بہنوئی اورعم زادمیاں امیرالدین انھیں اپنے ہاں لے گئے تھے اوران کی رہائش گاہ پر ہی میاں صاحب کاانتقال ہوا۔نماز جنازہ میاں امیرالدین کے بنگلے کے وسیع لان میں ہوئی اورانھیں میانی صاحب کے قبرستان میں اپنی خاندانی ادواڑ میں دفن کیا گیا۔

ان کی قبر سے ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خواجہ عبدالحئ فاروقی، سعادت حسن منٹو، مولانا احمد علی لاہوری، آغا حشر، احسان دانش، ڈاکٹر احمد عابدعلی، سرشیخ عبدالقادر، عبدالعزیز فلک پیمااورسعید بزمی کی قبریں زیادہ دورنہیں ہیں۔

[مارچ۱۹۸۴ء]

نانی، رضاالرحمٰن

آغوش رحمت میں

[ادارہ برہان کے کارکن رضاالرحمٰن کی نانی کاانتقال]

انتہائی افسوس ہے کہ رضاالرحمٰن صاحب کارکن مکتبہ برہان کی نانی صاحبہ ۵/ مارچ۱۹۸۴ء صبح دس بجے اس دار فانی سے رخصت کرگئیں۔مرحومہ نہایت متدین، صوم وصلوٰۃ کی پابند اوربہترین معلّمہ تھیں۔خواتین میں شرعی امور کی ترویج کے سلسلے میں مرحومہ معروف تھیں۔ان کی رحلت سے خواتین کے لیے اسلامی مسائل کے لیے ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرماکر ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطافرمائے اورہم پسماندگان کوصبرجمیل کی توفیق بخشے۔(آمین) قارئین سے مرحومہ کے لیے مغفرت کی دعا کے ساتھ نماز جنازہ غائبانہ کی درخواست ہے۔

[مارچ۱۹۸۴ء]

الجلالی، سیدعبدالدائم

آفتاب علم وفضل غروب ہوگیا

[سیدعبدالدائم الجلالی]

۵/نومبر۱۹۸۳ء شنبہ کے روز ساڑھے بارہ بجے دن بذریعہ ٹیلیفون عزیزم سیدنجم السلام میاں کی زبانی اس خبر وحشت اثر سے کہ استاذی علامہ سیدعبدالدائم الجلالی مفسرقرآن کریم داغ مفارقت دے گئے،قلب ودماغ کوسخت صدمہ پہنچا۔

مولانا سیدعزیزعبدالدائم صاحب جلالی مرحوم ۱۹۰۱ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔وہیں تعلیم حاصل کی،اوررام پور ہی کی قدیم وعظیم علمی درسگاہ مدرسہ عالیہ میں تقریباً۲۵ سال مدرس وپرنسپل رہے۔

مصطفیٰ آبادعرف رام پور پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی،لیکن علم وفضل کے اعتبار سے ایک قدآورشہر تھا،اورایک زمانے میں بخارائے ہند کے نام سے مشہور تھا، یہ عظیم خطہ علماء،شعراء،اطباء وصوفیاء اورعظیم سیاسی لیڈروں کا مولدو مسکن رہا ہے۔

علامۂ عصرمحقق زمانہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی فرزندمولانا نظام

الدین سہالوی مؤسس درس نظامی، رام پور کی شہرۂ آفاق درس گاہ مدرسہ عالیہ کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ اور مشہور منطقی وفلسفی ملامحمد حسن جن کی شہرۂ آفاق منطق کی کتاب ''ملاحسن'' جو ہندوپاک کی ہر بڑی عربی درس گاہ میں داخل نصاب ہے مدرسہ عالیہ رام پور میں مدرس رہے اوررامپور ہی میں پیوند خاک ہوئے۔

اولیاء اللہ میں مقتدائے مشائخ حضرت سید عبداللہ شاہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، اور مشہور بزرگ حافظ شاہ جمال اللہ علیہ الرحمۃ نے بھی رام پور ہی کو اپنا مسکن بنایا اور ہر دو بزرگوں کی آخری آرام گاہ بھی رامپور ہی ہے۔ اول الذکر بزرگ کے بغداد سے دہلی پہنچنے پر مشہور نقشبندی ومجددی بزرگ حضرت میاں مظہر جانجاناں اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مجدد حضرت مولانا فخر الدینؒ نے موصوف کی پالکی کو کاندھا دیا تھا۔

شیخ شیوخ العالم امام الصوفیاء شاہ احمد سعید مجددی کا وطن بھی رامپور ہی ہے، جن کے مریدین وخلفاء میں عرب وعجم کے نامور علماء ومشائخ شامل تھے۔

امام منطق وفلسفہ، مجاہدِ آزادیِ ہند علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور ان کے صاحبزادے بوعلی سینائے وقت، علماء منطق وفلاسفہ کے استاذِ اعظم علامہ عبدالحق خیرآبادی، جن کی وفات پر جامعہ ازہر مصر میں کئی روز کی تعطیل کردی گئی تھی اور جن کی کتابیں ان کی حیات ہی میں داخلِ نصاب ہندومصر ہوگئی تھیں، اسی مدرسہ عالیہ رامپور میں مدتِ مدید تک پرنسپل رہے۔

اور اسی بخارائے ہند کی خاکِ پاک سے عظیم محدث میاں محمد شاہ صاحب استاذ مولانا ابوالکلام آزاد وعلامہ شبلی نعمانی، اور میاں صاحب کے والدِ بزرگوار سید حسن شاہ صاحب محدث پیدا ہوئے۔

بوعلی سینائے ہند حکیم اعظم خاں رامپوری کی عظیم طبی تصانیف، اور مشہور مورخ مولوی نجم الغنی خاں صاحب کی عظیم علمی تصانیف کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آخر الذکر سے دوران گفتگو مصور فطرت شمس العلماء خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا کہ مولانا میری مصنفات کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے، (اس وقت غالباً خواجہ صاحب کی مصنفات کی تعداد ڈیڑھ سو ہی ہوگی) لیکن آپ کی ایک ہی کتاب میری تمام کتابوں سے زیادہ ضخیم ہے۔

مؤرخ اعظم علامہ شبلی نعمانی اور موجودہ صدی کے ہندو پاک کے سب سے بڑے عربی زبان وادب کے ماہر علامہ عبدالعزیز میمن نے بھی اسی مدینۃ العلوم رامپور کے مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور یہیں مشہور عالم مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے علامہ عبدالعلی ریاضی داں کے سامنے زانوئے تلمذتہہ کیا تھا۔

طبقۂ شعراء میں مشہور شاعر قائم چاند پوری اور بقول مولانا عرشی مرحوم ثم رامپوری کا مسکن ومدفن بھی رام پور ہی ہے۔ جگت استاد داغؔ دہلوی اور عظیم شاعر امیرؔ مینائی کے مدت تک یہاں رہنے کی وجہ سے رامپور کو شاعری کے ایک تیسرے دبستان ہونے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ نظامؔ رامپوری کی حسین غزلوں اور شیخ علی بخش بیمارؔ رامپوری کی شاعری کو اردو فراموش نہیں کرسکتی۔ اور غالبؔ کا تذکرہ رامپور سے تعلق کے بغیر نامکمل ہے۔

اور اس آخری دورِ انحطاط وزوال میں بھی مولانا محمد علی جیسا عظیم سیاست داں اور مردِ مجاہد جس کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، اور عظیم ومشہور عالم وادیب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشیؔ مرحوم بھی رامپور ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں علمی میدان میں چلنا اور دوڑنا سیکھا۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ذکر تھا مولانا سید عبدالدائم الجلالی کا۔ مولانا جلالی مرحوم ومغفور عصرِ حاضر کے بلند پایہ عالم، بلکہ جامع العلوم تھے، تفسیر وحدیث، فقہ وادب، منطق وفلسفہ اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مطالعہ وسیع تھا، علوم متداولہ مستحضر تھے، وہ خطابت وتحریر دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔

مولانا اعلیٰ درجے کے کامیاب مدرس تھے، منطق ہو یا فلسفہ، ادب ہو یا تفسیر، یعنی علومِ عقلیہ ونقلیہ جدید وقدیم دونوں کی کتابوں کے پڑھانے کی صلاحیت واستعدادِ تامہ رکھتے تھے کسی بھی مضمون کی کتاب جواُن کے سپرد کی جاتی تھی بہت عمدہ طریقے سے نہایت روانی کے ساتھ پڑھاتے تھے جس سے کہ طالب علم مکمل طور پر مطمئن ہوجاتا تھا۔ میں نے مرحوم سے عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں پڑھی ہیں، مقامات حریری جو عربی ادب کی نہایت مشکل کتاب ہے اور جس میں مغلق ودقیق الفاظ وعبارات بکثرت ہیں، بغیر مطالعے اور بغیر غوروفکر وتامل کے پڑھایا کرتے تھے اور ترجمہ اس قدر عمدہ کرتے تھے کہ اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں تھا۔ عموماً ایک عربی لفظ کے معنی ایک ہی اردو لفظ میں بیان کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عربی لفظ کا مقابل کوئی دوسرا اردو مترادف اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا نہیں تھا کہ ایک لفظ کی تشریح دس دس الفاظ میں کریں تب کہیں طالب علم مفہوم سمجھے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ عربی الفاظ کے زیادہ معانی نہیں جانتے تھے، وہ حافظ لغت تھے، جس طرح عربی زبان اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے، ایک ایک عربی لفظ کے دس دس، بیس بیس، پچاس

پچاس معانی ہیں، اسی طرح مولانا بھی ایک ایک لفظ کے دسیوں معانی جانتے تھے۔

تفسیر قرآن پر عبور وبصیرت کے سلسلے میں مولانا کے دوواقعے بیان کروں گا، اوروسعتِ معلوماتِ تصوف کے متعلق بھی دوواقعے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔تقریباً ۱۸سال قبل مسجد درگاہ حضرت شاہ ابوالخیرؒ میں تراویح میں ختم قرآن کی مجلس تھی، حضرت مولانا زید ابوالحسن داعی تھے اورمولانا مدعو، کوئی بڑا اجتماع نہیں تھا، البتہ حاضرین پڑھے لکھے تھے۔مولانا جلالی مرحوم نے قرآن کریم کے نزول وسببِ نزول پرنہایت جامع اور بصیرت افروز تقریر کی، کیا عرض کروں اس تقریر کے متعلق، معلوم ہوتا تھا کہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، حضرت مولانا زید جوخود ایک متبحر عالم اورصاحبِ نسبت بزرگ ہیں، جھوم رہے تھے اورفرمارہے تھے کہ کیا تبحر علمی ہے، افسوس ہے کہ ٹیپ ریکارڈ نہیں تھا کہ تقریر ٹیپ کرلی جاتی۔

دوسرے واقعے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا جلالی مرحوم نے قیام دہلی کے دوران مسجد گلی قاسم جان دہلی میں دومرتبہ قرآن عظیم ترجمہ وتفسیر میں ختم کیا۔مولانا نہایت پابندی کے ساتھ روزانہ اپنے مکان واقع گلی مدرسہ والی نزد جامع مسجد سے گلی قاسم جان قبل از نماز فجر جایا کرتے تھے، حالانکہ یہ پابندی مولانا کی افتادطبع کے خلاف تھی، غالباً کبھی انھوں نے ایسی پابندی نہیں کی ہوگی۔

مسجد مذکور میں ترجمۂ وتفسیر کی ابتدا کا واقعہ بھی کافی دلچسپ ہے، دہلی کے ایک لائق ومشہور عالم اس مسجد میں مدت دراز سے ترجمۂ کلام اللہ کیا کرتے تھے، ختم کے روز مولانا جلالی کو اختتامی تقریر اوردعا کے لیے دعوت دی گئی، مولانا نے اپنی تقریر میں سورۂ اخلاص کے معانی ومطالب پرروشنی ڈالی الوہیت وتوحید اور صمدیت کا مطلب بیان کیا، تخلیق وتولید کا فرق واضح کیا، غالباً تین روز میں تفسیر قل ھواللہ مکمل ہوئی۔ سامعین اس سورت کی جسے وہ اپنی پنج وقتہ نمازوں میں پڑھا کرتے تھے تفسیر وتشریح سے بہت متاثر ہوئے اورممبران وصدر منتظمہ کمیٹی مسجد نواب خسرومرزا صاحب نے کہا کہ اب آپ ہی اس مسجد میں ترجمہ وتفسیر کا درس دیا کریں، مولانا نے ہرچند منع کیا، لیکن دوسری طرف سے پیہم اصرار کی وجہ سے مولانا نے تفسیر کا درس شروع کیا۔تصوف پر گہری نظر اوروسعتِ معلومات کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہوتا ہے:

چند سال قبل میں اورمولوی ڈاکٹر ماجد علی خاں لیکچرر جامعہ کالج مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، ڈاکٹر ماجد علی خاں باضابطہ سلسلۂ تصوف میں داخل ہیں نیز رموزِ تصوف سے واقف، گفتگو کا رُخ تصوف اور وحدت الوجود کا باضابطہ نظریہ پیش کرنے والے حضرت محی الدین ابن عربی اوران کی ادق کتابوں کی طرف مڑ گیا۔مولانا نے اس وقت طویل تقریر نہیں کی بلکہ چند سوالات کیے اورمختصر طور پر چندرموز تصوف بیان کیے، جس پر ماجد علی خاں صاحب کہنے لگے کہ آج معلوم ہوا کہ ہم بے پڑھے لکھے ہیں ہم نے اس موضوع پر کچھ نہیں پڑھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ذکر تھا مجلس عرس وبزم مقالات حضرت نظام الدین اولیاء کا، مولانا فرمانے لگے کہ یہ لکھنا اور بیان کرنا بہت آسان ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کی کب اور کہاں ولادت ہوئی، لباس کیسا پہنتے تھے، کھانا کیسا تناول فرماتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔لیکن حضرت کی زندگی کا اصل مقصد، جس کی تبلیغ میں حضرت نے اپنی عمرعزیز صرف کردی یعنی حقیقت تصوف، یہ ہرایک کے بس کی بات نہیں اوراصل چیز یہی ہے۔بعض اوقات تصوف خصوصاً نظریۂ وحدت الوجود پر نجی صحبتوں میں نہایت بصیرت افروز تقریر فرماتے، رموز واشارات تصوف جابجا ان کی تفسیر 'بیان السبحان' میں پائے جاتے تھے۔ان کے منتسبین میں بہت کم حضرات کو یہ معلوم ہوگا کہ مولانا جلالی نظریۂ وحدت الوجود کے قائل وحامی تھے۔

مولانا جلالی مرحوم ذہانت کے اعتبار سے عبقری (جینیس) تھے۔ان کی ذہانت کے بہت سے واقعات ہیں جوان کے شاگردوں اوراحباب کو یاد ہوں گے، میں چندمختصر واقعات اس سلسلے میں بیان کروں گا۔

مولانا جلالی مرحوم کے فارسی زبان وادب کے آخری امتحان منشی فاضل جو اس زمانے میں نہایت مشکل اوراہم امتحان ہوتا تھا کے پاس کرنے کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔مولانا نے ارادہ کیا منشی فاضل کے امتحان دینے کا جب کہ صرف ۲۵روز بعد امتحان ہونے والا تھا۔علی نقی صاحب شادماں جو فارسی امتحانات کے مدرسہ عالیہ میں انچارج تھے، ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ نصاب کی کتابیں آپ کے پاس ہیں نہیں، دن بہت تھوڑے باقی ہیں آپ کیسے امتحان دیں گے؟ مولانا نے اپنے بردار حقیقی مولوی سید عبدالسلام میاں صاحب سے کہا کہ امتحان ضرور دوں گا۔رام پور کے ایک اورصاحب جن کے والد سے مولانا کے والد بزرگوار کے تعلقات تھے منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہورہے تھے، ان کے والد ہی کے ذریعہ طے ہوا کہ ان کی کتابیں مستعار لی جائیں چنانچہ ایک کتاب صبح ساڑھے نو بجے لی جاتی تھی اور پانچ بجے شام واپس کردی جاتی تھی، یعنی ایک کتاب کا مطالعہ صرف ایک روز کیا، بس یہی تیاری تھی۔امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔

وزیر احمد صاحب ہیڈ ماسٹر مرتضیٰ اسکول رام پور نے فارسی میں ایم۔اے کا امتحان مولانا سے پڑھ کر دیا تھا، موصوف فرماتے تھے کہ میں نے ایسا انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا، فارسی کی جو کتاب اُن کے سامنے رکھ دیتا ہوں، بغیر مطالعے کے اپنی ذہانت سے اُس کا مطلب سمجھا دیتے ہیں، گھر آ کر جب قاآنی اور خاقانی کی شروح دیکھتا ہوں، تو سب کچھ وہی ہوتا ہے جو مولانا سمجھا دیتے ہیں۔

غالباً ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ رام پور تشریف لائے، مدرسہ عالیہ رام پور میں آپ کے خطاب سے قبل چند توصیفی کلمات حضرت شیخ الاسلام کی شان میں مولانا جلالی نے کہے۔ مولانا مدنی نے اپنی تقریر میں اظہار ناراضگی فرمایا کہ لوگ میرے متعلق تعریفی کلمات کہنے میں مبالغہ کرتے ہیں جو نا مناسب ہے، تقریر ختم ہونے کے بعد مولانا جلالی شکریہ ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور برجستہ اُن کلمات توصیفیہ کی بہت عمدہ فلسفیانہ انداز میں تشریح کی اور ایک ایک تعریفی جملے کا جو انھوں نے مولانا مدنی کے متعلق کہے تھے ترجمہ کیا اور کہا کہ میں نے مبالغہ نہیں کیا، کیا حضرت مدنی ان صفات سے متصف نہیں ہیں، حضرت مدنی مسکرانے لگے۔

شروع میں، میں نے عرض کیا تھا کہ مولانا عبدالدائم صاحب خطابت و تحریر دونوں میدانوں کے شہ سوار تھے لیکن اُن کی خطابت سے عوام کم اور خواص زیادہ مستفید ہوتے تھے، مولانا پیشہ ور واعظ نہیں تھے، اس لیے اُن کی تقاریر میں اُتار چڑھاؤ نہیں تھا اور نہ ان کی تقریر میں لطائف وقصص ہوتے تھے، لیکن موصوف کی تقریر بے جھجک سادہ اور ایسی مربوط ہوتی کہ اگر لکھ لی جائے تو ایک مبسوط مقالہ تیار ہو جائے بلکہ تقریر مقالہ ہی ہوتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ غالب اکیڈمی میں ایک ماہر پروفیسر کا اردو میں ایک مقالہ سنا، کچھ لوگوں کا اور خود میرا یہ خیال تھا کہ پروفیسر موصوف تقریر کر رہے ہیں، لیکن معاً یہ خیال وتعجب ہوا کہ ایسی مربوط تقریر مولانا جلالی کے علاوہ کون کر رہا ہے فوراً ہی تعجب رفع ہو گیا، پروفیسر موصوف مقالہ پڑھ رہے تھے تقریر نہیں کر رہے تھے۔ مولانا جلالی کی گفتگو بھی مربوط اور منطقی اسلوب پر ہوتی تھی۔

مولانا کا دوسرا اہم میدان تصنیف وتالیف ہے۔ جس کے باعث وہ وفات کے بعد بھی زندہ رہیں گے اور طالبانِ علم وجویانِ حق ان کی تالیفات سے مستفید ہوتے رہیں گے اور یہ عبادت مولانا مرحوم کی آخرت کے لیے باعث اجر ہوگی۔ انشاء اللہ

اپنے ابتدائی دور میں تقریباً پچاس ساٹھ سال قبل مولانا جلالی مرحوم نے ایک ماہنامہ ''معلّم عربی'' کے نام سے شائع کیا جس میں ایک جانب عربی ہوتی تھی اور دوسری طرف اردو۔ دوسرا مجلّہ جس کا اجرا پہلے ''اتحاد'' اور پھر ''اتحاد اسلامی'' ے نام سے کیا گیا، اس رسالے کی مجلس ادارت میں مشہور شاعر راز یزدانی اور محشر عنایتی شامل تھے، رئیس التحریر مولانا سید عبدالدائم صاحب تھے۔ اس رسالے کے مضامین سے مولانا کی وسعتِ معلومات اور ایک لائق صحافی ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

غالباً اسی زمانے میں مولانا مرحوم نے ایک کتاب ''شعر العرب'' علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ''شعر العجم'' کے طرز پر تالیف کرنا شروع کی تھی، جاہلی شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ پہلی جلد کی شکل بطور مسودہ مولانا کے بردار خورد جناب مولانا سید عبدالسلام میاں کے پاس موجود ہے، اگر یہ کتاب طبع ہو جاتی تو طلباء واساتذۂ ادب عربی کے لیے کافی ادبی وعلمی سرمایہ مہیا ہو جاتا۔ اور اُسی دور میں مولانا نے استاذ عبدالحسین عراقی کی تالیف ''الزهورفی رامنبور'' کے لیے عربی میں کافی مواد فراہم کیا، یہ کتاب رام پور اور نوابان کی بزبان عربی تاریخ ہے۔

مولانا سید عبدالدائم صاحب کثیر الترجمہ اور سریع الترجمہ تھے۔ تقریباً پچاس سال قبل صحاح ستہ میں سے پانچ کتابوں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ تجرید بخاری اور مشکوۃ المصابیح کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ یہ سب تراجم زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ کتب مذکورہ کا سادہ اور شستہ زبان میں ترجمہ کیا ہے جو اس قدر عمدہ اور جامع ہے کہ ترجمہ پڑھنے کے بعد شرح کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حدیث شریف کا معیار، نیز احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ان تراجم سے عوام وخواص دونوں مستفید ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ سنا گیا ہے کہ ان میں سے بعض تراجم حال میں بعض چور مصنفین نے اپنے نام سے شائع کئے ہیں۔

امام اولیاء حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی کتاب ''غنية الطالبين'' کا ترجمہ بھی اُنھیں کا کیا ہوا ہے جو پاکستان میں عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔ ایک چھوٹا سا رسالہ ''مبادیِ منطق وفلسفہ'' طلباء کے لیے تحریر کیا ہے، جو دس روز کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ رسالہ داخلِ نصاب جامعہ طبیہ وطبیہ کالج ہے۔ تفاسیر کے ذکر سے قبل ایک عربی کتاب ''الغزو الفكرى'' کے ترجمے کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ کتاب موجودہ دور کے ایک اخوانی عالم کی ہے، جس میں جدید

اصطلاحات بھی استعمال کی گئی ہیں، یہ ترجمہ جماعت اسلامی کے کسی معتمد کے پاس محفوظ ہے طبع نہیں ہوا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہیں ہوگا کہ مولانا کو عربی بولنے پر گو زیادہ قدرت نہیں تھی، لیکن سمجھنے، پڑھانے اور ترجمہ کرنے پر چاہے جدید عربی ہو یا قدیم قدرت تامہ رکھتے تھے، لغت وادب عربی کے ماہر تھے۔

اُن کی ایک اور اہم کتاب ''لغات القرآن'' ہے غین سے یاء تک (الف سے عین تک مولانا عبدالرشید نعمانی کی تالیف ہے) یہ ایک علمی کتاب ہے جس میں قرآن عظیم میں مستعمل کلمات کے معانی ومطالب نہایت تحقیق ومحنت سے بیان کیے گئے ہیں، جیسا کہ کتاب کے نام سے بھی ظاہر ہے۔ طابع و ناشر ندوۃ المصنفین دہلی ہے، اس تالیف سے اہل علم، طلاب ومدرسینِ مدارسِ عربیہ استفادہ کرتے ہیں۔ مجھ سے اسلامیات وعربی کے ایک فاضل استاذ فرماتے تھے کہ ترجمۂ احادیث تو عوام کے لیے ہے، لیکن لغات القرآن سے ہم لوگ یعنی اساتذہ اور مدرسین اکتساب فیض کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ تفسیر مظہری کا ترجمہ بھی مولانا مرحوم کا مشہور ومعروف کارنامہ ہے۔ قرآن کریم کی ہندوستان میں لکھی جانے والی تفاسیر میں عربی زبان میں یہ عظیم ترین تفسیر ہے۔ یہ قول بروایتِ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی محدث اعظم علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا ہے۔ اس تفسیر کے مؤلف ہیں علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی شاگرد رشید امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور خلیفہ حضرت میاں جان جاناںؒ۔ اس کا تشریحی ترجمہ ضروری اضافات کے ساتھ بزبان اردو، مولانا سید عبدالدائم صاحب جلالی نے کیا ہے جو گیارہ ضخیم جلدوں میں ہے۔ مولانا نے یہ ترجمہ ساٹھ سال کی عمر کے بعد شروع کیا تھا، گویا یہ آپ کے آخری دور کی یادگار ہے۔ ترجمہ بہت عمدہ اور صاف وسادہ ہے کہ ہر ایک پڑھنے والا سمجھ لے اور مطمئن ہوجائے، آسان زبان میں ہے جو مولانا کی زبان اور تحریر نہیں معلوم ہوتی اور ضروری اضافات بشکل نوٹس کا انداز تحریر نہایت مشکل اور فلسفیانہ ہے جو مولانا کا طرز نگارش ہے، تعجب ہے کہ ایک ہی کتاب میں تحریر کے دو اسلوب ہیں جو مولانا کے ماہر ترجمہ ہونے پر دال ہیں، غالباً ترجمے میں مؤلف کے اسلوب وطرز کی اتباع وپابندی کی ہے اور اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ہر شخص کتاب کے مفہوم کو سمجھ لے اور ضروری اضافات میں اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔

چونکہ مولانا جلالی خود ایک لائق مفسر تھے اس لیے اضافات میں کہیں کہیں مؤلف سے نہایت ادب کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ ترجمہ کتابت و طباعت اور کاغذ کے اعتبار سے بہت عمدہ اور لائق تحسین ہے، جو حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہ کے علم وفضل، حسن ذوق اور آپ کے ادارے ندوۃ المصنفین کے سلیقۂ اشاعت کتب کا مظہر ہے، مفتی صاحب اس لیے بھی قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمے کے لیے سید عبدالدائم صاحب جیسے لائق مفسر اور ماہر مترجم کا انتخاب کیا۔

آخر میں مولانا جلالی کی اہم اور مایۂ ناز تالیف کا جس پر موصوف کو بھی ناز تھا۔ تفسیر قرآن عظیم جو ''بیان السبحان'' کے نام سے موسوم ہے کا ذکر کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہ تفسیر وسیم بک ڈپو، فائن آرٹ پریس دیوبند سے ۳۰ پاروں میں شائع ہوئی ہے، کتابت وطباعت کے اعتبار سے ناقص ہے بلکہ طباعت کتابت سے زیادہ قابل مذمت اور سونے پر سہاگہ ہر ہر پارے کے آخری صفحہ پر اشتہارات ہیں، کچھ پاروں کے آخری صفحات پر فیشن ایبل گھڑیوں، برقعوں اور زیورات کے اشتہارات بھی ہیں، اس پر مولانا مرحوم بھی اظہار افسوس کیا کرتے تھے۔

بیان السبحان موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے جو قدماء کے طرز پر لکھی گئی ہے اور جس میں دلائل نقلیہ وعقلیہ دونوں بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا نے ترتیب اس طرح رکھی ہے، پہلے ترجمہ آیات قرآنی کا بین السطور میں، اس کے بعد تفسیر تفصیلی طور پر جس میں مفسرین کے اقوال بیان کرنے کے بعد قوی قول کو ترجیح دی گئی ہے، بعد ازاں مقصود بیان یعنی خلاصۂ آیات جو نہایت جامع ہوتا ہے اور آخر میں اکثر مقامات پر رموز واشاراتِ تصوف۔ کہیں کہیں نکات اور ضروری ہدایات کا عنوان بھی قائم کیا گیا ہے اور کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتے ہیں لیکن قرآن وسنت واقوال صحابہ کی روشنی میں بقدرِ امکان غور کرکے کلام الٰہی کے سربستہ راز سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ ہم کو انہی کی (یعنی صحابہ) کی پیروی کرتے ہوئے قرآن مجید کے معارف جاننا اور کلام پاک کی تفسیر سمجھنا فرض قطعی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے، اس کی عبارت میں روانی وشگفتگی ہے، زبان کے اعتبار سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن بھی ایک عظیم تفسیر ہے بلکہ علماء کی رائے ہے کہ نقش اوّل مولانا آزاد کا ترجمان القرآن ہے اور نقش ثانی مولانا مودودی کی تفہیم القرآن اضافات کے ساتھ، لیکن باعتبار کثرت اقوال مفسرین وطریقۂ متقدمین اور رموز تصوف، مولانا جلالی کی تفسیر منفرد

ہے۔ یہ تفسیر عوام ہی کے لیے نہیں بلکہ اس سے خواص بھی جن میں طلباء واساتذہ اورصوفیاء بھی شامل ہیں استفادہ کرتے ہیں۔ایک اقتباس بطورنمونہ ملاحظہ ہو:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (البقرہ:۱۲۹)

تفسیر: گذشتہ آیات میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوضمنی طور پر دعائے ابراہیمی میں دخل تھا۔حضرت ابراہیمؑ نے صرف امت مسلمہ کے لیے دعا کی تھی۔اس آیت میں حضرت ابرہیمؑ صراحۃً اپنی دعا میں حضورِگرامی کا تذکرہ کرتے ہیں اوراس امر کوظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ کعبہ کی حفاظت اور نگہداشت امت مسلمہ کرے گی، لیکن امت مسلمہ کوضرورت ایک سردار کی ہوگی جو ہرطرح سے اس امت مرحومہ کی قیادت کرے گا اورتمام سعادت وبرکات اسی کے چشمۂ فیض سے وابستہ ہوں گی۔مطلب یہ ہے کہ الٰہی امت مسلمہ کے لیے ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمانا اور یہ رسول نہایت عظیم الشان عالی مرتبہ ہو، اس کے اندر وہ اوصاف واخلاق اورنورومعارف موجود ہوں جس سے عام و خاص، جاہل وعالم،تاریک دماغ رکھنے والا اورنورِفطری کے حامل سب یکساں فیض یاب ہوں اور ہرشخص اُس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو۔''

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ یعنی عام لوگوں کوتیری آیات اورمقدس کلام پڑھ کرسنائے، اُن کوشریعت الٰہیہ کے ظاہری احکام بتائے۔

وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰب یعنی جولوگ عالم ہیں،لیکن علماء میں ان کا مرتبہ امتیازی نہیں بلکہ عمومی ہے، توایسے علماء کو وہ کتاب مقدس کی تعلیم دے،احکام اورادلّہ بتائے،فروع واصول سے واقف کرے اور دلائل توحید ونبوت سمجھائے۔

وَالْحِكْمَةَ یعنی جولوگ علماء میں امتیازی شرف رکھتے ہیں،قوت اجتہاد کے مالک ہیں،علمی تبحر اوروسعتِ معارف کی وجہ سے صرف احکام وادلّہ کاعلم ان کے لیے سیرکن نہیں ہے بلکہ اُن کو اسرارِحقائق کی ضرورت ہے توایسے لوگوں کو اسرارشریعت کی تعلیم دے،حقائق ومعارف الٰہیہ بتائے، رموز کتاب سے واقف کرے۔

وَيُزَكِّيْهِمْ یہ مرتبہ خاصانِ خاص کا ہے،اولیائے امت ہی اس مرتبہ سے سرفراز ہیں ان کے نفوس قدسیہ ہوبہ ہوکمالِ نبوت کا آئینہ ہیں، جن کے اندر نورِ نبوت چمکتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ وہ نبی روشن روح رکھنے والوں کے تزکیہ کا بھی سبب ہے، اُن کے آئینہ دل میں اپنی روحانی تعلیم کے پانی سے تمام سیاہی اور زنگ دورکرکے اپنے فیوضِ قدس اورنورِرسالت سے اُن کومنور کردے۔

مقصودِ بیان:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اورتمام امت مسلمہ، حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی دعا کا نتیجہ ہے۔

امت اسلامیہ میں چار طبقات ہیں: عام، خاص، خاص الخاص، اخص الخاص۔ عام کی ہدایت کے لیےصرف معجزات اورظاہری آیات قرآنیہ اورفرامینِ نبویہ مخصوص ہیں۔ خاص کی ہدایت کے لیے احکام،ادلّہ،فروع واصول،دلائل توحید وبراہینِ رسالت کاعلم ضروری ہے۔خاص الخاص کے افادے کے لیے اسرارشریعت،حقائق ومعارف اوررموز کی تعلیم ضروری ہے۔

اخص الخاص میں تخلیۂ رذائل اورتحلیہ بالفضائل کا مادہ توموجود ہی ہوتا ہے اُن کی روحیں سعید اور دل مادۂ ہدایت سے لبریز ہوتے ہیں،لیکن تخلیہ کے بعدان کے قلوب کی صفائی اورتجلیہ وتزکیہ کی بھی احتیاج ہے، اور یہ سب کام جس حسن و خوبی سے حضوراقدس ﷺ نے انجام دیے وہ عدیم النظیر ہیں۔حضوروالا اشرف المخلوقات،اشرف الانبیاء اورخاتم النبین ہوئے۔ سچ ہے۔

كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُولِهِم، آیت[یہ آیت نہیں ہے۔مرتب] میں ایک لطیف تلمیح اس طرف بھی ہے کہ ہرشخص کا فرض ہے کہ وہ ہرمرتبے کوطے کرکے اوپر والے درجے میں پہنچنے کی کوشش کرے تاکہ انتہا پرپہنچ کرکمالات محمدیہ کامکمل آئینہ اورمجسمۂ اخلاق بن جائے۔اسی لیے حضوراکرم ﷺ نے فرمایا کہ علماء امتی کأنبیاء بنی اسرائیل۔

آخرمولانا واستاذنا حضرت سیدعبدالدائم صاحب کی زندگی کے متعلق چند ضروری معروضات اوربعض حضرات کے سوالات کے جوابات بھی عرض کر دوں۔مولانا مرحوم کبھی بھی طالب شہرت نہیں ہوئے، اسی لیے وہ عوام میں ایسی شہرت وقبولیت حاصل نہ کرسکے جس کے وہ مستحق تھے۔خواص میں وہ ضرورایک مشہور ومستند عالم تھے،لیکن یہ شہرت بھی بہت زیادہ نہیں تھی، اپنے بے پناہ علم و فضل کے اعتبار سے دوسرے عظیم ومشہور علماء کی طرح وہ بلند مقام حاصل نہ کرسکے، جس کاانھیں استحقاق تھا، اس میں علاوہ خواہش وطلب شہرت نہ ہونے کے دوسرے موانع بھی ہیں۔

۱) گوشہ نشینی،عوام سے ربط زیادہ نہ ہونا۔

۲)اظہارصداقت وبیبا کی جس سے عوام توعوام خواص بھی گھبراتے تھے۔

۳)جلال سادات۔

ایک بات اوربھی عرض کردوں، پیراں نمی پرند ومریداں می پرانند،مولانا

کی پشت پر کوئی ایسا مدرسہ یا جماعت نہیں تھی جو اُنھیں اُن کا صحیح مقام دلاتی اور اُن کے علم وفضل کا پروپیگنڈہ کرتی۔

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جس کا میں نے بارہا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ نہایت قابل لوگ بھی اور ایسے حضرات بھی جو ہر وقت مباحثے کے لیے تیار رہتے تھے، مولانا سے علمی گفتگو کرتے ہوئے گھبراتے تھے، اور اُن کے منطقی دلائل سے لاجواب ہوجاتے تھے، نیز بریلوی و دیوبندی دونوں مکاتب فکر کے علماء اُن کا اکرام اور اعتراف علم وفضل کرتے تھے یا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔

ایک شیعہ عالم ومجتہد کا واقعہ مجھے یاد ہے، موصوف کا نام تھا مولانا محسن نواب کے جو عربی کے لائق ادیب بھی تھے اور عراق میں بارہ سال رہ کر تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے جدید عربی بولنے اور لکھنے پر قدرت تامہ رکھتے تھے، میں نے ان سے عربی شعر کی کتاب حماسہ پڑھی ہے، اکثر اشعار کا ترجمہ عربی میں ہی کیا کرتے تھے۔ مولانا محسن نواب صاحب مدرسہ عالیہ رامپور میں پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے اور مولانا جلالی کے استاذ درجۂ فاضل، شیخ القراء قاری عبدالواحد صاحب نے اپنی سندِ قرأت جدید عربی اسلوب کے مطابق ترمیم کے لیے میرے ذریعے مولانا محسن نواب کے پاس بھیجی لیکن موصوف نے یہ سن کر کہ مولانا جلالی بنظر اصلاح یہ سند ملاحظہ فرما چکے ہیں، ترمیم واصلاح سے یہ کہہ کر سختی سے انکار کردیا کہ ایک بزرگ عالم کی اصلاح ومعائنہ کے بعد میں ہرگز اصلاح نہیں کروں گا، ایک لفظ کے بھی اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر مولانا جلالی مرحوم کی زندگی کے مندرجہ ذیل گوشوں پر روشنی نہ ڈالوں۔

مولانا مرحوم کے نزدیک مسلمانوں کی اقتصادیات شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں سدھارنے کا کام بہت اہم تھا، وہ ہمیشہ اپنی گفتگو میں اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ تعلیمات اسلامی کے مطابق مسلمان کا مالی نظام ہونا چاہیے، وہ فرماتے تھے کہ عبادات، نماز وروزے کے ساتھ ساتھ معاملات کی درستگی پر بھی زور دینا چاہیے کہ یہ بھی عبادت ہے اور دلیل عقلی سے ثابت کرتے تھے کہ اسلام کا معاشی نظام دنیا کے ہر اقتصادی ومعاشی نظام کو چیلنج کرتا ہے کہ اس سے بہتر معاشی نظام کسی بھی ازم کے پاس نہیں ہے اور اس سے مکمل طور پر مسلمان اپنی پسماندگی دور کرسکتا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا نے حضرت محمد یوسف صاحب امیر جماعت تبلیغ سے کہا تھا کہ مولانا آپ اپنی تبلیغی سرگرمیاں صرف پابندی نماز و روزہ اور چلّہ وگشت تک محدود نہ رکھیں، بلکہ اپنے نصاب تبلیغ میں مسلمانوں کے مالی نظام کی اصلاح کو بھی شامل کرلیں، جو لوگ گشت یا چلہ کے لیے کسی آبادی میں جائیں ان کے ذمہ یہ بھی قرار دیں کہ وہ تلاش کریں کہ اس گاؤں یا محلے میں کوئی ننگا بھوکا تو نہیں ہے، اگر ہے تو اس کی ضرورت وہاں کے رہنے والے دوسرے مالدار وصاحب حیثیت افراد سے پوری کرائیں۔ مولانا یوسف صاحب مرحوم ومغفور نے اس رائے سے اتفاق کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس کی افادیت و ضرورت سے انکار نہیں ہے اور میں اس سلسلے میں غور کروں گا۔

دوسری اہم بات، مولانا جلالی موجودہ دور کے جدید مسائل کو تعلیمات اسلامی کی روشنی میں بہت عمدہ طریقے سے حل فرماتے تھے اسی لیے وہ سائنس کی تعلیم کو بہت اہم قرار دیتے تھے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نئی نسل کے نیا ذہن رکھنے والے جدیدیت پسند یا عقلیت پرست حضرات بھی مولانا کے پاس آتے تھے، اور مولانا کی گفتگو سے متاثر ہوتے تھے، مولانا کبھی ایسے حضرات کی دل آزاری نہیں کرتے تھے، ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے تھے اور اپنی مدلل گفتگو سے انھیں قائل اور اُن کے شکوک کو رفع فرمادیتے تھے نیز انھیں مسائل حاضرہ کو شریعت اسلامیہ کی روشنی میں سوچنے پر مجبور کردیتے تھے۔

عمر کے آخری حصے میں مولانا مرحوم مدرسہ عالیہ فتح پوری (دہلی) میں استاذ اور مفتی رہے۔ میں اپنا مقالہ مولانا کے عزیز ساتھی قاری سید محمد میاں استاذ مدرسہ عالیہ فتح پوری کے اس قول پر جو موصوف نے مولانا مرحوم کی وفات کے دوسرے روز کہا تھا ختم کرتا ہوں، قاری صاحب نے فرمایا کہ کل علم کی ایک تاریخ لپٹ گئی۔ تغمده الله في فسيح جناة۔ [محمد نظر علی خاں رام پوری، مارچ ۱۹۸۴ء]

عثمانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن

آہ! مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

ترکش ما را خدنگ آخریں!

اس خامۂ حرماں نصیب نے برہان کے ۴۵ برس کے دور زندگی میں نہ جانے کتنے مشاہیر عالم و نامور ان روزگار کی وفات پر ماتم سرائی کی اور ان کے درد وفراق میں رنج والم کے آنسو بہائے ہیں، لیکن واحسرتا! آج اسے اس عظیم شخصیت کی جدائی پر نوحہ خوانی کرنا ہے جو خود ندوۃ المصنفین کی بانی مبانی تھی اور جس کا نقش گرم برہان کے اپنے وجود وبقا کا ضامن اور اس کا کفیل تھا یعنی حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی جو طویل علالت کے بعد ۱۲/مئی ۱۹۸۴ء کو

ساڑھے تین بجے بعدظہر جان جان آفریں کوسپرد کرکے رحلت گزائے عالم جاودانی ہوئے،۱۳مئی کودلی کی جامع مسجد میں ۸ بجے صبح کونماز جنازہ ہوئی جس میں مسلمانوں کے ہرطبقہ اور ہر جماعت کے ہزاروں عقیدت مندوں نے شرکت کی اور مہندیوں کے قبرستان میں جسے شاہ ولی اللہ دہلوی اورآپ کے خانوادۂ گرامی نے برصغیر کاجنت البقیع بنادیاہے، تدفین ہوئی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب کی ذات اورشخصیت ایسے اوصاف وکمالات کی جامع تھی جن کا فی زمانہ شخص واحد میں جمع ہونا شاذونادرہی ہوسکتاہے۔آپ دیوبند کے نامی گرامی خاندان عثمانی کے چشم وچراغ تھے جواپنے علمی و دینی امتیازات و خصوصیات کے باعث نہ صرف قصبہ میں بلکہ پورے ضلع میں نہایت ممتاز رہا ہے،مفتی صاحب کے جدامجد مولانا فضل الرحمٰن دارالعلوم دیوبند کے چار بانیوں میں سے ایک تھے اورخود بڑے صاحب علم وفضل تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو اولاد ذکور عطافرمائی ان میں شیخ المشائخ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اورحضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی تھے جوآسمان علم وفضل اورافق شریعت وطریقت پرآفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور ایک عالم کو اپنی ضیابخشیوں سے منور کرگئے۔ ان ہر سہ اصحاب ثلاثہ میں موخر الذکر دونوں بزرگ لاولد تھے البتہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے اورمتعدد بیٹیاں عطافرمائیں۔ان دو بیٹوں میں بڑے صاحبزادہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی تھے اور ان کے برادر خورد قاری جلیل الرحمٰن عثمانی ہیں جو دارالعلوم دیوبند میں درجہ تجوید وقرأت کے پرانے استاد ہیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی بچپن سے ہی بڑے ہونہار تھے، نہایت ذہین وذکی، لکھنے پڑھنے کے شوقین،طبیعت کے نیک اورصالح،ان اوصاف کے باعث حضرت مفتی صاحب کوآپ سے بڑی محبت تھی اورآپ نے ان کی تعلیم و تربیت پرخصوصی توجہ مبذول فرمائی، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے قرآن مجید تجوید وقرأت کے ساتھ حفظ کیا پھردارالعلوم کے درجۂ فارسی میں داخل ہوئے تو اس درجہ کے صدرمولانا محمد یسٰین صاحب تھے، یہ فارسی کے نامور اور بڑے لائق و فاضل استاد تھے،مفتی صاحب نے ان سے خاطرخواہ استفادہ کیا جس کی وجہ سے ان کا فارسی ادب اورشعروشاعری کا ذوق اعلیٰ اوررگ رگ میں رچابسا تھا۔ فارسی درجہ کی پنج سالہ تعلیم کی تکمیل کے بعدمفتی صاحب عربی کے درجہ میں داخل ہوئے تو سبحان اللہ! یہاں کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ یہ زمانہ دارالعلوم کے شباب اور اوج کمال کا تھا۔ ہراستاد اپنے فن میں نابغہ روزگار اورمیدان تعلیم وتربیت کا شہسوار،علم وفضل،تقوی وطہارت اورعلوم کے درس کی وہ گرم بازاری تھی کہ پورا برصغیراس کے زمزموں سے گونج رہا تھا۔مفتی صاحب نے اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت اورشوق وذوق طلب علم کے باعث اس سرچشمۂ فیوض وبرکات سے سیرابی وکام جوئی میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا،نتیجہ یہ ہواکہ ہردرجہ میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے چلے گئے اورآخر میں دورۂ حدیث میں بھی فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔

طالب علمی سے فراغت کے بعد ان کودرس اورافتاء کی خدمات سپرد کی گئیں،حسن تقریر کا ملکہ خداداد تھا اور استعداد پختہ، جلد ہی مدرس اورمفتی کی حیثیت سے دارالعلوم میں ان کی شہرت ہوگئی، پھر حضرت شاہ صاحب اور دوسرے اکابر کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں منتقل ہوئے تو وہاں طبقۂ علیا کے استاد اورمفتی کی حیثیت سے یہ دونوں خدمات بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ڈابھیل میں چند برس قیام کے بعدکلکتہ پہنچے، وہاں کولوٹولہ اسٹریٹ کی مسجد میں برسوں خطیب رہے اورساتھ ہی درس قرآن کا مشغلہ جاری رہا۔قیام کلکتہ کے زمانہ میں ہی انھوں نے اسلامیات پرمعیاری کتابوں کی تصنیف وتالیف اور ان کی عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ اشاعت کی غرض سے ایک ادارہ قائم کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ چنانچہ۱۹۳۷ء میں وہ دہلی آگئے اور یہاں ندوۃ المصنفین اورمجلّہ 'برہان' کی بنا ڈالی،ان برسوں میں اس ادارہ اوراس کے مجلّہ نے علم ادب اور اسلامیات کی جوعظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔ یہ سب کچھ بلاشبہ مفتی صاحب کی غیرمعمولی قوت عمل،جذبہ،فہم وفراست اورحسن نظم ونسق کے باعث ممکن ہوسکا۔

ایک انسان کا زندگی میں عظمت اور کامیابی حاصل کرنا تین چیزوں پر موقوف ہے: جذبہ،شعوراورقوت عمل،مفتی صاحب میں یہ تینوں اوصاف بدرجۂ اتم تھے۔ دارالعلوم کی روایات کے مطابق استخلاص وطن کا جذبہ شروع سے تھا اس لیے انھوں نے کانگریس کی تحریک آزادی اوراس سلسلے میں اس کے منصوبوں اور پروگراموں کی ہمیشہ تائید واعانت کی۔ جمعیت علمائے ہند کے صف اوّل کے زعما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔۱۹۶۲ء میں صدارت کے معاملہ میں ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی تو وہ جمعیت سے کنارہ کش ہوگئے اوراب آل انڈیا مجلس مشاورت ان کی عملی سرگرمیوں کی جولانگاہ بن گئی۔مفتی صاحب کی شخصیت اورملک میں ان

کے وقار اور حیثیت سے ہر طبقہ اور ہر جماعت کے لوگوں نے فائدہ اٹھایا لیکن مفتی صاحب جس کھلے دماغ کے انسان تھے اس کا ساتھ بہت کم لوگ دے سکے اس لیے افسوس ہے کہ مجلس مشاورت میں کھنڈت پڑگئی اور اس کے متعلق مفتی صاحب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا جس کا رنج ان کو آخر تک رہا۔

مفتی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک پختہ استعداد کے وسیع النظر عالم دین ہونے کے باوصف ایک بلند پایہ سیاسی رہنما بھی تھے، جو بات کہتے دماغ سے اتار کر کہتے تھے، تقریر اور تحریر دونوں کا اسلوب بڑا دل نشیں اور موثر ہوتا تھا۔ اسلامی معاشرہ اور عام پبلک میں ان کا بڑا اعتبار تھا اور دوسری جانب گورنمنٹ بھی ان کا بڑا لحاظ رکھتی اور ان کی عزت کرتی تھی۔ وہ نہایت بے لوث و بے غرض، حد درجہ خوددار، حق گو اور بیباک انسان تھے انھوں نے اپنے اثر ورسوخ سے ہزاروں کو فائدہ پہنچایا مگر کبھی کسی سے فائدہ کی امید نہ باندھی، وہ اگر پسند کرتے تو گورنمنٹ سے انھیں کیا کچھ نہ مل سکتا تھا لیکن جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا اندیشہ ہو مرحوم کو طبعًا اس سے نفرت تھی، اخلاق و شمائل اور عادات وخصائل کے اعتبار سے وہ بڑے پاکیزہ سرشت اور بلند مرتبہ انسان تھے۔ عمر ۸۴ برس کی ہوئی۔ ان کی وفات بے شبہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے جس کو جلد نہ بھلایا جاسکے گا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وبرد مضجعہ۔

پس ماندگان میں ایک اہلیہ جو کم وبیش اٹھارہ برس سے خود صاحب فراش اور سخت علیل ہیں اور چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے مجیب الرحمٰن عرصہ سے حبشہ میں برسرروزگار ہیں، باقی سب اولاد یہیں دلّی میں ہے، ان میں سے دوسرے بیٹے منیب الرحمٰن اپنا کاروبار کررہے ہیں، سب سے چھوٹے فرزند نجیب الرحمٰن سرکاری ملازمت میں ہیں، تیسرے بیٹے عمید الرحمٰن نے ادارہ اور برہان کے نظم ونسق سنبھال رکھا ہے اور ماشاء اللہ بڑی سوجھ بوجھ اور محنت سے کام کررہے ہیں، صاحبزادی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ہمیشہ مفتی صاحب کے ساتھ رہی ہیں اور تمام خانگی انتظامات انھیں کے سپرد رہے ہیں، ان کے شوہر مولوی اظہر صدیقی ہیں، وہ بھی یہیں رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کی سوا دو برس کی شدید علالت کے زمانہ میں ان سب نے اور خصوصاً صاحبزادی نے خانہ داری کی ذمہ داریوں کے ساتھ مفتی صاحب مرحوم کی جو خدمت دن رات ایک کرکے کی ہے اس کی مثال شاذونادر ہی ملے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا حامی وناصر ہو اور اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین

برہان کی کاپیاں پریس کو جانے والی تھیں کہ یہ حادثۂ فاجعہ پیش آگیا، اس لیے کتابت شدہ نظرات کو روک کر یہ چند سطریں رواروی میں لکھ دی گئیں ہیں، ورنہ مفتی صاحب پر ایک مضمون ان شاء اللہ جلد ہدیۂ ناظرین ہوگا جس میں راقم مفتی صاحب سے اپنے ساٹھ برس کے عمیق تعلقات کی دلچسپ مگر صبر آموز داستان سنائے گا۔ [مئی ۱۹۸۴ء]

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی رحلت پر ملت اسلامیہ سوگوار

گذشتہ ماہ قارئین برہان پڑھ چکے ہیں کہ علم واخلاق اور رشد ہدایت کا جو آفتاب عالم تاب آج سے ۸۴ سال پہلے دیوبند کے افق پر طلوع ہوا تھا وہ اپنی نورانی کرنوں، روحانی واخلاقی ضیا پاشیوں، ملی وملکی خدمتوں اور انسانی ہمدردی و غمگساری کے جوہر دکھا کر، تقریر وخطابت اور تصنیف وتالیف کے میدانوں میں گراں قیمت ضوفشاں چراغ روشن کرکے اور تحمل وبردباری، اخلاق و شائستگی، بے نفسی اور عفو و درگزر کے تابندہ نقوش ثبت کرکے ۱۲/مئی ۱۹۸۴ء کو غروب ہوگیا۔ اس طرح ایک زریں عہد، ایک شاندار تاریخ، اور ایک ایسے تابندہ و روشن دور کا خاتمہ ہوگیا جس کے ہر موڑ، ہر رخ اور ہر پہلو میں شرافت و وضعداری، انسانیت دوستی اور سیر چشمی ونرم گفتاری کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی وحق گوئی کی لافانی نور افشاں اور تابناک شمع روشن تھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے انتقال کی خبر دہلی کے اندر اور اخبارات اور ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ ملک کے تمام صوبوں بلکہ بیرون ملک بھی بہت سی جگہوں پر ہوگئی ہر جگہ دینی، علمی اور ملی حلقوں کو تڑپا گئی۔ آپ کو وصال ۳ بج کر ۲۰ منٹ پر ہوا اور ۴ بجے حاجی کرامت اللہ نے مکہ مکرمہ میں بذریعہ فون عالم اسلام کی معروف و برگزیدہ شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو یہ اطلاع دی۔ آپ کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ہوئی اور اسی وقت سینکڑوں لوگوں نے حضرت مفتی صاحب کے ایصال ثواب کے لیے طواف کیا۔

علی میاں مدظلہ، نے سعودی ریڈیو سے ایک تقریر فرمائی جس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے علمی کارناموں، ملی خدمتوں، اخلاقی وانسانی اوصاف اور ان کی منفرد وممتاز صلاحیتوں اور عظمتوں کا تذکرہ فرمایا۔ ان کی وفات کو ملتِ اسلامیہ کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ مدینہ منورہ میں بھی کافی حضرات نے ختم کلام اللہ در ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔ حق تعالیٰ سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ دہلی، میرٹھ، غازی آباد، دارالعلوم دیوبند، لکھنؤ، بریلی، کلکتہ، حیدرآباد، بہار،

مدراس اور گجرات کے کئی شہروں اور مدارس اسلامیہ میں حضرتؒ کے لیے ایصال ثواب اور جلسہ ہائے تعزیت کیے گئے۔ اخبارات نے بھی آپ کے سلسلہ میں تعزیتی مضامین اور اداریہ وغیرہ شائع کیے۔ افریقہ، لندن اور دوسرے ملکوں سے بھی اس قسم کی اطلاعات مل ہیں جن کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

۱۲/مئی سے اس وقت تک یہ بات ہر حساس و باشعور قلب وروح کو محسوس ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب کے وصال سے ملی وقومی، اسلامی اور دینی اداروں کے سر پر ایک ایسا شجر سایہ دار کا سایہ اٹھ گیا ہے جو بڑے بڑے طوفانوں، تیز وتند آندھیوں اور بادسموم کے جھکڑوں سے ان سب کی حفاظت کا باعث تھا۔ اب زندگی کی تپتی ہوئی دوپہر میں کوئی سایہ نظر نہیں آتا۔ حق تعالیٰ اپنی رحمتوں کے سایہ سے ہم سب کو، پوری ملت کو اور خاص طور پر ان کے خونِ دل وجگر سے سینچے ہوئے گلشن علم وادب ___ ندوۃ المصنفین ___ کو محروم نہ فرمائے، ہر شر اور نقصان سے اس کی حفاظت فرمائے اور ہم سب کو حضرت مفتی صاحب کے روشن ومنور نقوش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

[محمد اظہر صدیقی، جون ۱۹۸۴ء]

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ایک سال بیت گیا ___ ۱۲/مئی ۸۴ء کو دن کے تین بجے ___ جب آسمان پر سورج اپنی پوری تابانیوں، حرارت اور تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا ___ ٹھیک اُس وقت ایک آفتاب درخشاں اور ماہتاب ضوفشاں غروب ہوگیا جو علم ودین، شریعت وطریقت، اخلاق وشرافت کی روشن روایات، تفقہ فی الدین، دانشمندی و فراست، دُور اندیشی و بصیرت کے آسمانوں پر گذشتہ تریسٹھ سال سے چمک رہا تھا۔ اور اپنی زرتاب کرنوں سے زندگی کے بہت سے میدانوں اور علم ودین، دانش وبینش کے ایوانوں، ادب وانشا کی محفلوں، تصنیف وتالیف کے چمنستانوں کو برابر اور مسلسل منوّر کررہا تھا۔ یعنی ملّتِ اسلامیۂ عالم کے مخلص رہنما خادم انسانیت مفکّر ملّت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ۸۳ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے رُخصت ہوگئے۔

ہاں وہ آفتابِ درخشاں غروب ہوگیا جس کی زرتاب کرنوں نے تاریخ کے صفحات کو اخلاص وایثار، خدمتِ خلق قرآن وسنت کی ترویج واشاعت کے بہت سے روشن اور گراں مایہ نقوش عطا کیے تھے، آہ وہ آفتاب جس کی بدولت اور جس کی مخلصانہ کوششوں سے کتنے نوجوانوں کے ذہن وفکر کے اُفق روشن ہوئے تھے، ان کو زندگی کے میدانوں، علم وادب کے شبستانوں اور درس وتدریس کے مسندوں کی رونق بننے کی صلاحیت ملی تھی۔

بلاشک وشبہ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی قیمتی ___ قیمتی زندگی ___ جہد مسلسل اور کوششِ پیہم کا نمونہ تھی۔ وہ ملّت کی تعمیر واصلاح کے اہم مقصد میں اور علم ودین کی ترویج واشاعت میں اس طرح لگے رہے کہ کوئی لمحہ بے فکری کا باقی نہیں رہا، اس لیے کہ وہ اس نبی برحق ﷺ کے شیدائی اور پیرو تھے جو رحمت للعٰلمین تھا، معلّم اخلاق تھا، محسنِ انسانیت تھا ___ راہ کی دشوار گذاریاں، پیچ وخم ___ راستہ کے نشیب وفراز اور ناہمواریاں ان کے پائے عزم وثبات میں کبھی لغزش نہ لاسکیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ زندگی کے آخری سانس تک ملّتِ اسلامیہ اور پوری انسانیت کی خدمت کے میدان میں پیہم، مسلسل اور لگاتار سرگرم عمل رہنا اس اُمت کے فرد کی حیثیت سے ان کا مقصدِ حیات اور فریضہ ہے جو خالقِ کائنات کی طرف سے خیر اُمت کے اہم لقب کے ساتھ اس زمین کے اوپر بھیجی گئی ہے۔

لاریب ___ ! کہ مفتی صاحب مجسم محبت تھے، مجسم شرافت تھے، ان کا قلب اک ایسا صاف وشفاف آئینہ تھا جس پر کسی کی بُرائی کا کوئی معمولی سا بھی داغ نہ تھا، تنگ نظری وتنگ دلی سے وہ کوسوں دُور رہے، وہ اسلاف واکابر اور روحانیت کے تاجدار بزرگوں، اولیائے کرام اور علمائے اسلام کے اس بلند و مقدس قافلہ کی یادگار تھے جس کے بغیر ہماری شاہراہ علم وعمل تنگ وتاریک دکھائی دیتی ہے۔ وہ عظمت کا منار بھی تھے، علم وتفقہ کا پہاڑ بھی تھے، فکر وتدبر کا ایسا روشن چراغ بھی تھے جس کی لَو آندھیوں کا مقابلہ کرتی ہے، طوفانوں اور سیلابوں کی تباہ کاریوں کے سامنے سینہ تانے کھڑی رہتی ہے اور گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں روشنی پیدا کرتی ہے ___ ہاں ___ ! وہ چراغِ ضوفشاں جو زبانِ حال سے یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ؎

جلتے رہے ہم تُند ہواؤں کے مقابل
آزاد چراغِ تہہ داماں نہ رہے ہم

حضرت مفتی صاحبؒ ہندوستان کے انقلابی علماء کے اس گروہ میں شروع سے ہی شامل رہے جس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک تاریخی موقع پر اجلاس جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ کراچی ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے اور اُن سے علمائے ہند کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

"___ گاندھی جی ___ ! آپ کے سامنے یہاں جو یہ بوریہ نشین علما بیٹھے

ہوئے ہیں اُنھوں نے انقلابِ فرانس نہیں پڑھا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں میں اور پورے ملک میں اِن سے بڑی انقلابی جماعت کوئی دوسری موجود نہیں ہے ــــــ''

حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۹۱۹ء سے ہی ملکی تحریکات میں فکری وعملی حصّہ لینا شروع کردیا تھا اور زندگی کے آخری سانس تک ملک وملّت کی خدمت کرتے رہے۔

بلاشک وشبہ وہ مُدبّر تھے، مفکّر تھے اور سیاسی بصیرت اور ملکی وبین الاقوامی معاملات میں بلند پایہ فہم وفراست رکھتے تھے مگر وہ اس قسم کے سیاست داں نہیں تھے جس کے متعلق ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ ''سیاست داں صرف اپنی ذات کے لیے سوچتا ہے۔'' یا گذشتہ سال ہمارے نائب صدر جمہوریہ کا یہ مقولہ ''ٹائمز آف انڈیا'' میں شائع ہوا تھا کہ ''اک سیاسی لیڈر اگلے الیکشن کے بارے میں سوچتا ہے جب کہ سیاسی مُدبّر اگلی نسل کے لیے سوچتا ہے۔''

بلاشک وشبہ حضرت مفتی صاحبؒ ایسے سیاسی مدبّر ومفکر اور دانشور تھے جن کی نگاہیں دُنیائے انسانیت کے مستقبل پر لگی رہتی ہیں اور جن کے دل ودماغ اور ذہن وفکر کی ساری توانائیاں حال کو سنوارنے، اس کے پیچیدہ مسئلوں اور اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے وقف رہتی ہیں، آنے والی نسلوں کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے اور مستقبل کو تابناک بنانے کی دُھن اور لگن سے بھی وہ خالی نہیں ہوتے۔ الیکشنی سیاست سے حضرت مفتی صاحب کی دلچسپی صرف اسی حد تک رہتی تھی ان کی خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ ملک کے قانون ساز اداروں میں ایسے صاف ذہن وسیع قلب، سیکولر مزاج انصاف پسند لوگ کامیاب ہوکر پہنچیں جو ملک کی جمہوری وسیکولر اسپرٹ کے مطابق عدل وانصاف کے تقاضوں کی تکمیل کرسکیں اور خاص طور پر اقلیتوں کے سلسلہ میں جن کے دل ودماغ ہمدردی ودل سوزی کے جذبات سے لبریز ہوں، اس سلسلہ میں اپنے اثرات، مشوروں، کوششوں اور جدوجہد میں وہ کبھی تامل وکوتاہی نہ فرماتے تھے، ایسے نازک وقت بھی آئے جب اک خاص قسم کی فضا ملک میں ایسی قائم ہوئی اور ایسا ماحول سیاسی بازیگروں نے بنادیا جس میں سچّی بات کہنا اور مذہب وفرقہ کی سطح سے بلند ہوکر کسی سیکولر مزاج اُمیدوار کی حمایت کرنا اک صبر آزما کام ہوگیا۔ مگر یہ مفتی صاحبؒ کا دل گردہ تھا، ان کی جرأت وہمّت کا کمال بھی تھا، ان کی حق پرستی کا ثبوت بھی تھا اور ان کی دُور اندیشی وبصیرت کا مظاہرہ بھی کہ ایسے ماحول میں بھی اُنھوں نے مناسب وموزوں اُمیدواروں کی حمایت فرمائی چاہے اس کی وجہ سے کچھ سیاسی رہنماؤں کی پیشانیاں شکن آلود ہوگئیں اور ع

کچھ خاص دوستوں کے چہرے بھی اُتر گئے

آج ملتِ اسلامیہ ہند کو نہایت نزاکتوں کا سامنا ہے، دشوار گذار راستوں سے گذرتے ہوئے اس کو ۳۸ سال کا عرصہ گذر چکا ہے مگر افسوس کہ امن وسکون کی وہ منزل اس سے دُور ہی دُور ہوتی چلی جاتی ہے جس پر پہنچ کر وہ اپنی سماجی اور انسانی ڈیوٹی اور تعمیر وترقی کی ذمہ داریاں پوری کرسکے اور دُنیا کو دکھا سکے کہ مسلمان جب انسانیت کی خدمت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کے ہر قدم سے ایسے روشن نقش اُبھرتے چلے جاتے ہیں جو مورخوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں مصلحین کو طریقِ کار بخشتے ہیں اور خدمت انسانی کے راستہ کے مسافروں کے لیے مشعل راہ بنتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس ملک میں مسلمانوں کو امن وعافیت اور سکون واطمینان کی وہ منزل نصیب نہیں ہو پائی جہاں پہنچ کر اس کی افادیت کے جوہر کھل سکتے۔ زندگی کے موڑ، حالات کی کروٹیں اور وقت کی رفتار یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ؎

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں کہ تھک گئے پاؤں چلتے چلتے
مگر وہی فاصلہ ہے قایم جو فاصلہ تھا سفر سے پہلے

مگر حضرت مفتی صاحبؒ کے درج ذیل خیالات وافکار ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کس حوصلہ، اُمنگ ولولہ اور ہمّت کے جوہروں سے لبریز ہیں اور مایوس سے مایوس کمزور سے کمزور دل ودماغ کو بھی عمل کی تلقین کرتے اور عزم وحوصلہ کا پیغام دیتے ہیں:

''میں ہندوستان کے مسلمانوں سے قطعاً مایوس نہیں۔ ان کی ایک ایک بستی میں ایسے سیکڑوں تڑپنے والے دل موجود ہیں جو اسلام کو چلتی پھرتی حالت میں اور مسلمانوں کو اس کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ان تڑپتے ہوئے دلوں کو کس طرح جوڑا جائے۔ ہمارے یہاں الحمدللہ مسلمانوں کی متعدد تنظیمیں کام کررہی ہیں اور ان میں لاتعداد ایسے افراد موجود ہیں جن کے تقدس اور تقویٰ کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ میں اس زوال اور افلاس کے عالم میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مخلص اور بے لوث کارکنوں کا جو سرمایہ مسلمانانِ ہند کے پاس موجود ہے اس کی مثال اس ملک میں کسی گروہ یا جماعت کے پاس نہیں پائی جاتی، لیکن اُمّت ان جماعتوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس کی ذمہ داریاں ان سے زیادہ وسیع ہیں جو اب تک ہماری تمام تنظیموں نے لے رکھی ہیں۔ اس لیے ہم نے چاہا تھا کہ ہماری ان تمام تنظیموں

اوران سے ماورا ہمارے تمام مسالک اور مکاتبِ خیال کے اکابر کا ایک فورم ایسا ضرور ہونا چاہیے جہاں ہم بیٹھ کر اپنے حالات کا جائزہ لے سکیں ایک دوسرے کے کاموں میں ہاتھ بٹا سکیں اور مشترکہ اُمور میں مل جل کر آگے بڑھ سکیں، مسلم مجلسِ مشاورت اسی فورم کا دوسرا نام ہے۔

اپنے ملک کے غیر مسلموں کو ہم ایک طرح سے مظلوم سمجھتے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں سے کچھ مخصوص تاریخی پس منظر کی وجہ سے بدگمان ہیں اور اس بدگمانی کے باعث ان کی اکثر صلاحیتیں اور قوتیں ان مسائل پر صرف ہوتی رہتی ہیں جو صرف ایک پسماندہ اور آپس میں پھٹی ہوئی قوم کا خاصہ ہیں۔ ان کی اس سے بھی بڑی مظلومیت یہ ہے کہ ان کی رہنمائی کی باگ دوڑ کسی اخلاقی قیادت کی بجائے سیاسی مفادات، زبان وذات کی خودغرضی اور گروہی اغراض رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔ ایک عام غیر مسلم شہری کے زخمی دل پر پھائے رکھنے والا کوئی نہیں۔ ہماری تمنا تھی کہ مسلمان اس طرح آگے آتے کہ ان غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ڈھارس پیدا ہوتی اور وہ سمجھتے کہ چشتیؒ اور محبوبِ الٰہیؒ اور انھیں کی نہیں بلکہ رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام کے واقعات بیان کرنے والے محض تاریخ انسانی کا کوئی باب نہیں بلکہ مشاہدہ کی آنکھ آج بھی اس سیرت و کردار کو دیکھ سکتی۔ رہا مسلم تنظیموں کا معاملہ تو جماعت کے دائرے سے نکل کر انھیں اُمّت کا وسیع تر دائرہ میّسر آرہا ہے اور اس طرح ان کی صلاحیت کار کو ایک عظیم میدان فراہم ہو رہا ہے جہاں وہ باہمی تعاون سے اپنی استعداد اور قربانی کی حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں۔ کام اصلاح کا ہو یا دعوت تبلیغ کا، تعلیمی ہو یا اقتصادی اور اس کا دائرہ سیاست تک پھیلا ہوا ہو یا علم و دانش کے ارتقاء تک ہر ایک کو اپنی اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے پھیلاؤ وسعت اور گہرائی وگیرائی ملتی جاتی اور نئے نئے رفقائے کار فراہم ہوتے۔''

افسوس کہ آج سے ــــ ایک سال پہلے ــــ تقدیر کے ایک بہت بڑے المیہ سے دوچار ہو کر علم و عمل کے ایک ایسے چراغ سے ہم محروم ہو گئے۔ بہت بڑا سہارا تھا جو ٹوٹ گیا اب یاس ہے نا اُمیدی ہے، غم ہے، سوگ ہے، آنکھوں کی اشک فشانی ہے، دل کی فریاد ہے، نامرادیوں کا ڈر اور ناکامیوں کا خوف ہے۔ زندگی کا کارواں چل رہا ہے مگر ہر موڑ پر بلکہ ہر قدم پر خطرے ہیں اندیشے ہیں جو شب کے پُر ہَول سنّاٹے میں زندگی کے قافلہ کو درپیش ہیں اور راستہ میں پستیاں بھی ہیں بلندیاں بھی ہیں اور بہت سی ٹھوکریں بھی ہیں۔ سچ ہے بالکل سچ ــــ! کہ وقت کروٹیں بدلتا رہے گا انسان پیدا ہوتے رہیں گے مگر حضرت مفتی صاحبؒ جیسا مختلف صفات کا مجموعہ شخصیت اس دور زبوں حالی اور عہدِ زوال میں کہاں پیدا ہوگی ــــ؟

دین و دانش، فکر و ذہن اور علم و عمل کے ایک پیکرِ عظیم کا اُٹھ جانا قوم کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کے حلقۂ احباب وارادت اوران کے ہر چھوٹے بڑے واقف کار کا فرض ہے کہ وہ ان روشنیوں کو قائم رکھنے میں بھرپور امداد و تعاون کریں جو حضرت مفتی صاحبؒ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں اور جس کو قائم رکھنے اور جلا دینے کے لیے اُنھوں نے زندگی کی ساری توانائیاں بلکہ اپنا گراں مایہ خونِ دل وجگر صرف کیا ــــ ربِّ کریم وکارساز ہم سب کو ان کی روایات، ان کی یادگاروں اوران کی عظمتوں کو قائم رکھنے کی توفیق دے کہ درحقیقت یہ ہی ہے سچّا، حقیقی اور درست خراجِ عقیدت اس مفکّر مِلّت کی روحِ اقدس کو جو علم کی روشنی تھا، فکر و عمل کا چشمہ صافی تھا، اخلاق وہمدردی انسانیت ومحبت کی شمع فروزاں تھا ــــ اور جو بسترِ مرگ پر بھی ملّت کی تعمیر، دینی اداروں کی ترقی وحفاظت اور ہر انسان کی خدمت واعانت کو وقت کا سب سے بڑا تقاضہ اور سب سے بڑی عبادت سمجھتا رہا۔ اور جس کے فکر و عمل میں اس سچائی کا عکس پوری طرح جھلکتا تھا کہ:

عارضی چیز ہے تسخیرِ ممالک اے دوست
فتح کہتے ہیں جسے قلب کی تسخیر میں ہے

تمام حضرات مخلصین اور ذمّہ داران مدارس دینیہ سے خاص طور پر درخواست ہے کہ ماہِ مبارک میں ایصالِ ثواب وبلندی درجات کے لیے دعاؤں کا خاص اہتمام فرمائیں۔ [محمد اظہر صدیقی، مئی ۱۹۸۵ء]

آہ جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

دو برس ہاں دو برس پہلے کی بات   آرہی ہے خود بخود ہونٹوں پہ آج
تھا اِسی ماہ مئی میں بارہ کا دن   جب ہوا تھا شیخ کا یومِ وفات
اُن کا مسلک تھا ہر اک کی عافیت
خویش ہو یا غیر ہو سب کا بھلا!!

بعد از ختمِ قرآنِ کریم اور درود، فاتحہ خوانی نیز دعائے مغفرت اور تعزیت کے ایصالِ ثواب برائے روحِ پاک جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ ساکن کٹڑا نظام جامع مسجد دہلی، منجانب مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگ والی سُوہنہ ضلع گوڑگانوہ ہریانہ برموقعہ اُن کی دوسری برسی بتاریخ ۱۲ر مئی ۱۹۸۶ء بمطابق

۲؍رمضان المبارک (۱۴۰۶ھ)

مرحوم جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ علم وانسانیت کے آفتاب کسرِ نفسی کے جوہرِ انسانیت کے چراغ اللہ کے عاشق، رسول کے شیدا، فدا کارِ ملّت غرباء پرور، بیکس نواز قوم گیر ملّت ساز، خدا ترس، رحم دل، مشفق، شفیق، انکسارِ سادہ منکسر المزاج، علاوہ ازیں وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ بالخصوص قوم کے ایک ایسے ممتاز ہردلعزیز سچّے قائد جن کی شہرت دہلی سے گزر کر باہر بیرون میں پورے ملک اور ملک سے باہر دور تک پہنچ رہی تھی جس کی بناء پر ان کی زندگی دن بدن روشن ہوتی جارہی تھی اور جس کی وجہ سے اُن کا نام اور کام ہمہ گیر اہمیت کا مرکز بنا ہوا تھا لہٰذا اسی لیے آج بھی پوری ملّت اُن کے لیے سر پیٹ رہی ہے اور پیٹتی رہے گی۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ مخلص مجاہد، دانشور، مدبّر، مفکّر، مبلّغ اور سچّا قائد کہ یہ ایسی شخصیتیں ہیں جن کے حسین کردار اور اعلیٰ کارناموں میں ملّت کے وجود کی ضمانت پوشیدہ ہے لہٰذا اسی لیے یہ شخصیتیں ملّت کے لیے حاصلِ عمر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ افسوس کہ آج ہم ایسی ہی عظیم شخصیت سے جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سے محروم ہوکر اُن کے سوگ میں بیٹھے ہیں جن کے ارادے آہنی تھے اور بس یہی نہیں بلکہ وہ اپنے ٹھوس ضمیر اور صادق القول ہونے کی بناء پر ایک فولادی انسان تھے۔ تاریخ کو سخت جستجو اور گہری کھوج کے بعد کوئی ہیرا ملتا ہے۔ قوم کو خداوند کریم نے مفتی مرحوم صاحب ایک ہیرا دیے تھے افسوس کہ آج وہ ہیرا ہم سے چھن گیا اِنّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجعُوْن۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی تمام دینی وملّی وقومی خدمات کو بے حد قبول فرما کر پسرانِ عزیز ان کو اُن کا نعم البدل عطا فرمادے، آمین ثم آمین اور اُن کی پوری پوری مغفرت فرما کر اُن کی قبر کو نور سے بھر دیں، آمین اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل بالخصوص اُن کے پیارے بیٹوں کو مرحوم موصوف کے اوصافِ حمیدہ کو اپنانے کی پوری توفیق عطا فرمادیں۔ (آمین)

تجھ کو اے مردِ سخی ہرگز بھلا سکتے نہیں
تیرے احسانوں کا بدلہ ہم چکا سکتے نہیں
ابرِ رحمت تیرے مرقد پر گُہر باری کرے
حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے

خاص طور پر جناب عمید الرحمٰن عثمانی جو حضرت مفتی صاحبؒ کے ادارہ ندوۃ المصنفین میں ذمہ دار کی حیثیت سے بیٹھتے ہیں ان کو حوصلہ اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) [مئی ۱۹۸۶ء]

عبدالغفور، ڈاکٹر پی۔ کے

ڈاکٹر پی۔ کے۔ عبدالغفور

افسوس ہے ۲۳/مئی کو ڈاکٹر پی۔ کے۔ عبدالغفور کا اپنے وطن کالی کٹ میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم اس دن بالکل تندرست اور چاک وچوبند تھے۔ دوسرے دن مدراس، بمبئی اور دہلی کے طویل سفر پر روانہ ہونے والے تھے۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر کا وقت تھا اپنے چیمبر میں ایک مریض کا معائنہ کررہے تھے کہ ان کا قلم جیب سے نکل کر زمین پر گرا، ڈاکٹر صاحب قلم کو اٹھانے کے لیے ذرا نیچے جھکے ہی تھے کہ اچانک سینہ میں درد اٹھا اور بڑھتا چلا گیا۔ فوراً میڈیکل کالج میں داخل کردیے گئے، اعلیٰ سے اعلیٰ علاج، دیکھ بھال اور راحت وآرام، مرحوم کے لیے ان میں سے کس چیز کی کمی ہوسکتی تھی لیکن حملہ اس قدر سخت تھا (Massive Heart Attack) کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

عمر ساٹھ، پچپن کے لگ بھگ ہوگی، ڈاکٹر صاحب کے نام اور ان کے کام سے شمالی ہند کے عام مسلمان تو کم ہی واقف ہوں گے۔ لیکن جنوبی ہند کے بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام تھا۔ وہ مسلمانوں کے نہایت مخلص اور سرگرم وپُرجوش لیڈر تھے، انہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی، کالی کٹ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی جو تعلیمی اور اقتصادی نہایت شاندار خدمات انجام دی ہیں انھیں کا یہ اثر ہے کہ تعلیم میں آج کیرالا مسلمان سب ریاستوں کے مسلمانوں سے آگے ہے، پہلے یہ سوسائٹی جنوبی ہند کے لیے خاص تھی، لیکن بعد میں جب ڈاکٹر صاحب کو شمالی ہند کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی طرف متوجہ کیا گیا (اور توجہ دلانے والوں میں خاکسار راقم الحروف بھی ہے جو سوسائٹی کی مجلس عاملہ کا دیرینہ ممبر ہے اور جس سے ڈاکٹر صاحب کے شخصی اور ذاتی تعلقات نہایت شگفتہ اور دوستانہ تھے) تو ڈاکٹر صاحب نے اس میدان میں بھی کام کرنے کا عزم کیا۔ چنانچہ اس کا پہلا قدم یہ تھا کہ گزشتہ ماہ دسمبر میں سوسائٹی کا ایک نہایت عظیم الشان آل انڈیا اجتماع نئی دہلی میں منعقد ہوا، اس اجتماع میں جو اہم فیصلے کیے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ہند کی ہر ریاست میں مسلمانوں کے لیے ایک میڈیکل کالج کھولا جائے۔ چنانچہ ۲۴/مئی کو ڈاکٹر صاحب دلی کا جو سفر کرنے والے تھے وہ اسی تجویز کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں وزیراعظم سے ملنے کی غرض سے تھا،

ڈاکٹر صاحب کو عرب ممالک میں اور خصوصاً سعودی عربیہ میں بڑا اعتماد حاصل تھا۔ انہوں نے ہزاروں نوجوانوں کو اچھی اچھی ملازمتوں یا کاروبار کے لیے سعودی مملکت بھیج دیا۔

اخلاق وعادات کے اعتبار سے نہایت شریف اور خلیق وملنسار تھے ایک سالہ قیام کالی کٹ کے زمانہ میں کم وبیش ہر ہفتہ ہی ڈاکٹر صاحب سے ان کی کوٹھی پر ملاقات ہوتی تھی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پُرتکلف اخوان نعمت سے ڈاکٹر صاحب نے خاطر مدارت نہ کی ہو، فن کے لحاظ سے بھی وہ آل انڈیا شہرت کے مالک تھے لوگ دور دور سے ان کے پاس علاج کی غرض سے آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو بخشش ومغفرت کی نعمتوں سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین [جولائی ۱۹۸۴ء]

سعید، جسٹس بشیر احمد

جسٹس بشیر احمد سعید

افسوس ہے چند ماہ ہوئے جسٹس بشیر احمد سعید صاحب کا بھی کم وبیش ۸۴ برس کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے ان کے وطن مدراس میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم بڑے فعال ومتحرک اور سرگرم وپُرجوش مسلمان تھے انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مدراس میں وہی کیا جو ڈاکٹر عبدالغفور نے کیرالا میں کیا تھا، ''جنوبی ہند کے مسلمانوں کی تعلیمی انجمن'' کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے مدراس میں دو عظیم الشان کالج تعمیر کرائے ایک لڑکوں کے لیے اور دوسرا لڑکیوں کے لیے، آج یہ دونوں کالج مدراس یونیورسٹی کے نمایاں اور ترقی یافتہ کالج سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم آل انڈیا شخصیت کے بزرگ تھے، سالہا سال وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی مرکز کونسل اور کورٹ کے نہایت بااثر اور فعال ممبر رہے، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ دونوں کے سرگرم رکن تھے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کے شب و روز قومی کاموں میں ہی بسر ہوتے تھے۔ نماز، روزہ کے بڑے پابند، قرآن مجید کی تلاوت ان کے مشاغل یومیہ میں شامل، ندوۃ المصنفین کے شروع سے معاون تھے، برہان بڑے شوق سے پڑھتے اور اس کی بڑی قدر کرتے تھے، غرض کہ بڑی خوبیوں اور اعلیٰ اخلاق وصفات کے بزرگ تھے۔ حق گوئی اور حق پژوہی ان کا جوہر فطری تھا، انگریزی کے بڑے اچھے مقرر تھے، اردو میں بھی اظہار مدعا پر قادر تھے، تقریر بڑے جوشیلے انداز میں کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا نفس وجود مسلمانوں کے لیے بڑی تقویت کا سبب تھا کیونکہ وہ قانون دان بھی تھے اور مسلمانوں کے سچے ترجمان ووکیل بھی۔ [جولائی ۱۹۸۴ء]

عثمان، مولانا محمد

مولانا محمد عثمان

افسوس ہے چند ماہ ہوئے مولانا محمد عثمان صاحب کا بھی اپنے وطن مالیگاؤں میں انتقال ہوگیا۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، استعداد پختہ تھی۔ یوں تو ان کو مناسبت اور دلچسپی کم وبیش ہر فن سے تھی تاہم تفسیر اور حدیث ان کا خاص فن تھے۔ ایک عرصہ تک مالیگاؤں کے مختلف مدارس میں استاد رہے لیکن ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ جو ان کے لیے بقائے دوام کا ضامن ہے، مسلمان لڑکیوں کے لیے درس نظامی کا وہ عظیم الشان مدرسہ ہے جو مالیگاؤں میں جامعۃ الصالحات کے نام سے معروف ومشہور ہے، اب تو لڑکیوں کے لیے بڑے بڑے عربی مدارس ادھر اُدھر اور بھی کئی ایک ہوگئے اور ہوتے جارہے ہیں لیکن صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے جامعۃ الصالحات کو یک گونہ شرف فضیلت وتقدم حاصل ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے مولانا مرحوم کے اخلاص ومحبت، محنت ومشقت اور ذوق تعمیر وحسن انتظام کا۔

راقم نے کئی مرتبہ جامعہ کی دورۂ حدیث کی طالبات کا امتحان لیا ہے اور ہر مرتبہ طالبات کے صحیح اور برمحل جوابات سے دل نے مسرت محسوس کی ہے۔ ان کو جامعۃ الصالحات سے عشق تھا، شب وروز اس کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو علما وصلحا کا مقام جلیل عطا فرمائے اور جامعۃ الصالحات کو کسی قسم کے شر اور ضرر سے محفوظ رکھے۔ [جولائی ۱۹۸۴ء]

سعید، عمر

ایڈیٹر برہان کو صدمہ

قارئین برہان کو یہ معلوم کرکے افسوس ہوگا کہ ۱۰ر جولائی کو مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر برہان کا جواں سال بیٹا ''عمر سعید'' عمر ۴۰ سال مختصر علالت کے بعد انتقال کرگیا۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ راجعون۔

مولانا کو مفتی صاحبؒ کی وفات کا صدمۂ جانکاہ ابھی تازہ ہی تھا کہ ناگاہ ایک یہ حادثہ بھی پیش آگیا۔ مولانا کو اس قدر سخت صدمہ ہے کہ انھوں نے لکھنا پڑھنا سب ترک کردیا ہے اور ان پر ایک عالم کمشدگی طاری ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کریں اور مولانا کے لیے بھی

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

[عمید الرحمٰن عثمانی (منیجر)، اگست ۱۹۸۴ء]

خاں، مولانا حامد علی

مولانا حامد علی خاں مرحوم

رام پور کسی زمانہ میں دارالعلوم اور دارالعلماء تھا۔ یہاں کی گلی گلی کے اندر اونچے سے اونچے علماء موجود تھے۔ طلباء کی بھی انتہائی کثرت تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں یہاں طلباء موجود رہتے تھے جس میں افغانی، پنجابی، بنگالی، آسامی، برما اور رنگون تک کے رہنے والے یہاں آتے تھے۔ خود مقامی آدمیوں کو بھی انتہائی ذوق تھا کہ وہ عربی اور فارسی پڑھیں اور اس میں کمال حاصل کریں۔

یہاں پر فارسی کے باکمال حضرات میں سے مولوی عبدالرزاق خاں طالبؔ (متوفی ۱۹۱۶ء) مولوی حسین شاہ خاں نامیؔ (م ۱۸۹۴ء) بڑے بڑے قابل فارسی داں ہوئے۔ عربی داں حضرات میں یہاں پر کچھ تو مقامی علماء ہوئے اور کچھ بیرونی علماء نے یہاں آکر سکونت اختیار کرلی۔ بیرونی علماء میں سے مولانا عبدالعلی بحرالعلوم (م ۱۲۲۵ھ) تین سال تک رام پور میں رہے۔ ملا محمد حسن لکھنوی عرصۂ دراز تک یہاں پر رہے، یہیں شادی کی اور یہیں ۱۷۸۴ء/ ۱۱۹۹ھ میں انتقال فرمایا۔ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی (م ۱۸۶۱ء) مولوی عبدالحق خیر آبادی (م ۱۸۹۹ء) بھی یہاں مقیم رہے۔ عبدالحق خیرآبادی کے صاحبزادے مولوی اسدالحق صاحب نے بھی یہیں پر ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا۔

مقامی علماء میں سے مولانا فضل حق رامپوری بڑے جلیل القدر علامہ ہوئے۔ برما سے لے کر بخارا تک ان کا چرچا تھا۔ انھوں نے بڑی گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں کہ جن کے پڑھنے والے اور پڑھانے والے بھی اب دنیا میں موجود نہیں رہے۔ مولانا موصوف میرے استاذ تھے اور عرصۂ دراز تک مدرسہ عالیہ کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۴۰ء میں وصال ہوگیا۔ مولانا منور علی صاحب (م ۱۹۳۳ء) یہاں کے مشہور محدث تھے۔ ان کے استاذ الاستاذ میاں محمد شاہ صاحب (۱۹۲۰ء) اور ان کے استاذ میاں حسن شاہ صاحب (م ۱۳۱۲ھ) محدثین کرام میں سے تھے۔ مولوی اکبر علی خاں صاحب (م ۱۳۰۲ھ) بھی یہاں کے مشہور و معروف محدث تھے، مولانا عبدالعلی خاں ریاضی داں (م ۱۳۰۳ھ) اور مولوی عبدالعلی صاحب منطقی (م ۱۲۷۸ھ) بھی یہاں کے مشہور عالم ہوئے۔ الغرض یہ حضرات وہ تھے کہ جن میں سے بعض کو میں نے خود بھی دیکھا تھا۔

میرے طالب علمی کے زمانہ میں مولوی احمد امین خاں صاحب (م ۱۹۳۸ء) مولوی معزاللہ خاں صاحب (م ۱۹۴۳ء) مولوی نظیر الدین صاحب، مولوی افضال الحق صاحب (م ۱۹۵۵ء) اور خود میرے پیرومرشد اور استاذ حضرت مولانا وزیر محمد خاں صاحب (م ۱۹۲۵ء) مدرسہ عالیہ میں درس دیتے تھے اور ان تمام ہی حضرات کا اپنے دور کے باکمال علماء میں شمار تھا۔ میں جب علی گڑھ کی ریاست دادوں کے مدرسہ حافظیہ سعیدیہ کی ملازمت سے فارغ ہوکر رامپور میں آیا تو اس وقت بھی علماء کا اور علم کا چرچا یہاں پر بہت تھا۔ میں نے ملاّ حسن (منطق کی مشہور کتاب) اور شرح ہدایۃ الحکمۃ (فلسفہ کی بہترین کتاب) اپنے محلّہ (انگوری باغ) کی مسجد میں شروع کرائی، اس میں تقریباً بیس پچیس طالب علم شریک ہوا کرتے تھے۔ ان میں پندرہ سولہ طالب علم بہت سمجھدار تھے۔ انہی میں مولوی حامد علی خاں صاحب بھی تھے۔

مولوی حامد علی خاں صاحب نہایت گہری استعداد رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت کچھ فوائد ملاحسن اور شرح ہدایۃ الحکمۃ کے ذریعہ حاصل کیے۔ مولانا بڑے متوکل، قانع، مہذب، مدبر اور سمجھدار انسان تھے۔ کم عمری ہی میں اُن کے والد شیدا علی خاں صاحب کا انتقال ہوگیا تھا اس لیے مجبوراً معاش کے لیے رامپور کے دفاتر میں ملازمتیں کیں۔ وہ ملازمت بھی کرتے تھے اور تحصیل علم بھی۔ تحصیل علم میں انھوں نے یہاں کے بڑے بڑے علماء کی طرف توجہ کی اور فارغ التحصیل ہوکر درس و تدریس کی دنیا میں ایک اونچا مقام حاصل کیا۔

روہتک (ہریانہ) والے ان کے معتقد تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح روہتک آجائیں۔ چنانچہ ان کو یہاں کے دفتر کی ملازمت چھڑانے کے بعد وہ لوگ ان کو روہتک لے گئے۔ وہاں پر تھوڑے زمانہ تک مدرسہ خیرالمعاد میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب روہتک کے حالات کچھ نازک ہوئے تو ہم نے مولوی حامد علی خاں صاحب کو مجبور کیا کہ وہ رامپور آجائیں چنانچہ وہ رامپور تشریف لے آئے اور یہاں مدرسہ عالیہ میں ۷ دسمبر ۱۹۴۷ء سے درجہ تفسیر کے مفسر ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کو افتاء سے بھی ایک خاص مناسبت تھی۔ مشورے اور رائے وہ مجھ سے بھی لیتے تھے مگر تحریری فتویٰ نویسی وہی انجام دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھ کے فتاویٰ کی نقول ایک مجلد رجسٹر میں لائبریری مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ، مسٹن گنج رامپور میں محفوظ ہیں، اس کے علاوہ تقریر بھی بہت عمدہ کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں وہ میرے انتہائی دست و بازو تھے۔

جب میری عمر ۵۵ برس کی ہوئی اور ریٹائری کا زمانہ قریب آگیا تو وہ بھی

مدرسہ عالیہ میں تنہائی محسوس کرنے لگے اور ملازمت سے برداشتہ خاطر ہوگئے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ میں جو مدرسہ عالیہ سے مانوس تھا وہ صرف آپ کی وجہ سے تھا مجھے کچھ دوسرے حضرات سے الفت وانسیت پیدانہیں ہوئی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہتک والوں نے انتہائی زور دے کر انھیں دوبارہ بلالیا۔لہٰذا وہ ۱۶/ جنوری ۱۹۵۹ء کو مدرسہ عالیہ سے استعفی دے کر روہتک چلے گئے اور مدرسہ خیرالمعاد کو پھر آباد کیا۔وہاں پرانھوں نے علمی اور عملی خدمات کی وجہ سے بڑی عزت وشہرت پائی۔تقسیم ملک کے بعد جب نقل آبادی کا مسئلہ درپیش ہوا تو روہتک کی آبادی ملتان کی طرف منتقل ہوگئی اُسی منتقلی کی صورت میں وہ بھی انتہائی تکلیف کے ساتھ ملتان چلے گئے۔وہاں پراُن کی شہرت ومقبولیت میں روہتک سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ملتان میں ان کے مخلصین کے تعاون سے ایک شاندار مدرسہ خیرالمعاد اور ایک عالی شان مسجد تعمیر ہوئی اور ایک وسیع وعریض مکان بھی بنوایا کہ جس کا نام حامد منزل ہے۔

مولانا نے علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی حصّہ لیا۔اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ میں سیاست کے میدان میں آنے کے بعد دین اور اسلام کی ترقی کی کوشش کروں۔یہ چیز وہاں کے بہت سے ارباب علم کے پیشِ نظر تھی، چنانچہ ان کو اس میدان میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔عوام بھی ان کی بڑی قدرومنزلت کرتے تھے۔ایک بار سیاسی تنازعہ میں جب مولانا کو گرفتار کیا جانے لگا تو اس وقت شہر ملتان کے ہزاروں آدمی سڑکوں پر پولیس کی راہ میں لیٹ گئے کہ پہلے ہمیں گرفتار کرو بعد میں انھیں پکڑنا۔ چنانچہ مجبوراً حکومت نے وارنٹ منسوخ کیے۔یہ اُن کی مقبولیت کا عالم تھا۔

میدان سیاست کے علاوہ مولانا تحریر کے میدان میں بھی صاحب کمال تھے، ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے لیکن شاید محفوظ بہت کم ہی رہا، پھر بھی جس قدر محفوظ ہے اور طبع ہوکر آگیا ہے وہ اُن کی ذہانت، لیاقت اور طرزِ تحریر کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ان کا پہلا کارنامہ مقاماتِ ارشادیہ فارسی مؤلفہ عنایت اللہ خاں کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۶۰ صفحات پر محیط ہے اور تصوف کے مقامات واسرار کا بہترین نچوڑ ہے۔مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے تین ایڈیشن اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔دوسرا کارنامہ تذکرۃ المشائخ کی تصنیف ہے۔اس میں نبی اکرم ﷺ سے لے کر اپنے پیرومرشد مولوی حافظ عنایت اللہ خاں صاحب مجددی (م ۱۳۴۵ھ) تک کے حالات ۱۸۴ صفحات پر لکھے ہیں۔تیسری تالیف انوار مجدد الف ثانی کی شکل میں منظر عام پر آچکی ہے، اس میں مجدد صاحب (م ۱۰۳۴ھ) کے حالات، اقوال ومناقب وغیرہ کو ۳۲ صفحات پر سمونے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ مجموعۂ فتاویٰ کا تعارف ابتدا میں کرادیا گیا ہے۔

مولانا ایک عرصہ سے کمزور اور ضعیف تھے مگر سرہند شریف کے عرس میں برابر حاضری کی کوشش کرتے رہے اور آتے رہے مگر ایک وقت ایسا آیا کہ امراض نے ان کے اوپر احاطہ کرلیا اور وہ اس دنیا سے ۷/ جنوری ۱۹۸۰ء کو رخصت ہوگئے۔اللہ تعالیٰ اُس عالم میں اُن کو مراتب عالیہ مرحمت فرمائے۔

الحمد للہ کہ اُن کے تمام صاحبزادے دینی ذوق رکھتے تھے۔بڑے صاحبزادے حافظ محمد علی خاں مدرسہ کے کاموں کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں اور ان کے دوسرے برادران ناصر علی خاں واحمد علی خاں اور دیگر متوسلین، متعلقین ومریدین بھی مذہبی امور میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں اور مدرسہ کی ترقی میں کوشاں ہیں۔

اللہ جل شانہ وعمّ نوالہٗ اپنے کرم سے اُس عالم میں اُن کے مراتب عالیہ کو بلند وبالا فرمائے اور اس عالم کے اندر اُن کے مخلصین ومعتقدین کو کامیابی وکامرانی عطا فرمائے۔آمین [مولانا وجیہ الدین احمد خاں قادری، ستمبر ۱۹۸۴ء]

اندرا گاندھی، شریمتی

شریمتی اندرا گاندھی

۳۰/ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کے دردناک حادثۂ قتل کے بعد ۳۱/ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کا اپنے ہی حفاظتی دستہ کے دو ظالم و سفاک نوجوانوں کی گولیوں کی بوچھار کا شکار ہوکر ہلاک ہوجانا آزادی کے بعد سے اب تک وہ دوسرا نہایت الم ناک اور دردناک حادثہ ہے جس نے ملک وقوم میں درد وکرب اور شدت غم کی لہر دوڑادی ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب اندرا گورنمنٹ نے دربار صاحب امرتسر میں فوج بھیجنے کا اقدام کیا تھا ہمارا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا کہ اب خیر نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک خالصتان کے مطالبہ کا تعلق ہے وہ ایک خالص سیاسی معاملہ تھا اور اس لیے سکھوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو خالصتان کا مخالف تھا لیکن دربار صاحب میں فوج کا داخلہ خالص ایک مذہبی معاملہ تھا جس پر سب سکھ متفق ہوگئے خواہ وہ خالصتان کے حامی ہوں یا نہ ہوں۔

ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جب مذہبی جذبات بھڑکتے ہیں تو انسان دیوانہ ہوجاتا ہے اور اس وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں خود اس کی کم نظری یا غفلت کو دخل ہے یا نہیں۔اس کے عتاب اور غضب کا نشانہ صرف وہ شخص یا جماعت ہوتی ہے جس نے اس کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا ہے، چنانچہ وہی ہوا

جس کا ہمیں اندیشہ پہلے سے تھا اور ملک اندرا گاندھی جیسی محبوب اور ہر دلعزیز شخصیت سے محروم ہوگیا۔

اندرا گاندھی کی ہر دلعزیزی اور ان کی قائدانہ شخصیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ الیکشن میں اس طرح شکست کھا جانے کے بعد کہ ان کا اور ان کی پارٹی کا نام ونشان مٹ گیا اور ملک میں جنتا گورنمنٹ قائم ہوگئی اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری، حالانکہ ان کی مختلف طریقوں سے تذلیل کی گئی اور ان کی توہین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی تقریروں میں برابر یہ کہتی رہیں کہ جنتا گورنمنٹ بھانت بھانت کے لوگوں کا ایک سنگھٹن ہے جو ''اندرا ہٹاؤ'' کے نعرے پر متفق ہوگئے ہیں۔اب جب کہ اندرا ہٹ گئی ہے اور زمام حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے تو اب ان کے اندرونی اختلافات ابھریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ الیکشن کی مدت ختم ہونے سے پہلے پہلے حکومت کا شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔ چنانچہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اور جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ابھی پورے دو برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ جنتا گورنمنٹ ختم ہوگئی اور اندرا گاندھی پھر اس شان وشوکت اور ساتھیوں اور رفیقوں کے ساتھ واپس آگئیں اور پھر دوبارہ ہندوستان کی وزیراعظم بنیں۔ اس چیز نے ان کی ہر دلعزیزی کا لوہا ساری دنیا سے منوالیا اور اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں اس کی کوئی مثال شاذ و نادر ہی مل سکتی ہے۔

لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان کی حکومت کا یہ دور آخر اتنا شاندار اور کامیاب نہیں رہا جتنا کامیاب پہلا دور تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے ان کا پورا ساتھ نہیں دیا۔انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات روکنے کے لیے خاص مسلمانوں کے متعلق تمام ریاستوں کو جو احکامات بھیجے ان پر کسی حکومت نے عمل نہیں کیا۔یہی حال ان ضوابط کا ہوا جو قومی یکجہتی کے لیے حکومت کے منظور کردہ تھے۔گورنمنٹ کے افسروں میں قانون کی خلاف ورزی کا ایک عام رجحان پیدا ہوگیا تھا۔رشوت کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اشیاء کی گرانی میں روز بروز ہوش ربا اضافہ ہو رہا تھا،شہروں میں گندگی کے انبار نظر آتے تھے،بجلی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا، جن اداروں میں کبھی رشوت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا مثلاً کالج، یونیورسٹیاں وغیرہ،ان میں بھی داخلے اور امتحان میں رشوت کی گرم بازاری شروع ہوگئی تھی،عوام کی زندگی اجیرن بن گئی تھی، جو لوگ ناجائز ذرائع سے روپیہ کماتے ہیں یہ ملک انھیں کے رہنے کی جگہ بن گیا تھا پھر سب سے اخیر میں دربار صاحب میں کروڑوں روپے کے نہایت مہلک اسلحہ کا جو ذخیرہ ہاتھ لگا، یا اب بھی پنجاب کے مختلف علاقوں میں اسلحے برآمد ہو رہے ہیں، کیا یہ سب کچھ اعلیٰ افسران حکومت کی سازش اور غیر آئینی حرکات کے بغیر ممکن ہوسکتا تھا، اور دور کیوں جایئے؟ اندرا گاندھی کا اپنے حفاظتی دستے کے دو نوجوانوں کے ہاتھوں اس دردناک طریقہ پر ہلاک ہوجانا خود اس کی دلیل ہے کہ ان کا اعلیٰ خفیہ پولیس کا انتظام کس درجہ ناقص اور خراب ہے، یہ دونوں نوجوان سکھ تھے اس لیے خفیہ پولیس کا فرض تھا کہ ان کے حرکات وسکنات پر کڑی نگاہ رکھے، سیکورٹی ضوابط کے ماتحت یہ دو نوجوان بیک وقت یکجا نہیں ہوسکتے تھے پھر یہ کیسے جمع ہوئے،اس کے علاوہ ایک قاتل دو ماہ کی رخصت لے کر پنجاب میں اپنے وطن چلا گیا تھا، خفیہ پولیس کا فرض تھا کہ وہ یہ معلوم کرتی کہ پنجاب میں جو دہشت پسند فوج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں ان میں کوئی اس نوجوان کا قریبی عزیز وقریب تو نہیں تھا، پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے تھا کہ دو مہینے کی چھٹی کے زمانے میں یہ نوجوان کیا کرتا رہا اور کن لوگوں سے اس کی ملاقاتیں ہوئی ہیں اور کن کن لوگوں سے کیا کیا گفتگوئیں ہوئی ہیں، اگر اعلیٰ محکمۂ خفیہ پولیس اس طرح وزیراعظم کے حفاظتی دستے کی نگرانی کرتا تو غالباً یہ واقعہ پیش نہیں آسکتا تھا، بہرحال جو مقدر تھا وہ پیش آکے رہا اور ہم اس کو بھی حکومت کی نااہلیت اور کرپشن کا ایک شاخسانہ کہہ سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ حکومت کی ان کمزوریوں اور نااہلیوں کے باوجود خود اندرا گاندھی کی شخصیت ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیت تھی، انھوں نے شخصی اور ذاتی طور پر اس ملک کو آگے بڑھانے کے لیے اور اس ملک میں سالمیت برقرار رکھنے کی غرض سے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہیں وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے اور ان کا اس دنیا سے رخصت ہوجانا یقیناً ایک عہد کا خاتمہ ہے، ساتھ ہی ہم ہندوستان کے تمام ارباب سیاست سے خواہ وہ بااقتدار پارٹی کے افراد ہوں یا مخالف پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہوں دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ اس وقت ملک نہایت خطرناک حالات سے گزر رہا ہے، ضرورت ہے کہ سب لوگ اپنی اپنی پارٹی کے مفاد کو نظرانداز کرکے ملک وقوم کے مفادات کو پیش نظر رکھیں اور ان کے لیے مل جل کر اتحاد واتفاق سے کام کریں، ملک میں بہت بڑے پیمانے پر فوری طور پر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور جس میں ہزاروں آدمی ہلاک اور برباد ہوگئے ان کی کروڑوں روپے کی جائیدادیں اور املاک تباہ ہوگئیں، حد درجہ افسوسناک اور ملک کی پیشانی کا نہایت بدنما داغ ہے۔ ہر محبّ وطن کا فرض ہے کہ وہ آئندہ کے لیے اس بات کا عہد کرے کہ وہ اس صورت حال کا جرأت اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کرے گا اور اس کا پھر دوبارہ

اعادہ نہیں ہونے دے گا۔ [نومبر ۱۹۸۴ء]

اہلیہ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

ایک افسوس ناک خبر

نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ ۲۷/ مارچ ۱۹۸۵ء کی صبح سات بجے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ تدفین قبرستان مہندیان میں ہزارہا افراد کے درمیان عمل میں آئی۔

حضرت مفتی صاحب کی اہلیہ کی رحلت سے خاندان عثمانی کو زبردست جھٹکا لگا ہے۔ براہِ کرم زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کریں۔ مرحومہ اہلیہ مفتی صاحب بڑی خوبیوں اور بے پناہ صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کے بہت سے علمی، دینی اور مذہبی وتجارتی معاملات میں حصہ لیتیں اور اپنے مشوروں سے ادارے کو کمک پہنچاتی تھیں جس سے استفادہ حاصل ہوتا اور حضرت مفتی صاحب ان کے اس عمل سے بے حد متاثر ہوتے۔ اگر آپ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن کی اہلیہ کے ابتدائی حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں تو وہ جن حالات سے دوچار ہوتی رہیں کس طرح انھوں نے اس کو حسن وخوبی سے نبھایا وہ ہر لحاظ سے بے مثال ہے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے دل میں ان کی خوبیوں کی قدر و منزلت دن دوگنی رات چوگنی برابر مزید بڑھتی چلی گئی اور اہلیہ کی اتنی طویل علالت سے ان کا دل بے حد متاثر ہوتا تھا۔ میری والدہ ماجدہ کی جدائی میرے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ [عمید الرحمٰن عثمانی، اپریل ۱۹۸۵ء]

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی اہلیہ کا انتقال

افسوس ہے کہ ۲۷/ مارچ کو حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی اہلیہ محترمہ راقم الحروف کی خالہ اماں ___ ہم سب کو داغِ مفارقت دے گئیں اس طرح ایک ہی خاندان کے تین افراد دس ماہ کے اندر اندر اس دُنیا سے رخصت ہوکر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ سب سے پہلے گذشتہ سال ۱۰/ مئی کو احقر کی والدۂ محترمہ کے سایہ عاطفت سے ہم محروم ہوئے اس کے دو دن بعد حضرت مفتی صاحبؒ داغِ مفارقت دے گئے اور اب مرحومہ ___ خالہ اماں بھی رخصت ہوئیں ؎

داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یوں تو مرحومہ گذشتہ اٹھارہ ۱۸ سال سے علیل تھیں تقریباً ۱۲ سال سے قطعی طور پر صاحبِ فراش اور شدید تکالیف میں مبتلا تھیں، اُن کی زندگی کا ہر سانس کربناکیوں اور حرماں نصیبوں کا صبر آزما امتحان اور آزمائش کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ خود مرحومہ برسہا برس سے صحت وشفا، طاقت وتوانائی کے بجائے ایمان پر خاتمہ کی دُعا کرنے کی ہر چھوٹے بڑے سے خواہش فرماتی تھیں حالانکہ حضرت مفتی صاحبؒ نے مرحومہ کا ہر ممکن طریقہ پر علاج کرایا دُور دُور سے ڈاکٹروں کو بُلا کر دکھایا اور ان کی رائے سے قیمتی سے قیمتی علاج کرایا۔ مگر اللہ کی مرضی ___! اس وقت تو یہ دُنیا اس کی ساری ہماہمی اور ساری بھاگ دوڑ ایک بے معنی سی بات لگتی ہے۔ حالانکہ خوب معلوم ہے کہ موت کا ذائقہ ہر ایک کو ضرور چکھنا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ:

مشیّت ہیں مجالِ دَم زدن تو بہ، معاذ اللہ ___

مرحومہ قدیم وضع داریوں، بندگانہ شفقت وعنایت، غربا پروری، اقربا نوازی، ہمدردی وغم گساری اور اس کے ساتھ قربانی اور ایثار، عزم وحوصلہ جذبۂ انسانی شرافت وپاکبازی، وفا شعاری کی ایسی تصویر اور اُجلا، صاف ستھرا اور پاکیزہ نمونہ تھیں، جن سے دُنیا خالی ہوتی جارہی ہے وہ قدریں اب یہ بزرگ خواتین اپنے ساتھ لے جارہی ہیں جو قدیم مشرقی تہذیب کی جان اور قلب و رُوح کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کے نمونے اب نگاہوں سے اوجھل ہوتے جارہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی اولاد اور اہلِ خاندان ہی نہیں بلکہ ہر وہ انسان، ان کا غم محسوس کررہا ہے جسے ان کی ذات سے کچھ نہ کچھ واقفیت تھی ہم تو قدرتی طور پر یہی محسوس کررہے ہیں کہ ایک ایسی نورانی کڑی ٹوٹ گئی جو ماضی کے نقوش کی قیمتی یادگار تھی وہ شمع بُجھ گئی، وہ جو گذشتہ ۶۷ سال سے حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کی گراں قدر علمی، دینی سماجی اور ملکی وملّی خدمات کی راہوں کو روشن کرتی تھی، ایک بزرگ دانشمند خاتون جو خلوص، صداقت، سلیقہ اور ہوشمندی ہمّت وحوصلہ کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کو نہ صرف گھر کے اندر کے امور، اولاد کی دیکھ بھال، گھر کے تمام نظم وضبط ہی سنبھالے ہوئے نہیں تھیں بلکہ جب تک ان کی شدید علالت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا حضرت مفتی صاحب کے ادارہ ندوۃ المصنفین کے انتظامی معاملات میں بھی ان کی معاونت کرتی تھیں۔

عرصۂ دراز سے انھوں نے طویل، پریشان کُن اور صبر آزما علالت کی کرب ناکیوں کو جس طرح برداشت کیا امراض کی مسلسل یورش، ضعف ونقاہت اور پھر معذوری اللہ کی دی ہوئی توفیق سے ان کی صاحبزادی (راقم الحروف کی

اہلیہ) نے جس طرح اس طویل عرصہ میں شب وروز ان کی خدمت و تیمارداری کی وہ بھی اک مثالی کردار ہے، اس مثالی خاتون کی بیٹی کا جو مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کی فیض یافتہ اور حضرت مفکر ملتؒ جیسے دردمند ملی رہنما کی شریکِ حیات تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری تکلیفوں، ساری اذیتوں اور پریشانیوں کو مرحومہ کے لیے آخرت کی بہترین نعمتوں کا ذریعہ بنادے، اپنا قرب عطا فرمائے اوران کی صاحب زادی کی ساری خدمات قبول فرما کر دین و دُنیا میں سکون وراحت اور عافیت وسربلندی کا ذریعہ بنادے۔ اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو نوازے۔ آمین

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ خالہ اماں مرحومہ جو ہمیشہ سے صوم وصلوٰۃ کی پابند اور دُعاؤں کا خاص اہتمام کرنے والی خاتون تھیں، آخری وقت میں بھی کئی روز سے اللہ کا ذکر مسلسل کررہی تھیں، بے ہوشی اور حد سے زیادہ نقاہت وکمزوری کے باوجود ان کی زبان پر اللہ کا نام آتا رہتا تھا آخری وقت میں راقم الحروف صبح بعد نماز فجر سے ان کے پاس بیٹھ کر کسی قدر بلند آواز سے کلمۂ طیبہ کا ورد کررہا تھا طبیعت پر رقت کا عالم اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وہ مقدس ومحترم خاتون اب رُخصت ہورہی تھیں، جن کی شفقت وعنایت نے خود اس گنہ گار کو زندگی کے ہر موڑ پر نوازا تھا، سہارا دیا تھا، اسی عالم میں دیکھا کہ مرحومہ کو کچھ سکون سا ہونے لگا ہے، زبان کو حرکت ہوئی جیسے دوبار اللہ۔ اللہ کہہ رہی ہوں، چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوئی اور پھر خود بخود منہ بند کرلیا، قریب میں کھڑے ہوئے برادر عزیز عمید الرحمٰن کی چیخ نکل گئی، ان کی ہمشیرہ نے ان کو صبر کی تلقین کی اوران کو سنبھالا۔

اتنی تکلیفوں، اذیتوں اور کربناکیوں کے طویل سلسلہ کے بعد اس دُنیا سے ان کا رخصت ہونا آخرت میں بلند درجات کی قوی اُمید دلاتا ہے۔ حضور اقدسؐ کے یہ ارشادات گرامی بھی دل، دماغ اور روح کے لیے مشعلِ تاباں بنے ہوئے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کے یہاں آدمی کے لیے کوئی مقام مخصوص ہوتا ہے جب وہ اُسے اعمال کے ذریعہ حاصل نہیں کرپاتا تو پھر اللہ تعالیٰ اُسے ناگواریوں میں مبتلا کرتا ہے یہاں تک کہ اسے اُس مقام تک پہنچادیتا ہے'' (ابویعلیٰ ابن حیان) اور حضور اقدس محسنِ انسانیت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کہ:

''بلاؤں کا شکار سب سے زیادہ انبیائے کرام ہوتے ہیں پھر اس کے بعد وہ جو اُن سے زیادہ قریب ہوں____'' (ترمذی ابن ماجہ)

یہ ارشادات تنگ وتاریک حالات، یاس انگیز اور پریشان کن لمحات میں اُمید اور حوصلہ کی روشنی دکھاتے ہیں کہ اپنے عظیم بزرگوں کی دردناک تکالیف اوران کی اذیت ناکیاں دونوں جہان کی نعمتیں محسوس ہونے لگتی ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ، مرحومہ کی بال بال مغفرت فرمائے اور ہم لوگوں پر اُن کے جو بے شمار احسانات ہیں اُن کا اجرِ عظیم اپنی شانِ عالی کے مطابق عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ ربِّ کریم ہم پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

قارئین کرام اور حضرت مفتی صاحبؒ کے حلقہ کے تمام حضرات خصوصاً تمام مدارس دینیہ کے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ وہ مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب کا بطورِ خاص اہتمام فرمائیں۔

ماہنامہ برہان کے پرنٹر و پبلشر اور ادارہ ندوۃ المصنفین کے جنرل منیجر، برادر عمید الرحمٰن اور ان کی ہمشیرہ جو مرحومہ خالہ اماں صاحبہ اور حضرت مفتی صاحبؒ سے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں، خاص طور پر بہت ملول اور غمزدہ ہیں۔ عمید میاں پر ادارہ اور گھر کی تمام تر ذمہ داریاں بھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان دونوں کو بطور خاص اپنے فضل وکرم سے نوازے اور ہر طرح نصرت واعانت ان کے شامل حال فرمائے۔ آمین [محمد اظہر صدیقی، اپریل ۱۹۸۵ء]

<u>اکبرآبادی، مولانا سعید احمد</u>

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

اس سے زیادہ دلدوز خبر، مفتی عتیق الرحمٰنؒ کے وصال کے بعد ندوۃ المصنفین ماہنامہ برہان کے لیے کوئی دوسری نہیں کہ ۲۴ مئی مولانا سعید اکبرآبادی کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی رحلت، علمی، ادبی، اوردینی، اور صحافتی دنیا کا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کی کوئی صورت بظاہر موجود نہیں ہے وہ ان نادر شخصیتوں میں سے جن کے اندر قدیم اور جدید علوم جمع ہوجاتے ہیں اور وہ زمانہ کو اپنی خداداد ذہانت اور طبائع کی روشنی سے منوّر کرنے کا ایسا عظیم الشان کام انجام دیتے ہیں، جو قدیم علوم کے ماہرین اور جدید علوم کے علمبرداروں سے الگ الگ صورت میں ممکن نہیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایک طرف علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ذریعہ اور واسطے سے، اس سلسلۃ الذہب سے منسلک نظر آتے ہیں، جو اسرار علوم نبوت کے محرموں اور فقہ وحدیث کے بالغ نظر عالموں، اسلامی شرع اور دینی کمالات کے حامل شخصیتوں کا ایک ایسا قافلہ ہے، جس نے دینی علوم کو تحقیقی صلاحیتوں کے قالب میں ڈھال کر ہر زمانہ اور ہر عہد کے مطابق

بنانے اور اس کی رہنمایانہ استعدادقائم رکھنے میں ناقابلِ فراموش حصّہ لیا۔ دوسری طرف سے وہ جدید علوم سے پوری طرح واقف، اور دنیا میں سائنسی اورصنعتی اورمعاشی انقلابات کے اثرات ونتائج سے مکمل طور پر باخبر اور نئے زمانے کے تقاضوں کا پورا شعور رکھنے والے ایک دانشور تھے، جوقدیم علوم کی آب وتاب، مذہبی روایات کے تقدس کی برقراری اور اصول واحکام دین کی پاسداری بلکہ نگہبانی کا فرض آدھی صدی سے بھی زیادہ مدّت تک انجام دیتے رہے۔ وہ ایک طرف مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ،مولانا محمد یوسف بنوریؒ ،مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ،قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (تعالیٰ اللہ عمرہٗ) مولانا احمدعلی لاہوریؒ،اورمولانا قاری محمد طیّب قاسمیؒ ،جیسے نابغۃ العصراور فقید المثال ماہرین علوم شریعت اور رہنمایانِ دین وملّت کی بزم کے ممتاز رفیق، اور مولانا آزادؒ،مولانا مدنیؒ ،مولانا شبیر احمدعثمانیؒ ، علامہ ابراہیم بلیاوی جیسے عبقریوں کے ہم جلیس اورخوشہ چین تھے۔دوسری طرف ان کاتعلق ان تمام مشاہیر، مستشرقین اور جدید علوم کے ممتاز ماہرین سے جنہوں نے بیسویں صدی میں اپنی ذہانت اورقدیم علوم کی جدید توجیہات اورتطابق کی شمعیں جلائیں۔ اور ایک دنیا کوان کی روشنی سے اپنے ذوق کی تسکین اورعقائد کے استقرار واستحکام میں مدد پہنچائی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے فیضان علمی اوراثرات شخصی کا سلسلہ ہندوستان تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان کی عظیم شخصیت کی کرنیں ،قومی، سیاسی اور ملکی حدود کو توڑ کرمہذب دنیا کے سبھی علمی اور مذہبی حلقوں تک پھیل گئی تھیں۔ وہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، فرانس، کینیڈا اور ایشیا، انڈونیشیا کے علمی اورتحقیقی حلقوں میں بھی ایک جانی پہچانی شخصیت سمجھے جاتے تھے اوران کا نام عزت اوراحترام کے ساتھ لیاجاتا تھا۔ وہ ایک برگزیدہ محقق اوردینی علوم کے ماہر دانشور کی حیثیت سے دنیا کے اکثر ملکوں کا دورہ کرچکے تھے۔اوران ملکوں کے دینی، مذہبی،علمی اورتحقیقی حلقوں میں اپنی ذکاوت، ذہانت، تبحر علمی اور تحقیقی صلاحیت کی دھاک جماچکے تھے۔وہ ہندوستان کی ایسی علمی شخصیتوں میں ایک ممتاز دینی شخصیت تھے جودنیا بھر میں معروف اورجانی پہچانی شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے اہم، دینی،علمی اورتہذیبی اداروں سے ان کاتعلق رہا۔ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ، دارالعلوم دیوبند اورعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی سربراہی سے لے کر دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ منتظمہ تک کی رکنیت تک وہ ایک باعزت مقام اورقابل احترام حیثیت کے مالک رہے، دہلی کے مشہور اسٹیفنس کالج کے بھی وہ پروفیسر رہے۔ جہاں پاکستان کے موجودہ صدر جنرل ضیاء الحق سمیت طالب علموں اورمتعلموں کی ایک کثیر تعداد نے ان کی علمی شخصیت سے فیضان حاصل کیااوراپنے ذہنوں کوان کے چشمۂ علوم وذہانت سے سیراب کیا۔

یورپ اورامریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں نے ان کے علمی اوردینی کمالات کے اعتراف سے انہیں وزیٹنگ پروفیسر کے اعزاز سے نوازا،اورانہوں نے دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے علوم شرقیہ کے حلقوں کواپنے خیالات اورعلمی موشگافیوں سے متأثر کیا۔وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں ہونے والے بیشمار علمی مباحثوں،سمیناروں اورعلمی ودینی کانفرسوں میں شریک ہوئے اورمستقل رکن کی حیثیت سے متعدد عالمی انجمنوں اوراداروں میں شریک کیے گئے۔

دارالعلوم دیوبند،ان کی مادرِعلمی،ندوۃ المصنفین ان کا آشیانہ،ماہنامہ برہان ان کے ذہن کاترجمان اورساری دنیا ان کی پرواز کی زد میں رہی۔ ندوۃ المصنفین اورماہنامہ برہان، ان کے اصل مرکز علمی کی حیثیت سے آخرتک ان کے ساتھ رہے، انہوں نے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے علمی کاموں کے شریک، تصنیفی اورتحقیقی کارناموں کے سہیم اور ان کے ذہن وفکر کے امین کی حیثیت سے اپنے علمی وقار اور ندوۃ المصنفین کی شہرت کوچار چاند لگانے میں ناقابلِ فراموش حصّہ لیا۔

مولانا سعیداحمد اکبرآبادی ندوۃ المصنفین کے رفیق،اور ماہنامہ برہان کے مدیر ہی نہیں تھے،مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے دست راست ، بلکہ ایک بھائی کی حیثیت سے ان کی زندگی تک ایسے اعلیٰ مقام پر فائز رہے جن پر مفتی صاحب کی تمام شفقتیں،برادرانہ تعلق، اور جذباتی محبتیں نچھاور ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ندوۃ المصنفین کے قیام اوراس ادارہ کوہندوستان کاسب سے بڑا علمی، تحقیقی، اورتصنیفی مرکز کی شکل میں تبدیل کرنے کے منصوبے میں لاریب ___ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے سوا کوئی شریک نہ تھالیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ندوۃ المصنفین کوایک ممتاز اور باوقار علمی اور دینی ادارہ کی آب وتاب اورعزو احتشام دینے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اورمولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کا حصّہ سب سے زیادہ رہا۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرمفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کومولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اورمولانا سعیداحمد اکبرآبادیؒ کی رفاقت اور دست گیری کایقین نہ ہوتا تواس عظیم الشان منصوبہ کوعملی جامہ پہنانے کی ہمت ہی وہ بمشکل کرسکتے تھے۔ جہاں تک مفتی صاحب کی عزیمت اور استقلال کا سوال

ہے،اس کا ثبوت ۱۹۴۷ء کے ان فرقہ وارانہ فسادات کے زمانہ میں غیر مشکوک انداز میں سامنے آیا۔ جب کہ ان فسادات کی آگ کی لپٹیں دہلی کی قدیم تہذیب اورسماجی نظام کے ساتھ ندوۃ المصنفین تک کی چار دیواری تک بھی پہنچیں۔اور وہ اس بُری طرح ان کی زد میں آیا کہ لاکھوں روپیہ کی کتابیں جل کر خاک ہوگئیں اور بربادی اس خوف ناک حدتک پہنچی کہ تن کے کپڑوں کے سوا،مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے پاس اثاثہ کے نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔اور وہ ندوۃ المصنفین کی قرول باغ کی جلی ہوئی تاراج عمارت سے معجزانہ طور پر محفوظ اور صحیح وسالم پرانی دہلی پہنچ گئے۔ یہ وقت جودہلی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں بھی مجسم طور پر سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہوگیا تھا،ندوۃ المصنفین کی زندگی اورموت کے بارے میں بھی فیصلہ کن وقت تھا اور یہ وہ وقت تھا کہ ایک مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے علاوہ،ندوۃ المصنفین کے احیاء جدیداور جلے ہوئے تنکوں سے آشیانہ کی تعمیرنو کی ہمّت کسی کے اندر باقی نہ رہی تھی۔اورہم اس کے چشم دید گواہ ہیں کہ جب مفتی صاحبؒ نے دوبارہ ندوۃ المصنفین کے شیرازہ کو جمع کرنے کی تجویز رکھی تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے ساتھ مولانا سعیداحمد اکبرآبادیؒ بھی حیرت زدہ دکھائی دینے لگے، لیکن مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے عزم، حوصلہ اوراستقامت نے دوبارہ اس ناممکن کام کوممکن کردکھایا۔جسے اس وقت بلا استثناء سبھی لوگ ناممکن سمجھ رہے تھےاوراس بارے میں کامیابی سے مایوس تھے۔

مولانا سعیداحمد اکبرآبادیؒ کی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے ساتھ تعلق کی داستان بلامبالغہ آدھی صدی سے بھی زیادہ مدّت کا احاطہ کرتی ہے اور کلکتہ سے دہلی تک کی غیر منقطع ہم نشینی کی مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔اس تعلق کی خودنوشت کہانی مولانا اکبرآبادیؒ نے برہان میں مفتی صاحبؒ کی وفات کے بعد شروع کی تھی جوافسوس ہے کہ خود ان کی وفات سے نامکمل رہ گئی، تاہم ہم جیسے مشاہدوں کی نظر سے بھی وہ والہانہ تعلق ،جذباتی وابستگی اور ذہنی ہم رنگی پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی جومفتی صاحب کو مولانا اکبرآبادیؒ کے ساتھ تھی۔ وہ بلا مبالغہ مولانا اکبر آبادیؒ کواپنا عزیز بھائی ،اپنا دست وبازو،اوراپنے خاندان کاایک فرد، ہرمعنوں میں سمجھتے تھے۔آخرعمر میں، دارالعلوم کے مسئلہ پردونوں کے درمیان نظریاتی ہم آہنگی میں کچھ فرق ضرور آ گیا تھا۔لیکن کچھ تو مفتی صاحبؒ کے صاحب فراش ہو کر سرگرم اورعملی سرگرمیوں سے الگ تھلگ ہوجانے اور کچھ محبوبیت اوررفاقت کے اس مضبوط رشتے کی وجہ سے ،جس کا ذکراوپر کیا جاچکا ہے۔جذباتی تعلق میں ذرا بھی فرق نہیں آیااوردل سوزی اوردل ربائی کی کیفیت آخر تک باقی رہی۔

مفتی صاحب کی رحلت کے بعد،مولانا سعیداحمد اکبرآبادیؒ کی صحت میں بھی فرق آ گیا تھا اور قوائے جسمانی میں انحطاط کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔عوارض اور کمزوری نے ان پر اس درجہ قابو پالیا تھا کہ وہ مفتی صاحبؒ کی شخصیت پراپنا وہ تعزیتی مضمون بھی مکمل نہ کرسکے، جس کا سلسلہ انہوں نے برہان میں شروع کیا تھا۔آخرعمر میں انہیں اپنے جوان لڑکے کی موت کا صدمہ دیکھنا پڑا، جوان کے لیے عملی طور پرناقابل برداشت ثابت ہوا اوران کے مرض کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ چند مہینے پہلے وہ بغرض علاج اپنے اہل خاندان کے پاس کراچی چلے گئے۔ جہاں کینسر کے موذی مرض کی تشخیص ہوئی اوراسی مرض میں ۲۴رمئی کوان کا انتقال ہوگیا۔اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ان کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے اورانہیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے۔آمین۔

ندوۃ المصنفین کے سلسلے میں ہم نے ۱۹۴۷ء کے حالات کا تذکرہ اس مقصد کے تحت کیا ہے کہ جس طرح مفتی صاحبؒ کی زندگی میں،دہلی میں پھٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات اورتقسیم ملک کے بعد کے حالات نے ندوۃ المصنفین کی زندگی اورموت کا سوال پیدا کردیا تھا، وہی صورت اس ادارے کو مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی وفات اوراب مولانا سعیداحمد اکبرآبادیؒ کے بعد ندوۃ المصنفین کے مستقبل کودرپیش ہے۔مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے اپنی حیات میں بے شمار مرتبہ ندوۃ المصنفین کے مستقبل کے بارے میں تشویش ظاہر کی، اور ہر بار انہوں نے اس نکتہ پر گفتگو کوختم کردیا کہ:

''ندوۃ المصنفین جیسے ادارے بار بارنہیں بنتے ،ایک بار یہ ادارہ برباد ہوگیا تو دوبارہ ایسا ادارہ قائم ہونے کی کوئی امید نہیں۔''

اس سلسلے میں اطمینان کی ایک بات یہ ہے کہ عزیزی عمید الرحمٰن عثمانی نے مفتی صاحب کی زندگی میں ہی ندوۃ المصنفین کا اہتمام اورانتظام سنبھال لیا تھا اوراس فرض کوایسی قابلیت اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا کہ مفتی صاحبؒ کی زندگی کے آخری لمحات ندوۃ المصنفین کے سلسلے میں یک گونہ بےفکری کے ساتھ گزرے اوراس عرصے میں ندوۃ المصنفین کے کاموں میں نہ صرف کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ عمید الرحمٰن عثمانی کے حسنِ انتظام کے بہتر آثار بھی نمایاں طور پر سامنے آئے۔ بہت سی کتابیں نئی صوری خوبیوں کے ساتھ منصّۂ شہود پر آئیں۔اوراس کے تجارتی دائرے میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ عمید الرحمٰن نے معاملات اورحالات پرمکمل قابو پانے کی ایسی صلاحیت کا مظاہرہ کیا جوخوش آئندہ بھی تھا اورامید افزا بھی۔اس صورت حال میں سب سے زیادہ

ضروری بات یہ ہے کہ ندوۃ المصنفین ان کے انتظام اوران ہی کی نگرانی میں بدستور چلتا رہے۔اورکوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو جو چلتے چلاتے ادارے میں برہمی اورابتری پیدا کرنے کا باعث بن سکے۔

ہمیں امید ہے کہ ندوۃ المصنفین کے بہی خواہ اور متعلقین اس ادارے کے تحفظ کی ذمہ داری محسوس کریں گے اور مفتی صاحبؒ کے اہل خاندان بھی مفتی صاحبؒ کی اس حقیقی یادگار،اور ہندوستان کے ممتاز علمی اوراشاعتی ادارے کوقائم رکھنے اورترقی دینے میں، پورے جذبۂ خلوص اورسنجیدگی کے ساتھ عزیزی عمید الرحمٰن کا ہاتھ بٹائیں گے،جس کے لیے مفتی صاحب کے الفاظ سے بہتر کوئی الفاظ ہمیں نہیں ملتے کہ ''ندوۃ المصنفین جیسے ادارے بار بار نہیں بنتے۔'' اس لیے سب کی کوشش بجا ہونی چاہیے کہ یہ ادارہ قائم رہے۔ [جون ۱۹۸۵ء]

عمید الرحمٰن عثمانی کو گہرا صدمہ

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر و پبلشر ماہنامہ رسالہ برہان کو گہرا صدمہ وداغ

ابھی ابھی والدۂ ماجدہ کے بالکل تازے غم سے دوچار ہوئے چند یوم ہی گزرے تھے کہ اچانک تیسرے صدمے نے مجھے لپیٹ لیا۔ایک سال میں میرے حضرت والدِ ماجد مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور پھران کے بعد والدۂ محترمہ کے انتقال نے مجھ کو کافی بوسیدہ کردیا تھا جو یہ تیسرا جھٹکا اور مجھے لگا... نہایت رنج وغم کے ساتھ میں یہ اطلاع دیتا ہوں کہ میرے ماہنامہ رسالہ بُرہان دہلی کے مُدیر مورخہ ۲۴رمئی ۱۹۸۵ء مطابق ۳؍رمضان المبارک کو سخت علالت کے بعد کراچی (پاکستان) میں انتقال فرماگئے۔ موصوف سب سے پہلے اس رسالے کے ایڈیٹر چنے گئے یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا تھا، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے ان کا انتخاب بڑی سوجھ بوجھ سے فرمایا تھا۔ جنہوں نے ماہنامہ رسالہ برہان کی خدمت میں ایک تعمیری مثال قائم کی اس خلے کو جو مستقبل میں اور موجودہ دور میں کوئی پُر نہیں کرسکتا۔بہرحال وہ میرے لیے محسن اورسرپرست تھے اس تنہائی میں جو مجھے گہرا دلی صدمہ پہنچا ہے اس کو کیسے برداشت کیا جائے۔

میرے لیے آپ لوگ صبر وتلقین کی دُعا کریں میری یہ کوشش رہے گی کہ برہان کا معیار اور وقار اُسی انداز سے قائم رہے۔اس میں ،میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں آنے دوں گا۔میں آپ سے اس سلسلے میں خصوصی تعاون کی درخواست کرتا ہوں۔ میرے کارکنانِ ادارہ اور برادران حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی موت پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔

ہندوستان میں ان کے بعد تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا۔

نوٹ: ویسے کئی برس سے مولانا اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد کمزور ہوچکے تھے اور تقریباً ڈیڑھ برس سے رسالے کے کاموں سے صاحبِ فراش تھے لیکن اس کے باوجود رسالے کے نظم میں کوئی کمی نہیں پائی ،مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان وکرم اور فضل رہا ہے۔[عمید الرحمٰن عثمانی، جون ۱۹۸۵ء]

بہاری،مولانا ابوسلمہ شفیع احمد

مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری

بہار کی سرزمین سے آخری دور میں جو چند نامور علماء پیدا ہوئے ان میں جناب مولانا ابوسلمہ شفیع بہاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم وفضل ،تقویٰ وطہارت ،دینی وعلمی خدمت ، نیک نفسی ، تدریس وتعلیم ،تصنیف وتالیف ،ارشاد وتبلیغ اور دیگر دینی وعلمی کارناموں کی وجہ سے خاص مقام ومرتبہ رکھتے ہیں، افسوس کہ علم وعمل کا یہ چراغ دوشنبہ ۲۲؍دسمبر ۱۹۸۵ء کو کلکتہ کی سرزمین میں چھپ گیا رحمة الله عليه وغفرالله لهٗ۔نماز جنازہ جناب مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی نے پڑھائی، عام اندازہ کے مطابق جنازہ میں تیس چالیس ہزار مسلمان شریک تھے، جو مولانا مرحوم کی عنداللہ وعندالناس مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

مولانا مرحوم نے نام ونمود سے نفور اور شہرت وناموری سے دور رہ کر پوری زندگی دینی وعلمی خدمات میں بسر کی،اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا خاکہ ناظرین کے سامنے آجائے۔آپ ۱۹۱۲ء میں بہار شریف میں پیدا ہوئے ۔ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا حکیم امیر حسن صاحبؒ سے حاصل کی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے خسر مولانا اصغر حسن صاحبؒ پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے پڑھیں، اس کے بعد مدرسہ قومیہ میں داخل ہوکر سند حاصل کی، پھر مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں داخلہ لیا۔ان دنوں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم بھی اسی مدرسہ میں زیر تعلیم تھے ،دونوں حضرات کی دوستی یہیں سے شروع ہوئی اور آخری وقت تک قائم رہی۔آخر میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، یہاں ایک سال رہ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سُورت (گجرات) چلے گئے اور یہیں سے سند فراغت پائی،آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور مشہور ادیب مولانا ابوعبداللہ بن یوسف سورتیؒ ہیں، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔

فراغت کے بعد وطن آکر مدرسہ قومیہ میں تعلیم وتدریس میں لگ گئے،اسی کے ساتھ سیاسی اورملّی وقومی تحریکات میں حصہ لیتے رہے،سیاسیات میں کانگریس کمیٹی میں رہ کر کام کیا،مگر ۱۹۴۷ء کے بعد عملاً اس سے علیحدہ ہوگئے۔

۱۹۴۸ء میں امام بیہقیؒ کی مشہور ومعروف کتاب معرفتہ السنن وآلاثار کا پہلا حصّہ تعلیق وتصحیح کے بعد شائع کیا،۱۹۴۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں حدیث وتفسیر کے استاذ مقرر ہوئے اوراس عہدہ کونہایت ذمہ داری اورقابلیت کے ساتھ پورا کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوئے،اس کے بعد ادارۂ ترجمہ وتالیف کی بنیادرکھی اوراس ادارہ سے امام ابن قتیبہ کی کتاب المعارف سے سیرۃ الرسول کا اردوترجمہ مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا اوردیگر کتابیں بھی اس ادارہ سے شائع کیں،۱۹۵۰ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کے مضامین کا مجموعہ سید صاحب کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۵ء تک خلافت کمیٹی کلکتہ کے زیر اہتمام عیدین کی امامت فرمائی،وعظ وخطابت میں خاص ملکہ رکھتے تھے،ان کی تقریر عالمانہ اورپُرمغز ہونے کے ساتھ بڑی دلچسپ ہوتی تھی اس لیے عوام وخواص دونوں طبقے ان کی تقریر کے شیدائی تھے،زوربیان اورطرز خطابت میں امتیاز حاصل تھا،بڑے بڑے دینی جلسوں میں ان کی شرکت ہوتی تھی،اسی کے ساتھ کلکتہ کی مختلف مسجدوں میں درس قرآن دیا کرتے تھے،ان میں ٹیپوسلطان کی مسجد،شاہی مسجد،چترنجن ایونیو کی مسجد،راجہ بازار کی جامع مسجد اورسبزی منڈی کی مسجد میں درس قرآن کی بڑی اہمیت وافادیت تھی،حال کی بات ہے کہ جب کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کے خلاف ایک اسلام دشمن نے مقدمہ دائر کیا تو مولانا کی تحریک پرعالموں،دانشوروں اورمسلم وکیلوں نے دفاع قرآن کمیٹی قائم کی، جس نے بروقت مسلمانوں کی رہنمائی کی،مولانا مرحوم نے دفاع قرآن کمیٹی کو بیس ہزار روپیہ کی کتابیں عنایت فرمائیں جن کوفروخت کرنے کے بعد بیس ہزار کی رقم دفاع قرآن کمیٹی میں جمع ہوگئی۔مولانا قرآن کے نام پر عام چندہ کرنے کوسخت ناپسند کرتے تھے۔

ادارۂ ترجمہ وتالیف کوبغیر کسی سے چندہ لیے نہایت کامیابی کے ساتھ چلایا اورکئی اہم اورمفید کتابیں شائع کیں،اس ادارہ سے مسلمانوں کی اصلاح اور ردشرک وبدعت کے سلسلہ میں کئی پوسٹر شائع کیے۔

مولانا تقریر کی طرح تحریر میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے،ان کوتصنیف وتالیف کا نہایت ستھرا ذوق تھا،ان کی تصنیفات میں (۱) یکساں سول کوڈ اوراس کا اسلامی احکام پراثر، (۲) ختم رسالت اورقادیانی فتنہ، (۳) اکبر کا دین الٰہی، (۴) حجۃ الوداع، (۵) تعلیمات قرآن وغیرہ قابل ذکر کتابیں ہیں،عیدین کے خطبے بھی شائع کرتے تھے پیغام عمل کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔

یوں تو مولانا مرحوم جملہ اسلامی علوم وفنون کے عالم تھے اورمروجہ علوم میں یدطولیٰ رکھتے تھے مگران کوعلم حدیث سے عشق کی حد تک تعلق تھا،اس میں خاص استناد کا درجہ رکھتے تھے اوران کے علمی وتصنیفی کارناموں میں علم وحدیث کونمایاں حیثیت حاصل ہے۔

حضرت امام بیہقی کی نادرونایاب اورنہایت اہم کتاب معرفۃ السنن والآثار کواپنی تصحیح وتعلیق سے شائع کرنا چاہتے تھے اوراس کا پہلا حصّہ خود چھاپ کر بھی شائع بھی کیا۔مولانا نے اس کے چند نسخے میرے پاس بمبئی میں بھیجے تھے، میں نے اس کا ایک نسخہ مولانا ابولوفا افغانی رئیس الجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد کوبھیجا تو مولانا نے حدیث کے اس نادرونایاب تحفہ پر بڑے والہانہ انداز میں شکریہ ادا فرمایا تھا،امام ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ کی کتاب اسماء الصحابۃ الرواۃ ومالکل واحد من العدد بھی اپنے اہتمام سے شائع کی۔

رسالہ برہان ۱۹۵۰ء امام دارقطنی پرتین چارقسطوں میں مضمون شائع کیا۔ ۱۹۵۳ء میں رسالہ برہان میں پانچ قسطوں میں ''ہندوستان میں علم حدیث کی تالیفات'' کے نام سے مقالہ شائع کیا،۱۹۶۶ء کے رسالہ برہان میں مسند امام احمد پرایک طویل مقالہ سپردقلم فرمایا اور۱۹۷۴ء کے برہان میں امام شافعی کی ''کتاب الأمّ'' پرمحققانہ مضمون لکھا۔اس طرح مولانا نے بہت سے خالص علمی وتحقیقی مقالات تحریر کیے جن میں علم حدیث سے متعلق اہم معلومات۔۔۔

۱۹۶۶ء میں مولانا حج وزیارت کوتشریف لے گئے۔راقم بھی اسی سال حاضریٔ حرمین شریفین سے مشرف ہوا تھا۔اس مبارک سفر میں مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات ہوئی جو نہایت مخلصانہ اوردیرپا رہی۔اس سفر میں ان کی شفقت و محبت،ان کا خلوص وایثار،ان کی سادگی ونیک نفسی،اوران کا علمی شغف بہت قریب سے دیکھنے میں آیااورمولانا کی شخصیت نے اپنا گرویدہ بنالیا،ہم دونوں حرمین شریفین کے کتب خانوں میں ایک ساتھ جاتے۔مولانا علم حدیث سے متعلق مخطوطات ونوادرات سے اخذ واقتباس فرماتے اورراقم اپنے موضوعات سے متعلق معلومات جمع کرتا تھا۔اس وقت مکہ مکرمہ کے مشہور عالم سید علوی مالکیؒ حیات تھے،ہم لوگ ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے،ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد حسن علوی مالکیؒ نے مولانا مرحوم سے حدیث کی سند بھی لی تھی۔ مدینہ منورہ میں کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت میں ہم دونوں صبح

سویرے ہی پہنچ جاتے اور ظہر کی نماز کے وقت وہاں سے نکلتے تھے، واپسی کے بعد مولانا نے ادارۂ ترجمہ وتالیف قائم کیا تو راقم کو بھی اس کا بھی رکن بنایا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک بار بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی اور وہی خلوص، وہی یگانیت، اور وہی عالمانہ انداز تھا مگر یہ ملاقات بہت مختصر رہی۔ ادھر بہت دنوں سے کلکتہ جانے اور مولانا مرحوم اوران کے بعض دوسرے احباب سے ملاقات کرنے کا ارادہ ہورہا تھا کہ اچانک ایک دن اخبار میں مولانا کے وصال پُر ملال کی خبر پڑھی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اوران کے درجات بلند کرے، اوراُن کے صاحبزادے مولوی ابوطلحہ صاحب ندوی کوان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطافرمائے اوروہ اپنے والد مرحوم کی طرح دینی وعلمی زندگی کے وارث ہوں۔ آمین [قاضی اطہر مبارک پوری، فروری ۱۹۸۶ء]

واصف، مولانا حفیظ الرحمٰن

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف

گذشتہ مہینے (۱۳ مارچ) کواجڑنے اور بار بار بسنے والی دلّی کی ایک اورفخر روزگار شخصیت مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کی شکل میں اس دنیا سے اٹھ گئی اور دلّی کی بساط علم و دین اورادب وشعر پر چھایا ہوا اندھیرا کچھ اور گہرا ہوگیا، ان کی وفات پر محدود صحافتی اور علمی حلقوں میں اضطراب اور ہلچل کی کمزورسی کیفیت نظر آئی جو مولانا حفیظ الرحمٰن واصف جیسی جلیل القدر شخصیت کے ماتم کے لیے نہ صرف ناکافی بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی رفعت شان سے حددرجہ کم تر تھی۔ وہ ان ٹمٹماتی ہوئی شمعوں میں سے ایک شمع تھے جوآزادی سے پہلے اورآزادی کے بعد کی دہلی کی تمدنی تبدیلیوں اورلسانی اورسماجی تلاطم کی نوعیت اورکیفیتوں کی عکاس تھی اوروہ خود آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے درمیان نہ صرف حدِ فاصل کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ ان کا شمارسماجی انقلاب حال کے مشہور ماتم گساروں اور میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، حالیؔ اور داغؔ جیسے نوحہ خوانوں میں ہوتا تھا۔

وہ اس خانوادۂ علم وشریعت کے چشم وچراغ تھے، جس نے ۱۸۵۷ء میں اجڑنے والی دہلی کوازسرنوسجانے اور بہاروں سے آراستہ کرنے میں حصہ لیا تھااور ایک پورے تمدن کی تباہی کے بعد اس کے ملبہ سے نئی اوردلآویز عمارت تعمیر کرنے کی ہمت دکھائی تھی۔

وہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کے فرزند دلبند اوران کی سیرت اور خصلت کے بے شمار پہلوؤں میں ان کے حقیقی وارث اور جانشین تھے۔ انہوں نے آنکھ کھول کراپنے یگانہ روزگار والد کے علاوہ جن لوگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں، اور جن کی صحبتوں سے فیض اٹھایا تھاوہ سب وہ لوگ تھے کہ اب ان کا ثانی، دہلی کی سرزمین پرشاید ہی چشم فلک کوکبھی دیکھنا نصیب ہو۔

آج کی دہلی میں ان کا وجود بہاروں کی یادگار یا غالب کے الفاظ میں داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع کی طرح دکھائی دیتا تھا، کیونکہ ان کے دیکھتے ہی وہ دنیا یکسر تبدیل ہوگئی تھی، جسے انہوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تھا، اور جس کی امتیازی خصوصیات کواپنی شخصیت میں جذب کرکے، اس کا منفرد سانچہ تیار کیا تھا۔ وہ خواجہ حسن نظامی، خواجہ عبدالمجید، سائل دہلوی، بے خود دہلوی، راشد الخیری، دتاتریہ کیفی، ملاواحدی، آصف علی (بیرسٹر)، خواجہ محمد شفیع، آغا شاعر، حیدر دہلوی، خواجہ عزیز حسن بقائی، شاہد احمد دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا سمیع اللہ کی دہلی کے ترجمان تھے اوراس کہکشاں کاایک ستارہ تھے، جس میں ان کے فخر روزگار والدحضرت مولانا مفتی کفایت اللہ ایک آفتاب عالم تاب کی حیثیت رکھتے تھے۔

مفتی کفایت اللہؒ کا شمار آزادی سے پہلے کے اسلامیات ہند کی مقتدر اور اہم ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ مفتی کفایت اللہؒ سیاسی فراست، مردم شناسی، اور دینی تبحر کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں اتنے ممتاز تھے کہ ان کے پورے عہد میں صرف مفتی صاحب کا لفظ، ان کی شناخت کے لیے کفایت کرتا تھا اور ہر کس و ناکس سمجھ سکتا تھا کہ اس سے مفتی کفایت اللہ کے سوا کوئی دوسری ذات مراد نہیں۔ یہ وہ شرف وامتیاز ہے جوان کے بعد صرف وہ مفتی صاحب کے حوالے سے سارے ہندوستان میں پہچانے گئے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کی دلچسپیوں اورر جحانات میں بڑی رنگارنگی پائی جاتی تھی، دینی علم انہیں ان کے عظیم الشان والد سے ورثہ میں ملا تھا اوران کی تعلیم وتربیت بھی خالص دینی ماحول بلکہ کہنا چاہیے کہ مفتی اعظم کے گھرانے میں ہوئی، انہوں نے آنکھ کھول کر تصنیف وتالیف، شعروادب، اورمجلس آرائیوں کی وہ فضا دیکھی جس کی بدولت اس زمانہ کی دہلی، ہندوستان کا دھڑکتا ہوادل بن گئی تھی۔ ان مجلسوں میں ایک طرف حکیم اجمل خاں کی شرافتِ نفسی کی پھوار سے شریکِ بزم لوگوں کا مشام جاں معطر ہوتا، دوسری طرف مولانا محمد علی کی وغایت کی گرج اور شیر جیسی دہاڑ سے سیاستدانوں کے محلوں کے کنگرے لرزتے نظر آتے، ایک طرف سائلؔ اور بیخودؔ کی شاعری کے زمزموں سے دہلی کی ادبی فضائیں گونجتیں، دوسری طرف خواجہ حسن نظامی، اورراشد الخیری کا سحر نگار قلم ادب

کے کینوس پر فطرت اور غم کی مصوری اور عکاسی کرتا دکھائی دیتا۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کی شخصیت نے ان سارے اجزاء بلکہ ان کے بہتر عناصر کو اپنے اندر جذب کیا۔ وہ شاعری میں سائل دہلوی کے باقاعدہ شاگرد ہوئے، اور مولانا احمد سعید دہلوی اور خواجہ حسن نظامی کی صحبتوں میں انہوں نے میر تقی میر کے بقول چیلوں کے کوچوں کی ٹکسالی زبان اردو کا شعور اور ملکہ حاصل کیا اور نظم ونثر میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ ان کا شمار ایک طرف تو داغؔ اسکول کے نامور ترجمانوں اور صاحب دیوان (دیوان کا نام زرگل) شاعروں میں ہونے لگا، اور دوسری طرف وہ اردو بول چال اور نثری ادب کے ماہر اور مستند اہل قلم تسلیم کیے گئے۔ جگرؔ مراد آبادی کے بعد مولانا حفیظ الرحمٰن واصف ہی اردو کے ایسے شاعر تھے جو خوش نویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور جن کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے خطاط اور خوش نویس ہوتے۔ انہوں نے خوش نویسی نہ صرف اپنے والد مولانا مفتی کفایت اللہؒ سے ورثہ میں پائی تھی، بلکہ مشق اور محنت کے ذریعہ اس میں استادانہ مہارت بھی حاصل کی تھی۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، دہلی کے قدیم وجدید دور کے ایک نمائندہ ادیب، شاعر اور عالم تھے، انہوں نے علمی دنیا پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ مفتی کفایت اللہؒ کے لاکھوں فتوؤں کا انتخاب کفایت المفتی، کے نام سے نو (۹) ضخیم جلدوں میں شائع کرکے، دین وفقہ کے ایک بڑے سرمایہ کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا۔ کفایت المفتی کی ۹ جلدیں، یقیناً ان کی تالیفی صلاحیت، محنت اور سرمغزی کا ایسا ثبوت ہیں جو آنے والے لوگوں کے لیے ایک ولولہ انگیز مثال بنی رہیں گی۔ بلاشبہ یہ ایک آدمی کا کام معلوم نہیں ہوتا اور اس اعتبار سے حیرت انگیز ہے کہ انہوں نے اسے خاموشی کے ساتھ انجام دے دیا، اس ایک کارنامے کے علاوہ سائل دہلوی کی ایک سوانح عمری جس کا شمار ہم ان کی ابتدائی تصانیف میں کرتے ہیں، اور خود ان کی شاعری کا مجموعہ 'زرگل' بھی ان کے فن اور قلم کی یاد دلاتے رہیں گے۔

وہ عربی کے باقاعدہ عالم، دینی علوم کے ماہر اور فارسی اور اردو زبانوں کے فاضل اور نکتہ شناس تھے اور ۱۹۵۴ء میں مفتی کفایت اللہؒ کی وفات کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی میں، ان کی مسند پر بیٹھ کر ان کے جانشین کی حیثیت سے تفسیر اور دینی علوم کی مدرسی اور معلّمی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے۔ فارسی زبان پر پورے عبور اور اردو زبان کے پرانے محاورات اور مصادر پر ان کی گہری نظر تھی، اس لیے انہیں اس بے راہ روی سے زبردست تکلیف پہنچتی تھی، جسے اردو کے موجودہ شاعر اور ادیب اپنی ناواقفیت کے باعث نظم ونثر میں روا رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو زبانوں کی صحت اور درستگی پر زور دینے کے لیے جہاں 'اردو مصدر نامہ' جیسی اہم کتاب تصنیف کی وہاں سینکڑوں مضامین اردو زبان کی صحت اور لغت کے موضوع پر لکھے، جن میں سے بیشتر مضامین برہان میں شائع ہوئے۔

وہ ماہنامہ برہان کے مستقل سرپرستوں اور رفیقان قلم میں سے ایک تھے، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے نام کے شیدا، اور برہان کے ان قدردانوں میں سے تھے جن کے اخلاص، تعلق اور صحبت کی گرمی سے محرومی کا احساس ہمیشہ باقی رہے گا، جس کی تلافی کی اب کوئی صورت موجود نہیں۔ جب بھی وہ کوئی اہم مضمون یا تحقیقی مقالہ لکھتے، برہان کو ہی اس کی اشاعت کا ذریعہ بناتے۔ اردو زبان کے مصادر اور لغوی تحقیق اور لسانی نزاکتوں پر ان کے مضامین اور مقالوں کا ایک پورا سلسلہ برہان کی فائلوں میں محفوظ ہے۔ جو ان کی اردو زبان پر قدرت اور عربی و فارسی زبانوں پر ان کے کامل عبور کی دلیل ہے۔

ان کی وفات سے نہ صرف دہلی کی پرانی تہذیب اور اردو کے مخصوص کلچر کی نمائندہ ایک عظیم شخصیت اس دنیا سے اٹھ گئی بلکہ برہان کو ایک ایسے مستقل قدرداں اور عظیم اہل قلم سے محرومی کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا، جس کی تحریروں کو پورے ملک میں قدر اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاسکتا تھا۔ ان کی وفات بلاشبہ خاندان عثمانی اور برہان کے ادارے کے لیے ایک ذاتی صدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

[اپریل ۱۹۸۷ء]

نجم الدین، پرنس

پرنس نجم الدین

پرنس نجم الدین کی وفات کا حادثہ اتنا الم ناک اور صدمہ انگیز ہے کہ ہمیں اس کے دوررس اثرات کے تصور ہی سے وحشت ہورہی ہے ان جیسا دردمند مسلمان، ان جیسا عالم وفاضل اور ذہین شخص، ان جیسا سوشل ریفارمر، ان جیسا ماہر تعلیم اور ان جیسا اعلیٰ دماغ منتظم ایک مدت سے مسلمانوں میں کوئی دوسرا نہیں تھا، کہنے کو وہ بوہرہ فرقہ کے مسلمانوں کے روحانی پیشواؤں کے خاندان کے اہم ترین فرد تھے لیکن حقیقتاً ان کے فکر ونظر کی اڑان آفاقی تھی۔ جہاں کہیں مسلمانوں کی صف میں کسی بدنظمی کے آثار ظاہر ہوتے، جہاں کہیں کسی مسلم تحریک کو مشکل درپیش ہوتی، جہاں کہیں کسی مسلم ادارہ کو رہنمائی، تعاون اور مدد کی ضرورت ہوتی،

ان کا دل دردمندی اور بے قراری کی شدت سے دھڑکنے لگتا اور وہ پوری توجہ اور فراخ دلی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ کتنے مسلم رہنماؤں نے ان کی دل سوزی اور ہمدردی سے فیض اٹھایا، کتنے اداروں نے ان کی فیاضی اور سیر چشمی سے استحکام حاصل کیا، کتنی تحریکوں نے ان کے تعاون اور خاموش امداد سے قوت اور حوصلہ پایا۔ کتنے صاحب علم وفن ان کی قدردانی اور سرپرستی سے سیراب اور فیض یاب ہوئے ان کی لامتناہی اور طویل داستان، اب ان ہی کے ساتھ خاموش ہوگئی۔

وہ مسلمانوں کی فلاحی تحریکوں کے روح رواں آدھی صدی سے زیادہ عرصے تک بنے رہے لیکن ان کی سمندروں جیسی گہرائی، ان کی فطرت کا خاموش جوہر، ان کی منکسر مزاجی نے کبھی بھی اپنے کو کھولنے اور واشگاف کرنے کے سطحی انداز کے قریب نہیں آنے دیا۔ مسلمانوں کی ملّی سرگرمیوں کی سرزمین پر ان کا وجود سورج کی طرح تھا، جس کی کرنوں کا فیض خاص وعام کے امتیاز اور فرق کے بغیر ہر ایک کے لیے دستیاب تھا۔

وہ بوہرہ فرقہ کی فلاحی اور جماعتی سرگرمیوں کا ایک ایسا محور تھے کہ بلاشبہ اس کے معاشی، علمی، دینی اور سماجی امنگوں کے سارے سوتے ان ہی کی ذات کے سرچشمے سے پھوٹتے رہے۔ انھوں نے اپنے عظیم الشان والد سیدنا طاہر سیف الدین سے ملت کی دلسوزی، رہنمائی اور فیض رساں طبیعت ورثہ میں پائی تھی اور ان ہی کی تربیت سے ان کے اندر وہ علمی اور تہذیبی مذاق پیدا ہوا جس کی بلندی اور گہرائی کی دوسری مثال ان کے حلقے میں نہیں پائی جاتی۔ نوجوانی ہی کے دور میں ان کی علمی اور ادبی اور تاریخی شعور کی پرچھائیاں ملت کے دینی، علمی اور مذہبی حلقوں پر محسوس ہونے لگی تھیں، پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے کاموں اور مشغولیتوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور آخر آخر وہ ایک ایسے آفتاب عالم تاب کی طرح موجودہ وقت کے عالم اسلام پر قائم ہوگئے جس کی کرنوں کے سامنے ملکوں اور سلطنتوں کی حدود بے معنی ہوکر رہ گئیں۔

ان کے عظیم المرتبت بھائی سیدنا برہان الدین کی شفقتوں اور محبتوں نے جہاں ان کی اپنی دنیا کو روشن کیا وہاں ان کی اپنی دنیا کی روشنی نے ساری دنیا میں پھیلی ہوئی بوہرہ فرقہ کی ترقی اور کارناموں کی رفتار میں ایسی تیزی پیدا کی کہ یہ فرقہ پورے عالم اسلام میں بے مثال احترام اور عزت کا مستحق سمجھا جانے لگا۔

پرنس نجم الدین نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان، یمن، مصر اور سبھی ایسے ملکوں میں جہاں بوہرہ فرقہ کی آبادیاں پائی جاتی ہیں، ایک ایسے قابل احترام درجہ اور ایک ایسے باعزت مقام کے مالک بن گئے جس کے بنانے میں ان کی ذاتی خوبیوں اور شخصی کمالات نے حصہ لیا تھا۔ وہ عربی، گجراتی اور انگریزی کے قادر الکلام ادیب اور ایسی شخصیتوں میں سے ایک تھے، جن کے افکار اور جن کی تعمیری جدوجہد میں حیرت ناک مطابقت پائی جاتی تھی، وہ سورت کی جامعۃ السیفیہ کے ریکٹر اور اس یونیورسٹی کے ایسے معمار تھے جس نے بوہرہ فرقہ میں، عالموں اور فاضلین مذہب کی ایک پوری قطار پیدا کرنے میں حصہ لیا تھا، ان کی متعدد کتابوں سے جو حسب ضرورت عربی، گجراتی اور انگریزی میں لکھی گئیں ان کے تبحر علمی اور گہرے مذہبی شعور کی ترجمانی کے علاوہ بوہرہ فرقہ کی دینی اور مذہبی رہنمائی میں بھی حد درجہ مفید اور کارآمد ثابت ہوئیں اور جامعۃ السیفیہ کا علمی اور داخلی معیار دنیا بھر کے مدرسوں اور دینی اداروں کے لیے ایک مثالی اور قابل رشک معیار بن گیا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے انھوں نے پاکستان میں بھی سورت کی اس جامعۃ السیفیہ کے نمونے پر ایک یونیورسٹی قائم کی، اور سیدنا برہان الدین کی سرپرستی میں ایک عظیم الشان لائبریری اور دوسرے شعبے قائم کرنے کی تقریب منعقد کی تو صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق اور پاکستان کے دوسرے وزیروں نے جہاں اس تقریب میں شرکت کرکے اس کے وقار میں اضافہ کیا، وہاں پرنس نجم الدین اور سیدنا برہان الدین کی وجہ سے ہندوستان کا نام بھی روشن ہوا اور ایک ایسی مثال قائم ہوئی جس سے ثابت ہوا کہ پاکستان کی ایک علمی ضرورت کو ہندوستان کے صاحب علم لوگ اس طرح پورا کرسکتے ہیں کہ پاکستان کے ارباب علم واقتدار اس کے معیار اور نفاست کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔

اس سے پہلے، انھوں نے قاہرہ کی فاطمی اقتدار کی یادگار مسجد کی تعمیر نو میں حصہ لیا اور اپنے اسلاف کے ورثہ کی حفاظت اور اس کی قابل فخر طرز تعمیر کی بقاء کے سلسلے میں ایک ایسا لازوال کارنامہ انجام دیا جو آنے والی صدیوں میں سیدنا برہان الدین اور پرنس نجم الدین دونوں کی اعلیٰ ظرفی، بلند حوصلگی اور فیاضی کی یاد دلاتا رہے گا۔ انھوں نے اس جامع مسجد کی تعمیر نو میں دراصل اس تعمیری آرٹ کو از سر نو زندہ کرنے اور اسے ابدیت سے ہمکنار کرنے کے جذبہ کی تکمیل کی جو مصر کی خلافت کے مخصوص اور امتیازی فن تعمیر کی حیثیت رکھتا تھا اور گردش ایام سے مٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

وہ نہ صرف مصر کی فاطمی خلافت کی روایتوں کے امین بلکہ اس کے قابل فخر کارناموں کے سچے معنوں میں وارث تھے اور انھیں اپنے اسلاف کی عظمتوں کا پورا احساس تھا اور وہ فاطمی خلفاء کے جانشین کی حیثیت سے ان تمام روایتوں اور

امتیازی کاموں کو زندہ رکھنے کا ایک تیز اور شدید جذبہ رکھتے تھے، جن کی بدولت تاریخ اسلام میں فاطمی خلافت کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہوا تھا۔

سیدنا برہان الدین اور پرنس نجم الدین کے اس بے لوث جذبہ اور گہری جذباتی وابستگی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ جب انھوں نے قاہرہ کی اس یادگار جامع مسجد کو اپنے خرچ پر تعمیر کرنے کی تجویز مصری حکومت کے سامنے پیش کی تو ان کی نیت اور مقاصد کے بارے میں اوّل اوّل مصری لیڈروں کو شک و شبہات پیدا ہوئے اور انھوں نے اس مسجد کی تعمیر کی اجازت دینے کے باوجود بہت دنوں تک اس تعمیر کے مقاصد کے بارے میں خفیہ تحقیقات جاری رکھی، لیکن جب انھیں ان کی بے لوثی اور بے غرضی کا یقین ہوگیا تو اس کی افتتاحی تقریب میں نہ صرف صدر سادات، پوری خوش دلی اور قلبی انشراح کے ساتھ شریک ہوئے بلکہ پوری مصری حکومت نے اس تقریب کو یادگار اور باوقار بنانے میں اس طرح حصہ لیا کہ یہ تقریب عالم اسلام کی ایک یادگار تقریب بن گئی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو پرنس نجم الدین، یہاں کی ہر ملّی اور دینی تحریکوں کے جزو لاینفک سمجھے جاتے تھے، مسلم مجلس مشاورت کی سرگرمیاں ہوں، تحفظ شریعت کی تحریک یا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جدوجہد یا مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی مہم ___ ہر تحریک میں انھوں نے پوری دلچسپی کے ساتھ نہ صرف حصہ لیا، ہر ملّی کام میں نہ صرف یہ کہ پوری طرح شریک رہے بلکہ ہر آڑے وقت میں ان کاموں کی رہنمائی اور ہر طرح کے تعاون اور امداد میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ ان کی دلچسپیاں، ان کی ہمدردی اور تعلق صرف بوہرہ فرقہ کے لیے مخصوص اور محدود نہیں تھا بلکہ وہ فرقہ اور برادری کے محدود دائروں سے بہت بلند اور پورے عالم اسلام کی سربلندی کے ایک ایسے علم بردار تھے، جن کی نظیر اس زمانے میں مفقود اور ناپید تھی۔ مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے ساتھ ان کا ذاتی تعلق، ان کی گہری رفاقت اور عزت واحترام کا رویہ نہ صرف اوّل سے آخر تک برقرار رہا بلکہ وہ ان کے ایسے قدردانوں اور رفیقوں میں سے ایک تھے، جن کے جذبۂ اخلاص کی حدود، مفتی عتیق الرحمان عثمانی کی عقیدت تک بعض اوقات وسیع ہوجاتی تھیں۔ ماہنامہ ''برہان'' کے مفکر ملت نمبر کے لیے ان کے جو تاثرات ابھی حال ہی میں موصول ہوئے تھے جس میں انھوں نے پوری فراخدلی کے ساتھ ان کی ملّی خدمات کو خراج عقیدت وتحسین پیش کیا تھا۔ ہمارے لیے یہ بڑی ہی اذیت ناک اور صدمہ انگیز بات ہے کہ ہمیں نظرات کے کالموں کو یکے بعد دیگرے ماتم کے لیے مخصوص کرنا پڑا۔ گزشتہ شمارے میں مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ کی وفات پر غم واندوہ کے تاثرات ابھی تازہ تھے کہ پرنس نجم الدین کی رحلت کا یہ تازہ سانحہ پیش آ گیا، ان کی وفات سے یقیناً ''برہان'' کو ایک سچے قدردان سے محروم ہونا پڑا اور ملت اسلامیہ ایک ایسے صدمہ انگیز نقصان سے دوچار ہوئی، جس کی تلافی کی کوئی صورت موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مقام اخروی کو بلند کرے اور ان کے عظیم الشان بھائی سیدنا برہان الدین اور بوہرہ فرقہ کو ان کی وفات کے صدمہ پر صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ [مئی ۱۹۸۷ء]

عبدالرحمٰن، سید صباح الدین

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

بڑے ہی افسوس کی بات ہے کہ مشہور عالم، تحقیقی، علمی اور ادبی مرکز دار المصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور اردو زبان کے ممتاز علمی، ادبی اور تحقیقی رسالے 'معارف' کے مدیر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا اچانک ایک سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اپنے ایک عزیز اور مشہور مصنف سید شہاب الدین دسنوی کے ساتھ ایک رکشہ پر ندوہ سے فرنگی محل جارہے تھے کہ ایک گائے ان کے رکشہ سے ٹکرا گئی اور گائے کی یہ ٹکر موت کی ٹکر ثابت ہوئی کیونکہ سید صباح الدین اس کی ٹکر کے جھٹکے سے سڑک پر گرے تو پیچھے سے آنے والے ٹرک نے ان کے سر کو کچل دیا اور وہ آناً فاناً اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ یہ حادثہ ڈالی گنج کے لوہے کے پل کے قریب پیش آیا ان کے ہمراہی سید شہاب الدین دسنوی پوری طرح محفوظ رہے اور انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت دراصل ان ہی کے لیے رکشہ تک آئی تھی اور ایک جھپٹے میں ان کی روح قبض کرکے اس نے مشیت کے حکم کی تعمیل کردی۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن شبلی اسکول کے آخری تابندہ ستارے تھے اور اس سلسلے کی آخری کڑی تھے، جس نے مولانا شبلی نعمانی اور ان کے تربیت یافتہ مصنفین نے اردو ادب کے علمی، ادبی اور تحقیقی میدانوں میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ اردو جیسی شعر وشاعری کی زبان اور زبانوں کی برادری میں سب سے کم عمر اور نئی زبان دنیا کی ترقی یافتہ اور علمی زبانوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کے قابل بن گئی۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو اگرچہ شبلی کے دامن سے براہ راست وابستگی کا موقع نہیں ملا لیکن وہ دارالمصنفین اور ماہنامہ معارف کے اس سنہری دور میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے جو سید سلیمان ندوی کے علمی،

تاریخی اور تحقیقی کارناموں اوران کارناموں پراقصائے عالم میں اٹھنے والے داد و تحسین کے شور سے گونج رہا تھا۔ انھوں نے تحریر کی تربیت اور تحقیق کا ذوق بھی سید سلیمان ندوی سے حاصل کیا۔ وہ کم وبیش پچاس برس تک دارالمصنفین کے ساتھ وابستہ رہے اور اس آدھی صدی کی مدت میں انھوں نے دارالمصنفین کی تنگی اور فراخی کے دور دیکھے اور ہر حال میں خوش رہنے کے اصول پر کاربند رہ کر دارالمصنفین کے ایک رکن کی حیثیت سے لے کر اس کی سربراہی کے منصب کے تمام مراحل دارالمصنفین کی عمارت میں رہ کر ہی طے کیے اور تصنیف وتالیف سے لے کر مالیاتی شعبوں تک کے آدھی صدی کے تجربات سے حقیقی معنوں میں سبق حاصل کیے اوران ہی تجربات اور ان کے سبق کا نتیجہ تھا کہ وہ حقیقی معنوں میں دارالمصنفین کے ترجمان اوراس کی روح کے محافظ بن گئے تھے اور ان کی یہ حیثیت ساری دنیا میں مسلمہ اور غیر متنازعہ تسلیم کرلی گئی۔ ان کا شمار اردو زبان کے ایسے ممتاز مصنف اور باوقار اہل قلم میں ہوتا تھا جو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی علمی، ادبی، مجلسوں، سمیناروں اوراجتماعات میں عزواحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے اوران کی شرکت ان اجتماعات کی شان میں اضافہ کا سبب بنتی تھی۔

حضرت امیر خسرو پران کا وہ مقالہ جو انھوں نے امریکہ میں پڑھا اور اجودھیا کی بابری مسجد کی تاریخ جوانھوں نے دارالمصنفین کی خلوتوں تنہائیوں میں بیٹھ کر مرتب کی، ان کی تحقیقی صلاحیت، گیرائی اور گہرائی اورجلالت شان کے شاہد عادل کہے جاسکتے تھے۔ وہ ہندوستان میں مذہبی رواداری کے بہت بڑے حامی تھے اور بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کے رجحان سے بے حد دکھی اور پریشان رہتے تھے، اس لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موضوعات پر اپنے قلم کے جوہر دکھاتے تھے جو ہندوستان میں قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ امن اور ہندومسلمان کے درمیان فاصلے کو کم کرنے کے لیے مفید ثابت ہوسکیں، اس سلسلے میں مغل سلاطین کی مذہبی رواداری اورصوفیائے کرام کی وسیع مشربی کے موضوعات پرایسی تحریریں کتابوں کی شکل میں یادگار چھوڑیں جو ماضی کے ہندومسلم اتحاد اور یگانگت پر مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد ہی نہیں عاشق صادق بھی تھے۔ جب ان کا تذکرہ آتا تو ان کا قلم بے اختیار ہوکرلعل وگُہر اگلنے لگتا تھا انھوں نے سید سلیمان ندوی کی زیر تربیت تحریر وتحقیق کا ملکہ حاصل کیا تھا وہ ان کے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ ان کے قلم سے کوئی چالیس کے قریب کتابیں نکلیں، ان میں بزم صوفیہ، بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ اور ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کی ایک جھلک نے بڑی شہرت پائی۔ ان کی آخری تصانیف میں اورنگ زیب عالمگیر اور بابری مسجد کی تاریخ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان میں اورنگ زیب عالمگیر جس میں انھوں نے جادوناتھ سرکار کی متعصّبانہ تحریفوں اور تحقیقی ٹھوکروں کی نشاندہی بڑی جاں فشانی کے ساتھ کی ہے غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوسکی۔

۷۸ سالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا شمار اس وقت چوٹی کے محققین اور اہل قلم میں ہوتا تھا، ان کی تحریر میں سید سلیمان ندوی جیسی جامعیت، مولانا عبدالسلام ندوی جیسی گہرائی، مولانا عبدالسلام قدوائی جیسی سنجیدگی اورشاہ معین الدین احمد جیسی تازگی اور گیرائی نہیں تھی لیکن ان کے قلم کی روانی، شگفتگی اورارواں دواں تحریر کو اقبال کے الفاظ اوران کے اشعار کے مفہوم سے ہم آہنگ کرتے چلنے کا فن، ان کے پیش روؤں کے قائم کردہ معیار میں اضافہ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس منفرد اسلوب کی بدولت ان کی تحریر اتنی شگفتہ اور اتنی دلآویز ہوگئی تھی کہ سینکڑوں تحریروں کے درمیان بھی اپنے البیلے انداز کے سبب ممتاز اورنمایاں نظر آتی تھی۔

جن لوگوں کو ان پر فوقیت حاصل تھی وہ ان کے سامنے ہی سامنے اپنی زندگی کی مہلت پوری کرکے اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے، اس لیے اب شبلی اسکول کے اہل قلم اورصاحب اسلوب مصنفین میں ان کا کوئی ہمسر باقی نہ رہا تھا۔ وہ اپنی ملّی دردمندی، دانشوری اوردوسرے اخلاقی خصائص کے لحاظ سے ایک ایسی قابل احترام اورمقبول شخصیت کے مالک تھے کہ ہرمجلس میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے اوران کے وسیع اور گہرے مطالعہ اورعلمی ژرف نگاہی حاضرین کو متعجب اورمسرور کردیتے تھے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی وہ علی گڑھ کے گریجویٹ بھی تھے اورانگریزی لکھنے پر بھی انھیں پوری قدرت حاصل تھی لیکن انھوں نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سرکاری ملازمت کے بجائے اردو کا ایک مصنف اورمحقق بننے کو ترجیح دی۔ وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں آئے اورانھوں نے بڑی قلیل تنخواہ پردارالمصنفین کے رکن کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی شروع کی۔ سید سلیمان ندوی کی صحبتوں اوران کی تربیت کی بدولت جلد ہی ان کا شمار صاحب طرز مصنفین اورسلیقہ مند محققین میں ہونے لگا اوران کی شہرت ہندوستان کے علمی حلقوں کے علاوہ رسالہ معارف کی وساطت سے بین الاقوامی حلقوں تک پہنچ گئی اوردنیا بھر کے علمی اداروں اوردانش گاہوں

میں ان کے علمی اورادبی اورتحقیقی مرتبہ کااعتراف کیاجانے لگا۔وہ دارالمصنفین کے ناظم، رسالہ معارف کے ایڈیٹر کے علاوہ ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ،انجمن ترقی اردو ہندکی مجلس عاملہ اوراتر پردیش کی مجلس منتظمہ کے ممبر بھی تھے۔ان کے علاوہ وہ ہندوستان، پاکستان، برطانیہ اورامریکہ کے اہم اردو اجتماعات اور سمیناروں میں گئے جہاں انھوں نے اپنی دانشوری اورعلمی وادبی صلاحیتوں کااچھا اثر علمی،تحقیقی اور تاریخی حلقوں پر چھوڑا۔ان اجتماعات اورسمیناروں میں انھوں نے جومقالے پڑھے وہ اپنی جگہ مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے تھےان میں سے بعض مقالے کتابوں کی شکل میں شائع بھی ہوئے۔

سید صباح الدین کے پس ماندگان میں ان کی بیوہ، دولڑکیاں اوردولڑکے ہیں ان کی میت کی پہلی نماز ندوۃ العلماء کے صحن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی جس کے بعد ان کے جسد خاکی کواعظم گڑھ لے جایا گیا جہاں سوگواروں کی کثیر تعداد کی موجودگی میں انھیں آخری منزل پر پہنچادیا گیا۔

اردوزبان کو جو پہلے ہی اپنے عظیم المرتبت اہل قلم،شاعروں اورمصنفین کی دائمی جدائی کے صدموں سے بے حال تھی،سید صباح الدین کی وفات سے زبردست صدمہ اور ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا ہے جب تک وہ زندہ تھے ان کے بعد رونما ہونے والی صورت حال کا تصورتک کسی کو نہ تھا لیکن ان کے اچانک رخصت ہونے کے بعد دارالمصنفین پہلے سے زیادہ ویران اور مستقبل کے خوفناک اندیشوں کے ہجوم میں گھرا ہوادکھائی دینے لگا ہے وہ ایک ایسی قوم کے فرد تھے جوزوال اورانحطاط کے ایسے دور سے گزر رہی ہے کہ ایک شخصیت کے دنیا سے گزر جانے سے ایک پورے ادارے کا وجود بے یقینی سے دوچار نظر آنے لگتا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی زندگی ہی میں دارالمصنفین اورشبلی اکیڈمی کے سلسلے میں ملکیت کے تنازعے کھڑے ہوگئے تھے اورمقدمہ بازی تک نوبت پہنچی تھی،اب ان کے بعدمعلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں جن لوگوں نے ادارے سے باہر کمیٹیاں بناکر ان کے ذریعے دارالعلوم پر قبضہ کی جومثال قائم کی تھی اس کی بدولت ملک بھر میں کتنے ہی اہم اور تاریخی اداروں اورتعلیم گاہوں کامستقبل خطرہ میں پڑگیا تھا اورایک جگہ کی کامیابی، دس جگہ اسی طرح کی حرص کو جگانے کا سبب بن رہی ہے۔بہرحال ہماری دعا ہے کہ دارالمصنفین کا موجودہ علمی اور تحقیقی معیاراوراس کا بنیادی کردار باقی رہے اورعلم وادب وتحقیق کا یہ مرکز تخریب اورتباہی کی آندھیوں سے محفوظ رہے کہ ایسے ادارے صدیوں میں جاکر کہیں بنتے اورتعمیر ہوتے ہیں۔

[نومبر۱۹۸۷ء]

مہدی،جمیل

آہ! جمیل مہدی

وا حسرتا! کہ دل ہے بہت بے قرار آج
سینے میں چبھ گئی ہے کوئی نوکِ خار آج

دل میں درد ہے،روح مضطرب اوربے چین ہے،قلم پرلرزہ طاری ہے، زبان وبیان کی قوت دم بخود اورمردہ ہے،نبض حیات ڈوبتی ہوئی معلوم ہورہی ہے کہ میرے گذشتہ تیس(۳۰)سال کے قابل احترام بزرگ مگر بے تکلف رفیق اور ہمدم و دمساز۔ بھائی جمیل مہدی(مدیر روزنامہ 'عزائم' لکھنؤ وماہنامہ 'برہان' دہلی) ۱۳/فروری۱۹۸۸ءکوصبح کوساڑھے سات بجے اس دارفانی سے دار بقا کی طرف کوچ کرگئے۔انالله وانااليه راجعون۔وہ بہادر، بےخوف، جیالا بے باک وبے لوث انسان، وہ صاحب طرزادیب، وہ سراپا اخلاص و ایثار صحافی، وہ دوستوں کا دوست،اپنوں کا غمخوار،چھوٹوں کامشفق وبے مربی، بزرگوں کی محفلوں میں باادب مگر بے لاگ انسان ہمیں چھوڑ گیا جس کے دم سے قلم کی آبروسلامت تھی، اردوصحافت کی عظمت قائم تھی۔مولانا ظفر علی خاں،مولانا ابوالکلام آزاد، غلام رسول مہر،مولانا محمد علی جوہر،مولانا عبدالماجد دریابادی،مولانا محمد عثمان فارقلیط کی پاکیزہ روایات کی پاسداری تھی۔اردو میں دیانت دارانہ صحافت کا بھرم قائم تھا۔ آج کے خودغرضانہ ماحول،مفاد پرستیوں،ضمیرفروشیوں اورمصلحت اندیشیوں کے پُرہول سناٹے میں بھی جس کی ولولہ انگیز اور چونکا دینے والی تحریروں سے حق وصداقت کی بلند آواز گونج اٹھتی تھی،افسوس وہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی جس کی بدولت ملت کے زریں عہد اورشاندار ماضی سے اس درماندہ، شکستہ اورچاروں طرف سے مہیب ومہلک خطروں سے گھرے ہوئے حال کی تاریکیاں،روشنی کی کرنیں،عمل کی توانائیاں فکروبصیرت اورتجربوں کی تجلیاں حاصل کرتی تھیں۔

آج ملک وملت کے افق پرزبردست انتشار وافتراق اورسنگین ونازک صورت حال کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں،ایسےخوفناک وقت میں جبکہ طرح طرح کے طوفانوں،سیلابوں اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ چاروں طرف سنائی دے رہی ہے جمیل مہدی جیسے بے لاگ، بےخوف اور بےلوث اوراس قدر دیانت دارانہ

اور زندہ کردار وضمیر کے حامل صحافی اور عقیدہ کے پختہ اور روشن فکر کے حامل انسان کی شدید ضرورت تھی۔مگر ؎

ضرورت جتنی جتنی بڑھ رہی ہے صبح روشن کی
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

جمیل مہدی نے انقلاب وحریت،علم وشریعت،دین وہدایت کے سرچشمۂ صافی ــــ دیوبند کی تاریخی سرزمین پر جنم لیا۔اس کی علم پرور فضاؤں میں عظیم و بے مثال علمائے کرام کی آغوش تربیت میں پرورش پائی اور یہیں قلم پکڑنا سیکھا، اپنی خداداد ذہانت،قدرت حافظہ،کثرتِ مطالعہ اور محنت شاقہ کے طفیل ابتدا ہی میں ادب وانشاء کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔''نگار'' جیسے شہرۂ آفاق ماہنامہ میں پہلی نگارش افسانہ کی شکل اور ان کے چھوٹے بھائی محزون نیازی کے نام سے شائع ہوئی،بمبئی کے ماہنامہ 'شاعر' کے نائب مدیر اور روزنامہ 'جمہوریت' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، یہیں سے بحرادب وانشاء کے اس شناور کا رخ سیاست کی راہوں کی طرف مڑ گیا،اُس وقت کی مشہور سیاسی شخصیتوں سے ربط وضبط پیدا ہوا،فلم اور ادب کی بڑی بڑی ہستیوں نے جمیل مہدی کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا،شکیل بدایونی،علی سردار جعفری وغیرہ سے بے تکلف دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔اس کے بعد بہت عرصہ تک دیوبند میں ہی قیام رہا،یہیں سے ایک سہ روزہ اخبار 'مرکز' جاری کیا جس کے انقلاب انگیز اداریوں نے ایوان حکومت میں تہلکہ مچا دیا۔۱۹۶۲ء میں ہم لوگوں نے دیوبند میں مجلس مشاورت قائم کی اور ۱۴/اکتوبر ۱۹۶۶ء کو ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ،مولانا منظور نعمانی، پنڈت سندرلال،مسٹر ایم این انور،جعفر امام،ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور بہت سے اصحاب علم وفضل تشریف لائے، اس جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی اور تلاوت کلام پاک کے بعد بھائی جمیل مہدی نے ایک پرزور مگر طویل مقالہ پڑھنا شروع کیا،ابھی مقالہ شاید نصف ہی پڑھا گیا تھا کہ جمعیۃ علماء کے ایک مخصوص گروہ کی طرف سے تخریب کاری کے مقصد سے بھیجے گئے کچھ لوگوں نے جلسہ میں ہلڑبازی شروع کی،اس وقت قابو پاکر دوبارہ جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی تو پنڈت سندرلال نے ایسے پراثر انداز میں تقریر فرمائی کہ مجمع تڑپ تڑپ اٹھا لیکن اسی شرپسند گروپ کے کئی سو آدمی دارالعلوم دیوبند کے طلباء کے ساتھ دوبارہ بھیجے گئے اور لوٹ مار، پتھراؤ، آتش زنی کا وہ ننگا ناچ ناچا گیا کہ تہذیب وشرافت اور عدل وانصاف کے سارے تقاضے پامال ہوکر رہ گئے، حد یہ ہے کہ اکابر علمائے کرام مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی وغیرہ پر قاتلانہ حملوں کی کوشش کی گئی، خاص طور سے حضرت مفتی صاحب کو نشانہ بنایا گیا اور ان کے سر اور جسم پر چوٹیں آئیں،اس جلسہ پر حملہ بلاشک دیوبند کی تاریخ وتہذیب کے دامن پر بدنما داغ تھا مگر اس واقع نے جمیل مہدی کو پورے طور پر سرگرم ہوجانے پر مجبور کردیا، کچھ عرصہ کے بعد ہی وہ لکھنؤ بلائے گئے روزنامہ 'قائد' میں بحیثیت مدیر کام شروع کیا، کچھ عرصہ بعد 'قائد' کی ادارت چھوڑ کر 'ندائے ملت' سے وابستہ ہوئے اور پھر ۱۹۶۹ء میں خود اپنا ہفتہ وار اخبار 'عزائم' جاری کیا جس کو دس سال کے بعد روزنامہ میں تبدیل کردیا گیا۔درحقیقت یہ اخبار جمیل مہدی کے خونِ دل وجگر سے سینچا ہوا ایک ایسا پودا ہے جس کی حفاظت، بقا اور ترقی کی ساری ذمہ داریاں ان کی وفات کے بعد اب ان لوگوں کے کاندھوں پر آگئی ہیں جن کو اردو صحافت کی صحت مند روایات،ایماندارانہ اظہار خیال، بے لاگ تبصروں اور ملک وملت کے مسائل پر شعور وتجربہ کی پختگی کے ساتھ دیانت دارانہ اظہار خیال سے دلچسپی ہے اور جن کو جمیل مہدی سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔یہ ہی ان کی روح کو بہترین نذرانۂ عقیدت ہے۔خدا کرے 'عزائم' زندہ رہے، باقی رہے،ترقی کی منزلیں طے کرے اور ملک وملت کی خدمت ورہنمائی کا فرض انجام دیتا رہے،رب کریم و کارساز مسٹر حسام صدیقی،عزیز عدیل مہدی سلمہ اور دوسرے اراکین ادارہ 'عزائم' کو حوصلہ،ہمت اور استقامت عطا فرمائے اور ان کو 'عزائم' کی بقا کے لیے قدم قدم پر کامیابیوں اور اپنی نصرتوں سے نوازے۔آمین

جمیل مہدی صرف ایک نثر نگار،صرف ایک صحافی اور صرف ادیب ہی نہ تھے بلکہ وہ خود ایک عہد،ایک تاریخ اور ہماری ان روایات اور قدروں کے ترجمان، نشان اور علامت تھے جو ہماری تاریخ ملی کی جان،آبرو اور وقار ہیں۔وہ بہت لکھتے تھے، بے تحاشا اور بے تکان لکھتے تھے،مگر اس کے باوجود بہت خوب بلکہ خوب تر لکھتے تھے۔ان کی تحریروں میں بلکہ ان کی رگ رگ میں ملت کا بے کراں، بے پایاں اور گہرا درد موجود تھا۔سوز وتڑپ کی ایک جاں گداز کیفیت سے فکر واحساس اور شعور وجذبات معمور تھے۔ان کے قلب ودماغ اور عزم وحوصلہ نے کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے کسی طرح اور کسی قیمت پر مرعوب ہوجانا سیکھا ہی نہ تھا، اصولوں پر سمجھوتہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ان کی زندگی ریب وریا سے کوسوں دور اور مصلحت اندیشی سے پاک تھی، ان کا قلب ایسا صاف وشفاف آئینہ تھا جس میں بھلے برے،کھرے کھوٹے،سچ اور جھوٹ کا عکس نمایاں طور پر سے دکھائی دیتا تھا۔

اکابر دیوبند علمائے کرام مثلاً شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب اور دوسرے بزرگوں سے ان کا تعلق ہمیشہ ادب واحترام کا رہا اور ان ہی بزرگوں کے سایہ میں ان کے فکر وشعور کی نشوونما ہوئی۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب کے سانحۂ ارتحال پر جوادار یہ انھوں نے 'عزائم' میں لکھا تھا وہ ان کے تعلق خاص کے ساتھ ساتھ حق پسندی، بے باکی، آزادیٔ فکر اور ان کے مخصوص اسلوب نگارش کا عظیم، خوبصورت، پُراثر نمونہ تھا۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے ان کے والد بزرگوار کا بھی تعلق رہا اور مرحوم بھائی جمیل مہدی بھی حضرت مفتی صاحب سے بہت قریب تھے، یہ ہی قربت وعقیدت تھی کہ مولانا سعید اکبرآبادی مرحوم کے انتقال کے بعد سے وہ 'برہان' کی ادارت بڑے خلوص کے ساتھ کررہے تھے ان کی وفات راقم الحروف کا ذاتی صدمہ اور نقصان تو ہے لیکن قبلہ مفتی صاحب کی علمی امانت (جس کی حفاظت و بقا ہم تمام خدام ہی کا فریضہ ہے) یعنی ماہنامہ 'برہان' کو بھی اس سے زبردست دھکا لگا ہے۔ برادر عزیز عمید الرحمٰن سلمہ پر اس حادثہ کا قدرتی طور پر بہت اثر ہے۔ حق تعالیٰ شانہ ہم کو اس علمی یادگار 'برہان' کی خدمت وحفاظت کی توفیق بخشے اور ہماری مدد فرمائے۔ آمین

جیسا کہ قارئین کے علم میں آچکا ہوگا کہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں دمہ کے شدید و پریشان کن اور پرانے عارضہ کے علاج کے لیے ان کو بلرام پور ہسپتال (لکھنؤ) میں داخل کرایا گیا لیکن جب دیکھا گیا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہے تو ڈاکٹروں کے مشورہ سے انھیں دہلی لایا گیا، چند روز کے علاج کے بعد کچھ افاقہ بھی محسوس ہونے لگا تھا مگر ۱۲/فروری کو قلب کا دورہ پڑا تو ان کو رام منوہر لوہیا ہسپتال میں منتقل کیا گیا اور ۱۳/فروری کی صبح ساڑھے سات بجے اچانک وہ آواز بند ہوگئی جس کی گھن گھرج سے بڑے بڑے ایوانوں میں زلزلہ سا آجاتا تھا، وہ چمن خاموش ہوگیا اجڑ گیا جس میں ''آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی'' کے جیتے جاگتے، ہنستے اور بولتے ہوئے پھول مہک رہے تھے۔ جمیل مہدی کی وفات ایک فرد کی ہی موت نہیں ہے بلکہ ایک دورِ حریت، آزادیٔ فکر و ضمیر، خودداری، خوداعتمادی کے ایک درخشاں عہد کی موت ہے۔ دیوبند کے ''خطۂ صالحین'' (قبرستان قاسمی) میں سینکڑوں اولیائے کاملین، مفسرین، محدثین اور شہدائے کرام کے مزارات کے درمیان صرف جمیل مہدی کی تدفین عمل میں نہیں آئی بلکہ ملّی دردمندی، خلوص، بے غرضی اور بے خوف اظہار خیال کی گراں قیمت روایات منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگئی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دورِ زوال وپستی میں جب کہ بہت سے قلم اور بہت سی زبانیں بازار کی ایک جنس بن کر رہ گئی ہیں، ان گراں مایہ قدروں اور روشن روایات کی بڑی اہمیت ہے جن کو جمیل مہدی نے اپنا خونِ دل وجگر دے کر زندہ رکھا اور آخر دم تک ان کو سینے سے لگائے رہے۔

حق تعالیٰ شانہ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے قارئین کرام سے پُرخلوص گزارش ہے کہ مرحوم کے لیے ایصال ثواب کا خاص اہتمام فرمائیں۔ یہ ادارۂ برہان اور خود راقم الحروف پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

[محمد اظہر صدیقی، فروری ۱۹۸۸ء]

ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی۔!!

برہان اور ندوۃ المصنفین کی کشتیٔ حیات کیسے کیسے طوفانوں اور کیسی کیسی خوفناک موجوں سے گزر رہی ہے، اس کی ایک اہم، اندوہناک اور دل دوز کڑی وہ حادثۂ فاجعہ ہے جو ۱۳/ فروری کی صبح کو پیش آیا جس سے دل ودماغ کی کائنات اور ہوش وحواس کی دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا ــــــ برادر محترم جمیل مہدی کی وفات حسرت آیات ادارۂ برہان کے لیے ایک خوفناک، لرزہ خیز اور تہلکہ انگیز واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت والد ماجد مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی وفات حسرت آیات کے بعد ایک شجر سایہ دار سے محرومی تھی، مگر زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں ہولناک تپش اور دھوپ کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ سہارے نظر آتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی سرپرستی مجھے ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا حوصلہ دیتی تھی، ان کی شدید علالت اور سفر پاکستان کے موقع پر میرے بہنوئی جناب بھائی اظہر صدیقی نے میرا ساتھ دیا، دستِ تعاون بڑھایا اور کچھ عرصہ برہان کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے انتقال کے بعد بھائی جمیل مہدی نے برہان کی ادارت سنبھال لی تو مجھے ایک گونہ اطمینان ہوگیا تھا مگر اس زندگی میں اطمینان وسکون تو اب دولتِ گم گشتہ ہوکے رہ گئی ہیں بھائی جمیل مہدی بھی اس دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے اور میں پھر ایک بار بے سہارا ہوکر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور ہم سب لوگوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

براہ کرم دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ میری مدد فرمائیں اور میں حضرت مفتی صاحب کی علمی یادگاروں کو ''بادخزاں کے مسموم جھونکوں'' سے محفوظ رکھ سکوں۔ بلاشبہ حق تعالیٰ ہی محافظ حقیقی ہیں، وہی ہمارے حافظ وناصر ہیں۔

جمیل مہدی کیا تھے اور کیا نہیں تھے یہ تو ملک بھر کے اخبارات ورسائل میں لکھا جاچکا ہے مگر مجھے سب سے زیادہ ان کے خلوص اور بے لوثی و بے نیازی کی شان اور اس تعلق کا احساس بہت دنوں تک بلکہ ہمیشہ یاد رہے گا جو گذشتہ دو سال میں مجھے ان کے اندر بدرجۂ اتم نظر آیا۔ میں تمام قارئین کرام سے خصوصی درخواست کرتا ہوں کہ براہ کرم جمیل مہدی کے لیے بارگاہ رب العزت میں دعائے مغفرت فرمائیں اور ان کے پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی توفیق کی دعا کریں۔ شکریہ! والسلام۔

غم آگیں

[عمید الرحمٰن عثمانی، فروری ۱۹۸۸ء]

<u>ضیاء الحق، جنرل محمد</u>

جنرل محمد ضیاء الحق

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق اور ان کے ہمراہ کئی اعلیٰ فوجی آفیسر ۱۷/ اگست کو بہاول پور کے قریب ایک فضائی حادثے کا شکار ہوکر جاں بحق ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پرواز کے چند لمحے کے بعد ہی طیارہ میں زبردست دھماکہ ہوا اور مرحوم کا صدارتی طیارہ آناً فاناً ٹوٹ کر بکھر گیا۔ طیارہ کے تمام مسافر، امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافل، پاکستان کے فوج کے سربراہ جناب جنرل محمد ضیاء، پاکستان کے دو لیفٹننٹ جنرل، تین میجر جنرل، پانچ بریگیڈ، ایک کرنل، ایک اسکواڈرن سمیت ۱۳۷ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

حادثہ کی وجوہات کیا ہیں؟ اعلیٰ پیمانے پر تحقیقات جاری ہیں اور اس سلسلے میں امریکہ نے پاکستان کے ساتھ ہر ممکن تعاون اور سی۔آئی۔اے کے ذریعہ تحقیقات میں مدد دینے کی پیش کش کی ہے۔

اس بھیانک حادثہ اور بین الاقوامی سازش کے جو بھی ذمہ دار ہوں حقیقت یہ ہے کہ صدر ضیاء الحق اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم ۱۲/ اگست ۱۹۲۳ء میں پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دہرہ دون کے دون اسکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لیا جہاں قبلہ جناب پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم سابق مدیر ''برہان'' سے بھی مرحوم صدر کو استفادہ کا موقع ملا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل ضیاء، حضرت اکبرآبادی سے تمام زندگی بے حد متاثر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں دہرہ دون کی رائل ملٹری اکیڈمی سے فراغت کے بعد فوج میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۷۶ء تک وہ ایک جونیئر افسر تھے جنرل ٹکا خاں کے ریٹائر ہونے کے بعد مسٹر بھٹو نے ان کو جنرل بنادیا۔ ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء بھٹو کا تختہ الٹ کر خود اقتدار پر قابض ہوگئے۔ ۱۹۷۷ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد چیف ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں مرحوم باضابطہ پاکستان کے صدر بن گئے۔ ۱۹۸۴ء میں مرحوم نے ریفرنڈم کرایا جس کا نتیجہ ان کے حق میں نکلا، اس کے بعد انھوں نے پھر ملک کے منتخب سربراہ کی حیثیت سے صدر کے عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس دوران انھوں نے جو بھی اقدامات اٹھائے وہ اپنے ذہن وفکر کے اعتبار سے پاکستانی عوام کی فلاح وبہبودی کے لیے اٹھائے۔ بلاشرکت غیرے پاکستان کے سب سے بڑے اور ذمہ دار عہدے پر فائز رہ کر انھوں نے ثابت کردکھایا کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے سیاست داں، ہوش مند قائد اور مدبر و منتظم بھی ہیں جنھوں نے اپنی انفرادیت، خودی اور تشخیص [تشخص] کو ہر حال میں قائم رکھا اور جس کا اعتراف آج مرحوم کی وفات کے بعد ملکی و بین الاقوامی اور عالمی سطح پر کیا جارہا ہے۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء۔

مرحوم کی شہادت کی وجوہات سے قطع نظر جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت اور عظمت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ بلاشبہ صدر پاکستان مرحوم برصغیر کی حالیہ سیاسی تاریخ کی اہم ترین شخصیات میں سے تھے۔ پاکستان اور پڑوسی ملک کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام کے لیے ان کی موت ایسا دردناک سانحہ ہے جس کے اثرات طویل مدت تک محسوس کیے جائیں گے۔

یہ بات اپنی جگہ سوفیصد درست ہے کہ ان کی موت کا حادثہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اتنا ہی اہم موڑ ثابت ہوگا جتنا کہ گیارہ سال پیشتر ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔ اندرونی وبیرونی مخالفت ومزاحمت اور پاکستان میں متحارب قوتوں کی اقتدار کے لیے رسہ کشی اور سازشوں کے باوجود مرحوم صدر ایک طویل عرصے تک بڑی شان و وقار کے ساتھ برسر اقتدار رہے، اور اس دوران مادّی، انتظامی اور سیاسی اعتبار سے پاکستان کے استحکام کے لیے زبردست کوششیں کیں اور اسے بین الاقوامی برادری میں ایک

ممتاز اور منفرد مقام دلایا۔

صدر ضیاء نے پڑوسی ممالک خاص طور پر ہندوستان کے ساتھ برادرانہ اور خیر سگالی کے تعلقات رفتہ رفتہ معمول پر لانے کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا سے تعلقات اور روابط میں بھی صدر مرحوم نے مناسب، موزوں اور متوازی حکمت عملی (STRATEGY) اپنائی تھی۔

وہ اگرچہ بعض توسیع پسند اور طاقتور ملکوں کے لیے ہمیشہ ان کی راہ میں ایک رکاوٹ رہے۔ان ممالک کی اندرونی سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود کامیابی اور استقلال کے ساتھ ملکی نظم ونسق سنبھالتے رہے۔پاکستان کی تاریخ میں اتنا طویل دور حکومت کسی اور حکمراں کو نصیب نہیں ہوا۔اقتدار کی اس طویل مدت میں ان کے کٹر سے کٹر سیاسی مخالفین بھی ان کی دیانت وامانت یا ذاتی نوعیت کے کسی معاملہ میں ان کا نام کبھی ملوث نہیں کر سکے کہ اپنے قریب ترین عزیز واقارب اور دوستوں کو بے جا مراعات یا مالی منفعت پہنچائی ہو۔

جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہونے والے اس پیشہ ور سپاہی اور مجاہد کے لیے ''پاکستانی جغرافیائی وطن میں نہیں بن سکتا تھا پاکستان مرحوم کے لیے ایک نظریاتی وطن تھا''۔ مرحوم ضیاء کی ذاتی زندگی میں اخلاص اور پاکیزگی اور عوامی زندگی میں فرض شناسی اور دیانت داری کا اعتراف دوست دشمن سب کو رہا۔یہ اسی ''آئیڈیل ازم'' کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کو ایک تاریخی وارثت، ایک نظریہ، ایک فلاحی ریاست اور مثالی مملکت اور نظریات کی بنیاد پر قبول کیا جانے والا وطن سمجھتے تھے۔

جنرل ضیاء مرحوم کے گیارہ سال پر محیط دور اقتدار کا تجزیہ فی الوقت ممکن نہیں ہے۔مرحوم نے ملک کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں جو مثبت، تعمیری اصلاحات کیں، ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔

اسلام کو بحیثیت ایک نظام (SYSTEM) اور پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ اور اس ملک کو اسلام کا نمائندہ ملک بنانے میں جنرل ضیاء الحق ذاتی طور پر بڑے مخلص، اس کے پُر جوش حامی اور داعی تھے اور اس تعلق سے وہاں جو کچھ بہتری نظر آرہی ہے وہ مرحوم کی ذاتی کوشش اور اور خواہش ہی کا نتیجہ ہے۔نئی حکومت ''اسلامی شریعت کے نفاذ'' کے تعلق سے کیا پالیسی اپناتی ہے ابھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔صدر مرحوم کی ہلاکت کے پیش نظر فی الحال پورے ملک میں ایمرجنسی نافذ کی گئی ہے اور عام لوگوں کے بنیادی حقوق معطل اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

اسی طرح مسلم ممالک سے روابط اور تعلقات میں صدر ضیاء کے دور میں قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔مسلم سربراہ کانفرنس میں صدر مرحوم نے خصوصی مقام حاصل کیا۔وہ امن کمیٹی کے چیئرمین (Chairman) تھے۔سائنس اور ٹیکنالوجی کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔مصر کو دوبارہ کانفرنس کا رکن بنانے کا ذریعہ بنے اور اس سے تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہوئے۔اسلامی سربراہی کانفرنس کے سیکرٹری جنرل کے عہدے پر پاکستان کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ پاکستان غیر جانبدار تحریک کا رکن بنا۔افغانستان کے مسئلہ کا باوقار اور پُر امن حل اور وہاں سے روسی افواج کے انخلاء کے معاملہ میں بین الاقوامی اصولوں کی پاسداری اور جرأت مندانہ موقف نے صدر مرحوم کو ایک یادگار اور بلند وقار عطا کیا۔پاکستان نے ۳۰ لاکھ افغان مہاجرین کو پناہ دے کر اور ان کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کر کے جو عظیم انسانی کارنامہ انجام دیا ہے اسے دنیا بھر میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔اقوام متحدہ میں اس کی پیش کردہ قراردادوں پر ۱۲۳ ممالک نے حمایت میں ووٹ ڈالے جو مسلم اور غیر مسلم دنیا اور متعدد اشتراکی ممالک کی جانب سے اظہار اعتماد کا ایک شاندار اور قابل فخر ریکارڈ ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آج کا پاکستان دنیا کی نظروں میں کل کے پاکستان سے بہت بلند مقام پر فائز ہے۔

پاکستان کے سیاسی افق سے صدر ضیاء کے اچانک غائب ہوجانے سے پاکستان کے سامنے کئی اہم ترین موڑ آگئے ہیں اور فی الحقیقت پاکستان مسائل اور آزمائشوں سے دوچار ہوگیا ہے۔صدر ضیاء کی ہلاکت سے طاقتوں کا ہر توازن اثر انداز ہوا ہے۔سیاست کی وہ ساری بساط الٹ گئی ہے۔پاکستان کے تین پیشہ ور سپاہیوں کی ایک ساتھ موت، پاکستان ہی نہیں بلکہ مغربی ایشیا اور وسط ایشیا تک سیاست بدل گئی ہے۔اب افغانستان، ایران، سعودی عرب، عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں سیاست کا رخ بدل سکتا ہے۔مرنے والے کی نظر بڑی وسیع، ذہن بڑا درّاک اور تعلقات بڑے وسیع تھے۔ان کی سیاست، دانائی، تدبر، فراست اور معاملہ فہمی مسلمہ تھی۔

بہر حال مرحوم کی المناک فضائی حادثے میں شہادت سے ایک ایسے دور کا خاتمہ ہوگیا ہے جسے مستقبل کا مورخ کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتا۔چونکہ صدر مرحوم ایک ہوائی حادثہ کا شکار ہو کر اللہ کے حضور پہنچے ہیں اور شریعت اسلامی کے اعتبار سے ایک مسلمان جب کسی ناگہانی حادثہ کا شکار ہو کر مرتا ہے تو اس کو ''شہادت حکمی'' کا عظیم مرتبہ ملتا ہے۔اس معنی کر [کذا] صدر ضیاء کی موت ایک

شہید کی موت ہے اور روز محشر میں شہید سے کوئی پوچھ گچھ نہیں۔

بارگارہ خداوندی میں ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم اوران کے رفقاء کو اعلیٰ علیین میں جگہ دیں، ان کے درجات بلند فرمائیں، اپنے دیدار سے نوازیں۔ اور سوگوار خاندان، ہم سب کو اور پاکستانی عوام کو اس حادثۂ جانکاہ کو برداشت کرنے کی توفیق وہمت دیں۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ پاکستان کے موجودہ حاکموں کو پورے عزم اور یکجہتی کے ساتھ حالات میں سدھارلانے کی توفیق دے اور پاکستانی قیادت اور باشعور عوام جلداز جلد اس خلا کو پُر کرسکیں جو صدر مرحوم کے اٹھ جانے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ دراصل ایک متحد، مضبوط، پائیدار اور اندرونی اعتبار سے مستحکم پاکستان سے ہی ہندوستان اور برصغیر کے لوگوں کا وسیع تر مفاد وابستہ ہے!!!

[ستمبر ۱۹۸۸ء]

خمینی، امام

امام خمینی

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

انقلاب ایران کے تاریخ ساز قائد، ایران میں اسلامی جمہوریہ کے بانی، روحانی پیشوا اور عالمِ اسلام کے ایک عظیم فرزند علامہ روح اللہ آیت اللہ خمینی مرحوم ۳رجون بروز شنبہ کو اپنی علالت اور آپریشن میں ناکامی کے بعد بالآخر وہاں پہنچ گئے جہاں ہم میں سے ہر ایک کو ایک دن جانا ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ راجِعُون۔ علامہ خمینی کے انتقال کی خبر سے مسلم ممالک میں صفِ ماتم بچھ گئی، موت اَٹل اور بَرحق ہے اور یہ تلخ گھونٹ ہر متنفّس کو اپنے وقت پر پینا ہے۔ ''کل نفسٍ ذائقۃُ الموت'' اور ''اِذَا جَآءَ اجَلُھَا لَا یَسْتَاخِرُون ساعۃ وَلَا یستقدمون'' فرمانِ الٰہی ہے۔

تاہم اس کارگاہِ ہستی میں بعض شخصیات ایسی بھی پیدا ہوتی ہیں، جن کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد جو خلاء پیدا ہوتا ہے، اس کا پُر ہونا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ صدی میں جن اہم شخصیات نے جدید تاریخ پر گہرے نقوش واثرات چھوڑے ہیں، اور ایک لمبی مدت تک جن کی یاد باقی رکھی جائے گی ان میں مرحوم رہنما کی انقلاب آفریں ذات بھی شامل ہے۔

بلاشبہ علامہ خمینی کے انتقال سے سیاسی بالغ نظری، جرأت، بے باکی انقلاب، عزم اور خودداری کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا، علامہ خمینی اپنی ذاتی خصوصیات اوصاف اور کمالات کے اعتبار سے ایک پُرکشش، باوضع اور بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے ان کے بعض عقائد وافکار ونظریات، سیاسی سوچ و اپروچ اور طریقِ کار سے جمہوری اختلاف کے باوجود ان کی اصول پسندی، جذبۂ حرّیت، ایثار وقربانی اور جدوجہد کی تعریف کیے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔

علامہ آیت اللہ خمینی ۱۹۰۰ء میں شمالی ایران کے جران نامی ایک قصبہ خمین میں پیدا ہوئے، کل عمر ۸۹رسال کی پائی، بچپن سے ہی آپ کی تعلیم وتربیت ایک خاص ماحول میں ہوئی۔ آپ نے اسلامیات، دینیات، فقہ اور فلسفہ کے شعبوں میں تعلیم حاصل کی، وہ بلا کے ذہین اور تیز آدمی تھے، اور شروع سے ہی ایران میں شاہی طرز نظام اور پہلوی سلطنت کی مغرب نواز پالیسیوں کے سخت مخالف تھے۔ جوانی کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی انھوں نے بادشاہی طرزِ نظام کے خلاف مہم کا آغاز کردیا۔ ایران کے سابق بادشاہ رضا شاہ پہلوی کے دورِ اقتدار میں جب ملک میں بدعنوانی اور انارکی کا غلبہ ہوگیا اور پورے ملک میں مغربی تہذیب وکلچر کا یلغار ہونے لگا تو ایران کے مذہبی علماء اور عوام حکمران طبقہ کے شدید مخالف ہوگئے اور آیت اللہ خمینی کی امیج ایک بے باک رہنما کی حیثیت سے بننے لگی، ۱۹۶۳ء میں خمینی نے حکومتِ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، نتیجۃً ملک بھر میں بڑے پیمانے میں تشدد اور افراتفری پھیل گئی۔ حکومت نے آیت اللہ خمینی کو گرفتار کرلیا اور اس کے بعد ۱۹۶۴ء میں ان کو ملک بدر کردیا۔ پہلے آپ نے عراق میں پناہ لی اور وہاں بھی انھوں نے پہلوی راج کے خاتمہ کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ جب انہیں عراق سے بھی نکالا گیا تو وہ پیرس چلے گئے اور جلاوطنی کی چودہ سالہ مدت میں بھی حکومتِ ایران کا تختہ الٹنے کی شبانہ یوم فکر میں کوشاں رہے اس دوران خمینی نے زیادہ سے زیادہ ایرانی عوام کا اعتماد اور ہمدردیاں بھی حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس میں پوری طرح کامیاب رہے، چنانچہ ۱۹۷۸ء میں جب اندرون ملک شاہی نظام کے خلاف زبردست پھوٹ پڑی تو رضا شاہ پہلوی کو ۱۶رجنوری ۱۹۷۹ء کو اپنا تخت وتاج چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ جلاوطنی کے طویل وقفے کے بعد ۱۹۷۹ء میں علامہ خمینی اسلامی جمہوریہ انقلاب کے بانی کی حیثیت سے اپنے وطن لوٹے تو ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب تھی، اپنی پیرانہ سالی اور ضعیف العمری کے باوجود ان میں جو قوت ارادی، عزم وعمل اپنے نظریہ کی حقانیت، صداقت پر اعتماد اور مقصد کے حصول کے لیے لگن تھی تاریخِ عالم میں اس کی مثالیں بہت ہی خال خال نظر آتی ہیں۔

مارچ ۱۹۷۹ء میں ایرانی عوام کی اکثریت نے ''اسلامی جمہوریہ'' کے حق

میں ووٹ دیااور ملک میں ''شیعہ مذہب'' کوسرکاری دین قرار دیا گیا اور جوجدید آئین مرتب کیا گیا اس کے تحت علماء کونسل کو'' ویٹو پاور'' حاصل ہوگیا اورعلامہ خمینی تاحیات ایران کے اعلیٰ اختیار والے رہنما قرار دیے گئے۔ ایران میں شہنشاہی نظام کے خاتمہ کے بعد جوسیاسی اورفکری انقلاب آیااس نے پوری دنیا کوحیرت واستعجاب میں ڈال دیا۔علامہ خمینی نے اپنے فکر وتدبّر اورسیاسی سوجھ بوجھ سے ایرن میں انقلاب برپا کرکے نہ صرف شہنشاہیت کی تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی بلکہ ملک کاپورا سیاسی اوراقتصادی نظام بدل کررکھ دیا۔

علامہ خمینی نے اپنی زندگی میں جس قدرنشیب وفراز دیکھے اورجس طرح واقعات پر وہ اثر انداز رہے اس کی بھی کوئی جھلک ہمیں دوسرے معاصر سیاسی قائدین کی زندگیوں میں نظرنہیں آتی۔ علامہ کی وطن سے جلا وطنی، ایرانی انقلاب، شاہ ایران کی معزولی اور زوال، امریکہ اورمغربی ممالک کے ساتھ تصادم، سفارت کاروں کا یرغمال، امریکہ سے اثاثہ جات کاحصول، عراق کے ساتھ طویل ترین جنگ پھر جنگ بندی ایسے ہنگامہ خیز واقعات ہیں جن میں سے ایک آدھ بھی بہت سے رہنماؤں کی زندگی میں وقوع پذیرنہیں ہوتا۔

جدید دور کی تاریخ میں یہ بہت ہی اہم واقعہ ہے کہ علامہ خمینی کی رہنمائی اور پیام کے نتیجے میں ایران کی نوجوان نسل نے مغرب زدگی اور جدیدیت کی نقالی کی بدترین لعنت سے نجات حاصل کی اوراپنے آپ کو مذہب اوراقتدار سے وابستہ کرکے سراٹھا کرفخر اوروقار کے ساتھ جینے لگے، اس عظیم انقلابی کارنامہ کا عالم عرب سمیت عالم اسلام نے بجاطور پردل سے خیر مقدم کیا تھا،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انقلابِ ایران کے بعد اکثر عرب اوراسلامی ممالک کے ساتھ ایران کے تعلقات میں کشیدگی رہی اوراس کی وجہ وہ ایرانی تحریکات تھیں جن کے ذریعہ علامہ خمینی نے ایرانی طرز کااسلامی انقلاب ان ممالک میں بھی درآمد کرنے کی کوشش اورتلقین کی تھی۔

ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ علامہ خمینی موجودہ دَور کے ان عظیم رہنماؤں میں شامل تھے جوفکری انقلاب کے ذریعہ دنیا میں تعمیری تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں۔

علامہ خمینی ایران کوایک اسلامی مملکت کانمونہ بنا کرپیش کرنا چاہتے تھے کہ آج کے جدید اورمغرب زدہ ماحول میں ایک ایسی سلطنت وجود میں آئے جو عملاً اسلام کی حقیقی اورعملی تصویربن جائے۔علامہ خمینی کا یہ نعرہ کہ ''لاشرقیہ ولا غربیہ۔ اسلامیہ اسلامیہ'' کامفہوم ہی یہ تھا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو مغرب اورمشرق کے مہلک اثرات سے پاک ہواورجس میں اسلامی فکر وشعور کی جھلک ملتی ہو، یہ تصور بہت اچھا اور یہ کوشش بہت مبارک تھی۔اگر یہ ساری صورت حال عملی شکل اختیار کرلیتی تواسلامی ممالک امریکی اورروسی غلبے اورتسلّط سے نکل کر اپنی ایک آزادمعیشت قائم کرلیتے اور دونوں بلاکوں کے معاشی اور تمدنی غلبے کا شکار ہونے سے بچ جاتے۔مگرافسوس ایسانہیں ہوسکا۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

علامہ خمینی اب اس دنیا میں نہیں رہے اوران کی موت نے ردّعمل کا جو سلسلہ شروع کیاہے وہ حالانکہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ایران سے باہر بھی رنج وغم کی لہرفطری ہے۔اس طرح یہ تشویش بھی بجا ہے کہ علامہ خمینی کے بعد وہاں کے سیاسی حالات کیا کچھ رُخ اختیارکریں گے؟ مغربی ایشیا کی صورت حال پرعلامہ کے انتقال سے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اورعالمِ اسلام سمیت اب بڑی طاقتوں کی بھی خارجی پالیسی کیا کچھ بنے گی؟ اورجناب علی خامنائی نے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں تاہم علامہ خمینی کوجو مقام ومرتبہ اور ایرانی عوام میں مقبولیت ومحبوبیت اوراثر ورسوخ حاصل تھاوہ سب کچھ کسی دوسرے رہنما کوحاصل ہونا ممکن نہیں۔ پھر بھی امید کی جاسکتی ہے کہ خمینی اور خامنائی میں جوصوتی ولفظی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے وہ گفتار وکردار اورفکر وعمل کے سانچے میں بھی ڈھل سکیں گے۔ہمیں اعتراف ہے کہ علامہ خمینی اس صدی کے ان عظیم رہنماؤں میں تھے جن کے اثرات مادی اورجغرافیائی حدود سے ماوراتھے اوربقول شاعر مشرق:

ہزاروں سال نرگس اپنے بے نوری پہ رُوتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

[عمید الرحمٰن عثمانی، ستمبر۱۹۸۹ء]

اہلیہ،مولانا ابوالحسن علی ندوی

اہلیہ،مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

یہ خبرانتہائی رنج وغم اورصدمہ کے ساتھ سنی گئی کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اہلیہ محترمہ زینے سے گرنے کی وجہ سے کچھ عرصہ شدید علالت میں مبتلا ہوکرانتقال فرماگئیں۔اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجعُون۔

مرحومہ بڑی ہی نیک وپاکباز خاتون تھیں۔اس بڑھاپے میں بھی وہ دینی خدمات میں ہمہ تن مصروف تھیں۔اپنے نیک دل شوہر اورعالم اسلام کی مقتدر ہستی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی علمی ودینی خدمات میں معین تھیں۔

ایسے وقت میں جب کہ حضرت مولینا ابوالحسن علی میاں مدظلہ بھی ضعیف العمری کے دور میں ہیں ان کی موت کا صدمہ اور زیادہ ہوجاتا ہے۔حضرت مولینا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی دامت برکاتہم کی دینی وعلمی خدمات آج ہر جگہ تحسین وستائش کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ہمارا اندازہ ہے کہ اس میں مرحومہ کی قناعت پسندی وصبر کا بڑا زبردست دخل ہوگا۔مولینا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی آپ بیتی میں قرآن پاک کی تفسیر اوراپنی علمی خدمات کے ذیل میں اپنی اہلیہ محترمہ کے تعاون اور ان کی صبروقناعت پسندی وسلیقہ شعاری کا ذکر شکروا حسان مندی کے ساتھ کیا ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ علماء کرام مال واسباب سے خالی ہوتے ہیں۔وہ دین کے سچے خادم ہوتے ہیں۔دنیا ان کے لیے کوئی اہمیت کی حامل نہیں ہوتی ۔علماء کرام کی قومی وعلمی دینی خدمات میں ان کی رفیقۂ حیات کے ایثار وقربانی سے سرشار کردار کا زبردست حصہ رہتا ہے اس لیے علماء کرام کی خدمات میں ان کی رفیقۂ حیات کی اہمیت مسلمہ امر ہے ۔اوراس لحاظ سے محترم حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال سے ہم سب کو صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دلی اور ماہنامہ برہان حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اہلیہ محترمہ کے انتقال پر حضرت مولینا علی میاں مدظلہ سے عالم اسلام سے اور خود اپنے آپ سے اظہار تعزیت کرتا ہے اور دُعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اور حضرت مولینا علی میاں مدظلہ اور ہم سب عقیدتمندوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے ۔آمین ثم آمین ۔ [جنوری ۱۹۹۰ء]

حسین، مولانا افضل

مولانا افضل حسین

یکم جنوری ۱۹۹۰ء کو جماعت اسلامی ہند کے قیم مولینا افضل حسین صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔اِنَّاللّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجعُون۔

مولانا مرحوم حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانیؒ کے خصوصی رفقاء میں سے تھے۔جب مجلسِ مشاورت کا قیام عمل میں آیا تھا اس وقت حضرت مفتیؒ کے شانہ بشانہ مولینا افضل حسین بھی اس کی کامیابی کے لیے پیش پیش تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ میں ان کی رائے کی اہمیت تھی۔مولینا کا تعلق کئی مذہبی وتعلیمی تنظیموں سے رہا۔بورڈ آف اسلامک پبلی کیشنز کے قائم مقام صدر تھے۔جس کے زیر اہتمام ہفت روزہ انگریزی ریڈینس شائع ہوتا ہے۔ ملّت کے اس دردمند خادم رہنما کے انتقال سے ہم سب کو صدمہ ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا کرے ۔ آمین۔ [جنوری ۱۹۹۰ء]

بقائی، حکیم شریف الدین

حکیم شریف الدین بقائی

دہلی کی ایک عظیم خاندانی شخصیت اور بزرگان دین کے محبِّ خاص حکیم شریف الدین بقائی ۲؍جنوری ۱۹۹۰ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے ۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجعُون۔

مرحوم بقائی انتہائی نیک، عابد وزاہد اور مُخیر تھے۔دینی اداروں سے ان کی وابستگی قابل قدر تھی۔ادارہ ندوۃ المصنفین کے قدیم ترین ممبر تھے اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ سے ان کا بڑا ہی قریبی تعلق وشغف تھا۔بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ حکیم شریف الدین بقائی مفتی صاحبؒ کے شیدائی تھے۔مفتی صاحب کے ساتھ اکثر ان کی نشست رہتی تھی۔ان کے انتقال سے جہاں ان کے متعلقین اور دلّی والوں کو صدمہ عظیم ہوا ہے، وہیں ادارہ ندوۃ المصنفین و برہان بھی اپنے قدیم ترین مخلص سے محروم ہوجانے کی وجہ سے سخت رنج وغم سے دوچار ہے۔ان کے لائق ہونہار صاحبزادے ڈاکٹر معین الدین بقائی سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے ادارہ مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔ [جنوری ۱۹۹۰ء]

صدیقی، مولانا ابواللیث

مولانا ابواللیث صدیقی

ملّی، دینی اور علمی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی کہ سابق امیر جماعت اسلامی ہند حضرت مولانا ابواللیث صدیقی ندوی اس ماہ دسمبر ۱۹۹۰ء میں طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے ۔اِنَّاللّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجعُون۔

مرحوم مولانا ابواللیث بڑے جید عالم دین تھے۔عربی کے اسکالر تھے۔ مگر اس کے باوجود سادگی وشرافت کے پیکر مجسّم تھے۔خاموش طبع تھے مگر بلا کے ذہین اور دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔۱۹۴۷ء کے پُر آشوب دور میں انہوں نے ہندوستان ہی میں دین اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے کا بیڑہ اٹھانے کا عزم مصمم کیا۔اوران کی اعلیٰ کارکردگی ، کامیاب قیادت سے ملّت کو فیض بھی حاصل ہوا۔

مفکّر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے ان کو بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ان کی

تعظیم وتکریم کرتے تھے اورملّی مسائل میں ان کے مشوروں سے فیضیاب بھی ہوتے رہے۔خود حضرت مفتی صاحبؒ بھی ان کی علمی قابلیت کے معترف تھے۔ مجلس مشاورت کے سلسلے میں ان کی خدمات سے انہوں نے بھرپور استفادہ بھی حاصل کیا۔ان میں متانت کُوٹ کُوٹ کربھری ہوئی تھی۔ان کے انتقال پرعظیم مذہبی رہنما وعالم دین حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی صاحب مدظلہٗ نے صحیح کہا ہے کہ ان کے انتقال سے ملّت ہند ایک سچّے رہنما مخلص انسان سے محروم ہوگئی ہے۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔آمین! [دسمبر ۱۹۹۰ء]

وجے لکشمی، پنڈت

پنڈت وجے لکشمی

اسی ماہ میں ایک دوسرا حادثۂ جانکاہ ملک کو پنڈت وجے لکشمی کا بھی پیش آیا ہے۔محترمہ جواہرلال نہرو کی ہمشیرہ تھیں۔لیکن وہ خود بھی بڑی قابلیت کی مالک تھیں۔صحیح بات کہنے میں وہ کبھی نہیں چوکیں، چاہے اس کے لیے ان کو اپنے خاندانی افراد ہی سے ناراضگی کیوں نہ لینی پڑی ہو۔ایمرجنسی کی مخالفت میں وہ اپنی بھتیجی شریمتی اندرا گاندھی کے خلاف میدان میں کود پڑیں۔

وہ بڑی بہادر خاتون تھیں اورایک اچھی مقرر بھی تھیں۔ بھارت کی نمائندگی کرتے ہوئے انہوں نے غیرملکوں میں بھی اپنی قابلیت کالوہا منواتے ہوئے اپنے ملک کا نام روشن کیا۔یو۔این۔ او میں ان کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف واظہار کیا گیا۔ان کے انتقال سے ہندوستان نے اپنی ایک بڑی محسنہ کوکھودیا ہے۔ان کی کمی کو ہمیشہ ہی محسوس کیا جائے گا۔ہندوستان کی سیاست میں ____ ایسا ہماراالیقین ہے۔ [دسمبر ۱۹۹۰ء]

حسین، مولانا قاضی سجاد

مولانا قاضی سجاد حسین

۲۳/ دسمبر ۱۹۹۰ء کوحضرت مولانا قاضی سجادحسین صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔

قاضی سجادحسین صاحب کے انتقال سے ملت اسلامیہ ایک زبردست عالم دین ممتاز مفکر ومدبر سے محروم ہوگئی ہے۔کیونکہ قاضی صاحب بڑے ہی بلند اوصاف کے حامل انسان تھے وہ تصنع وبناوٹ سے قطعاً مبرا تھے۔عرصہ دراز تک مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے خدمت دین میں منہمک ومشغول رہے۔عربی وفارسی کے جید عالموں میں ان کا شمار تھا۔حضرت مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ہمراہ ہی ۱۹۶۷ء میں انہیں فارسی زبان کے عالم کی حیثیت سے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب کے ہاتھوں پدم شری ایوارڈ عطا کیا گیا۔مفتی صاحب مرحوم کوعربی اسکالرایوارڈ دیا گیا تھا۔

قاضی صاحب حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے شاگرد خاص بھی تھے اور ساتھی بھی۔اکثر علمی اورقومی معاملات میں وہ حضرت مفتی صاحب سے مشورہ فرماتے اوران کے مشورے ورائے ہی کوافضلیت واہمیت دیتے تھے۔

۱۹۵۴ء میں حضرت قبلہ مفتی صاحب نے راقم (عمید الرحمٰن عثمانی) کو حضرت قاضی سجادحسین کی شاگردی میں سونپ دیا۔راقم نے قاضی صاحب سے فارسی کی کئی کتابیں پڑھیں اوران کی صحبت وشاگردی میں رہ کر کافی کچھ فیض و استفادہ حاصل کیا۔

قاضی صاحب ہمارے سب کے لیے قابل احترام بزرگ تھے۔حضرت قبلہ اباجان مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے ان کو جولگاؤ تھا وہ بھی قابل ذکر ہے۔ ہرجمعہ کوبعد نماز مغرب حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی،مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن، مولوی سعید احمد اکبرآبادی، حکیم اقبال احمد ہمدم دواخانے والے اورقاضی سجادحسین صاحب پابندی سے ادارہ ندوۃ المصنفین میں آتے اورکھانا سب ساتھ ہی تناول کرتے، ہرجمعہ ہم سب کے لیےعید سے کم نہ ہوتا۔ والدہ مرحومہ ہرجمعہ کوطرح طرح کے عمدہ کھانے خوداپنے ہاتھوں سے تیارکرکے مسرت وانبساط حاصل کرتیں۔دراصل مفتی صاحب مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، قاضی سجادحسین، حکیم عبدالحمید، مولوی سعید احمد اکبرآبادی یہ سب ایک ہی نشست رکھتے تھے۔آموں کے موسم میں سب ساتھ مل کرراقم کے برادر خورد نجیب الرحمٰن عثمانی کوہمراہ لے کرمولوی مرغوب الرحمٰن صاحب مہتم دارالعلوم دیوبند کے یہاں پہنچتے اورآموں کی لذت سے محظوظ ہوتے، کبھی کرتپور میں قاضی سجادحسین صاحب کے برادر قاضی جوادحسین اورایک دوسرے عزیز حافظ شفاعت علی صاحب کے یہاں مہمان ہوتے اوران کی آموں کی میزبانی سے سرور ولطف حاصل کرتے۔اب یہ سب داستانِ ماضی ہوکر رہ گئی ہے۔

قاضی سجادحسین صاحب کے انتقال سے ہمیں بڑا گہرا صدمہ ہوا ہے۔وہ بڑے ہی نیک انسان تھے سنجیدہ ومتین عالم تھے۔ان کا اپنا الگ مقام تھا۔۱۹۴۷ء کے بعد فارسی کلاسیکی زبانوں پرانہوں نے جوکام کیے ہیں اورپند نامہ،گلستان اور دیوان حافظ کی اشاعت وترجمہ کے علاوہ آٹھ جلدوں میں مثنوی مولانا روم کا ترجمہ جیسے ان کے کارنامے یادگار ہیں۔آنے والی نسلیں اس سے دیرتک استفادہ

حاصل کرتی رہیں گی۔

اللہ تعالیٰ قاضی سجاد حسین صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو اور ان کے عزیزان ولواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

[دسمبر ۱۹۹۰ء]

امینی، مولانا محمد تقی

''آفتاب جو غروب ہوگیا''

تیرہ وتار تھی پہلے ہی یہاں شام حیات　　دامن چرخ سے ایک اور ستارہ ٹوٹا
کوئی بتلاؤ میری قوم کے معصوموں کو　　کون برباد ہوا کس کا سہارا ٹوٹا

یہی کوئی دن کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے جب ہمارے ایک دوست نے اطلاع دی کہ مولانا محمد تقی امینی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یہ خبر سنتے ہی اولاً تو سکتہ کی سی کیفیت ہوگئی۔ کانوں کو جیسے یقین نہ آیا ہو۔ ابھی تقریباً ایک گھنٹہ قبل انہوں نے مجھے یاد فرمایا تھا۔ میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ دھوپ سینک رہے ہیں۔ اور خاصے روبہ صحت معلوم ہو رہے ہیں لیکن اب اچانک یہ خبر؟ کیا واقعی مولینا کا انتقال ہوگیا ہے۔ کیا سچ مچ مولانا ہم سے جدا ہوگئے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ مولینا نے رخت سفر باندھ لیا ہے اور کوچ کر گئے؟ کیا امت کا یہ درشاہوار بے نور ہوگیا؟ کیا یہ عظیم المرتبت شخصیت ہمیں داغ مفارقت دے گئی؟ کیا اُمّت کی تقدیر کے آسمان سے ایک اور ستارہ شہاب ثاقب ہوگیا؟ ___ ہم جلدی سے مولینا کے گھر کی طرف لپکے مگر دروازے ہی پر جیسے کسی نے قدم پکڑ لیے ہوں۔ نالہ وشیون کی آوازیں ایسا ثبوت تھیں کہ ہمیں اس خبر پر یقین کرنے کے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ؎

چل بسا داغؔ آہ میت اسکی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

پروفیسر سابق ڈین فکلٹی آف تھیالوجی مولینا محمد تقی امینی صاحب کے اُٹھ جانے سے ایک پوری انجمن خالی ہوگئی ہے، وہ ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک کارواں تھے۔ وہ ایک آدمی نہیں بلکہ ایک انجمن تھے۔ ایک بزم اور ایک محفل تھے۔ اگر ان کو آج کے دور میں علماء کا سرخیل کارواں کہا جائے، میں سمجھتا ہوں کہ بے جا نہ ہوگا۔ ان کی ذات اپنے آپ میں ایک ادارہ تھی۔ وہ علم وحکمت کا چلتا پھرتا خزانہ تھے۔ اُن کے دم سے علی گڑھ میں علم دین کی قندیل روشن تھی، جب کبھی کوئی دینی، فقہی مسئلہ حل نہیں ہو پاتا تھا تو یقین رہتا تھا کہ مولینا کے یہاں حل ہو جائے گا۔ مگر آہ ___ کسی کو بھی نہ بخشنے والی موت نے آج آپ کی باری لگادی۔ انھیں بھی ہم سے چھین لیا۔ اور وہ بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ ؎

ہائے گلچین اجل یہ تجھ سے نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا چمن میں جس سے ویرانی ہوئی

ابھی چند ماہ پہلے ہی کی تو بات ہے مجھے مولینا نے یاد فرمایا اور ہفتہ وار اخبار ''بلٹز'' کا ایک شمارہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''مشتاق میاں! اس میں ہمارے متعلق ایک مضمون آیا ہے۔ اسے دیکھو۔'' میں نے لیا اور پڑھا۔ اس کا عنوان تھا ''ستارہ جو آفتاب بنا'' اس عنوان کا ذکر کرتے ہوئے مولینا نے فرمایا کہ کچھ دنوں بعد آئیگا ''آفتاب جو غروب ہوگیا'' اگرچہ اس لفظ کی دہشت سے ہمارا کلیجہ اچھل کر حلق میں آنے کو ہوا تھا مگر ہمیں یقین تھا کہ ہمارے مشفق استاد ابھی تادیر ہمارے سروں پر سایہ فگن رہیں گے اور ہم ان کی صحبت میں علم وفن کے موتی چنتے رہیں گے۔ لیکن ان کا آفتاب بننا سچ مچ ان کے غروب کی علامت بن گیا۔

؎ کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام ہے

آج امت مسلمہ جس قحط الرجال سے دوچار ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جب امت کا سیاسی وسماجی اور خصوصاً مذہبی شیرازہ منتشر ہو رہا ہے، پوری قوم ایک مستقل کرب وبے چینی میں مبتلا ہے، امت کے مسائل ومصائب کا مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، ان کی پریشانیاں پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہیں، آئے دن کے ہنگاموں اور شورشوں میں قوم کی رہی سہی قوّت بھی ختم ہو رہی ہے، ایسے مصائب سے پُر حالات میں مولانا جیسے مدبّر، ذہین اور زبردست عالم دین کا اٹھ جانا پوری اُمّت کے لیے ایک سانحہ سے کم نہیں ہے۔

ضرورت جتنی بڑھتی جارہی ہے صبح روشن کی
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

مولینا محمد تقی امینی صاحب کی ولادت ۲۲ر شوال ۱۳۴۴ھ مطابق ۵ر مئی ۱۹۳۶ء کو ضلع بارہ بنکی کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد کا نام عبدالحلیم تھا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے آپ کو گاؤں ہی کے ایک مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ وہاں مولانا نے کلام پاک کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ قرأت وتجوید کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ذہانت وفطانت کی علامات بچپن ہی سے نمایاں تھیں۔ اس لیے آپ کے اساتذہ نے ان کے والد صاحب سے مشورہ کرکے انہیں جامع العلوم کانپور میں داخل کروا دیا۔ یہاں آپ نے عربی زبان کے علاوہ اسلامیات، فقہ اور تفسیر کی تعلیم پائی۔ اس وقت ہندوستان کے طول وعرض میں علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے

تین ادارے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور مدرسہ امینیہ دہلی۔ مگران میں مفتی کفایت اللہ صاحب کی وجہ سے امینیہ کوایک خاص اہمیت حاصل تھی۔اس وقت تو امینیہ کے در و دیوار سے بھی علم و عرفان کی بارش ہوتی تھی۔دارالعلوم دیوبند کے علماء بھی سند فراغت لینے کے بعد وہاں درس حدیث کے لیے آتے تھے اس لیے مولانا محمد تقی صاحب کے بھی اساتذہ نے سمجھا کہ اس درشاہوار کو جب تک مولانا مفتی کفایت اللہؒ جیسا عظیم المرتبت فقیہہ اورمحدث نہیں ملے گا اس وقت تک اس کی فطری تابنا کی محتاج رونمائی رہے گی۔ چنانچہ آپ کواعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ امینیہ دہلی بھیج دیا گیا۔ یہاں گویا آپ کومنزلِ مقصود مل گئی یا فردوس گم گشتہ آپ کو حاصل ہوگئی۔ آپ کی امیدیں بَرآئیں،علم وعرفان کی جس محفل کے لیے آپ کے سینہ میں نامعلوم سی خلش تھی،اس کوتسکین مل گئی۔علم وفقہ کی تخم ریزی کاتب ازل نے آپ کی فطرت میں رکھی تھی اس کو برگ وبار نکالنے کا موقع ملا گیا اوراس نے اپنی ننھی ننھی کونپلیں نکالنی شروع کیں۔مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بھی جلد ہی محسوس کرلیا کہ یہ ایک انتہائی ذہین اور باصلاحیت طالب علم ہے اس لیے اپنی خصوصی توجہات مولانا پر منعطف کردیں۔قابل عظمت استاذ کے زیرِ سایہ یہ ننھا سا پودا بہت جلد تناور درخت بن گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولینا کی نسبت ''امینی'' سے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ''امینیہ'' کی طرف نسبت ہے۔جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ نسبت مولانا کے ''نظریہ امانت'' کی غماز ہے۔جس کوانہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''اسلام کا زرعی نظام'' میں پیش کیا ہے۔بعض وجوہ اورحالات کی نامساعدت کی وجہ سے اس نظریہ کوفروغ نہ مل سکا اورلوگوں نے ''امینی'' کومدرسہ کی طرف نسبت سمجھ لیا۔

امینیہ سے فارغ ہوتے ہی مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے آپ کی عمدہ صلاحیتوں کے پیشِ نظر اپنی ذمہ پر میواتیوں کے مشہور مدرسۂ سبحانیہ میں جواس وقت قرول باغ دہلی میں تھا مدرس کی حیثیت سے بھیج دیا۔

مشہور عالم، مولینا عبدالمنان صاحب، مولانا عبدالغفار صاحب صدر مدرس و شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی اورمولانا محمد اسحاق صاحب شیخ الحدیث مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح (میوات) نے اسی زمانہ میں آپ سے فیض حاصل کیا۔اسی دور میں آپ کے تعلقات ندوۃ المصنفین کے بانی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور ''برہان'' کے مدیر مولینا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم سے استوار ہوگئے تھے جوتادم حیات باقی رہے۔لیکن مولینا کو مدرسہ سبحانیہ کی فضا راس نہ آئی اس لیے جلد ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء چلے گئے، یہاں کی علمی محفلوں سے مولینا خود بھی مستفید ہوئے بلکہ مولانا کی آمد سے ان میں رونق آ گئی۔لیکن مولانا یہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکے۔آپ کو جلد ہی ندوۃ العلماء سے سبکدوش ہو جانا پڑا۔اس کے بعد آپ جامع العلوم کانپور اور وہاں سے مستعفی ہوکر مدرسہ ثانویہ ناگپور (مہاراشٹر) تشریف لے گئے۔یہیں آپ نے اپنی سب سے مشہور کتاب ''اسلام کا زرعی نظام'' لکھی۔یہ مولانا کی پہلی باضابطہ تصنیف تھی۔ناگپور کے مدرسہ سے سبکدوش ہوئے تو دارالعلوم معینیہ اجمیر میں خدمات شروع کردیں۔یہاں آپ نے اپنی دوسری مشہور کتاب ''فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر'' لکھی۔

اگرچہ مولانا ایک کامیاب مدرس تھے اور مختلف مدرسوں اورعلاقوں میں ایک عرصہ تک خدمات انجام دیتے رہنے سے مزید تجربات ہوگئے تھے۔مگر مولانا کے مزاج میں جوفطری آزادی ودیعت کی ہوئی تھی اورآزادانہ کام کرنے کا جو مادہ مولانا کی طبیعت کا جزو ثانی تھا وہ مولانا کو کسی جگہ جمنے نہیں دیتا تھا۔مولانا چاہتے تھے کہ انہیں ایسا میدان عمل مہیا ہوجائے جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کی ترجمانی کرسکیں۔اپنی تصنیفی اورتالیفی سرگرمیوں کوبغیر کسی کی مداخلت کے جاری رکھ سکیں، جہاں ان کے خیالات پر کسی مہتمم یا صدرمدرس کی قدغن کا اندیشہ نہ ہو۔اوراللہ تعالیٰ نے مولانا کی منشاء کے مطابق انہیں جگہ دلوادی۔آپ ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں لکچرر کی حیثیت سے مقرر ہوگئے۔

علیگڑھ میں مولانا کے لیے جہاں اورسہولیات تھیں وہاں ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ اورمولانا فضل الرحمٰن گنوری جیسے دانشوروں کی رفاقت مل گئی۔

مولانا کو جومعاشی بےفکری اوراظہار خیال کی آزادی نصیب ہوئی تو آپ نے اپنی بہترین صلاحیتوں کوتصنیف وتالیف کے میدان میں وقف کردیا۔اپنی پوری توجہ تحقیق وتصنیف پر مبذول کردی اوراس میدان میں بہت ہی مختصر وقت میں وہ حیرت انگیز کارکردگی کا اظہار کیا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔یونیورسٹی کے ارباب انتظام نے اس غیر معمولی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے لکچرر سے براہ راست پروفیسر بنادیا۔مولانا خود فرماتے تھے کہ ''اللہ کا شکر ہے مجھے پروفیسر بننے کے لیے نہ کسی کی سفارش کی ضرورت پیش آئی اور نہ ہی درخواست دینے کی،خود بہ خود پروموشن ہوتا گیا۔''

مولانا محمد تقی امینی صاحب یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے پروفیسر اور ڈین فیکلٹی بھی رہے۔ آپ نے اس شعبہ کے بکھرے وقار کو مستحکم کیا اور اس کی اہمیت منوائی۔ آپ کی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہی کی شبانہ روز کی محنتوں کے نتیجہ میں اس شعبہ کی علیٰحدہ عمارت بنی اور لائبریری بھی۔ اس شعبہ میں آپ نے نظامت دینیات کے فرائض بھی انجام دیے۔

اگرچہ آپ کی عمر ریٹائرڈ ہونے کی ہوچکی تھی مگر صحت اچھی تھی۔ اور یونیورسٹی کے اربابِ انتظام کا اصرار تھا اس لیے ابھی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مگر تین سال قبل اچانک گٹھیا کے مرض نے شدید حملہ کیا اور چند ہی مہینوں میں بالکل صاحب فراش ہوگئے۔ ایک سال پہلے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید مولانا داعئ اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور پھر روبصحت معلوم ہونے لگے۔ بلکہ خاصے صحت مند محسوس ہونے لگے تھے۔ تاہم سردی میں شدّت کی وجہ سے عموماً گھر ہی میں رہتے تھے۔ اگر دھوپ تیز ہوتی تو کبھی کبھی چہل قدمی بھی کر لیتے تھے۔ حکیم کلیم اللہ صاحب کا علاج چل رہا تھا اور اس سے خاصے مطمئن تھے۔

آج ہی ۲۱ر دسمبر کو صبح مجھے بلوایا اور کہا ''ہماری طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ ذرا حکیم صاحب کو میرا حال بتا آؤ۔'' میں نے سائیکل لی اور فوراً دوا لے کر آ گیا اس وقت یہی کوئی سوا گیارہ بجے تھے۔ مولانا دھوپ سینک رہے تھے۔ میں اجازت لے کر اندر گیا اور دوا پیش کی۔ دوا لیتے ہوئے مولانا نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میاں تم آتے ہی نہیں میں نے تم سے کہا تھا ہر روز آیا کرو تم سے مل کر طبیعت ذرا خوش ہوجاتی ہے اور کچھ علمی باتیں بھی ہوجاتی ہیں۔'' میں نے عرض کیا۔ ''حضرت آپ کی خرابی صحت کی وجہ سے پابندی نہیں کر پاتا۔ کہیں تکلیف نہ ہو۔'' فرمایا۔ ''آیا کرو ہمیں تمہارا انتظار رہتا ہے۔'' میں نے وعدہ کر لیا اور چلا آیا۔ ابھی مجھے آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ایک عزیز نے آ کر اطلاع دی، مولانا محمد تقی امینی صاحب چل بسے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا جب اُمّت کا یہ درشاہوار، یہ تابندہ و درخشندہ ستارہ اور یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

وہ ایک دل جو چمک رہا تھا خلوص وایماں کی تابشوں سے
خلوص و ایماں کے دشمنوں کو خبر سناؤ کہ وہ بھی ڈوبا

پروفیسر مولانا محمد تقی امینی صاحب کے آخری دنوں میں مجھے خاص طور پر ان کی خدمت میں رہنے کا موقعہ حاصل ہوا۔ ان دنوں میں عموماً آپ کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا تھا۔ میں نے مولانا کے مزاج میں جو خاص عناصر ترکیبی پائے جن سے کوئی بھی شخصیت تشکیل پاتی ہے وہ ان کی سادگی تھی۔ وہ انتہائی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ نام ونمود، شہرت وناموری، عجب وخودبینی، غرور و تکبر، کبر ونخوت، حسد وجلن وغیرہ بُری صفات سے قطعی مبّرا تھے۔ بلکہ ان کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ بھیڑ بھاڑ، جلسے جلوس سے آپ کی طبیعت گھبراتی تھی۔ اگرچہ آپ شعلہ بیان خطیب تھے مگر یونیورسٹی کی جامع مسجد کے علاوہ کہیں بھی کیسا بھی جلسہ ہو اس میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ آپ زیادہ تر گوشہ گیر ہی رہتے تھے۔

آپ کے مزاج کا دوسرا اہم عنصر محبت تھا۔ آپ ہر کسی سے محبت کرتے تھے، بلکہ محبّت ہی آپ کی طبیعت کا غالب پہلو تھا۔ آپ کی محبت کا فیض اتنا عام تھا کہ اس میں کسی طبقہ، یا گروہ، کسی مسلک یا مذہب، کسی ذات یا برادری کی کوئی قید نہیں تھی۔ جس طرح ایک بڑا آدمی آپ کی محبت میں شریک ہوسکتا تھا اسی طرح ایک چھوٹا آدمی بھی۔ آپ جیسے ایک مسلم کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے اسی طرح ایک غیر مسلم کو بھی، جس طرح آپ کے جذباتِ محبت عالموں کے لیے تھے اسی طرح جاہلوں کے لیے تھے۔ آپ فسادات کی خبریں سن کر بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ آنکھیں پُرنم ہوجاتی تھیں۔ کہتے تھے: ''جس گھر کا کوئی فرد اس جنون کی نذر ہوگیا اس گھر کا کیا عالم ہوگا''۔

مولانا کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت محبت کا ہی ثمرہ تھا کہ ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی جہاں یونیورسٹی کے اعلیٰ ذمہ داران اور اساتذہ وطلبہ کا سیلاب امنڈ آیا وہیں محلّہ کے معمولی مزدور اور جھگیوں میں رہنے والوں کی آنکھیں بھی اشکبار ہو اُٹھیں۔

مولانا بچوں پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے، ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ اگر کسی کا کوئی مضمون شائع ہوجاتا تو اسے انعام دیتے۔ چاہے بلوا کر ہی دینا پڑتا۔ معمولی معمولی کاموں پر بہت زیادہ احسان مندی کا اظہار فرماتے حتّی کہ کبھی کبھی تو کام کرنے والا شرمندگی محسوس کرنے لگتا۔

مولانا اگرچہ زندگی بھر استاد رہے۔ تمام علوم دینیہ کی وقتاً فوقتاً تدریس کی خدمات انجام دیں لیکن مولانا کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں۔ مولانا نے متنوع موضوعات پر اتنا تصنیفی کام کیا ہے کہ ایک آدمی سے اس کی مختصر سی زندگی میں اس کی توقع بہت ہی مشکل سے کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ مولانا کی کتابیں تین درجن کے قریب ہیں۔ لیکن موضوع کے تنوع بلکہ نیاپن سے ان کی حیثیت بہت

زیادہ ہوگئی ہے۔

اگر ان کی کتاب ''اسلام کا زرعی نظام'' اور ''فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر'' سامنے ہوتو وہ ایک بالغ نظر فقیہہ معلوم ہوتے ہیں۔اوراگر ''احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت''، ''اجتہاد کا تاریخی پس منظر''، ''اجتہاد اسلامی نقطہ نظر سے'' اور ''مقالات امینی'' سامنے ہوتو اعلی درجہ اصولی (اصول فقہ کے ماہر) معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ''حدیث کا درایتی معیار'' سامنے ہوتو ان کی محدثانہ وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے اوراگر 'تہذیب کی تشکیل جدید'' ''لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر''، ''عروج وزوال کا الٰہی نظام''، ''مذاہب میں مفاہمت کے اصول''، ''عہد جدید کی اجتماعی مشکلات''، ''فتنہ الحاد اب اور ۔۔۔'' کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب وتمدن، عروج وزوال کے اصول پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔

ان کے علاوہ متعدد موضوعات پر ان کی عمدہ تصنیفات ہیں جو ان کی دقت نظر، وسعت مطالعہ اوراعلیٰ مقام کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ان کی تصنیفات کے متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوچکے ہیں اورمختلف ممالک میں بڑی کثرت کے ساتھ ان کو پذیرائی مل رہی ہے۔اور آخر میں ''حکمۃ القرآن'' کے نام سے قرآنیات پر ایک عمدہ کتاب لکھی تھی۔اوراب 'ہدایۃ القرآن' کے نام سے تفسیر لکھ رہے تھے۔ مگر افسوس کہ اس کے چھ اجزاء بھی مکمل نہ ہوسکے۔

مولانا نے ایک علمی پندرہ روزہ ''احتساب'' بھی جاری کیا تھا جو ایک عرصہ تک فقہ واسلامیات پر قابل قدر مواد پیش کرتا رہا لیکن مولانا کی خرابی صحت کے سبب بند ہوگیا۔کاش کہ کوئی مولانا کی نگارشات کو زندہ رکھے۔

[محمد مشتاق تجاوری، مارچ ۱۹۹۱ء]

رحمانی، مولانا منت اللہ

حادثۂ وفات

ماہِ مارچ ۱۹۹۱ء میں ملّتِ اسلامیہ کو اپنے دو عظیم رہنما عالمِ دین کے حادثۂ وفات سے دوچار ہونا پڑا۔

امیر شریعت بہار حضرت مولٰینا منت اللہ رحمانی اور میرٹھ شہر کے مشہور عالمِ دین، اسلامی مصنف حضرت مولٰینا قاضی زین العابدین تھوڑے سے آگے پیچھے وقفہ میں انتقال فرماگئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دونوں ہی ملّتِ اسلامیہ کی عظیم وبرگزیدہ ہستیاں تھیں۔حضرت مولٰینا منت اللہ رحمانیؒ نے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی خدمت کرنے کے لیے اپنے مرحوم عالمِ دین والد مولٰینا محمد علی مونگیری سے ورثہ پایا تھا۔جس طرح مولٰینا محمد علی مونگیریؒ نے مسلمانانِ ہند کی تعلیم وتربیت کے لیے انتھک کوشش کی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کو جن لوگوں نے ایک تصور سے حقیقت بننے میں مدد دی ان میں مولٰینا محمد علی مونگیریؒ کا نام سرفہرست ہے۔مسلمانوں کی خدمت میں وہ جی جان سے لگے رہے جُٹے رہے۔اسی طرح ان کے لائق وہونہار صاحبزادے اور بعد میں مِلّتِ اسلامیہ ہند کے غازی ومجاہد مولٰینا منت اللہ رحمانی نے مسلمانانِ ہند کی ہر طرح خدمت ورہنمائی کی۔مسلم پرسنل لاء بورڈ میں حضرت مولٰینا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی رفاقت ورہنمائی میں بڑا اہم کردار نبھایا اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے انتقال کے بعد انہوں نے ان کے مشن کو ان کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں کے تحت ہی آگے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی ممبر تھے۔مسلمانوں کی کئی فلاحی انجمنوں سے بھی ان کا ربط وتعلق تھا۔

بقول معاصر ''قومی آواز'' مولٰینا منت اللہ رحمانیؒ کی وفات حضرت مولٰینا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی وفات کے بعد یہ دوسرا بہت بڑا صدمہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پہنچا ہے اوراس کمی کو پورا کرنا آسان نہ ہوگا۔۹۷ سال کی عمر پائی۔

[اپریل ۱۹۹۱ء]

زین العابدین، قاضی

قاضی زین العابدین

میرٹھ کے عالمِ دین قاضی زین العابدین ایک بڑے اسلامی مصنف بھی تھے۔ادارہ ندوۃ المصنفین سے ان کی عظیم وضخیم کتاب تاریخ مِلّت تین حصّوں میں شائع ہوچکی ہے، پہلا حصّہ نبیؐ عربی، دوسرا حصّہ خلافت راشدہ اور تیسرا حصّہ خلافت بنوامیّہ پر تھا جو علمی حلقوں میں مستند وپسندیدہ ہیں۔قبلہ ابا جان حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ سے ان کو خصوصی لگاؤ وانس تھا۔ان کا نام جب بھی لیتے تعظیم وتکریم سے ہی لیتے۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے۔جمعیۃ العلماء ہند سے وابستہ تھے۔حضرت مولٰینا اسعد مدنی صاحب، حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی ہمیشہ ہی عزت وتکریم کرتے تھے۔جب جمعیۃ العلماء ہند کے سلسلے میں مولٰینا اسعد مدنی سے حضرت مفتی صاحب کے بعض معاملات میں اختلافات ہوئے تب بھی

یہ دونوں بزرگ ہمیشہ ہی حضرت مولیٰنا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کا ادب ولحاظ کرتے تھے اور عزت وتکریم میں ہمیشہ ہی بازی لے جانے کی کوشش کرتے۔

مولیٰنا قاضی زین العابدین صاحبؒ قبلہ ابّا جان مفکّرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے شیدائی تھے اور میرے بھائی نجیب الرحمان عثمانی کے سسرالی رشتے کے بزرگ بھی تھے۔ حضرت مفتی شوکت علی فہمیؔ (اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز اور صحت وتندرستی عطا فرمائے) کے عزیز خاص تھے۔ ان کے انتقال سے علمی ودینی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ ابھی حضرت مولیٰنا قاضی سجاد حسین صاحب، حضرت مولانا محمد تقی امینی اور مولیٰنا ابواللیث کا صدمہ ہی ہرا تھا، ان کی وفات سے ہمارے آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ برہان کو ان کی وفات کا عظیم صدمہ ہوگیا۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی حضرت مولیٰنا منّت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار) اور حضرت مولیٰنا قاضی زین العابدین صاحبؒ کے انتقال پُرملال پر خود اپنے سے، ملّت اسلامیہ سے اور تمام لواحقین سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے۔ آمین۔

[اپریل ۱۹۹۱ء]

ماتھر، شری راجندر

شری راجندر ماتھر

ہندی روزنامہ 'نوبھارت ٹائمس' کے چیف ایڈیٹر شری راجندر ماتھر ۱۱ر اپریل ۱۹۹۱ء کو صرف ۴۵ر سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ آنجہانی ماتھر بڑے ہی فراخ دل اور غیر متعصب انسان تھے۔ سیکولرزم کے دلدادہ اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے ہمیشہ ہی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ رمضان شریف کے عاشق تھے۔ روزہ افطار پارٹیوں میں باوجود بڑی مصروفیتوں کے ضرور جاتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے رمضان شریف کا انتظار رہتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس نیک دل انسان کی موت رمضان شریف ہی میں ہوگی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی اخبار نہیں ہے جو ان کے دکھ درد سب کو سنائے۔ مسٹر ماتھر نے نوبھارت ٹائمس کے ذریعہ مسلمانوں کی مشکلات و پریشانیوں کو اہلِ وطن تک پہنچایا۔ ہر محاذ پر مسلمانوں کا دفاع کیا۔ مسلمانوں کو ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی بتایا۔ فرقہ پرست ہندوؤں کو ہمیشہ ہی انہوں نے ڈانٹا۔ واضح ہو کہ ہندی نوبھارت ہندوستان کا سب سے زیادہ کثیرالاشاعت اخبار ہے جس کے پڑھنے والے بھی کچھ ایک چھوڑ کر سب کے سب ہندو ہی ہیں۔ ایسے شریف اور نیک غیر مسلم انسان و مسلم دوست کی وفات سے یقیناً مسلمانانِ ہند کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ [اپریل ۱۹۹۱ء]

گاندھی، راجیو

راجیو گاندھی

وسط مدتی انتخابات کے دوران میں مدراس کے ایک انتخابی جلسہ میں تقریر کے پروگرام سے کچھ دیر پہلے ہی ہندوستان کے سابق وزیراعظم اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر جناب راجیو گاندھی ایک بم دھماکے میں لُقمۂ اجل ہوگئے۔

اس وسط مدتی انتخاب کے بارے میں جہاندیدہ دانشورانِ ملک اور خود مقتول ... راجیو گاندھی یہ خدشہ ورائے ظاہر کررہے تھے کہ اس وسط مدتی انتخاب میں زبردست تشدّد کا امکان نظر آرہا ہے۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ جس تشدّد کے امکان کا اظہار کیا جارہا ہے وہ ملک کی اس عظیم ہستی ہی کو اپنی منحوس لپیٹ میں لے لے گا۔ مگر انہونی ہوکر رہی اور ملک ایک ایسے رہنما سے محروم ہوگیا جو دورِ حاضر کا ہیرو تھا اور مستقبل کی روشن قندیل، اور جس سے ملک وقوم بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

جناب راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل میں کس پارٹی، کس گروہ، کس ملک یا کس فرد کا ہاتھ ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ ابھی تک کسی نے اس کی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے۔ عام طور پر ایل۔ ٹی۔ ٹی دہشت پسندوں پر شک ظاہر کیا جارہا ہے۔ اور اس کے لیے اخبارات کی اطلاع کے مطابق کچھ ٹھوس ثبوت بھی جائے واردات سے مِلے ہیں۔ جو عورت اپنے جسم پر بم باندھ و لپیٹ کر خود بھی ہلاک ہوئی ہے اور جناب راجیو گاندھی کے ساتھ اور دوسرے تیرہ افراد کو ہلاک کرنے کا باعث بنی ہے اس کے متعلق بھی عام قیاس یہ ہی ہے کہ وہ ایل ٹی ٹی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر ابھی یہ سب قیاس آرائیاں ہی ہیں، یقین و قطعیت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ حکومتِ ہند نے تمام حادثۂ قتل کی تحقیقات کے لیے بروقت ایک کمیشن بنادیا ہے جو عرصہ تین ماہ میں اس سلسلے میں اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ اس سے پہلے جو بھی اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرے گا وہ صرف قیاسات ہی کے زمرے میں ہوگا۔ اور حقیقت ویقین کا گمان کرنا عبث ہی ہوگا۔

۱۹۸۹ء میں ہندوستانی عوام نے جس جوش کے ساتھ غیر کانگریس حکومت

کے قیام میں ووٹ سے تعاون دیا تھا اسے غیر کانگریسیوں نے آپسی گروہ بندی اور اپنی پارٹی مفاد میں پڑ کرنا کارہ کر دیا اور جو ملک کے لیے خطرہ کا سگنل بن کر رہ گیا۔ مختصر مدت میں دوبارہ انتخاب نے ملک کی معیشت پر جو بوجھ ڈالا ہے اس کے اثرات کا تو انتخاب کے بعد ہی عوام کو اندازہ ہوگا اور جو اس قدر بھیانک ہوگا جس کا قبل از وقت تصوّر ہی ملک کے بہی خواہوں کے ہوش اُڑا رہا ہے۔ راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل نے ایک اور خطرہ ملک کے سامنے پیدا کر دیا ہے اور وہ ہے انڈین نیشنل کانگریس میں انتشار کا، سیکولرزم کے زوال کا، سیکولرزم ویسے بھی کانگریس کے لیے صرف انتخاب کے دوران میں اقلیتوں کے لبھانے کے لیے ایک چمکدار شئے بن کر اور جس کا عمل سے بَرائے نام ہی واسطہ رہ گیا تھا۔ راجیو گاندھی کے قتل کے بعد تو لفظ سیکولرزم ہی کے قائم رکھنے کے لالے پڑ جائیں گے۔

اس وسط مدتی انتخاب میں تشدّد کیوں زیادہ دکھائی دے رہا ہے۔ اسے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ آزادیٔ ملک کے محسنوں کو بُھلا کر ایسے لوگوں نے میدانِ سیاست میں آ کر اپنی چودھراہٹ قائم کر لی ہے جو مذہب کی آڑ میں کھوکھلے نعروں سے اس ملک کے عوام میں مقبولیت چاہتے تھے اور اس میں انھیں طاقت وقوت یقیناً ایسے لوگوں سے بھی ملی جو اپنے بھاری بھرکم وجود سے کانگریس کے اندر براجمان تھے لیکن ان کا دل مخصوص فرقہ پرستی کا طرفدار و ہمدرد تھا، سیکولرزم انکے دل کے کسی گوشہ میں بھی جگہ نہ پائے ہوئے تھا چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک مسجد آناً فاناً جنم بھومی میں تبدیل ہوگئی اور اس کے اندر ہی اندر گُپ چُپ عرصۂ دراز تک ایک پودے کی طرح پرورش کی گئی اور جب اسے ''پھل'' دینے کے قابل سمجھا گیا تو اسے انتخاب کے بازار میں 'حصولِ ووٹ'' کے لیے لے آیا گیا۔ یہ کانگریس کے منہ پر زبردست کلنک ہے جس پر ان کانگریسیوں کو دکھ ہے جنھوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ملک وقوم کے لیے واقعی مخلصانہ قربانیاں دی ہیں۔ آج کانگریس واقعی بہی خواہوں کی جگہ آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔

بہرحال راجیو گاندھی کا حادثۂ قتل بہت ہی افسوسناک ہے ملک وقوم کا ہیرو ملک وقوم کے مفاد پر قربان ہوگیا۔ یہ ملک کا سپوت اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو سیکولرزم کی آن وشان میں یقین رکھتا تھا۔ ملک وقوم کو سالہا سال اس صدمہ سے چھٹکارا نصیب نہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل کا ایک محرک وہ بھی ذمہ دار ہے جس کی نہرو وگاندھی خاندان سے ازلی دشمنی ہے۔ ایک مخصوص فرقہ پرست پارٹی (جو وقتاً فوقتاً اپنے نام بھی بدلتی رہتی ہے) نے اپنی بدنام زمانہ رتھ یاترا کے ساتھ زہریلا وجارحانہ پروپیگنڈہ کچھ کیسٹوں میں جاری کیا ہوا تھا۔ اسی فرقہ پرست پارٹیوں کی دوسادھوی عورتوں نے بے لگام شرانگیز باتوں سے ہندوستانی سماج کو پراگندہ بنانے کا ذمہ اوڑ لے رکھا تھا۔ اسی فرقہ پرست جماعت کی دوسری معاون فرقہ پرست پریشد نے (اخبارات کی اطلاع کے مطابق) اپنے کیسٹوں میں راجیو گاندھی کو ہتھوڑے سے مندر کو توڑتے ہوئے پیش کیا۔ جب انتخاب اس طرح کے زہریلے ونفرت انگریز پروپیگنڈہ کے ساتھ لڑے جائیں گے تو پھر اس قسم کے تشدّد کے امکان کو خارج کرنا ہی کم عقلی کی بات ہے۔ تحقیقاتی کمیشن کو راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل کے دوران میں ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر بھی اپنی تفتیش کو بڑھانا چاہیے کیونکہ راجیو گاندھی کے نہ ہونے سے فرقہ پرست طاقتوں کو ہی تقویت ملے گی۔ ملک کے امن پسند اور سیکولر نظریات کے حامل عوام کو راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل سے جو زبردست دھچکا لگا ہے وہ بیان وقلم کی زد سے باہر ہے۔ [مئی ۱۹۹۱ء]

ناز انصاری، غفار احمد

آہ! ناز انصاری

کچھ ہستیاں، جنھیں ہم مسلسل دیکھتے رہے ہیں، لازوال معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ بھی فنا پذیر ہیں اور ایک دن ان کی موت کا غم سہنا ہوگا۔ اس دنیا کی ہر چیز فنا پذیر ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کو ہمہ وقت پیش نظر رکھے تو شاید موت کا غم آسان ہوجائے۔

سرکردہ جرنلسٹ غفار احمد ناز انصاریؔ بھی ان ہی ہستیوں میں سے تھے جن کے بارے میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ایک دن ہم سے جدا ہوجائیں گے لیکن ''کُل من علیھا فان'' کے مصداق اس دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے۔ حج کے دوران میں میدان عرفات میں ناز انصاریؔ کی رحلت کی خبر بذریعہ فون یہاں دہلی میں اہل خانہ کو ملی۔ اہل خانہ سے حکومت سعودی عرب نے تدفین کے متعلق پوچھا تھا۔ اہل خانہ نے وہیں مکہ معظّمہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں تدفین کی اجازت دے دی۔ مرحوم حج پر جانے سے پہلے وصیت بھی کر گئے تھے کہ موت ہوجانے کی صورت میں انہیں وہیں دفن کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کی یہ دعا یا تمنا بھی پوری کردی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ، چار لڑکیاں اور چار داماد ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا

فرمائے۔آمین

اردوصحافت میں نازانصاری کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔عہد جوانی ہی سے انہیں اخبار نویسی کا شوق تھا۔۱۹۴۶ء میں ریلوے کی نوکری چھوڑ کر صحافت میں آئے اورروزانہ اخبار 'انصاری' سے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا،اس کے بعد وہ متعدد روزناموں اورہفت روزہ اخبارات میں کام کرتے رہے۔ الجمعیۃ ،نئی دنیا، پیام مشرق ،مشرقی آواز اور تیج میں باقاعدہ ملازمت کرتے رہے۔الجمعیۃ کے چیف ایڈیٹر کے عہدہ تک پہنچے۔ان کے علاوہ کئی ہفت روزہ اور ماہناموں میں مستقل طور پر کالم لکھتے رہے۔اخیر عمر میں اپنا روزنامہ 'انتباہ' نکالا تھا جوابھی تک جاری ہے۔صحافت میں نازانصاری کی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں۔انہوں نے ایسے وقت میں اپنے قلم سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی جب ہندستان میں ان کا سیاسی اور ملّی وجود ہی خطرہ میں پڑگیا تھا۔۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور میں اور اس کے بعد کی خوف، بے اعتمادی اور مایوسی کی دودہائیوں میں ان کی انقلابی تحریروں نے مسلمانوں کے تن مردہ میں جان ڈالی اورانہیں پھر سے جینے کا حوصلہ دیا۔وہ پکّے نیشنلسٹ تھے اپنے نظریات کے بارے میں انہوں نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔مفکر ملّت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔وہ کسی بھی وقت کسی اہم مسئلہ پرصلاح مشورہ کے لیے ان کی خدمات میں آجایا کرتے تھے۔

ہم دعاکرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں درجات عطا کرے۔آمین۔ [جولائی ۱۹۹۲]

فاروق، میرواعظ مولوی محمد

میرواعظ مولوی محمد فاروق صاحب کی شہادت

میرواعظ مولوی محمد فاروق کچھ سرپھروں کی گولیوں سے چھلنی ہوکر شہید ہوگئے۔اِنّاللِّہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون ط

یہ خبر جیسے ہی عوام تک پہنچی، سب ہی پر سکتہ سا چھا گیا، ہرشخص غم وصدمہ کے سمندر میں ڈوب گیا، کیونکہ میرواعظؒ ایک قابل احترام ہستی کا نام تھا، وہ کشمیری عوام کے ہی محترم رہنما نہ تھے، بلکہ ملّتِ اسلامیہ ہند کے سچے رہنما تھے۔عالم وعابد اورزاہد تھے۔بڑے ہی وضعدار انسان تھے۔ہرشخص سے مروت واخلاق کے ساتھ ملتے تھے۔۱۹۸۶ء میں راقم اپنے رفیق فخرالدین صاحب کے ہمراہ سری نگر گیا تو حضرت میرواعظؒ ہی کے یہاں قیام کیا۔اس دوران میں ان کی میزبانی کے جوہر وآداب کا مشاہدہ تو ہوا ہی، ساتھ ان کی تقویٰ وعبادت سے لبریز زندگی، ان کے اعلیٰ اخلاق وبہترین ومثالی کردار کے جونمونے نظروں کے سامنے آئے اس کے پیش نظر راقم یہ کہے بغیر نہ رہے گا کہ کشمیر میں ان کی شخصیت اسلامی کردار وعمل تقویٰ وریاضت اور ملک وقوم کی ہمدردی ومحبت میں منفرد تھی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ رُوتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے جہاں میں دیدہ ور پیدا

قبلہ ابّاجان حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اوران کے قائم کیے ہوئے ادارہ ندوۃ المصنفین سے جوان کو لگاؤ وعقیدت تھی وہ اظہر من الشّمس ہے،وہ اس ادارہ سے دلی وابستگی کا برملا اظہار کیا کرتے، اس کی امداد واعانت کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ان کی شہادت سے ادارہ ندوہ المصنفین کا ذاتی نقصان ہوا ہے،لیکن اللہ پاک نے ان کو ان کے بہترین عمل وکردار کی بدولت جوشہادت کا مرتبہ دیا ہے اس سے انہیں مقرب الٰہی رحمت خاص اور جنت کا جومژدہ ملا ہے اس پر ہر مسلمان کورشک ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے متعلقین اورہم سب کوصبرجمیل عطا فرمائے،آمین۔ان کے صاحبزادے اوران کی جگہ میرواعظ مولوی عمر فاروق سے ادارہ اظہار تعزیت کرتا ہے۔اوردعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قابل احترام نیک وبرگزیدہ جنت نشین والد میرواعظ مولوی محمد فاروق کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطافرمائے۔ آمین۔ [جون ۱۹۹۰ء]

دریابادی، حکیم عبدالقوی

حکیم عبدالقوی دریابادی

ماہِ اکتوبر ۹۲ء میں ایسی ۳ عالم ہستیاں اس دار فانی سے کوچ کرگئیں جن کا غم و افسوس مدتوں ہوتا رہے گا۔حکیم عبدالقوی دریابادی اورمولانا حامد اللہ الانصاری غازی مختصرسی علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم عبدالقوی دریابادی مولانا عبدالماجد دریا بادی کے بھتیجے اور داماد تھے۔ان میں علم وقابلیت اس قدر تھی کہ ان کی سادگی وقناعت پسندی نے اس کو چھپا رکھا تھا۔مشرقی ومغربی علوم میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔انگریزی زبان میں بے تکلف لکھا کرتے تھے، اردو فارسی اورعربی میں تو ملکہ حاصل تھا ہی۔کتنے ہی اردو اخبارات کے اداریے بغیر نام کے لکھا کرتے تھے۔فاضل طب تھے ایم۔اے کی

ڈگری اعلیٰ نمبروں سے انہوں نے حاصل کی اس کے باوجود کبھی بھی انہوں نے اپنی قابلیت کا رعب یا سکّہ جمانے کی کوشش نہیں کی۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے ان کو قلبی لگاؤ تھا۔ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے جب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی یاد میں مفکّر ملّت شائع کیا گیا تو اس میں حکیم عبدالقوی دریابادی نے خصوصی طور پر اپنا مضمون اشاعت کے لیے ارسال فرمایا۔ ''صدق جدید'' لکھنؤ کو انھوں نے مرحوم دریابادی کے بعد جس طرح جاری رکھا وہ مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی یادگار رہے گا۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ [نومبر ۱۹۹۲ء]

غازی، مولانا حامد اللہ الانصاری

مولانا حامد اللہ الانصاری غازی

مولانا حامد اللہ الانصاری غازی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ایک بلند عالم جید صحافی اور غازی صرف نام ہی کے نہیں کام کے بھی تھے۔ سراپا عمل و جہد کی زندگی بسر کی۔ دارالعلوم دیوبند میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اور پھر اس کے لیے ایک مجاہد بھی ثابت ہوئے۔ کچھ عرصہ ڈابھیل میں بھی دارالعلوم کے ساتھیوں کے ساتھ علم وعمل اور دین کی خدمت انجام دینے میں جٹے رہے۔

حضرت قاری طیب صاحب کے لائق داماد تھے۔ اور قاری طیبؒ کو ان پر ناز تھا۔ ندوۃ المصنفین سے مرحوم حامد الانصاری غازی کا تعلق خاص الخاص رہا ہے۔ ادارہ کی طرف سے ان کی ایک کتاب ''اسلام کا نظامِ حکومت'' شائع ہوکر مقبولیت کا مقام حاصل کرچکی ہے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی شخصیت سے انھیں انتہائی درجہ کی عقیدت وانسیت تھی، دہلی جب بھی آتے تو حضرت مفتی صاحبؒ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا ان کا اوّل کام ہوتا۔ بمبئی میں ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی کتابوں کا تعارف علمی حلقوں میں کراتے رہتے تھے۔

ان کے انتقال سے علمی دنیا میں ایک خلاء سا محسوس ہورہا ہے۔ ان کی اولاد میں لڑکے جلیل القدر عہدوں پر فائز ہیں، ایک سعودی عرب میں کسی اعلیٰ منصب پر اور ایک امریکہ میں کسی اچھے عہدہ پر فائز ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ حامد الانصاری غازی کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی جوار رحمت میں اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ عنایت فرمائے آمین ثم آمین۔

[نومبر ۱۹۹۲ء]

کٹھوری، حکیم الیاس

حکیم الیاس کٹھوری

حکیم الیاس کٹھوری مقیم میرٹھ پچھلے دنوں اچانک انتقال فرماگئے۔ مرحوم بڑے حاذق و فائق طبیب تھے۔ مزاجیہ انداز میں اپنے چاہنے والوں کو ہمیشہ خوش رکھا کرتے تھے۔ قاری محمد طیب اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے خاص شیدائی ومعتقد تھے۔ عالموں سے انھیں زیادہ ہی محبت تھی خلوص کے ساتھ ہمہ وقت ان کی خدمت میں جٹے رہتے۔ نیکی وشرافت کی تصویر تھے۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے خصوصی نمبر ''مفکر ملّت'' میں بھی حکیم الیاس صاحبؒ نے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے سلسلے میں بڑا ہی پراز معلوماتی مضمون برائے اشاعت ارسال فرمایا تھا۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی حامد الانصاری غازی، حکیم عبدالقوی دریابادی اور حکیم الیاس کٹھوری کے انتقال پرملال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام متعلقین کو ان کی وفات کے صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ [نومبر ۱۹۹۲ء]

لانبہ، سردار نرنجن سنگھ

انتقال پرملال

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے انتہائی عقیدت مند سردار نرنجن سنگھ لانبہ ۴ جنوری ۱۹۹۳ء کی علی الصبح کو اچانک انتقال فرماگئے۔ وہ ۸۴ سال کے تھے۔ اور بڑے ہی مخلص اور غریبوں کے ہمدرد وبہی خواہ تھے۔ بہت بڑے کاروباری ہوتے ہوئے بھی بے سہاروں، بیواؤں، یتیموں کی فلاح و بہبودگی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، انسانیت کی خدمت میں ہمیشہ جٹے رہتے تھے۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے جاں نثار وفدائی تھے، ان سے تعلق خصوصی قیام پاکستان سے قبل راولپنڈی ہی سے تھا، برابر خط وکتابت رہتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد مفتی صاحب کی عقیدت ومحبت ہی انہیں دہلی کھینچ لائی تھی۔ تعصّبات و تنگ نظری سے بالکل پاک وصاف تھے، بلا لحاظ مذہب وملّت ضرورت مندوں کی امداد کرتے رہتے تھے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال کی خبر ملتے ہی بلک بلک کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ آج ہمارے مسلمانانِ ہند اور ملک کے اوپر سے سایہ شفقت اٹھ گیا ہے۔ مفتی صاحب کے جنازے میں باوجود سخت بیماری وتکلیف کے جامع مسجد سے مہندیان تک پیدل ہی چلتے رہے، لوگوں نے

ان کے درد کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے انھیں سواری میں بیٹھنے کے لیے کہا تو بولے کہ جس ہستی نے ملک وقوم کی خدمت میں اپنی پوری زندگی قربان کردی اس ہستی کے لیے ہم پیدل بھی نہیں چل سکتے کیا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ لانبہ صاحب قدیم روایات وتہذیب کے امین تھے۔ ان کے انتقال سے ایک خلا سا محسوس ہورہا ہے۔حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے انتقال پر ملال پر ہم سب کو، ان کے متعلقین کو اور ان کے تمام احباب کو صبر جمیل عطا کرے۔آمین

ادارہ ندوۃ المصنفین، رسالہ برہان ان کی اہلیہ ان کے صاحبزادگان کلدیپ، کیول،....

[عمید الرحمٰن عثمانی، جنوری وفروری ۱۹۹۳ء]

نورگت، مولانا غلام محمد

مولانا غلام محمد نورگت

گزشتہ ماہ ہندوستان کی مشہور دینی شخصیت حضرت مولانا غلام محمد نورگت کی وفات سے علمی ودینی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ان کی اچانک وفات کی خبر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں رنج وغم کے ساتھ سنی گئی۔ اِنّاللّٰہِ وَاِنَّااِلَیہِ رَاجِعُوْن۔

ادارہ ندوۃ المصنفین سے مرحوم مولانا غلام محمد نورگت کا تعلق ورابطہ اس کے قیام اول ہی سے تھا۔وہ اس کے نہ صرف لائف ممبر ورکن تھے بلکہ اس کے بانی اور عالم اسلام کی زبردست ہستی مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے خصوصی رفقاء میں تھے۔حضرت مفتی صاحبؒ کے مشوروں وہدایات کے تحت انہوں نے اپنے آبائی وطن گجرات سورت اوراس کے مضافات میں اسلامیات کے فروغ اور مذہبی ودینی تعلیمات کے لیے دینی مدرسوں کے قیام میں بڑھ چڑھ کرحصہ لیا۔کتنے ہی مدارس انہوں نے قائم کیے اور ان کا سنگ بنیاد حضرت قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے دستِ مبارک سے رکھوایا۔علمی ودینی کاموں کو انجام دینے اورانہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ سے برابر صلاح ومشورہ لیتے رہتے، قدم قدم پر مفتی صاحبؒ کی رہنمائی سے استفادہ حاصل کرتے رہتے تھے۔حضرت مفتی صاحبؒ سے حضرت مولانا غلام محمد نورگتؒ کے اس قدر تعلق خصوصی اوران کی بے لوث دینی خدمات سے متاثر ہوکر مشہور علمی ودینی شخصیت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی دامت برکاتہم نے اپنی تصنیف 'حیات عبدالحیؒ' میں خاص طور پر اسے بیان فرمایا ہے۔مفتی صاحبؒ کو وہ اپنا مشفق ومہربان اور بڑے بھائی کی طرح سمجھتے تھے، ان کی ہر بات ماننا وہ باعث سعادت سمجھتے تھے۔حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کی خبر سن کر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے،اس کے بعد جب بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا کہیں ذکر ہوتا تو ان کی یاد کرتے کرتے ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔ ادارہ ندوۃ المصنفین سے انہوں نے آخری دم تک تعلق و رابطہ برقرار رکھا۔مفتی صاحبؒ کی اولاد کو اپنی ہی اولاد کی طرح گردانتے اور سمجھتے تھے___ ہم نے بھی ان میں قبلہ ابّاجان مفکرملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی محبت وشفقت اور انسیت ہی پائی جسے آج ان کی وفات سے ہمیں محروم ہونا پڑرہا ہے___ کیا بتائیں کہ وہ کس قدر مشفق تھے مہربان تھے، کرم فرما تھے، نیک تھے، متقی وپرہیزگار تھے۔پوری ملت اسلامیہ کے لیے ان کے دل میں اتھاہ ہمدردی وچاہت اور درد تھا۔ملّی مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے ان کی وفات سے ادارہ ندوۃ المصنفین خاندان مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور پوری ملّتِ اسلامیہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی روح کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور ہم سب کو ان کے صاحبزادگان وعزیز واقارب متعلقین اور ملّت اسلامیہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔تعزیت خود اپنے آپ سے، خاندان مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے، ملّتِ اسلامیہ سے اوران کے تمام لائق و ہونہار صاحبزادگان سے ہے۔حق مغفرت فرمائے۔ [اپریل ۱۹۹۳ء]

فہمی، مفتی شوکت علی

مفتی شوکت علی فہمی

برہان کے لیے نظرات اورحضرت مولانا غلام محمد نورگت کی وفات پر تعزیتی نوٹ لکھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ ابھی ابھی ٹیلی فون پر یہ منحوس اطلاع ملی کہ بعد نماز مغرب بروز جمعرات ۱۵/اپریل ۹۳ء مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے مدتوں کے ساتھی ورفیق، راقم کے چھوٹے بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی کے خسر وعظیم ادیب و صحافی مغلیہ دورحکومت کے تاریخ داں اوردلّی کی تہذیب وشرافت، نیکی و انسانیت کے آئینہ، وضعداری واخلاق کریمانہ کے پیکر مجسم، رسالہ 'دین ودنیا' کے بانی ومدیر حضرت مفتی شوکت علی فہمی اس دارفانی سے رحلت فرماگئے ہیں۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ خبروفات ہم سب کے لیے زبردست دکھ وغم اورصدمہ کا باعث ہے

کیونکہ قبلہ ابّا جان حضرت مفکرِ ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے انھیں قلبی تعلق تھا اور جب ادارہ ندوۃ المصنفین ۱۹۳۸ء میں قرول باغ میں قائم ہوا تھا تو اس وقت بھی مفتی شوکت علی فہمی سے ان کے روابط تھے جو آخر وقت تک قائم رہے۔ حضرت ابّا جان مفتی صاحب کی وفات کے بعد وہ ہمارے خاندان کے قابلِ احترام بزرگ کی حیثیت سے ہم سب کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابّا جانؒ جب ۱۹۴۷ء کے بعد علاقہ جامع مسجد دہلی میں آکر آباد ہوگئے تو تقریباً روزانہ ہی ملاقات فرماتے تھے۔ دونوں بزرگ آپس میں ایک دوسرے کی رائے ومشورہ کا نہ صرف ادب واحترام کرتے تھے بلکہ ان پر عمل پیرا بھی رہتے تھے۔

مفتی شوکت علی فہمی صاحب بلا کے ذہین تھے۔ 'دین ودنیا' میں ان کے حالات حاضرہ پر ادا ریئے علمی حلقوں میں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ ان کے قلم میں بڑی جان تھی۔ کئی کتابیں انھوں نے رقم فرمائیں جو علمی وادبی حلقوں میں مقبولیت کی سند حاصل کیے ہوئے ہیں۔ بڑے ہی نستعلیق بزرگ تھے۔ نفاست پسند تھے، لباس کے معاملے میں بھی بڑے نفیس تھے، گفتگو میں بڑی ہی بردباری تھی۔ عوام وخواص میں عزت واحترام اور توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملّی مسائل میں ان کے مشورے قابل قدر ہوتے تھے، سیاسیات واخلاقیات اور تاریخ پر انہیں کمال دسترس حاصل تھا۔ اتنی خوبیوں اور اعلیٰ اوصاف کی حامل ہستی آج ہمارے درمیان میں نہ رہی، یہی سوچ وتصوّر کرکے دل ودماغ میں عجیب قسم کی بے چینی سی محسوس ہورہی ہے۔ اب کیا ہوگا۔ ہر اچھی شخصیت ہمارے بیچ میں اٹھتی چلی جارہی ہے جو پھر کبھی دیکھنی ہمیں نصیب نہ ہوگی۔ حضرت مفتی شوکت علی فہمی تاریخ ملتِ اسلامیہ ہند کا اب ایک زریں باب بن کر رہ گئے ہیں۔ مورخ اسلام کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں خاص مقام ومرتبہ عطا فرمائے۔ اور ہم سب کو ان کے صاحبزادگان وصاحبزادیوں ومتعلقین وعزیز واقارب اور تمام متعارف لوگوں کو اس حادثۂ وفات پر صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

[اپریل ۱۹۹۳ء]

نوید عثمانی، مولانا شمس الرحمٰن

آہ! مولانا شمس الرحمٰن نوید عثمانی

۱۷/ ربیع الاوّل ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۶/ اگست ۱۹۹۳ء بروز جمعرات کو نیک و برگزیدہ عالم دین، اسلامی مصنف اور ملّتِ اسلامیہ کے ہمدرد وغم خوار جناب شمس الرحمٰن نوید عثمانی یوپی کے نوابی شہر رامپور میں اچانک انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مولانا شمس الرحمٰن نوید عثمانی حضرت مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے چچیرے چھوٹے بھائی تھے اور راقم الحروف کی والدہ مرحومہ سے بھی ان کی قریبی رشتے داری تھی گویا ان سے راقم کے کئی رشتے تھے۔ وہ راقم کے چچا بھی، بھائی بھی، ماموں بھی اور پھوپھا بھی تھے۔ بڑے ہی جیّد عالم تھے، اسلامی مسائل پر انھیں بلا کا عبور حاصل تھا۔ جدید علوم کے شناسا و ماہر تھے۔ سائنس اور قرآن پر ان کی معرکۃ الآرا کتاب علم داں طبقے میں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی گئی اور پسند کی گئی۔ وید اور قرآن پر بھی انھوں نے ٹھوس علمی کام کیا ہے۔ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے ترجمان ''برہان'' میں ان کے علمی و ادبی وتحقیقی اور پُراز معلومات مضامین ہر خاص و عام سے داد تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ مرحوم نوید عثمانی جماعت اسلامی ہند کے رکن خاص تھے۔

حضرت مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا بڑا ہی ادب واحترام کرتے تھے اور جب حضرت مفتی صاحب کے انتقال کی خبر سنی تو آہ کے ساتھ ان کے منہ سے بے ساختہ جملہ نکلا: ''آج ملّتِ اسلامیہ یتیم ہوگئی''۔ مسلمانانِ ہند کا سچا قائد، رہبر وغم خوار وہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو کہا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اب دیکھنا ملّتِ اسلامیہ ہند کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ان کا یہ اندیشہ وخیال آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال مئی ۱۹۸۴ء میں ہوا اس کے بعد اکتوبر ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی آنجہانی ہوئیں۔ راجیو گاندھی وزیر اعظم ہوئے۔ ان کے دورِ وزارتِ عظمیٰ ۱۹۸۶ء میں بابری مسجد کا تالہ کھلا، اس میں کھلّم کھلا پوجا پاٹ شروع ہوئی اور پھر مسلمانانِ ہندی کے نئے نئے قائدین پیدا ہونا شروع ہوئے، انہوں نے جس طرح مسلمانوں کی قیادت کی اس سے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے مسلمانان ہند کوئی قوم نہیں بلکہ فروخت ہونے والی کوئی شے ہے۔ لیڈری کی دوکانیں سجائی گئیں اور بالآخر اس کا انجام بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں ہوا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے۔

مرحوم جناب شمس الرحمٰن نوید عثمانی برہان کے نظرات بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ قبلہ ابّا جان حضرت مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال کے بعد ان کے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان کے کام کو جس لگن، محنت اور کامیابی کے ساتھ مفتی صاحب کے پروگرام کے مطابق جاری و ساری

رکھا اسے دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتے تھے اور شاباشی کے ساتھ بارگاہِ عالی میں احقر کے لیے دعا گو رہتے تھے۔

گزشتہ جون جولائی ۹۳ء کے نظرات میں جو حاجی احمد اللہ مرحوم کا واقعہ حسب روایت مرحوم احمد اللہ کے صاحبزادہ حشمت اللہ شائع ہوا تھا اسے پڑھ کر تعریفی خط لکھا، کئی کشمیری حضرات کے تعریفی جملے سنائے۔ حاجی احمد اللہ مرحوم کشمیری کے لیے کہا کہ ایسے ہی لوگ اسلام کے مبلغ ہیں جو دین کے ساتھ بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہوئے اللہ کے بندے پر عائد حقوق العباد کو بجا لانے کا حق ادا کرتے ہیں۔

ادارہ ندوۃ المصنفین و ماہانہ ''برہان'' کو مولانا شمس الرحمٰن نوید عثمانی کی ناگہانی وفات پر بڑا دکھ وصدمہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا مرحوم کو بال بال مغفرت فرما کر اپنی جوارِ رحمت میں مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

راقم الحروف ادارہ ندوۃ المصنفین کی طرف سے خود اپنے آپ سے اور متعلقین سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔ بارگاہِ رب العزت میں صبر جمیل کی استدعا ہے۔ [ستمبر ۱۹۹۳ء]

ٹونکی، خلیق

خلیق ٹونکی

خطاطی کی دنیا کے ممتاز وعظیم فنکار جناب خلیق ٹونکی جون ۱۹۹۴ء میں طویل علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم خلیق ٹونکی فن خطاطی میں اعلیٰ شہرت کے مالک تھے اس کے علاوہ مرحوم میں بڑی خوبیاں تھیں، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، منکسر المزاج تھے، اخلاق کریمانہ کے مالک تھے۔ اور مفکر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے شیدائی اور معتقد تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان کے فن کو نکھارنے میں بڑا تعاون کیا۔ ادارہ ندوۃ المصنفین اور اس کے رسالے ''برہان'' ہی سے انہوں نے فنِ کتابت کی ابتداء کی۔ قبلہ مفتی صاحبؒ نے ادارہ ندوۃ المصنفین اور اس کے رسالے ''برہان'' کے لیے کتابت وطباعت میں ہمیشہ ہی اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی لیے انہوں نے ہندوستان کے اعلیٰ فنکاروں کو کھوج کھوج کر چُن چُن کر ادارہ میں جمع کیا۔ جناب آل حسنؒ، جناب محمد یوسفؒ، جناب عبدالقیومؒ اور خلیق ٹونکی کو بحیثیت کاتب کے ادارہ ندوۃ المصنفین میں رکھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خلیق تونکی کتابت کی دنیا میں شہرت کی بلندی پر پہنچے، سرکاری ایوارڈ بھی انھیں حاصل ہوئے، ملک اور بیرونِ ملک میں ان کے ہزاروں شاگرد موجود ہیں۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کی کئی کتابیں ان ہی کی کتابت کی ہوئی ہیں۔ ادارہ کی مشہور کتابیں 'مصباح اللغات' اور 'قصص القرآن' جناب خلیق ٹونکی ہی کی کتابت کی ہوئی ہیں۔

انھیں ہمیشہ ہی اس بات کا اعتراف رہا کہ ان کی کامیابی وشہرت میں بفضلِ خدا حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور ان کے ادارہ ندوۃ المصنفین کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ہی ادارہ ندوۃ المصنفین اور اس کے ڈائرکٹر راقم الحروف عمید الرحمٰن عثمانی سے زندگی کے آخری لمحے تک والہانہ لگاؤ وعقیدت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ ''آمین ثم آمین'' اور ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان ان کی رحلت پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔ [ادارہ، جولائی ۱۹۹۴ء]

دہلوی، سید اخلاق حسین

سید اخلاق حسین دہلوی

شمع اردو کا ایک اور چراغ بُجھ گیا، اردو کے ممتاز اہل قلم اور ادیب ونقاد علامہ سید اخلاق حسین دہلوی اپنی رہائش گاہ لال محل بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں تقریباً چھ ماہ کی علالت سے گذرتے ہوئے اٹھاسی سال کی طبعی عمر میں انتقال فرما کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم انتہائی دیندار اور بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے ان کی سوانح عمری میں یہ مرقوم ہے کہ انہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں ایک تحقیقی کتابچہ ''عشق'' مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد تو ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ کر علمی دینی اور ادبی حلقوں میں داد تحسین حاصل کر گئیں۔ 'ویدک دھرم اور اسلام' ان کی کتاب علمی اور تاریخی دنیا میں بڑی شہرت وسراہت کا باعث بنی۔

حضرت علامہ سید اخلاق حسین دہلوی کو علماء کرام سے بڑی ہی عقیدت تھی، مفکر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے انہیں والہانہ لگاؤ وانسیت اور محبت تھی، اکثر ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر میں مفتی صاحبؒ سے ملاقات کی غرض سے آتے اور بڑی دلجمعی کے ساتھ ان کے خیالات سے استفادہ کرتے، مجاہد ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ سے بھی ان کا خصوصی تعلق وربط تھا۔

دہلی کی تہذیب وتمدن کی نمائندگی کے جیتے جاگتے نمونہ تھے۔آہ !ایسی زندہ دل،متین ومخلص شخصیت بھی اب ہمارے درمیان سے اٹھ گئی:

''اب اسے ڈھونڈ چراغ رخِ زیبا لے کر''

مرحوم علامہ سید اخلاق حسین دہلوی ملّی کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ان کے برادرِ خورد حکیم سید حسین دہلوی جن کا انتقال تقریباً ڈیڑھ دوسال پیشتر اپنے برادرِ کلاں کی حیات میں ہی ہوگیا تھا۔دہلی کی معاشرتی اورادبی زندگی کی جان تھے۔خلوص وایثار کے پیکر مجسم!

اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور متعلقین کوصبر جمیل عطا کرے ۔آمین۔ ادارہ ندوۃ المصنفین حضرت علامہ سید اخلاق حسین دہلوی کے سانحۂ رحلت پرخصوصی طور پر اظہار تعزیت کرتا ہے اور بارگاہِ عالی میں مغفرت کے لیے دعا گو ہے! [اگست۱۹۹۴ء]

مخمور عثمانی

مخمور عثمانی

آہ! دیوبند اور دہلی کی ادبی،علمی اور معاشرتی زندگی میں چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے مخمور عثمانی بھی موت کی آغوش میں چلے گئے۔طویل علالت کے بعد مورخہ ۱۶/جنوری ۱۹۹۵ء کو دہلی میں انتقال فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم عثمانی کا تعلق قبلہ اباجان مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نوراللہ مرقدہ سے نیازمندی کا تھا۔حضرت مفتی صاحبؒ نے ہی دیوبند سے دہلی بلایا،ادارہ ندوۃ المصنفین کے کاموں میں مشغول رکھا اور پھر مرحوم خود اپنی ہی استطاعت وکوششوں کی بدولت روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ماہنامہ جمالستان دہلی اور ماہنامہ آستانہ دہلی سے وابستہ ہوکر ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۳ء تک ہمدرد دواخانہ دہلی کے شعبۂ نشرواشاعت کے انچارج رہے۔تصنیف وتالیف کا شوق تھا''اب کیا ہوگا'' کے عنوان سے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی ان کا شائع ہو چکا ہے۔دہلی سے نورس اور دیوبند سے بشریٰ کے نام سے معیاری رسائل نکالے۔

مرحوم مخمور عثمانی بزرگوں عالموں کے قدردان تھے۔قبلہ اباجان حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے تو دل وجان سے عاشق اور معتقد اور خاندان مفتی صاحبؒ کے شیدائیوں میں تھے۔

احقر سے خصوصی لگاؤ اورانسیت رکھتے تھے موقعہ بہ موقعہ بڑی ہی حوصلہ افزائی کیا کرتے اور جگہ جگہ احقر کی ستائش وتعریف کرتے کہ دیکھو اس لائق فرزند (عمید الرحمٰن عثمانی) نے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی وفات کے بعد جس طرح ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان کو جاری وقائم رکھا ہوا ہے اس سے عقیدت مندانِ مفتی صاحبؒ کو کس قدر اطمینان وراحت اور خوشی حاصل ہورہی ہے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ مرحوم مخمور عثمانی کے پُرخلوص مشوروں اور ہمت افزائی کے کلمات سے احقر کو ہمیشہ قوت وتوانائی فراہم ہوتی رہی۔

اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے آمین۔ان کے صاحبزادگان اور متعلقین کوصبر جمیل عطا کرے آمین۔ادارہ ندوۃ المصنفین ورسالہ برہان مخمور عثمانی کی وفات وحسرت آیات پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔

[فروری ۱۹۹۵ء]

کیرانوی،مولانا وحید الزماں

آہ! مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

ماہ اپریل ۱۹۹۵ء میں نامور علمی وادبی دینی شخصیت حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کی طویل علالت کے باعث انتقال پُرملال کی خبر سے اسلامی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مولانا وحید الزماں کیرانوی کو عربی علوم وفنون میں کمال کا ملکہ حاصل تھا وہ عربی ادب میں اہم مقام کے مالک تھے۔عالمِ عرب ان کی عربی دانی سے حد درجہ متحیّر ومتاثر تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں ان کی خدمات قابل قدر وقابل ستائش رہی ہیں۔حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیبؒ سے خصوصی انسیت رکھتے تھے اور مفکر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے حد درجہ معتقد وقدر شناس تھے۔ان کے انتقال پر دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف دونوں ہی میں غم ورنج کا شدّت سے اظہار کیا گیا۔نماز جنازہ بھی دارالعلوم میں ہی ادا کی گئی۔جوحضرات ان سے کسی بھی وجہ سے اختلاف رکھتے تھے ان کی وفات نے انھیں بھی رلا دیا۔

سعودی عربیہ،کویت ودیگر اسلامی ملکوں میں ان کے انتقال پر اظہار تعزیت کے پیغامات ابھی تک موصول ہورہے ہیں نماز جنازہ میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔

ادارہ ندوۃ المصنفین ورسالہ برہان مرحوم مولانا وحید الزماں کیرانوی کے انتقال پُرملال پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔احقر عمید الرحمان عثمانی بہ نفس نفیس جنازہ میں شریک رہا اور عزیز واقارب سے تعزیت کرتا رہا۔ [اپریل ومئی ۱۹۹۵ء]

عثمانی، شمیم

آہ! شمیم عثمانی!

ایک ہونہار، ایک زندہ دل انسان، ایک مفکّر ومدبّر، ادیب و دانشور، انگریزی زبان کا لیکچرار، اردو زبان کا عوامی جذبات سے مزیّن شاعر، عالموں کا قدردان، عالموں کا چہیتا، نیک دل شمیم عثمانی اپریل ۱۹۹۵ء کو ذیابیطس کے شدید مرض میں مبتلا ہوکر انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اب ایسا کیا بتایا جائے کہ اس نیک دل، ہونہار، قابل ترین، جوان ادیب وشاعر کے کم عمری ہی میں انتقال سے کس قدر رنج ودکھ اور صدمہ ہوا ہے بیان سے باہر ہے، مفکّرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے رشتہ وقربت خاص تھا اور اسی حیثیت سے مفتی صاحب قبلہؒ کی اولاد سے تعلق وربط رکھتے تھے۔

ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان کے سلسلے میں وہ اکثر احقر عمید الرحمٰن عثمانی کے لیے بڑے ہی اچھے تاثرات رکھتے تھے، کہا کرتے تھے کہ میرے لیے اس سے زیادہ مسرت وانبساط کی بات اور کیا ہوگی کہ قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی یادگار کو ان کے لائق فرزند عمید الرحمٰن عثمانی نے قائم کررکھا ہے۔ اگر موت نے مجھے پہلے لبیک کہا تو میں مفتیؒ سے جنّت میں یہ ہی جاکر سب سے پہلے کہوں گا کہ آپ کی یادگار قائم ہے جو ملک وملّت اور علم وادب کی خدمات انجام دے رہی ہے۔ اور عمید الرحمان عثمانی نے آپ کی شمع کو بجھنے نہیں دیا ہے۔

کس قدر خوبیوں کا انسان تھا شمیم عثمانی! جب بھی ملاقات ہوتی یا دفتر برہان میں آتے تو ان کی آمدہی سے بہاریں رقص کرنے لگتیں۔ باتیں ان کی ایسی ہوتیں جس سے احساس ہوتا کہ پھولوں کی بارش ہورہی ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم شمیم عثمانی کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ادارہ برہان وندوۃ المصنفین دہلی شمیم عثمانی کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔ مرحوم کی ایک بیوہ اور ایک لڑکا بعمر ۲۲ سال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے سامان غیب سے مدد فرمائے۔

شمیم عثمانی قبلہ مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے چچیرے بھائی، ہمارے چچا، خالہ زاد بھائی، بہنوئی بھی تھے۔ اور صحافت سے تو رشتہ جگ ظاہر تھا ہی۔

[اپریل ومئی ۱۹۹۵ء]

فاروقی، توفیق

بھائی توفیق فاروقی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے

موت تو سب ہی کو آتی ہے اور آنی ہے ہی، جو چیز پیدا ہوئی ہے اسے فنا بھی ہونا ہے۔ موت بھی آنی ہے۔ لیکن کچھ حضرات کی موت سے ایسا غم وصدمہ اور دکھ ہوتا ہے کہ غم بھلانے سے بھی نہیں بھول پاتا ہے۔

برہان میں وفیات کا صفحہ لکھا جاچکا تھا، شمیم عثمانی اور حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے انتقال کی تعزیتی تحریر سپردِ قلم کی جاچکی تھی کہ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ ''خاتون مشرق'' اور ''گلابی کرن'' کے مدیر جناب توفیق فاروقی مورخہ ۲۴/اپریل ۱۹۹۵ء بروز پیر کو عارضہ قلب میں مبتلا ہوکر انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم توفیق فاروقی مجاہد آزادی مولانا عبداللہ فاروقیؒ کے فرزند اکبر تھے، بڑے ہی ملنسار خلیق ومتواضع اور یوپی ودہلی کی تہذیب ووضعداری کے نقیب و علمبردار تھے۔ انہوں نے ''خاتون مشرق'' اور ''گلابی کرن'' جیسے رسالوں کے ذریعے مشرقی خصوصاً مسلمان خاتون کو نیک وباعمل اور عفت وعصمت کا پیکر بنانے کا بڑا ہی اچھا اور قابل ستائش کام کیا۔

مفکر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ سے مرحوم توفیق فاروقی اور ان کے والد مرحوم مولانا عبداللہ فاروقی نے ہمیشہ رہنمائی حاصل کی۔ احقر عمید الرحمٰن عثمانی سے بڑی محبت وعقیدت رکھتے تھے کہتے تھے کہ بھئی تم تو مجاہد ہو کہ اپنے ابّا جان اور ملّت کے رہبر مفتی صاحب کی یادگار ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان کو قائم رکھا ہوا ہے۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے تمہارا دم بڑا غنیمت ہے۔

ذاتی معاملات میں مفتی صاحب کی وفات کے بعد بڑی مدد کی حمایت کی، بہرحال مرحوم توفیق فاروقی بڑے زندہ دل انسان تھے انہوں نے ادب وصحافت کی خدمت کی، ملک وملّت کی خدمت کی۔ مسلمان عورت کو اسلامی خاتون بنانے کے کاموں کو بڑی اچھی طرح انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے امین۔

ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان کی طرف سے احقر عمید الرحمٰن عثمانی توفیق فاروقی کے انتقال پر خود اپنے، سے ملت اسلامیہ سے، اعزا واقارب اور متعلقین سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

[اپریل ومئی ۱۹۹۵ء]

عثمانی، قاری جلیل الرحمٰن

ایک ولی اللہ کی وفات
قاری جلیل الرحمٰن عثمانی کا انتقال پرملال

دیوبند قصبہ میں جہاں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے علمِ دین کی شعاعیں تمام دنیامیں پھیلائیں اوردارالعلوم جیسا عظیم علمی دینی ادارہ قائم کرکے رہتی دنیا تک دیوبند کا نام روشن کیا وہاں دیوبند قصبہ کوخود اس بات کا شرف و اعزاز حاصل ہے کہ اس کی سرزمین پرایسی ایسی نامور برگزیدہ جلیل القدر ہستیوں نے بھی جنم لیا جن کی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کی بدولت اللہ کے بندوں نے بہت کچھ علم وعمل اورروحانی فیوض وبرکات حاصل کیے۔سرزمین دیوبند میں حضرت مولانا قاری مفتی عزیزالرحمٰن عثمانیؒ کی ہستی ایسی تھی جنہیں لوگ ولی اللہ کہتے تھے۔ان کے عمل وکردار نے کتنے ہی لوگوں کوراہ مستقیم دکھلائی ۔ہزاروں انسانوں نے ان کی پاکیزہ زندگی سے رہنمائی حاصل کی۔دیوبند کے علاوہ ہندوستان اور بیرونِ ممالک کے عوام نے ان کی روحانی ہستی کوسمجھا اور پہچانا۔ قدرتی بات ہے کہ ان کے خاندان میں ان کی روحانی برکت سے ان کی اولاد میں ان کی بہترین واعلیٰ دینی تربیت سے جواولاد پیدا ہوئی اس نے بھی اپنے نیک عمل وکردار کاوہ نقش قائم کیا جوقابل رہنما اصول ہے۔مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ بانی ادارہ ندوۃ المصنفین ورسالہ برہان اورحضرت قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے لائق فرزند تھے۔۱۹۸۴ء میں مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی وفات ہوئی جس سے ملّت اسلامیہ کونا قابل تلافی نقصان پہنچا اوراب یکم ستمبر ۹۵ء کوحضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن عثمانیؒ کے صاحبزادے اور مفکرِملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے اکیلے برادر خوردحضرت قاری جلیل الرحمان عثمانی انتقال فرماگئے ۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم بڑے ہی خوش خلق ملنسار اور باکمال روحانی اوصاف کے حامل انسان تھے۔حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ توچھپے ہوئے ولی تھے۔ان کی خوبیوں وصلاحیتوں کااندازہ بہت کم ہی لوگوں کو ہوا،ان کی شخصیت کی رہنمائی سے جن لوگوں میں صلاحیتیں تھیں انہوں نے بھرپور فائدہ حاصل کیا، ان کی روحانی شخصیت کوجس نے پہچان لیااس نے صحیح معنوں میں اپنی زندگی کوباکمال اوصاف سے بھرلیا۔

مفکرِ ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی وفات سے ہم پریتیمی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھااوراب اپنے محترم چچا حضرت قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ کی وفات سے ہم پرکس قدرغم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے یہ خداہی جانتا ہے۔ان کی وفات کاصدمہ اس قدر ہے کہ قلم ان کی وفات پر یہ تعزیتی نوٹ لکھتے ہوئے کپکپارہا ہے۔کیالکھیں کیانہ لکھیں۔ان کی خوبیاں اچھائیاں اور نیکیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ ان کا تحریری احاطہ کرناہی مشکل محسوس ہورہا ہے ۔انھیں تقریباً ایک ماہ پہلے ہی سے اپنی وفات کا حساس ہوگیا تھا جب ہی تو گھر کے افراد اور ملنے والوں کونصیحتیں و ہدایتیں کرتے رہتے تھے۔خاندانی وگھریلو معاملات میں وصیتیں لکھ رہے تھے۔ ہروقت یادالٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آمین ثم آمین ۔

برہان کے تمام قارئین سے ایصالِ ثواب کے لیے گزارش واستدعا ہے کہ مرحوم حضرت قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ کی مغفرت وثواب کے لیے زیادہ سے زیادہ قرآن خوانی فرمائیں۔یہ وہ چراغ گل ہوگیا جس کی تلافی اب کبھی نہ ہوسکے گی۔ ادارہ ندوۃ المصنفین ورسالہ ''برہان'' کوان کی وفات سے زبردست صدمہ پہنچا ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صبرجمیل عطافرمائے ۔آمین ثم آمین۔

[ستمبر۱۹۹۵ء]

مبارک پوری، قاضی اطہر

قاضی اطہر مبارک پوری

ماہِ صفرالمظفر ۱۴۱۷ھ کے اواخر میں ہندوستان وبیرون ہندوستان کی اہم علمی ومذہبی شخصیت قاضی اطہر مبارک پوری کی وفات سے دل ودماغ ہل کر رہ گیا۔قاضی صاحب مرحوم کی شخصیت کاتصوراتی خاکہ ہروقت نظروں کے سامنے گھوم پھر رہاہے وہ ندوۃ المصنفین دہلی میں تشریف لاتے اوراپنی خداداد قابلیت وافکار سے دفتر میں موجود ہرشخص کومتاثر کردیتے۔

قاضی اطہرمبارک پوری کاقبلہ ابّاجان مفکّر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ سے دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی ہی سے خصوصی تعلق ولگاؤ رہا ہے۔حضرت مفتی صاحبؒ نے ندوۃ المصنفین دہلی میں ان کو بلاکران سے کئی علمی وادبی کتابیں تصنیف کرائیں۔قاضی اطہرمبارک پوری کی تاریخ خلافت عبّاسیہ، تاریخ خلافت راشدہ، تاریخ بنوامّیہ ، دیار یورپ جیسی اہم کتابیں ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی ہی سے شائع ہوئیں اورعلمی حلقے میں قبولیت کا باعث بنی۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستگی سے قاضی اطہر مبارک پوری کی شخصیت علمی وادبی حلقوں خصوصاً عالم اسلام میں خوب خوب متعارف ہوئی۔احقر نے رسالہ ''برہان'' دہلی کے صفحہ اوّل پر قاضی اطہر مبارک پوری کا نام نمایاں طور پر شائع کرانے کا اہتمام رکھا جس سے میرا قاضی صاحب سے لگاؤ وانسیت کا پتہ چلتا ہے۔

قاضی صاحب کی علمی خدمات کے لیے صدر جمہوریہ ہند نے عربی اسکالرشپ کا اعزاز خصوصی بھی دیا۔ بہت ساری خوبیوں، صلاحیتوں، قابلیت کے باوجود قاضی صاحب انکساری کے پیکر مجسم تھے۔مفتی صاحبؒ کے انتقال کے بعد دفتر ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے برابر رابطہ وتعلق قائم رکھا اور راقم عمید الرحمان عثمانی کی موقع بہ موقع تعریف وستائش کرتے رہے۔ جس سے احقر راقم عمید الرحمان عثمانی کے لگن وجذبہ اور حوصلہ میں اضافہ ہی ہوا۔

بہرکیف قاضی اطہر مبارک پوری بڑی نیک وبرگزیدہ شخصیت تھے۔ان کی وفات سے تاریخ کا ایک زریّن علمی باب بند ہوگیا ہے۔اللہ رب العزت کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔آمین!

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی اوراحقر راقم عمید الرحمان عثمانی قاضی اطہر مبارکپوری کے انتقال پُرملال پراظہار تعزیت کرتا ہے۔ اور بارگاہِ عالی میں مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔ [جون وجولائی ۱۹۹۶ء]

والدہ، ڈاکٹر جوہر قاضی

تعزیت

رُکن مجلسِ ادارت اعزازی ماہنامہ برہان ڈاکٹر جوہر قاضی کی والدہ محترمہ ۵/ جولائی ۱۹۹۷ء کو شنبہ کی صبح مختصر علالت کے بعد دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر انتقال کرگئیں۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ کی عمر تقریباً پچھتر سال تھی۔ وہ ایک دین دار خاتون تھیں۔ان کی وفات بلاشبہ ڈاکٹر جوہر قاضی، اہل خاندان اوران کے رفیق سفر جناب حکیم قاضی محمد یٰسین عالم صاحب مدیر اعلیٰ ماہنامہ 'راحت وصحت' کے لیے ایک عظیم صدمہ ہے۔ میں اپنی طرف سے اور کارکنانِ ادارہ کی طرف سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

ہم جناب ڈاکٹر جوہر قاضی اوران کے اہل خاندان کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ مجھے بذاتِ خود اس سانحۂ ارتحال سے سخت جھٹکا لگا ہے۔

[عمید الرحمٰن عثمانی، جولائی واگست ۱۹۹۷ء]

فاروقی، مقیم الدین

آہ! مقیم الدین فاروقی

ماہ ستمبر ۱۹۹۷ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سکریٹری جناب مقیم الدین فاروقی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم فاروقی بڑے ہی ملنسار اور ہمدردِ قوم انسان تھے۔مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے زبردست معتقد تھے ان کے پرستار تھے۔یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی میں رہنے کے باوجود انہوں نے کسی بھی مذہب اسلام مغائر حرکت کو نہیں ہونے دیا۔مسلم پرسنل لاء کے معاملے میں ان کے خیالات اپنی پارٹی سے بالکل مختلف تھے اوروہ اس معاملے میں اس آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مؤید تھے جس کے سربراہوں میں حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مفکر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حضرت مولانا امیر شریعت منت اللہ رحمانیؒ جیسے اکابرین کا نام گرامی رہا ہے۔ اور جس کے موجودہ کرتا دھرتا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؔ دامت برکاتہم کا اسم مبارک نمایاں ہے۔ایم فاروقی بیشک کامریڈ تھے لیکن اندر سے وہ پکّے مسلمان تھے۔ان کا دل ودماغ اسلامی تعلیمات سے منور وسرشار تھا۔غریب پرور اور رحم دل تھے دوسروں کے کام آنا ان کا اصل مقصد تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی لغزشوں کو درگذر فرما کران کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمائے اوران کی مغفرت فرما کر مقامِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اٰمین ثم اٰمین۔ [م۔س۔ب، ستمبر ۱۹۹۷ء]

ڈیانا، لیڈی

لیڈی ڈیانا

جو ملک ابھی کچھ عرصہ تک دنیا کے بہت بڑے حصّے پر حکمراں تھا اور جس ملک کے باشندوں کو اپنے ملک کی تہذیب اورانسانیت پر بڑا فخر وناز تھا اس ملک کی ملکہ ڈائنا اپنے خاوند شہزادہ پرنس چارلس کی اپنے سے بے وفائی اور دوسری بے نکاحی عورتوں کے ساتھ معاشقے سے پریشان ہوکر اس سے علیحدگی وطلاق حاصل کرنے پر بالآخر مجبور ہوئی اور پھر جب اس نے اپنی طلاق کے بعد شہزادی ملکہ نے کسی دوسرے مرد سے عشق کی پینگیں بڑھائیں تو وہ کسی کار حادثہ شکار ہوکر ملک الموت کے آغوش میں جا پہنچی۔ یہ ہے مہذب ملک کے لوگوں کا کردار ...

دوسرے لفظوں میں ماڈرن انسانوں کے کنگ میکرس...مغربی ملکوں کے اخلاق و انسانیت کا حال وخاکہ، جہاں مرد کے لیے کوئی قید ہے کہ وہ کسی سے بھی کوئی تعلق قائم کرے چاہے کسی بھی قسم کا اور نہ ہی عورت کے لیے کوئی پابندی ہے کہ وہ کسی ضابطہ میں مقید ہونے کی تکلیف گوارہ کرے۔ پرنس چارلس اور لیڈی ڈائنا کی شادی ۱۹۸۱ء میں انگلینڈ کے دارالحکومت لندن میں ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں دونوں کے یہاں دو بیٹے ولیم اور ہینری پیدا ہوئے جو اب جوانی کی دہلیز پر چڑھنے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پرنس چارلس ایک خاتون کومیلا پارکر کے عشق میں مبتلا ہوگئے، ان کی رنگ رلیوں کی خبریں جب شہزادی ڈائنا کے کانوں میں پڑیں تو پہلے انھیں ان خبروں پر یقین ہی نہیں آیا مگر جب آئے دن یہ خبریں باوثوق ذرائع سے شہزادی ڈائنا کے کانوں میں چھید ڈالتی رہیں تو پھر اس نے بھی اپنے معاشقے شروع کردیئے اور موت سے دس بارہ دن پہلے ہی شہزادی ڈائنا کی محبت میں پھنسے ہوئے ایک مصری مسلمان ارب پتی مسٹر ڈوڈی الفہد تھے جن کے والد کا مغربی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں ڈیپارٹمینٹل اسٹور ہوٹلس وغیرہ کا کاروبار ہے جن کے یہاں رات بھی دن کی روشنی کے مانند ہے اور جن کا ہر دن ہر رات عشق کی رنگینیوں ہی میں گذرتا۔

ڈائنا الفہد کے عشق میں کیسے مبتلا ہوئیں یہ کہانی بھی دلچسپ ہے۔ محض ۱۹ سال کی عمر میں اس کی پرنس چارلس سے شادی ہوئی، ۲۰ سال کی عمر میں وہ ماں بن گئی۔ ۲۳ سال کی عمر میں اس کا اپنے خاوند پرنس چارلس سے اختلاف ہوگیا جو تقریباً ۱۰ سال چلا۔ ۱۰ سال کوئی کم نہیں ہوتے اس درمیان میں ڈائنا اپنی جوانی کی ایک حد پار کر کے پختگی کی عمر کے قریب پہنچ گئی۔ ۳۳ سال کی عمر میں وہ مطلقہ شہزادی بن گئی اور اس کے بعد اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سنائی دینے لگیں۔ پاکستان آئی تو یہاں اس کے کسی مسلمان ڈاکٹر سے تعلقات کے قصّے چرچا میں ہونے لگے۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کے رہن سہن اور طرز معاشرت کی تعریف کرنی شروع کردی۔ اسلام سے اس کے لگاؤ کے واقعات کئی کئی بار سننے کو ملے اور آخر میں جب اس کی موت ہوئی تو وہ اپنے ایک مسلمان منگیتر ہی کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے محبوب وعاشق اور منگیتر ڈوڈی الفہد پیرس کے اپنے ایک ہوٹل میں کھانا کھا کر کار سے کہیں جارہے تھے کہ کار حادثہ کا شکار ہوئی، ڈائنا اور اس کے عاشق ومحبوب الفہد دونوں ہی موت کے منہ میں جا پھنسے۔ الفہد نے ڈائنا کو بیش قیمت قیمتی تحفے تحائف دیئے اور اسی میں ہیرے کی ایک انتہائی قیمتی انگوٹھی بھی اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اسے پیش کی، اسی طرح شہزادی ڈائنا نے بھی بیش قیمت تحفے دے کر الفہد سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ایک تحفہ پر یہ الفاظ کندہ کرائے: ''شہزادی ڈائنا کی طرف سے محبت کے ساتھ۔'' بہرحال یہ دونوں ہی جواں دل محبت کے اتھاہ نشے کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے دونوں طرف بے قراری تھی محبت کی آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ دونوں ہی کے دل مچل رہے تھے جلد از جلد محبت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کے لیے لیکن موت نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔

۴۱ سالہ مصری ڈوڈی الفہد کی تو اس کے والد الفیض نے بک لینڈس لندن کے قبرستان میں حادثہ کے کچھ گھنٹوں بعد ہی تجہیز وتکفین کردی۔ لیکن تمام دنیا میں سوگواروں کے سیلاب کو دیکھتے ہوئے موت کے چھ دن بعد یعنی ۶/ستمبر کو ایک جھیل میں بنے ٹاپو پر دفنایا گیا جس میں دنیا بھر کے عظیم سیاستدان، حکمران، رہنما شریک ہوئے۔ بی۔ بی۔ سی نے تقریباً ۴۴ زبانوں میں اس کے آخری سفر کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا۔ پورے برطانیہ کے عوام نے آنسوؤں کے ساتھ اس کو رخصت کیا۔ میلوں دور تک اس کے جنازہ کو عوام نے کندھا دیا۔ تقریباً ۶۰ لاکھ انسانوں کا جمِ غفیر اس کے آخری سفر کے وقت دیدار کے لیے موجود تھا۔ کہتے ہیں کہ آج تک اس قدر عوام کا ہجوم کسی جنازہ میں نہیں دیکھا گیا۔ برطانیہ کے عوام کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ وہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ تک پر ڈائنا کی موت کی ذمہ داری کا شک کرنے لگے اور اس کے لیے ان پر نکتہ چینی کی بوچھاڑ کردی۔ اور ہمارے لیے یہ ہی پہلو قابل غور ہے۔ اب بقیہ گفتگو اس پہلو کے پیشِ نظر ہم کرنا چاہیں گے۔

مغربی ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس طرح لیڈران، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اس کے پیش نظر تمام مغربی ممالک میں جس واقعہ میں بھی کسی بھی اسلام یا مسلمان کا کسی طرح نام آجائے تو وہاں کے عوام میں نفرت وغصّہ کا لاوا پھوٹ پڑنا چاہیے نہ کہ وہاں برعکس اس کے دوسرا ہی منظر دیکھنے کو ملے، جس میں ہمدردی ورحم کے جذبات صاف دکھائی دے رہے ہوں۔ شہزادی ڈائنا کی موت نے ہمیں کچھ اس طرح کا احساس کرایا ہے اور اسی طرح کی مغربی دنیا میں تصویر پیش کی ہے شہزادی ڈائنا برطانوی عیسائی شہزادہ پرنس چارلس سے طلاق لینے کے بعد ایک مسلمان کے عشق میں مبتلا ہوئی، سیاستدان اور کلیسا کے پادریوں نے اسے کیسی ہی بُری نظر سے کیوں نہ دیکھا ہو مگر عوام نے اپنے سیاستدان وحکمرانوں اور مذہبی رہنماؤں کے خیالات کے خلاف ہی اپنے خیالات ظاہر کئے جس میں ڈائنا اور

اس کے محبوب الفہد کے ساتھ ہمدردی بھری ہوئی تھی، یہ ایک پہلو ہے جسے مبلغین اسلام اپنے دماغ میں محفوظ رکھیں اس پر اظہار خیال ابھی ذرا ٹھہر کر۔

یہ بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ جس دن تمام دنیا کے اخبارات نے یہ خبر شائع کی کہ شہزادی ڈائنا ڈوڈوی الفہد کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہورہی ہے اس خبر کو پڑھتے ہی ہمارے دماغ میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کیا عیسائی دنیا اور برطانوی حکمراں اس بات کو برداشت کرلیں گے کہ برطانوی تخت پر مستقبل قریب میں جو بادشاہ بیٹھنے والا ہے اس کی ماں کا خاوند ایک مسلمان ہے۔الفہد سے شادی کے بعد ڈائنا کے اولاد ہوئی تو برطانوی بادشاہ کا تیسرا بھائی یا بہن مسلمان ہے۔ہمارا دماغ ان ہی سوالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈائنا اور الفہد کی کار حادثہ میں موت کی خبر آگئی اور اس کے دوسرے دن ہی لیبیا کے کرنل قذافی اور مصر کے ایک مبصر کا یہ تبصرہ بھی نظر سے گذرا کہ شہزادی ڈائنا اور اس کے محبوب الفہد کی موت میں کوئی سازش ہے اور برطانوی حکمرانوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہوتی کہ برطانوی تخت کے وارث کی ماں یا بھائی و بہن مسلمان بھی ہے۔اس میں کہاں تک صداقت کا پہلو ہے اس پر واقعات خود ہی آسانی سے روشنی ڈال رہے ہیں اور ڈالیں گے ہم اور آپ کیوں اس پر مغز پچی کریں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کلیساؤں کا سارا زور مذہب اسلام کی بیخ کنی میں لگا ہوا ہے اور وہ عیسائیت کا بول بالا کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے ہیں اور اس میں چاہے امریکہ ہو یا فرانس یا برطانیہ اسی نظریہ سے اس نے اپنے سب سے بڑے مذہبی دشمن یہود سے ہاتھ ملایا ہوا ہے اور اسرائیل کو جس طرح آگے بڑھانے کی کوششیں جاری ہیں وہ بھی اسی کا ایک حصّہ ہے۔

اب ذرا ہم پھر آرہے ہیں اسی ایک پہلے والے پہلو کی طرف کہ اس قدر ترکیبیں، سازشیں، کوششیں اسلام مخالف ہونے کے باوجود کلیسا اپنے ناپاک خفیہ منصوبوں میں کامیاب نہیں ہونے پارہی ہے۔انھیں نہ تو شرک و بدعت اور مورتی پوجا سے کوئی لینا دینا ہے اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہورہا ہے۔ دور حاضر میں سائنسی ماحول کے انسان کے لیے سب سے زیادہ اپیل کرنے والا مذہب اسلام ہی ہے اور یہ بات بھلا عیسائیت کے مبلغین کیسے برداشت کرسکتے ہیں۔ان کی ہر کوشش اسلام مغائر ہی ہے ہر توڑ اسلام پر ہے لیکن جب وہ اس قدر کوششوں کے بعد نہ کامیاب ہوں تو ان کی جھنجھلاہٹ قابل فہم ہی ہے۔اس موقع پر ہمیں اس بات پر اطمینان ہے کہ تمام دنیا اسلام کی حقانیت کی اندر ہی اندر قائل نظر آرہی ہے۔انھیں کلیساؤں کے اختیارات اور رویئے سے بے انتہا شکایات بھی ہیں۔اس لیے اب ان کے دل و دماغ میں اسلام یا مسلمانوں سے متعلق کوئی نفرت قطعاً نہیں ہے جب ہی تو جن جن جگہوں پر پہلے اسلام اور مسلمانوں کا عروج تھا اور عیسائیوں نے اپنی صلیبی جنگوں کے طفیل اور دیگر سازشوں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کو وہاں سے ختم کرکے عیسائیت کا پوری طرح سے تسلط قائم کردیا تھا وہاں بھی اب مسلمانوں کے حالات بحال ہورہے ہیں مسجدیں اور مکتب قائم ہونے شروع ہوگئے ہیں اور اسلامی معاشرہ کی چہل پہل دکھائی دینے لگی ہے۔نفرت کی جگہ ہمدردی اور تعلقات استوار کرنے بنانے کے جذبہ نے لے لی ہے۔شہزادی ڈائنا کی موت کے بعد اس سے پیدا ہوئی عیسائی عوام کی بے پناہ ہمدردی اس کا سب سے بڑا خوش آئند نظارہ ہے جس کو مبلغین اسلام اپنے لیے نیک شگون سمجھتے ہوئے عیسائیت و چرچ اور پادریوں سے بیزار عوام الناس کی طرف پورے ساز و سامان کے ساتھ اپنی توجہ مرکوز کردینی چاہیے اسی میں ملت اسلامیہ کے لیے روشن مستقبل کی خوشخبری پنہاں ہے۔اہل نظر کی نظریں صاف طور پر دیکھ رہی ہیں۔

[ستمبر ۱۹۹۷ء]

ٹریسا، مدر

مدر ٹریسا

مدر ٹریسا بھی ۵/ستمبر ۱۹۹۷ء بروز جمعہ کو انتقال کرگئیں۔ان کے انتقال سے عیسائی دنیا کو بڑا گہرا دھچکا لگا ہے۔کہنے کو وہ ایک ہمدرد، غمگسار انسانیت تھیں لیکن ان کی تمام خدمات بباطن عیسائیت کی تبلیغ و نشر و اشاعت کی معین تھیں اسی وجہ سے انھیں نوبل انعام سے بھی نوازا گیا اور نوبل انعام انھیں کیوں نہ ملتا جبکہ اس کے دینے والے عیسائی مذہب کے پیروکار ہی ہیں۔ہم مسلمانوں کے لیے ان کی شخصیت میں جو دیکھنے کی بات ہے وہ ہے ایمانداری، شرافت جذبۂ خدمت خلق، قربانی، ایثار ہے۔اپنے مذہب کی تبلیغ انھوں نے اسی جذبہ و ایثار اور قربانی کے ساتھ خدمت خلق کے راستے سے کی جو ایک سعی میں شامل ہے۔اپنا بچپن، اپنی جوانی، اپنی رشتہ داری عزیز داری سب کچھ اس ایثار کی تیئں خاتون نے اپنے مذہب کے لیے نچھاور کردیا۔۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئی یہ خاتون ۱۹۲۸ء میں مکمل طور پر اپنے آپ کو خدمت خلق و انسانیت کے راستے سے اپنے مذہب کے سپرد کرچکی تھی۔اپنی تمام خواہشات اپنی تمام تمنائیں اس نیک خاتون نے اپنے مذہب کو دے دیں۔یہ بہت بڑا مجاہدہ ہے اس خاتون کا، اپنے مذہب پر سچے دل سے

قربانی نے انھیں ہماری طرف سے خراج عقیدت کا مستحق بنادیا ہے۔
[ستمبر ۱۹۹۷ء]

بجنوری، مولانا احمد رضا

حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کی وفات حسرت آیات

دینی ومذہبی اور علمی دنیا کا ایک اور چراغ بجھ گیا۔حضرت مولانا احمد رضا بجنوری ۹۴ سال کی عمر میں مختصر سی علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۲ رجنوری ۱۹۹۸ء کو حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کا انتقال ہوا۔جیسے ہی یہ خبر دفتر برہان میں پہنچی سب ہی رنج وغم میں ڈوب گئے۔کیونکہ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کا تعلق، واسطہ اور رابطہ ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان سے روز اول ہی سے رہا۔ادارہ کے بانی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے حضرت مولانا کا بھائیوں سے بھی بڑھ کر قلبی تعلق رہا۔ایک تو ہم سبق ہونے کی وجہ سے اور دوسرے استاد محترم حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے چونکہ مولانا احمد رضا داماد تھے اس لیے استاد کے داماد ظاہر ہے بھائی اور بہنوئی ٹھہرے۔

اسی وجہ سے حضرت مفتی صاحبؒ مولانا احمد رضا کو بہت ہی چاہتے تھے ان سے قلبی محبت اور لگاؤ رکھتے تھے۔اور اسی رشتہ سے حضرت مولانا احمد رضا بھی حضرت مفتی صاحبؒ کو بڑے بھائی کی حیثیت سے سمجھتے تھے۔ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کو اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا احمد رضا بجنوری عربی زبان کے زبردست عالم تھے۔عربی پر خداداد عبور حاصل تھا اور اسی طرح اردو زبان پر بھی انہیں ملکہ حاصل تھا۔ان کی عربی زبان اور اردو زبان میں زبردست تصانیف ہیں۔ان کی مشہور ومعروف کتاب 'انوار الباری' (کئی ضخیم جلدوں میں) اعلیٰ درجہ کی علمی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ انہوں نے بلند پایہ تصانیف قلم بند کی ہیں۔جسے زبردست علمی ذخیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔آمین۔ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کے انتقال پُر ملال پر اظہار تعزیت کرتا ہے اور بارگاہ عالی میں دعا گو ہے کہ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کی مغفرت فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔آمین! ثم آمین۔

حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کے پانچ صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں جو ماشاءاللہ حیات ہیں اور دین ومذہب اور ملت اسلامیہ کی مختلف راہوں سے خدمت میں مصروف عمل ہیں۔ [مارچ ۱۹۹۸ء]

سعید، حکیم محمد

حکیم محمد سعید دہلوی آف ہمدرد دواخانہ پاکستان کی شہادت

کس قدر ظالم ہاتھ تھے اور کس قدر درندہ صفت دل کا وہ انسان نہیں حیوان رہا ہوگا جس نے فرشتہ صفت ہستی، غریب انسانوں کا مسیحا، ملک وملت کا خیرخواہ، پوری انسانیت کی فلاح وبہبودگی چاہنے والا، شرافت کا پیکر مجسم، حکیم محمد سعید دہلوی پر گولیاں چلا کر آن کی آن میں ان کو شہید کردیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جیسے ہی یہ خبر عوام الناس تک پہنچی کہ کراچی پاکستان میں ہمدرد دواخانہ کے مطب سے فراغت کے بعد جب حکیم محمد سعید دہلوی اپنی کار میں بیٹھنے لگے تو کچھ نامعلوم درندوں نے ان پر اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کردیں جس سے وہ ان کا ڈرائیور اور تین ان کے ہمراہ اصحاب موقع پر جاں بحق ہوگئے۔غم وصدمہ میں ڈوب گئے۔ اور ان سب کے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی کہ ہائیں یہ کیا ہوگیا، کیا شرافت وانسانیت کا بھی قتل ہونا شروع ہوگیا ہے۔حکیم محمد سعید دہلوی شرافت انسانیت کی جیتی جاگتی تصویر تھے، وہ بڑے وضعدار انسان تھے انہوں نے دوسروں کے آرام کے لیے اپنا آرام چھوڑ دیا تھا۔ان کا مقصدِ حیات صرف اور صرف بنی نوع آدم کی خدمت کرنا تھا اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہ انسانیت کی فلاح وبہبودگی کے کاموں ہی میں اپنے کو لگائے ہوئے تھے۔

تقسیم سے پہلے وہ اور ان کے برادر معظم ملک وملت کی نادرِ روزگار ہستی حکیم عبدالحمید دہلوی حفظہ اللہ تعالیٰ متحدہ ہندوستان میں اپنے عظیم الشان کارناموں کی بدولت مشعل راہ تھے۔ مجھے ان کی وہ صحبتیں یاد ہیں جب قبلہ ابّا جان حضرت مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ اور ان کے مخصوص احباب حضرت قاضی سجاد حسینؒ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مجاہد ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہم کی قربت میں حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی اور ان کے برادرِ خورد حکیم محمد سعید دہلوی بڑے سے بڑے مسائل پر تبادلۂ خیال کرکے ان کے حل وتدارک کے لیے مستعد عمل ہوجایا کرتے تھے، بلا کی ذہانت تھی اور حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی وحکیم محمد سعید دہلوی دونوں بھائیوں کی محبت اتفاق واتحاد ضرب المثل تھا،

ملک وملّت کی فلاح و بہبودگی سے متعلق کوئی بھی کام ہوتا تو اس کی ذمہ داری یہ دونوں بھائی اپنے کاندھوں پر اٹھانا باعثِ فخر سمجھتے۔تقسیم ملک کے بعد حکیم عبدالحمید دہلوی نے ہندوستان میں رہ کر ملک وملّت کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا تو حکیم محمد سعید دہلوی نے ہجرت جیسی سخت ترین مصیبت کو ہنسی خوشی جھیلتے ہوئے انسانیت کی فلاح وترقی کے لیے پاکستان کی سرزمین میں کام کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں بڑے سے بڑے ارب پتی نے بھی انسانیت کی فلاح کے لیے وہ عظیم کام نہ کیا ہوگا جو بے سروسامانی کی حالت میں اکیلے دم پر حکیم محمد سعید دہلوی نے انجام دے دیا۔کالج، اسکول، اسپتال سے لیکر چھوٹے بڑے تمام وہ کام انجام دے دیے جو انسانیت کی بقا، ترقی اور ضرورت کے لیے ہوتے ہیں۔ بلکہ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ حکیم محمد سعید دہلوی نے پاکستان میں انسانیت کے لیے ایسے بہت سے عظیم کام انجام دیئے ہیں جس کو انجام دینے کے لیے حکومتِ پاکستان بھی اپنے کو بے بس سمجھتی رہی۔

جب مجھے ان کی شہادت کی خبر ملی تو میں خود دم بخود ہوکر رہ گیا دل ودماغ کو ایک زبردست ناقابل برداشت جھٹکا لگا۔اور صدمے سے تمام جسم کی وہ حالت ہوگئی کہ جو بیان سے باہر ہے۔اللہ تعالیٰ مرحوم حکیم محمد سعید دہلوی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اوران کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔خصوصیت سے دعا ہے کہ ان کے برادرِ معظم حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کو اس عظیم حادثہ وفات پر پہاڑ جیسا غم جھیلنے کی توفیق بخشے۔آمین ثم آمین۔ [اکتوبر ۱۹۹۸ء]

دہلوی، حکیم عبدالحمید

آہ! حکیم عبدالحمید دہلوی

موت ہر جاندار کے لیے مقدر ہے جو دنیا میں پیدا ہوا ہے اسے ایک دن جانا بھی ہے۔موت کسی کو نہیں چھوڑتی چاہے وہ پیغمبر وولی ہی کیوں نہ ہو۔لیکن بعض شخصیتوں کی موت کو ایک شخصیت کی موت کہہ کر اور اس پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر اسے بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ان کی موت سے ایک عالم کو رنج وغم اور دکھ وصدمہ کے ساتھ ناقابل تلافی نقصان بھی ہوتا ہے۔حکیم عبدالحمید دہلوی کا شمار ایسی شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کی وفات سے ان کے خاندان کے افراد کو صدمہ ورنج تو ہے ہی پوری قوم کو پوری ملت کو ان کی وفات کی خبر سن کر رنج وغم اور دکھ وصدمہ کے ساتھ ساتھ ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنی پوری زندگی ملک وقوم کی بے لوث خدمت کے لیے صرف کی ہے۔وہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم وملک کے لیے جیتے تھے۔انہوں نے تو اپنی زندگی قوم وملک اور انسانیت کی خدمت اور فلاح وبہبودگی کے لیے وقف کردی تھی۔ ان کے دل میں غریبوں کے لیے تڑپ تھی ہمدردی تھی۔۱۹۶۴ء میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے اخبار ''صدق جدید'' لکھنؤ میں ایک دہلوی صحافی نے حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور ملک وقوم [کے لیے] ان کی بے لوث خدمات پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں حکیم عبدالحمید کو ولی کامل کہا گیا تھا۔

ایک وقت تھا جب حکیم عبدالحمید صاحب پابندی سے ہر جمعہ کو دفتر ندوۃ المصنفین میں تشریف لاتے تھے اور حضرت قبلہ ابا جان مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، قاضی سجاد حسین صاحب اور سعید احمد اکبر آبادی کے ساتھ رائے ومشورہ کرتے تھے۔ہماری والدہ مرحومہ ہر جمعہ کا انتظار کرتی تھیں کہ ان رہنمایان ملت کے لیے اپنے ہاتھ سے کھانے تیار کرتی تھیں اور ہر اتوار کو حکیم صاحب گاڑی بھیج کر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن، قاضی سجاد حسین اور سعید احمد اکبر آبادی کو کوٹلیا مارگ نئی دہلی میں واقع اپنی کوٹھی پر ضروری مشورے کے لیے بلایا کرتے تھے۔اتوار کو ان علماء کرام کا رات کا کھانا حکیم صاحب ہی کے ساتھ ان کی کوٹھی پر ہوتا تھا۔یہ مشورہ ہی کی برکت تھی کہ حکیم صاحب نے تغلق آباد میں جہاں اس وقت آبادی کا نام ونشان نہ تھا ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا بنجر زمین تھی ہزاروں گز زمین خریدی آج وہاں عالیشان ہمدرد نگر آباد ہے جس میں اسکول سے لے کر ہمدرد یونیورسٹی مجید یہ ہاسپٹل وغیرہ وغیرہ قائم ہے۔ ہزاروں چنے ہوئے اعلیٰ دماغ کی قابل ہستیاں براجمان ہیں جو ملت کی خیرخواہی کے پلان پر عمل پیرا ہیں۔

حکیم عبدالحمید نے ملک وقوم کے لیے وہ عظیم الشان کام کیا ہے جس پر ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابیں لکھی جائیں گی ان کی خدمت پر مورخین ریسرچ کریں گے اور انہیں بیسویں صدی کا انسانیت کا مسیحا کہا جائے گا۔ وہ ہر حال میں قناعت پسندی کرتے تھے اپنے اوپر کچھ خرچ نہ کرتے تھے، ان کی کمائی قوم کے کاموں کے لیے فراخ دلی کے ساتھ خرچ ہوتی تھی۔ بہرحال ملت کا یہ محسن آج ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے۔ادارہ ندوۃ المصنفین حکیم عبدالحمید کے انتقال کو اپنا ذاتی اور ملک وملت کا عظیم نقصان تصور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم عبدالحمید صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین

[جولائی، اگست ۱۹۹۹ء]

عثمانی، نجیب الرحمان

آہ! ہمارا چھوٹا بھائی

نجیب الرحمان عثمانی کا انتقال پر ملال

دل ودماغ رنج وغم اورصدمہ میں ڈوبا ہوا، ہاتھ کانپ رہا ہے، قلم لرز رہا ہے یہ لکھتے ہوئے کہ میرا پیارا لاڈلا چھوٹا بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی اس دنیا میں نہیں رہا موت کے ظالم ہاتھوں نے اس کی روح قبض کرلی ہے اور وہ زندگی سے لڑتا ہوا بالآخر موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سوگیا ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب کیا لکھوں کیا نہ لکھوں طبیعت سخت پریشان ہے اور گہرے رنج میں ڈوبی ہوئی ہے کہ میرا چھوٹا بھائی کس طرح مسلسل دوسال تک بستر علالت پر اور تقریباً ۸ ماہ تک ڈائیلاسسز پر موت وزندگی کی کشمکش میں مبتلا رہا اور پھر ۲۷/ ستمبر ۱۹۹۹ء کی شب کو ہم کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر اس دنیا سے اس دنیا میں چلا گیا۔ہر زندگی کے لیے موت مقدر ہے کسی کو آگے جانا ہے اور کوئی پیچھے چلا جاتا ہے جانا سب ہی کو ہے مگر بہت سی موتیں زندوں کے لیے ہمیشہ کے لیے رنج وصدمہ کا باعث بن جاتی ہیں۔برادرخورد نجیب الرحمان عثمانی ہم سب کا پیارا تھا، چہیتا تھا، ماں باپ کا تو تھا ہی لاڈلا، ماں باپ کے بعد ہم سب نے اس کی محبت اپنے سینوں میں بٹھالی تھی وہ ہماری آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔ یہ کیا خبر تھی کہ موت اسے اس قدر جلد ہم سے چھین لے جائی گی کہ ہم دیکھتے رہ جائیں گے روتے بلکتے ہوئے اس کی موت کے صدمہ سے بلبلا کر چیخ پڑیں گے۔

نجیب الرحمان عثمانی عرف بڑے میاں قبلہ ابا جان حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے سب سے چھوٹے اورلاڈلے بیٹے تھے اللہ پاک نے خوبصورت بنایا تھا ماں کا بھی چہیتا تھا اور پھر اس کے ظاہری حسن کے ساتھ باطن میں خوبیاں ہی خوبیاں بھر رکھی تھیں۔عجز وانکساری میں اپنے قابل احترام باپ ہی کی طرح تھے۔علم وقابلیت میں نمایاں جوہر تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے نمایاں نمبروں کے ساتھ ایم۔اے پاس کیا تھا۔اخلاق وانسانیت ہمدردی ملت جیسے اعلیٰ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔شعائر اسلام صوم وصلوٰۃ کے سخت ترین پابند تھے۔ اتنی ساری خوبیوں کے ساتھ غرور وتکبر نام کا بھی ان میں نہ تھا۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے ان کے لیے رشتہ زوجیت بھی بڑی تلاش وجدوجہد اور چھان بین کے بعد علمی دنیا کے نامور ثقہ عالم وادیب، مفکر ومدبر، بہترین انشاء پرداز، ملت اسلامیہ کے مشہور ومعروف راہنما وقائد، ملک کی قابل احترام شخصیت اور 'دین ودنیا' کے مدیر شہیر حضرت مفتی شوکت علی فہمیؒ کی صاحبزادی سے طے کرکے قلبی طمانیت وخوشی حاصل کی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے نجیب الرحمان عثمانی کی زوجہ زرینہ رحمان کو ان کے زمانۂ علالت میں جس طرح خدمت وتیمارداری کی سعادت عطا فرمائی ہے ایسی سعادت کسی کو کم ہی نصیب ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیک عفت زرینہ رحمان زوجہ نجیب الرحمان عثمانی کو ان کے شوہر کی بے پناہ خدمت کرنے کا بہترین اجروصلہ عطا کرے اور انہیں اپنے شوہر کے غم کو برداشت وصبر کی توفیق عطا کرے۔

اس وقت خاندان کے تمام ہی افراد بھائی نجیب الرحمان عثمانی کی وفات کے صدمے سے بے حال ہیں کیا بتائیں ان کی خوبیاں یادکرکر کے دل ودماغ کو کس طرح تڑپا رہی ہیں۔کسی کروٹ چین ہی نصیب نہیں ہورہا ہے غم ہلکا کیا جائے تو کس طرح کیا جائے۔ایسا پیارا بھائی کس کو نصیب ہوتا ہے، ہمارا نصیب اچھا تھا کہ ہمیں نجیب الرحمان عثمانی جیسا پیارا بھائی ملا مگر اب یہ بھائی ہم سے بچھڑ گیا ہے موت کی آغوش میں چلا گیا ہے تو دل کو کس طرح ڈھارس دیں کس طرح تسلی دیں وہ کون سے الفاظ ہیں جو یادکرکے اپنے اس پیارے بھائی نجیب الرحمان عثمانی کی موت پر صبر کرلیں۔نہیں ہورہا ہے صبر اللہ ہی سے دعا ہے کہ ہمارے دل ودماغ کو کسی طرح صبر کرادے ایسا پیارا بھائی اب دیکھنے کو نہیں ملے گا یہ سوچ کر ہی دم نکلا جارہا ہے۔

یاالٰہی! تو بڑا رحیم وکریم ہے۔ ہمارے بھائی نجیب الرحمان عثمانی نے دنیا میں تیرا حکم ہرحال میں مانا ہے تیری رضا ہی میں اس نے اپنی رضا سمجھی ہے یاپروردگار عالم! میت جنازہ میں شریک ہر مومن کے دل کی آواز تھی کہ یہ جنتی ہے 'آواز خلق کو نقارہ خدا سمجھو' اس لیے یقین ہے کہ نجیب الرحمان عثمانی کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور رحم سے جنت الفردوس نصیب ہوگی۔

ادارہ ''برہان'' اپنے قارئین کرام سے گزارش کرتا ہے کہ مرحوم نجیب الرحمان عثمانی کے ایصال ثواب کے لیے گھروں میں اسلامی درسگاہوں میں قرآن خوانی کا اہتمام فرمائیں اور مغفرت کے لیے دعاگو رہیں۔اس کے لیے ہم تمام حضرات کے ذاتی طور پر شکرگزار رہیں گے۔انشاء اللہ!

[ستمبر واکتوبر ۱۹۹۹ء]

نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کا انتقال

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے جن کا علمی واسطہ ورابطہ تھا وہ رفتہ رفتہ اب اس دنیا سے اٹھتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے علمی میدان میں ایک خلا سامحسوس ہورہاہے۔ایک کے بعد ایک علمی ہستی اس دنیا سے اٹھتی جارہی ہے اور ہم کو رنج و غم کے صدمہ میں مبتلا کرتی جارہی ہے۔ایسی ہی ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی ہے جو ماہ اگست ۱۹۹۹ء کے آخر عشرہ میں کراچی پاکستان میں موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوگئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم مولانا عبدالرشید نعمانی کا بانی ندوۃ المصنفین دہلی حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے خصوصی تعلق تھا،حضرت قبلہ مفتی صاحب نے ان کی علمی صلاحیتوں کو پہچان کران سے کتاب 'لغات القرآن' لکھوائی جومفید قرآنی خدمت ہے یہ حروف معجم پرمرتب کی گئی ہے اور چھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ شروع کی چارجلدیں جوالف سے شروع ہوکر ع پرختم ہوئی ہے مولانا نعمانی کی محنت وریاضت کاثمرہ ہیں۔اس کی پہلی جلد کے شروع میں مولانا نعمانی مرحوم کا بیش قیمت معلوماتی مقدمہ ہے جس میں کتاب کی نوعیت اوراس کی ترتیب میں ملحوظ رکھے جانے والے امور کے علاوہ اپنی محنت وجاں فشانی وغیرہ کا بھی ذکر کیاہے۔اس کو بڑے اہتمام سے حضرت مفتی صاحبؒ کی نگرانی میں ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی طرف سے شائع کیا گیا۔باقی دوجلدیں مرحوم کی عدم فرصت کی وجہ سے حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالیؒ نے مرتب فرمائیں۔جب بھی مرحوم دہلی میں قیام فرماتے رسالہ ''برہان'' کے لیے علمی مضامین لکھتے جو برہان میں شائع ہو کرعلمی دنیامیں قبولیت کی سند حاصل کرتے۔

مرحوم میں بے پناہ خوبیاں تھیں، پاکستان جاکر بھی ہندوستان کی یادانہیں ستاتی رہتی ان کے انتقال سے ادارہ ''برہان'' کوزبردست صدمہ ہواہے۔اللہ تعالیٰ مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی بال بال مغفرت فرمائے اورکروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔آمین ثم آمین۔

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کے انتقال سے تمام علمی دنیا تعزیت کی مستحق ہے۔ادارہ برہان اظہارتعزیت کرتاہے اورتمام متعلقین کے لیے صبرجمیل کی بارگاہ عالی میں دعا کرتاہے۔ [ستمبرواکتوبر۱۹۹۹ء]

حسینی، حکیم محمد زماں

حکیم محمد زماں حسینی کا انتقال

یہ کس کومعلوم تھا کہ بیسویں صدی جاتے جاتے بھی امت مسلمہ کوایسا صدمہ دے جائے گی کہ جس سے امت مسلمہ عرصہ درازتک ابھرنہ سکے گی۔عالم دین،مفسرقرآن،مصنفِ اسلام، مدبر ومفکر حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اس عالم فانی سے رخصت ہوکرعالم بقاء میں پہنچ کر مالک حقیقی سے جاملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے انتقال پرملال پرتعزیت پورے عالم اسلام میں کی جائے گی۔اس لیے کہ ان کی شخصیت کے اٹھ جانے سے تمام عالم اسلام کوصدمہ پہنچا ہے،نقصان ہواہے۔ان کی زندگی عالم اسلام کی خدمت کے لیے جیسے وقف تھی۔انہوں نے اپنی تحریروں،تقریروں اورتصانیف کے ذریعہ عالم اسلام کی سچی رہنمائی وخدمت کی ہے۔وہ بے لوث اورمخلص تھے کسی جاہ ومنصب سے بے نیازصرف دین کی خدمت میں ہی ان کوسکون واطمینان اورراحت وخوشی حاصل تھی۔شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔صحیح فکرتھی، سوچ میں سچائی تھی،بلند کردار کے حامل تھے،سادگی رگ وریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی طرح جوش وجذبہ سے طبیعت بھری ہوئی تھی۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی طرح وسیع النظر تھے اورحضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی صحبت ومجلس سے فیض یافتہ تھے۔مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے جاں نثار شیدائی شاگردوں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ان کے علم وفکر کے معترف وشناسا تھے۔ سیرت پاک پرحضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحبؒ کی تقاریر سننے سے تعلق رکھتی تھیں۔ہندوستان کے وزیراعظم راجیو گاندھی سیرت پاک کے جلسے میں ان کی تقریر سننے کے لیے شروع سے آخر تک بیٹھے رہے اوررسول پاک ﷺ کی روزمرہ زندگی کے تمام واقعات،پڑوسیوں سے حسن سلوک،غیرمسلموں سے بہترین برتاؤ،دشمنانِ اسلام سے نبی اکرم ﷺ کاحسن سلوک جیسے موضوع پر مرحوم نے ایسی بصیرت آمیزتقریر کی کہ وزیراعظم راجیو گاندھی اورسیکڑوں غیرمسلم حضرات متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔راجیو گاندھی نے اس تقریر کوسننے کے بعد رسول اکرم ﷺ سے احترام وعقیدت ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ ایسے ایمان افروزواقعات سے روحانی سکون ملتاہے اوراس اعلیٰ درجہ کی تقریر سننے کا یہ پہلاموقع خدانے میسر کیاہے۔

مولانا حکیم محمد زماں حسینی بڑی خوبیوں اچھائیوں کے مالک تھے وہ بہت بڑے انسان تھے مگران میں اپنی بڑائی سننے کی عادت ہی نہیں تھی، وہ اپنے کو کم تر سمجھتے تھے شاید وہ بارگاہ عالیٰ میں یہ دعا کرتے ہوں کہ مجھے اپنی نظر میں اپنے کو حقیر وکم تر بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول کیا ہوگا اوران کو نظر میں اپنے کو کم تر وحقیر ہی بنادیا ہوگا مگر عالم میں ان کا مرتبہ پروردگار عالم نے بہت ہی اونچا وبلند کررکھا تھا۔ان سے ایک بار کا ملنے والا انسان ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہوکر رہ جاتا تھا وہ خود کلکتہ میں رہتے تھے لیکن ان کی اپنی شخصیت کی خوبیاں ملک کے کونے کونے میں ان کے دلوں میں گھر کی ہوئی تھیں۔وہ بڑے مخلص تھے ہرایک کے کام آنا انہیں پسند تھا۔وہ انتہائی خلیق وملنسار تھے ہرانسان سے چھوٹے بڑے سے ان کا میل جول تھا جس میں کبھی بھی انہوں نے اپنے بڑے پن اورعلم کونمایاں نہ ہونے دیا ہمیشہ ہی اپنے اعلیٰ کردار وعمل سے انہوں نے ہرموقع پرانسانیت کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔

ادارہ ندوۃ المصنفین سے حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی کا شروع سے آخر تک تعلق رابطہ رہا۔رسالہ ''برہان'' کے نگران رہے۔حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی وفات کے صدمہ نے انہیں سخت نڈھال کردیا تھا۔ دہلی میں جب بھی تشریف لاتے قیام ادارہ میں رکھتے۔صرف آخری وقت میں ایک دوبار کو چھوڑ کر اوروہ بھی ان کے صاحبزادے کے بے حد اصرار پرشاید کسی ہوٹل میں قیام کیا تھا ورنہ تو ادارہ سے ان کی وابستگی ان کے لیے باعث سکون وعافیت تھی۔ ہمارے خاندان کے معاملات میں بھی ان کے نیک مشورے ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اورکروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی کے انتقال سے علمی دنیا میں ایک خلا ہوگیا ہے جس کا پُر ہونا محال دکھائی دیتا ہے۔ [جنوری،فروری ۲۰۰۰ء]

ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی

آہ! مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

یہ بات کس طرح دل میں اتاری جائے کہ عالم اسلام کی سب سے زیادہ معتبر اورمعروف ومشہور شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں، وہ ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء کوانتقال فرماگئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ بات اب بات نہیں رہی ہے حقیقت ہوچکی ہے اورحقیقت کو کسی بھی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے اور جب یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس دنیا سے ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو ہمارے لیے رونے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں رہا ہے۔رونا اس لیے ہے کہ اس دنیا میں ایک وہ ہی ہستی ایسی بچی تھی جوصرف اورصرف اسلام اورانسانیت کے لیے مستعد عمل تھی۔جس نے اپنی پوری حیات میں اپنے لیے کچھ نہ پاکر پوری انسانیت کے لیے سب کچھ کیا، اپنی تمام تر توانائیوں کو اسلام کی سربلندی اورانسانیت کی بہتری وفلاح کے لیے صرف کیا۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے انتقال کو ہم بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ ہی کہیں گے۔اس پرفتن ماحول میں وہ شرافت میں یکتا تھے، انسانیت میں منفرد تھے، اخلاق وتہذیب اورتمدن عالم انسانیت کے لیے فقید المثال تھے، رواداری ووضعداری میں ان کی زندگی ایک نمونہ تھی،تقویٰ وطہارت میں انہیں امتیازی خصوصیات حاصل تھیں۔ سادگی ان کا اوڑنا بچھونا تھی، دوسروں کے لیے ان کے یہاں سب کچھ تھا ضرورت مندوں،حاجت مندوں کے لیے وہ بادشاہ تھے، لیکن اپنے لیے وہ کچھ نہ تھے انہوں نے اپنی زندگی کو دوسروں کی خدمت، انسانیت کی فلاح اوراسلام مذہب کی آبیاری کے لیے وقف کررکھا تھا۔ وہ اپنے آپ میں ایک انجمن تھے ان میں اسلامی تعلیمات کی صحیح معنوں میں تمام ہی خصوصیات تھیں۔ان کی ہر بات میں اسلامیت جھلکتی تھی۔ وہ دورصحابہؓ کی تمام خصوصیات واچھائیوں اورخوبیوں کے حامل تھے۔

ان کی وفات سے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ انسانیت کی روشنی مدھم ہوگئی ہے۔کس طرح بتائیں کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے انتقال سے کس قدر غم وصدمہ ہوا ہے ان کی ذات میں کسی بھی قسم کی کمی کا کوئی بھی ذرہ نہ تھا۔

مولانا وحید الدین خاں کے بقول:''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات میں یہ تمام حیثیتیں بہ تمام وکمال جمع ہوگئیں تھیں''۔مولانا محمد منظور نعمانی نے ایک بار موصوف کو''رُجل موہوب'' کہا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لیے یہ خطاب لفظ بلفظ درست ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا کارنامۂ حیات تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔وہ اپنی ذات میں ایک متحرک صدی تھے۔صدی کی آخری تاریخ کو یہ متحرک شخصیت خاموش ہوگئی۔وہ انسانیت سے جداہوکر اپنے رب سے جاملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ان کے اندر بیک وقت مختلف اورمتنوع خصوصیات موجود تھیں۔مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جوکام اکادمی کرتی ہے وہ ہمارے یہاں ایک آدمی کرتا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس قول کا ایک زندہ نمونہ تھے وہ ایک فرد تھے مگرانہوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت کو عالم اسلام میں اچھی طرح سمجھا گیا پہچانا گیا، خانۂ کعبہ کی چابی ان کو سونپ کران کی شخصیت میں یقین واعتماد کا اظہار کیا گیا جو اعزاز بادشاہ وقت کو حاصل تھے وہ اعزاز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دے کر دنیائے اسلام میں ان کی بے لوث خدمات کو سراہا گیا۔ وہ عربی کے فاضل تھے، انگریزی زبان کے ماہر تھے، اردو ادب کے مسلمہ ادیب تھے، اس کے علاوہ کئی زبانیں انہیں آتی تھیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو کے قریب ہے جن میں بڑی بڑی مایہ ناز کتابیں ہیں جنہیں عوام الناس میں سراہا گیا۔ عربی زبان جب بولتے تھے تو عرب کے لوگ حیرت واستعجاب کے عالم میں انہیں دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ عربی میں ان کی تصانیف علوم کا خزانہ ہیں جنہیں عرب لوگ پاکر اپنی خوشیاں نہ چھپا پاتے تھے۔ عربوں کو انہوں نے علم وفن سے مالا مال کر دیا جب ہی تو عربوں نے ان کو بڑے بڑے انعام دے کر اپنے کو خوشی ومسرت سے ہمکنار کیا۔ کنگ فیصل ایوارڈ، برونائی اور عرب امارات کے خصوصی ایوارڈ دے کر دراصل عرب دنیا نے اپنے آپ ہی کو دنیا میں نمایاں کیا۔ مولانا موصوف کے لیے یہ ایوارڈ صرف خدمت انسانی کے لیے ہی تھے، ان کی شخصیت ان ایوراڈ سے بے نیاز رہی ان کی شخصیت سے یہ ایوارڈ جب وابستہ ہوئے تو حقیقت میں ان ایوارڈ کی خصوصیت واہمیت میں نمایاں اضافہ ہی ہوا۔ جب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو رابطہ عالم اسلامی کا رکن، رابطہ ادب اسلامی کا صدر اور آکسفورڈ سلامک یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر کا صدر بنایا گیا تو دراصل یہ مولانا موصوف کی شخصیت کی نہیں بلکہ انہوں نے خود اپنے اداروں کی حیثیت نمایاں کی اور جس کی وجہ سے انہیں بے پناہ استفادہ حاصل ہوا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے انتقال سے ادارہ ندوۃ المصنفین ذاتی نقصان محسوس کرتا ہے۔ ادارہ کے تمام کاموں سے وقتاً فوقتاً واقفیت حاصل کرتے رہتے۔ ان کے اکثر خطوط میں ادارہ کے سلسلے میں مشورے ہوتے تھے جو ادارے کے لیے باعث افتخار ہیں۔ حضرت قبلہ ابا جان مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے انہیں والہانہ عقیدت ومحبت اور انسیت تھی۔ ان کی اولاد سے وہ بڑی محبت کرتے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی کے انتقال پر ان کا گرامی نامہ بطور تعزیت کے وصول ہوا جسے پڑھ کر ہم سب خاندان کے افراد کو ڈھارس ملی۔ مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی شخصیت وکارناموں پر ایک عظیم سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت باوجود انتہائی مصروفیت کے انھوں نے بخوشی قبول کی اور سیمینار میں شروع سے آخر تک موجود رہے اور حضرت مفکر ملت کی خدمات اور ان سے اپنے قریبی تعلقات پر سیر حاصل تقریر فرمائی جو ٹیپ کی گئی اور جسے حاصل سیمینار کہا گیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی انہوں نے جس طرح قیادت کی ہے ہر معاملہ میں چاہے وہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذریعے، چاہے ندوۃ العلماء جیسے دینی اور عالمی شہرت کے مالک ادارے کے ذریعے، سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے حق ادا کر دیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے یوپی حکومت کے ایک وزیر کی شرانگیزی اور تعلیمی معاملات میں دخل اندازی اور پرائمری اسکولوں میں وندنا سرسوتی جیسی ایک مخصوص دعا جو ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے کو لازم قرار دینے پر جس طرح ہندوستانی مسلمانوں اور ملک کے سیکولر عوام ولیڈروں کو دکھ وتکلیف پہنچی اور اس پر پورے ہندوستان میں ایک عجیب بحران پیدا ہوگیا تھا اس وقت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جس طرح پورے ہندوستان کے سیکولر عوام کی رہنمائی کی اس سے حکومت کے ارباب حل وعقد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بالآخر حکومت ہند کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری باجپئی کو درمیان میں پڑ کر مداخلت کرنی پڑی اور سرسوتی وندنا جیسی متنازعہ پرارتھنا کو اسکولوں میں پڑھنے کے فیصلے کو واپس لینا پڑا اور صوبائی سرکار کے وزیر تعلیم کو ذلت وخواری نصیب ہوئی۔

مولانا کے صرف ایک ہی بیان نے فرقہ پرست عناصر کی شرانگیز سیاست کی بساط ہی کو الٹ کر رکھ دی۔ بابری مسجد کی تحریک سیاست کے ٹھیکے داروں نے اپنے ہاتھ میں لے کر جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو نقصان پہنچایا اس سے مولانا کو یقیناً دلی کوفت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ بابری مسجد کی تحریک جس طرح چلائی گئی وہ مولانا کے مزاج سے مطابقت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ اسے دیکھ کر تو مولانا کو ذہنی اذیت ہوتی ہوگی، سیاست کے بازی گروں نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ جس سے اس کی واپس ممکن ہی نہیں تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بابری مسجد شہید ہو کر رہی اور اس طرح تمام دنیا نے ہندوستان کے سیکولرزم کے انہدام کو دن کی روشنی میں ہر جگہ دیکھا، دنیا کے تمام انسان ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے اور فرقہ پرستوں کی یلغار سے بابری مسجد کی شہادت کو نہ بچا سکے۔ بہرحال ہم کہاں چلے گئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے انتقال کے صدمہ نے کچھ ایسی تلخ یادوں کو بھی ابھار دیا ہے جس سے یقیناً اس بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت کو دکھ ہوا ہوگا۔ حضرت مولانا موصوف معصوم فطرت انسان تھے ان کا دل صاف تھا جس میں ہر ایک کے لیے محبت تھی انسیت تھی مگر کسی کے لیے نفرت کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ دنیا سے اس قدر انس رکھتے تھے جس قدر ایک مومن کے لیے دنیا کی

ضرورت ہوتی ہے وہ حق پرست تھے دنیا کے ساز وسامان سے ان کا کوئی لگاؤ نہ تھا دنیا ان کے پیچھے پیچھے تھی دنیا کے اسباب ان کے انتقال کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے مگر وہ ان سے کوسوں دور تھے وہ بوریہ نشین تھے۔ان کے گھر میں پکا فرش تک نہ تھا ایک چٹائی پر ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا مگر بڑے بڑے شاہوں کے محل ان کے آگے ہاتھ باندھے ہروقت کھڑے رہتے تھے اور وہ اس چاہ میں ہاتھ ملتے رہ گئے کہ مولانا صرف ان کی طرف ایک نگاہ ہی کرکے کرم فرمادیں لیکن مولانا ان سب سے بے نیاز تھے۔محلوں کے بیچ میں ان کو اپنے سادہ بوریہ بستر ہی میں محلوں کی شان وشوکت کی خوشبو ملتی تھی۔انہیں عیش وآرام اور جدید آسائشوں سے سجے دھجے شان وشوکت کے محلوں کے بجائے اپنی سادگی میں راحت واطمینان نصیب تھا۔ان کی مسرت سادگی کی زندگی میں تھی اور یہ بات موجودہ دنیا میں صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی ہی کی شخصیت میں پنہاں تھی۔ایسی ہمہ جہت صفات شخصیت اب ہمارے درمیان میں نہ رہی ہے یہ کس قدر دکھ صدمہ اور اتھاہ غم کی بات ہے۔

اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عالم اسلام کی بیسویں صدی کی سب سے بڑی اور سب سے اہم وبے مثال ہستی تھی جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئی اور جسے بیسویں صدی نے ہی ہم سے چھین بھی لیا اور ہم سب روتے بلکتے ہی رہ گئے۔ادارہ ندوۃ المصنفین عالم اسلام سے عالم انسانیت سے اس حادثۂ وفات پر اظہار تعزیت کرتا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے جہاں میں دیدہ ور پیدا

[جنوری،فروری ۲۰۰۰ء]

۞۞۞

اشاریہ (شخصیات)

ا

ابراہیم، حافظ محمد ۱۱۴
ابن سعود، سلطان ۶۵
ابوزہرہ، شیخ محمد ۱۴۲
اجمیری، مولانا معین الدین ۳۱
احسنؔ مارہروی ۳۲
احمد، حاجی اسرار ۵۰
احمد، حاجی اقبال ۱۳۶
احمد، حاجی شیخ رشید ۶۴
احمد، فخر الدین علی (صدر جمہوریہ) ۱۵۶
احمد، مولانا سید فخر الدین ۱۳۳
احمد، حافظ ضیاء الدین ۶۰
اختری بیگم [اہلیہ، سعید اکبرآبادی] ۱۷۲
اسدؔ ملتانی ۸۷
اسعد اللہ، مولانا ۱۶۸
اسماعیل، حکیم محمد ۹۹
اسمٰعیل، الحاج محمد ۱۳۳
اقبال، ڈاکٹر محمد ۲۵
اکبرآبادی، مولانا عاشق حسین سیماب، دیکھیے: سیماب اکبرآبادی، مولانا عاشق حسین
اکبرآبادی، مولانا سعید احمد ۲۱۴
الجلالی، سید عبدالدائم ۱۹۶
الحسنی، مولانا محمد ۱۶۷
العمری، مولانا سید فخر الحسن الحسنی ۱۷۲
الگیلانی، سید فضل اللہ ۱۶۶
آلمؔ مظفرنگری ۱۲۲
الہ آبادی، مولانا شاہد فاخری ۱۴۶
امجدؔ حیدرآبادی ۹۲
امین الحسینی، سید (مفتی اعظم فلسطین) ۱۴۳
امینی، مولانا محمد تقی ۲۳۳
انبیٹھوی، مشتاق احمد ۳۶
اندرا گاندھی، شریمتی ۲۱۱
انصاری، عبدالقیوم ۱۳۵
انصاری، غفار احمد ناز، دیکھیے: ناز انصاری، غفار احمد
انصاری، مولانا سعید ۱۰۰
اہلیہ، سید ابوالحسن علی ندوی ۲۳۰
اہلیہ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۲۱۳
اہلیہ، مولانا محمد انور شاہ الکشمیری ۱۱۲
ایم اسلم، میاں ۱۹۵
آزاد، اسرار احمد ۱۲۳
آزاد، مولانا ابوالکلام ۸۲
آزاد، مولوی ابوالمکارم محمد عبدالبصیر عتیقی ۳۵

ب

بجنوری، مولانا احمد رضا ۲۵۰
بخاری، مولانا سید عطاء اللہ شاہ ۹۴
بدایونی، پروفیسر ضیاء احمد ۱۳۸
برکتی، مولانا مفتی عمیم الاحسان مجددی ۴۳
بریلوی، حکیم صدیق احمد امروہی ۱۶۳
بسملؔ سعیدی ۱۶۱
بشیر الدین، خان بہادر مولوی ۷۷
بقائی، حکیم شریف الدین ۲۳۱
بلیاوی، علامہ محمد ابراہیم ۱۱۳
بلیاوی، مولانا عبدالحفیظ ۱۲۹
بنوری، مولانا محمد یوسف ۱۶۲
بہاری، مولانا نور الدین ۷۸
بہاری، مولانا ابوسلمہ شفیع احمد ۲۱۷
بہاری، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد ۳۲
بہوروی، خیر، دیکھیے: خیر بہوروی
بھٹناگر، سرشانتی سروپ ۷۰

پ

پاشا، مصطفےٰ کمال ۲۶
پرشاد، ڈاکٹر راجندر ۹۹
پوتا، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۱۱
پھلواری، سید شاہ محمد محی الدین ۴۶
پھلواری، مولانا محمد جعفر شاہ ۱۸۴

ت

تاجورؔ نجیب آبادی، مولانا احسان اللہ خاں ۵۵
تھانوی، مولانا احتشام الحق ۱۷۱
تھانوی، مولانا اشرف علی ۳۶
تھنگل، سید عبدالرحمٰن ۱۳۵

ٹ

ٹریسا، مدر ۲۴۹
ٹونکی، خلیق ۲۴۳
ٹونکی، مولانا حیدر حسن خاں ۳۶

ث

ثانی، مولانا محمد [بھانجا، مولانا سید ابوالحسن علی الندوی] ۱۷۹

ج

جاپان والا، الحاج شیخ فیروز الدین ۱۲۴
جامعی، پروفیسر محمد سرور ۱۹۵
جان، شیخ محمد (خان بہادر) ۱۷۳
جعفری، رئیس احمد ۱۱۹
جگرؔ مرادآبادی ۹۰
جلیس، مولانا محمد اسحاق ۱۶۹
جناح، محمد علی ۴۹
جونپوری، شفیق، دیکھیے: شفیق جونپوری
جوہریؔ، علامہ طنطاوی ۲۹
جیراج پوری، مولانا حافظ محمد اسلم ۳۵
جیون بخش، حاجی محمد اسمٰعیل ۸۰

چ

چشتی، شاہ سلیمان احمد ۹۴

ح

حاوی، مولانا عبدالباری ۱۳۳
حبیب، پروفیسر محمد ۱۲۸
حسرتؔ موہانی، مولانا ۵۶
حسن، ڈاکٹر ہادی ۱۰۱
حسن، سید صدیق ۱۰۱
حسن، مولانا سید مرتضیٰ ۵۹
حسن، مولوی مجید ۱۱۱
حسینی، حکیم محمد زماں ۲۵۳
حسین، پروفیسر سید احتشام ۱۳۵
حسین، ڈاکٹر ابرار ۶۰
حسین، ڈاکٹر ذاکر ۱۳۱
حسین، ڈاکٹر سید عابد ۱۶۵
حسین، سید عنایت ۸۵
حسین، مولانا افضل ۲۳۱
حسین، مولانا سید اصغر ۴۲
حسین، مولانا قاضی سجاد ۲۳۲
حسین، مولانا سید اختر ۱۶۲
حفظ الرحمٰن، قاری ۱۲۱
حمید اللہ خاں، حاجی (نواب بھوپال) ۸۸

حیدرآبادی، امجد، دیکھیے: امجد حیدرآبادی

خ

خان، ڈاکٹر عبدالبصیر ۱۱۱
خان، ڈپٹی حبیب اللہ ۹۲
خان، سر حافظ احمد سعید (نواب آف چھتاری) ۱۷۸
خان، لیاقت علی ۵۷
خان، مولانا رسول ۱۳۰
خان، ڈاکٹر یوسف حسین ۱۶۶
خان، مولانا حکیم مقصود علی (نواب مقصود علی) ۹۸
خاں، مولوی محمد عبدالرحمٰن ۹۸
خاں، پروفیسر عبدالمعید ۱۳۸
خاں، ڈاکٹر ۸۴
خاں، مولانا بشیر احمد ۱۱۰
خاں، مولانا حامد علی ۲۱۰
خاں، مولانا ظفر علی ۷۹
خاں، میر عثمان علی (نظام حیدرآباد) ۱۱۱
خمینی، امام ۲۲۹
خیر بہوروی ۱۲۹

د

دانش، احسان ۱۷۹
دریابادی، حکیم عبدالقوی ۲۳۹
دریابادی، مولانا عبدالماجد ۱۵۴
دلؔ شاہ جہاں پوری ۸۸
دہلوی، سید اخلاق حسین ۲۴۳
دہلوی، مفتی محمد کفایت اللہ ۶۲
دہلوی، مولانا حافظ احمد سعید ۸۷
دہلوی، حکیم عبدالحمید ۲۵۱
دہلوی، خواجہ حسن نظامی ۷۳
دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ ۴۶

ڈ

ڈیانا، لیڈی ۲۴۷

ر

راس، ڈینی سن ۳۲
راشدی، پیر سید حسام الدین ۱۸۲
رائے پوری، مولانا شاہ عبدالقادر ۹۷
رحمانی، مولانا عبدالصمد ۱۳۷
رحمانی، خواجہ محمد علی شاہ ۱۲
رحمانی، مولانا منت اللہ ۲۳۶
رحمت اللہ، مولانا محمد ۱۵۳
رشیدی، مولانا سید سراج احمد ۲۵
رضوی، سید ابوالنظر ۷۶
رضوی، سید محبوب ۱۶۶
رفیع، مولانا محمد ۱۸۹
رودولوی، چودھری محمد علی ۸۶
روش صدیقی ۱۲۳

ز

زارزؔتشی، پنڈت تربھون ناتھ ۱۰۷
زورؔ، ڈاکٹر محی الدین ۹۹
زین العابدین، قاضی ۲۳۶

س

سالک، عبدالمجید ۸۶

سبحانی، مولانا آزاد ۸۰
سعید، جسٹس بشیر احمد ۲۰۹
سعید، حکیم محمد ۲۵۰
سعید، عمر ۲۰۹
سعیدی، بسمل، دیکھیے: بسمل سعیدی
سکروڈوی، مولانا سید محمد ادریس ۸۰
سکسینہ، رام بابو ۸۲
سلیمان، سر شاہ محمد ۳۳
سلیم، مولانا محمد ۱۶۰
سملکی، حاجی موسیٰ میاں ۴۰
سملکی، مولانا محمد بن موسیٰ ۱۰۰
سنبھلی، مولانا محمد اسمٰعیل ۱۴۸
سندھی، مولانا عبیداللہ ۴۱
سواتی، مولانا فضل الرحمٰن ۱۳۹
سہارنپوری، مولانا مفتی حافظ عبداللطیف ۶۷
سہیل، اقبال ۷۵
سیف الدین، ڈاکٹر سیدنا طاہر ۱۰۸
سیماب اکبرآبادی، مولانا عاشق حسین ۵۵
سیوہاروی، قاضی ظہور الحسن ناظم، دیکھیے: ناظم سیوہاروی، قاضی ظہور الحسن
سیوہاروی، مولانا حفظ الرحمٰن ۹۵
سیوہاروی، نہال، دیکھیے: نہال سیوہاروی

ش

شاستری جی ۱۰۸
شاہجہاں پوری، دل، دیکھیے: دل شاہجہاں پوری
شاہجہاں پوری، مولانا مفتی مہدی حسن ۱۵۰
شاہدی، پرویز ۱۱۶
شروانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں ۵۴
شریف الحسن، مولانا ۱۵۹
شریف، پروفیسر ایم ایم ۱۰۹
شفیع، مولانا مفتی محمد ۱۵۳
شفیع، مولانا محمد ۹۱
شفیع، مولوی محمد (خان بہادر) ۱۰۰
شفیق جونپوری ۱۰۰
شہابی، مفتی انتظام اللہ ۱۱۸
شہیدؔ فرنگی محلی، مولانا صبغۃ اللہ ۱۰۵
شیروانی، پروفیسر حافظ محمود خاں ۴۴

ص

صالح، حاجی محمد ۱۳۷
صدیقی، اعجاز ۱۶۲
صدیقی، پروفیسر رشید احمد ۱۵۵
صدیقی، ڈاکٹر عبدالستار ۱۳۴
صدیقی، ڈاکٹر محمد زبیر ۱۴۹
صدیقی، روش، دیکھیے: روش صدیقی
صدیقی، محمد یوسف ۱۵۰
صدیقی، مولانا ابواللیث ۲۳۱

ض

ضیاء الحق، جنرل محمد ۲۲۷

ط

طٰہٰ حسین، ڈاکٹر ۱۴۲

ظ

ظہور الحق، قاضی، مولوی ۳۶

ع

عاقل، مولانا محمد ۱۳۵
عالی، نواب ۳۸
عباسی، قاضی محمد عدیل ۱۷۰
عبدالباقی ۱۱۵
عبدالحق، افضل العلماء ڈاکٹر ۸۳
عبدالحق، ڈاکٹر مولوی ۹۳
عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ ۸۵
عبدالرحمٰن، مولانا الحاج ۶۷
عبدالرحمٰن، سید صباح الدین ۲۲۲
عبدالرشید، خواجہ (لیفٹننٹ کرنل) ۱۸۹
عبدالسمیع، مولانا ۴۵
عبدالعلیم، ڈاکٹر ۱۴۹
عبدالعلی، ڈاکٹر سید ۹۲
عبدالغفور، ڈاکٹر پی۔ کے ۲۰۸
عبداللطیف، مولانا مفتی ۸۷
عبداللطیف، ڈاکٹر سید ۱۳۱
عبداللہ، شیخ محمد ۱۸۴
عبدالمجید، خواجہ ۹۹
عبدالناصر، جمال ۱۲۲
عثمانی، مولانا شمس الرحمٰن نوید، دیکھیے: نوید عثمانی، مولانا شمس الرحمٰن
عثمانی، شمیم ۲۴۵
عثمانی، قاری جلیل الرحمٰن ۲۴۶
عثمانی، مخمور، دیکھیے: مخمور عثمانی
عثمانی، مولانا عامر ۱۲۰
عثمانی، مولانا لقاء اللہ ۱۲۰
عثمانی، مولانا مطلوب الرحمٰن ۸۹
عثمانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن ۲۰۲
عثمانی، مولانا یعقوب الرحمٰن ۵۹
عثمانی، نجیب الرحمان ۲۵۲
عثمانی، مولانا شبیر احمد ۵۰
عثمانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن ۲۰۲_۲۰۸
عثمان، مولانا محمد ۲۰۹
عرشی، مولانا امتیاز علی خاں ۱۷۶
عطا شیخ، مولانا شاہ محمد حلیم ۷۴
علال الفاسی، شیخ ۱۴۳
علوی، ڈاکٹر مصطفےٰ حسن ۱۷۴
علی، آصف ۶۵
علی، سید مرتضیٰ ۷۸
علی، عبداللہ یوسف ۶۷
علی، مولانا احمد ۹۵
علی، مولانا حکیم سید محفوظ ۱۰۲
علی، مولانا شوکت ۲۸
علی، مولانا محمد مبارک ۱۱۸
علی، مولانا محمد اعزاز ۷۰
عمر الدین، پروفیسر محمد ۱۰۴

غ

غازی، مولانا حامد اللہ الانصاری ۲۴۰
غریب، حاجی احمد ۱۱۲
غلام السیدین، خواجہ ۱۳۲

ف

فارقلیط، مولانا محمد عثمان ۱۵۱
فاروقی، توفیق ۲۴۵
فاروقی، خواجہ عبدالحئی ۱۰۵
فاروقی، مقیم الدین ۲۴۷
فاروقی، مولانا عبدالسلام ۱۳۸

فاروقی، مولانا محمد کفیل ۱۸۵
فاروق، میر واعظ مولوی محمد ۲۳۹
فتح پوری، نیاز، دیکھیے: نیاز فتح پوری
فرقت، غلام احمد ۱۳۶
فرنگی محلی، مولانا صبغۃ اللہ شہید،
دیکھیے: شہید فرنگی محلی، مولانا صبغۃ اللہ
فرنگی محلی، مولانا مفتی عتیق احمد ۱۶۰
فریدی، ڈاکٹر عبدالجلیل ۱۴۳
فہمی، مفتی شوکت علی ۲۴۱
فیصل، شاہ (شہید) ۱۴۵
فیض آبادی، مولانا حمید الدین ۱۱۸
فیضی، پروفیسر اصغر علی ۱۷۸

ق

قادری، ڈاکٹر محمد ایوب ۱۹۵
قدوائی، رفیع احمد ۶۸
قدوائی، شفیق الرحمٰن ۶۵
قدوائی، مولانا عبدالسلام ۱۶۸
قریشی، پروفیسر اشتیاق حسین ۱۷۴
قریشی، شعیب ۹۵

ک

کاشمیری، آغا شورش ۱۴۷
کاظمی، اسد اللہ ۱۲۹
کاظمی، سید محمد احمد ۸۷
کاندھلوی، مولانا محمد الیاس ۴۰
کاندھلوی، مولانا احتشام الحسن ۱۳۲
کٹھوری، بشیر احمد ۷۴
کٹھوری، حکیم الیاس ۲۴۰
کول، پنڈت کشن پرشاد ۷۰
کیرانوی، مولانا وحید الزماں ۲۴۴
کیرانوی، مولانا محمد جلیل ۱۱۷
کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ ۷۴
کیمرن، اے ۵۳
کینیڈی ۱۰۲

گ

گابا، ایل۔ کے ۱۷۷
گاندھی جی ۴۶
گاندھی، راجیو ۲۳۷
گیلانی، مولانا سید مناظر احسن ۷۷

ل

لانبہ، سردار نرنجن سنگھ ۲۴۰
لدھیانوی، مولانا حبیب الرحمٰن ۷۸

م

ماتھر، شری راجندر ۲۳۷
مارہروی، احسن، دیکھیے: احسن مارہروی
ماہر القادری ۱۶۳
مبارک پوری، قاضی اطہر ۲۴۶
مبارک پوری، مولانا شکر اللہ ۳۵
مجددی، مولانا قاری محمد اسحاق نقشبندی ۴۳
مجیبی، مولانا شاہ عز الدین ۱۶۰
محروم، پروفیسر تلک چند ۱۰۹
محمد زکریا، مولانا ۱۸۰
محمد طیب، مولانا قاری ۱۹۳
محمد، ملاّ جان ۱۳۴

محمود، مولانا سید ۱۲۸
محمود، ڈاکٹر سید ۱۲۹
مخمور عثمانی ۲۴۴
مدنی، سید احمد مہاجر، مولانا ۲۹
مدنی، مولانا سید حسین احمد ۸۰
مدنی، مولانا عبدالحق ۷۲
مراد آبادی، جگر، دیکھیے: جگر مراد آبادی
مراد آبادی، قاضی عبدالغفار ۷۶
مرزا، ڈاکٹر وحید ۱۵۴
مظفر نگری، الم، دیکھیے: الم مظفر نگری
مظہری، علامہ جمیل ۱۷۳
ملتانی، اسد، دیکھیے: اسد ملتانی
ملیح آبادی، مولانا عبدالرزاق ۸۵
منصور، مولانا محمد میاں ۴۴
منگلوری، مولانا سید طفیل احمد ۴۵
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ ۱۶۹
موہانی، مولانا حسرت،
دیکھیے: حسرت موہانی، مولانا
مہدی، جمیل ۲۲۴
مہر، مولانا غلام رسول ۱۳۲
میاں، مولانا سید محمد ۱۴۷
میرٹھی، مولانا شیخ محمد عالم بدر ۱۰۶
میرٹھی، قاضی زین العابدین ۲۳۶

ن

ناز انصاری، غفار احمد ۲۳۸
ناظم سیوہاروی، قاضی ظہور الحسن ۸۸
ناغر، میجر محمد یٰسین خان (خان بہادر) ۱۶۳
نامی، مولانا محفوظ الرحمٰن ۱۰۳
نانا، مولانا محمد اسمٰعیل ۱۶۵
نانوتوی، مولانا محمود احمد ۱۲۰
نانی، رضا الرحمٰن ۱۹۶
نجم الدین، پرنس ۲۲۰
نجیب آبادی، مولانا احسان اللہ خاں تاجور، دیکھیے:
تاجور نجیب آبادی، مولانا احسان اللہ خاں
نجیب آبادی، مولانا اکبر شاہ خان ۲۶
ندوی، مولانا محمد اویس نگرامی ۱۵۴
ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ۱۱۸
ندوی، مولانا سید ابوظفر ۸۴
ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ۲۵۴
ندوی، مولانا سید سلیمان ۶۶
ندوی، مولانا شاہ معین الدین ۱۴۵
ندوی، مولانا عبدالسلام ۷۹
ندوی، مولانا مسعود علی ۱۱۲
ندوی، مولانا عبدالباری ۱۴۸
نظام الدین، محمد ۱۲۰
نعمانی، مولانا عبدالحمید ۱۸۶
نعمانی، مولانا عبداللطیف ۱۳۵
نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید ۲۵۳
نورالدین ۱۴۵
نورالنبی، ڈاکٹر محمد ۱۸۷
نورگت، مولانا غلام محمد ۲۴۱
نوری، محمد یٰسین (بیرسٹر) ۲۹
نوید عثمانی، شمس الرحمٰن ۲۴۲
نہال سیوہاروی ۵۹
نہرو، پنڈت جواہر لال ۱۰۳
نیاز فتح پوری ۱۱۰
نیازی، مولانا عبدالسلام ۱۱۰
نیر، شفیع الدین ۱۶۲

و

واصف، مولانا حفیظ الرحمٰن ۲۱۹
والدہ، ڈاکٹر جوہر قاضی ۲۴۷
والدہ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۴۰
وجے لکشمی، پنڈت ۲۳۲
وصی اللہ، مولانا شاہ ۱۱۳
ولی الدین، ڈاکٹر میر ۱۴۸

ی

یعقوب، قاری محمد ۱۶۲
یوسفی، مظفر شاہ خاں ۱۱۷
یوسف، مولانا محمد (امیر تبلیغی جماعت) ۱۰۵
یوسف، قاری محمد ۱۲۳

مرتب کا تعارف

نام : محمد سہیل شفیق
ولدیت : شفیق احمد صدیقی
تاریخ پیدائش : ۱۹رمئی ۱۹۷۷ء (کراچی)

اسناد:

تحفیظ القرآن (دارالعلوم صابریہ فرقانیہ، کراچی)
شہادۃ العلوم الاسلامیہ (دارالعلوم نضرۃ العلوم، کراچی)
ایم۔اے۔(اسلامی تاریخ)، ایم۔اے۔(علومِ اسلامیہ)
پی ایچ۔ڈی۔(اسلامی تاریخ)۔ جامعہ کراچی، کراچی

مشغولیت:

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، کراچی
منتظمِ اعلیٰ: مرکز برائے ترتیبِ اشاریہ، حواشی و کتابیات، کراچی

علمی و تحقیقی وابستگی:

رکن مجلسِ ادارت: ششماہی الایام، کراچی
رکن قومی مجلسِ مشاورت: ششماہی التفسیر، کراچی
مدیرِ انتظامی: ششماہی معارف مجلۂ تحقیق، کراچی
رکن مجلس مشاورت: ضیائے تحقیق، فیصل آباد
رکن مجلس مشاورت: الاحسان، فیصل آباد
معاون مدیر: کتابی سلسلہ نعت رنگ، کراچی
رکن مجلسِ مشاورت: ماہنامہ ارمغانِ حمد، کراچی
رکن قومی مجلسِ مشاورت: ششماہی الدیبل، حیدرآباد
رکن مجلسِ مشاورت: ششماہی شاہد انٹرنیشنل، کراچی
رکن مجلسِ مشاورت: ششماہی جستجو، فیصل آباد
رکن مجلسِ مشاورت: ششماہی عروج مجلّہ تحقیق، کراچی
رکن مجلس ادارت: ششماہی المحصنات، کراچی
(سابق) مدیر: اخبارِ علمیہ، جامعہ کراچی
(سابق) نائب مدیر: ماہنامہ The Muslim World،
مؤتمر عالم اسلامی، کراچی

مطبوعہ مقالات و مضامین :

ملکی و غیر ملکی رسائل و جرائد میں ۶۰ سے زائد علمی و تحقیقی مقالات اور مضامین

مطبوعہ کتب :

۱۔	اشاریہ ''معارف'' اعظم گڑھ	قرطاس، کراچی	۲۰۰۶ء
۲۔	مشرق وسطیٰ کا بحران	قرطاس، کراچی	۲۰۰۷ء
۳۔	اشاریہ ''نعت رنگ''	نعت ریسرچ سینٹر، کراچی	۲۰۰۹ء
۴۔	وفیاتِ معارف	قرطاس، کراچی	۲۰۱۳ء
۵۔	اشاریہ ''جہانِ حمد''	حمد و نعت ریسرچ سینٹر، کراچی	۲۰۱۳ء
۶۔	نعت نامے بنام صبیح رحمانی	نعت ریسرچ سینٹر، کراچی	۲۰۱۴ء
۷۔	اشاریہ التفسیر	مجلس التفسیر، کراچی	۲۰۱۵ء
۸۔	معارفِ شبلی	قرطاس، کراچی	۲۰۱۶ء
۹۔	مکتوبِ ترکی	قرطاس، کراچی	۲۰۱۶ء
۱۰۔	وفیات برہان (زیرِ نظر)	قرطاس، کراچی	۲۰۱۸ء

زیرِ طبع کتب:

۱۱۔	جامعہ نظامیہ بغداد	قرطاس، کراچی
۱۲۔	اشاریہ ''ارمغانِ حمد''	حمد و نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

اعزازات :

''نشانِ ظفر'' (۲۰۱۴ء)، (۲۰۱۵ء)، (۲۰۱۶ء)
منجانب: انجمن اساتذۂ جامعہ کراچی، کراچی
سیرت نگار ایوارڈ۔ ۲۰۱۶ء اسلامک اکیڈمک فورم (سندھ)

وفیات نگاری مسلمانوں کی علمی روایت میں بڑی مقبول اور مضبوط رہی ہے، اور برعظیم پاکستان وہند میں بھی بیسویں صدی میں اس سلسلے میں خاصا کام ہوا ہے، اور اس روایت کو آگے بڑھانے میں اردو کے علمی و دینی جرائد نے بنیادی کام کیا ہے۔ انہی جرائد میں ''برہان'' بھی شامل ہے۔ زیر نظر ''وفیاتِ برہان'' سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی ۱۹۳۸ء سے اپریل ۲۰۰۱ء تک اس میں سوا تین سو سے زائد مشاہیر اور اپنے اپنے احاطۂ کار میں نمایاں کام کرنے والوں کے بارے میں معلومات یک جا کی گئی ہیں۔ پہلی شخصیت جس کی یاد میں قلم اٹھایا گیا تھا، وہ علامہ اقبال تھے اور جس آخری رجل عظیم کی یاد میں آنسو بہائے گئے ہیں، وہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

''وفیات برہان'' میں یوں تو پاکستان وہند کے حکمرانوں، بڑے سیاست دانوں، بعض خادمان انسانیت کا ذکر ہے اور ان سے ندوۃ المصنفین دہلی کے اعیان ثلاثہ ---مفتی عتیق الرحمن عثمانی، حفظ الرحمن سیوہاری اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی ---کا تعلق بھی تھا۔ ''وفیات برہان'' کا غالب حصّہ مولانا اکبرآبادی کے قلم سے ہے۔ اُن کی زندگی میں خال خال وفیات مفتی عتیق الرحمن عثمانی یا کسی اور کے قلم سے ہیں۔ مولانا اکبرآبادی کے جانشینوں میں زیادہ تر وفیات نگاری عمید الرحمن عثمانی نے کی ہے۔

جناب ڈاکٹر محمد سہیل شفیق ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے پون صدی پر محیط ''برہان'' کی مجلدات کی ورق گردانی کی۔ جملہ وفیات کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا اور وفیات کے ذخیرۂ ادب میں ایک وقیع کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سفیر اختر

''برہان'' ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و تحقیقی جریدہ ہے جس کا اجراء جولائی ۱۹۳۸ء/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے زیر ادارت ہوا۔ مولانا کی وفات کے بعد مارچ ۱۹۸۵ء سے مئی ۱۹۸۵ء تک مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے داماد اطہر صدیقی نے ''برہان'' کی ادارتی ذمے داریاں نبھائیں۔ ان کے انتقال کے بعد جمیل مہدی نے یہ خدمت انجام دی۔ ۳؍فروری ۱۹۸۸ء کو جمیل مہدی راہیٔ ملک عدم ہوئے تو عمید الرحمن عثمانی (فرزند مفتی عتیق الرحمن عثمانی) نے مدیر کے فرائض سنبھالے اور اُنھی کی ادارت میں مارچ اور اپریل ۲۰۰۱ء کے مشترکہ شمارے کے ساتھ ''برہان'' کی اشاعت کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

وفیات ماہنامہ ''برہان'' کا ایک مستقل سلسلہ تھا جس کے تحت مشاہیر کی وفیات سے متعلق سینکڑوں صفحات تحریر کیے گئے۔ جن میں قومی اور بین الاقوامی سبھی شخصیتیں شامل ہیں۔ مجموعی طور پر ماہ نامہ ''برہان'' میں گزشتہ تریسٹھ برسوں (جولائی ۱۹۳۸ء تا اپریل ۲۰۰۱ء) میں تین سو چھتیس (۳۳۶) شخصیات کی وفیات قلم بند کی گئی ہیں۔ زیر نظر کتاب انہی تحریروں پر مشتمل ہے۔

ترتیب وتدوین کا یہ کام ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی نے انجام دیا ہے۔ اس سے قبل وہ نوے سالہ ''اشاریہ معارف'' اور ''وفیات معارف'' (اعظم گڑھ) بھی مرتب کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

قیمت: ۱۰۰۰ روپے

9 789699 640537